شیخ القرآن والتفسیر والحدیث حضرت علامہ مفتی

محمد فیض احمد اویسی صاحب مدظلہ

مکتبہ غوثیہ

یونیورسٹی روڈ، بالمقابل عسکری پارک، کراچی۔

فون: 4926110-4910584

مصنف

سراج العلماء زبدۃ الفضلاء حضرت علامہ شیخ اسماعیل حقی رحمہ اللہ تعالیٰ

مترجم

شیخ التفسیر والحدیث مولانا ابوالصالح محمد فیض احمد اویسی مدظلہ

ناشر

مکتبہ غوثیہ ہول سیل

پرانی سبزی منڈی بالمقابل مین گیٹ عسکری پارک
متصل دارالعلوم غوثیہ بابا جلال بلڈنگ کراچی۔
فون: 4926110, 4910584

نام کتاب ________ فیوض الرحمٰن اردو ترجمہ، روح البیان پارہ نمبر۹

مصنف ________ حضرت علامہ اسماعیل حقی قدس سرہ

مترجم ________ حضرت علامہ مفتی فیض احمد اویسی رضوی مدظلہ

سن طباعت ________ ۲۰۰۷ء

مصحح ________ چودھری مشتاق احمد خاں، لاہور

ناشر ________ مکتبہ غوثیہ ہول سیل، پرانی سبزی منڈی، کراچی

باہتمام ________ محمد قاسم جلالی (بانی وچیئرمین ویلفیئر ٹرسٹ) کراچی

پارہ ۱۲

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا
كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ
عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ
الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ
الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ
لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

ترجمہ: اور زمین پر کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمۂ کرم پر نہ ہو اور وہ اس کے ٹھہرنے اور سپرد ہونے کی جگہ کو جانتا ہے سب کچھ واضح بیان کرنے والی کتاب میں ہے۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل والا ہے اور اگر آپ فرمائیں کہ بے شک تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر ضرور کہیں گے کہ یہ تو نہیں مگر کھلا جادو۔ اور اگر ہم ان سے کچھ عرصہ کے لیے مؤخر کردیں تو کافر ضرور کہیں گے کہ عذاب کو کس شے نے روکا ہے۔ خبردار کہ جس دن ان پر عذاب آئے گا تو ان سے نہ پھیرا جائے گا۔ انھیں وہی عذاب گھیرے گا جس کی ہنسی کرتے تھے۔

تفسیر عالمانہ وَمَا میں مَا نافیہ ہے۔ مِنْ صلہ کا ہے دَآبَّةٍ عام ہے یعنی ہر جانور جو بھی رزق کا محتاج ہو، چھوٹا ہو یا بڑا، مذکر ہو یا مؤنث، صحیح سالم ہو یا عیب دار، پرند ہو یا غیر پرند۔ اس لیے کہ پرند بھی کسی وقت زمین پر پاؤں سے چلتا ہے فِی الْاَرْضِ اس کا متعلق محذوف ہے اور وہ دابۃ کی صفت ہے۔ یعنی دابۃ ہر فرد کے لیے چاہے وہ زمین کے کسی حصہ میں ہو۔ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُهَا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر اس کا رزق ہے۔ یعنی جو اس کے لائق غذا و معاش ہے

اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لگایا ہے۔ یہ اس کی مہربانی اور فضل و کرم ہے۔

ف : تبیان میں ہے کہ یہ ایجاب کرم ہے نہ ایجاب حق۔ یعنی یہ وجوب اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر محض فضل وکرم کے طور فرمایا ہے، نہ یکہ ہمارا کوئی اس پر حق ہے کہ اس کی ادائیگی اس پر واجب تھی اور اس نے ادا کی (معاذ اللہ) اس لیے کہ مخلوق میں سے کسی کا اس پر حق نہیں۔

مسئلہ : جامع صغیر میں ہے کہ:

دعا میں "بحق نبیك او بیتك او عرشك (یعنی اپنے نبی علیہ السلام اور اپنے گھر اور اپنے عرش) کے حق کی وجہ سے دعا قبول فرما" کہنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر حق بمعنے حرمت اور تکریم و تعظیم مراد ہو تو (بلا کراہت) جائز ہے[1]۔ (کذا فی شرح الطریقہ)

نکتہ : بحر العلوم میں لکھا ہے کہ:

لفظ عَلیٰ سے (اللہ تعالیٰ نے جو عطائے رزق کا وعدہ فرمایا، اسی وجہ سے) یہ لفظ وجوب پر دلالت کرتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار اور اپنے فضل و کرم سے بندوں کا رزق اپنے ذمہ کرم لگایا ہے یہ ایسے ہے جیسے بندہ اپنے اختیار سے نذر کے روزے مان لیتا ہے۔

فائدہ : بعض مفسرین نے فرمایا کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے واجب نہیں (یہی اہلسنت کا مذہب ہے) لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے لفظ عَلیٰ (جو وجوب پر دلالت کرتا ہے) استعمال فرمایا۔ اس میں چند وجوہ ہیں:

۱۔ اشارہ کیا گیا ہے کہ جو ازل میں رزق کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ضرور پورا ہوگا۔

۲۔ بندوں کو اپنے مالک پر بھروسا ہو کہ وہ کریم جس طرح کا وعدہ فرماتا ہے وہ لازماً پورا ہوگا۔

۳۔ جب بندوں کو یقین ہوگا کہ رزق کا وعدہ کریمانہ ہو چکا ہے تو پھر اس کی تلاش میں خواہ مخواہ پریشانی کیوں۔

فائدہ : لفظ علیٰ میں استعارہ تبعیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن حیوانات وغیرہ کے لیے رزق کا وعدہ فرمایا ہے اس کے فضل و کرم پر واجب ہے کہ وہ ضرور پہنچے اس لیے کہ اس کے وعدے کے خلاف ہونا محال ہے۔

فائدہ : بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر علیٰ بمعنے مِنْ ہے۔ یعنی ہر ایک کو رزق منجانب اللہ پہنچتا ہے یا عَلیٰ بمعنے اِلیٰ ہے یعنی ہر ایک کا رزق اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ رزق میں کمی بیشی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کہاں کون ٹھہرے گا اور کہاں سپرد ہوگا۔ اس جملہ کی تفسیر میں چند وجوہ ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مُستقر سے انسان کا وہ مکان مراد ہے جس میں وہ شب و روز

---

[1] اس نے وہابیہ غیر مقلدین اور بعض جہال دیوبندیوں کا رد ہو اکہ وہ ایسے الفاظ کہنے سے کفر و شرک کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں۔

بسر کرتا ہے یا جہاں جہاں رات اور دن میں قیام کرتا اور آرام کرتا ہے۔ اور مستودع سے وہ جگہ مراد ہے جہاں مرنے کے بعد مدفون ہوگا جیسے کسی شے کو کہیں چھپا کے رکھ دیا جاتا ہے ایسے ہی قبر میں انسان کو چھپا کے رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی لیے قبر کو مستودع سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ جب کسی کو کسی جگہ مدفون ہونا ہوتا ہے اسی طرف اسے کوئی حاجت کھینچ کر لے جاتی ہے۔ جب ضرورت پوری کرلیتا ہے یا کرنے نہیں پاتا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ وہیں مرجاتا ہے۔ اسے وہیں دفنا دیا جاتا ہے۔ قیامت میں زمین عرض کرے گی یہ وہی ہے جسے میرے اندر امانت رکھا گیا تھا۔

۲۔ مستقر سے وہ قرارگاہ مراد ہے جہاں باپ کی پشت اور ماں کے شکم میں ایک عرصہ رہتا ہے۔ اسی طرح جملہ حیوانات، یہاں تک کہ انڈوں کا بھی یہی حکم ہے اور ماں کے رحم کو مستودع سے اسی لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ استیداع کسی شے کو کسی کے پاس امانت رکھنا، چونکہ عورت کے رحم کے اندر مرد اپنا نطفہ رکھتا ہے اسی بنا پر اسے مستودع کہا جاتا ہے اور چونکہ مرد کی پشت میں حیز طبعی و منشأ خلق کے لحاظ سے نطفہ قرار پکڑتا ہے اسی لیے اسے صرف مستقر سے تعبیر کیا گیا۔

۳۔ حیوان کے لیے زمین کا وہ مکان جہاں وہ بالفعل ہوتا ہے اور مستودع سے مراد ہے وہ جگہ جہاں وہ اس حالت سے پہلے بالفعل موجود تھا۔ مثلاً باپ کی پشت اور ماں کے رحم یا انڈے کے اندر وغیرہ۔

سوال: اس تقریر میں مستودعها کو مستقرها سے پہلے لانا چاہیے تھا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔

جواب: چونکہ الارض کا ذکر رزق کی وجہ سے آچکا ہے اس کی مناسبت سے مستقرها پہلے لایا گیا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ہر دابہ کے مستقر کو عدم سے جانتا ہے کہ اس میں صورۃ ہذا کے قبول کرنے کی استعداد تھی اور اسے یونہی مقدر کیا جائے گا اور مستودع سے اس کی موجودہ صورت کہ جب وہ مقدر ہو جائے گا تو ایسے ایسے ہوگا۔

۵۔ عالم ارواح میں ہر روح انسانی کے مستقر کو جاننا مراد ہے اس لیے کہ عالم ارواح میں بھی ارواح چار صفوں میں منقسم تھے:

۱۔ ارواح انبیاء علیہم السلام وخاص اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ

۲۔ عام ارواح اولیاء و خواص المومنین

۳۔ عام ارواح المومنین والمسلمین

۴۔ ارواح الکفار والمنافقین

اور مستودع سے ان ارواح کے آخرت کے مراتب اور درجات و منازل بہشت میں یا دوزخ میں کُلٌّ ہر ایک یعنی دواب اور ان کا رزق اور ان کا مستقر و مستودع فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۞ یعنی لوح محفوظ میں ثابت اور ظاہر ہے کہ جسے تمام ملائکہ دیکھتے ہیں یا اتنا ظاہر ہے کہ اسے ہر دیکھنے والا دیکھتا ہے۔

تفسیرِ صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُم الکتاب ہے کہ وہ ہر قسم کے محو و اثبات کے تغیّر سے پاک ہے۔

اعجوبہ : چار چیزیں تغیّر و تبدل کو قبول نہیں کرتیں :

۱۔ عمر

۲۔ رزق

۳۔ اجل

۴۔ ازلی سعادت و شقاوت

سبق دانا وہ ہے جو رزق کی فکر نہیں کرتا، نہ اس کے اہتمام میں لگا رہتا ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہے اور اسی میں ثواب بھی ہے۔ ؎

مکن سعدیا دیدہ بر دیدہ بر کس
کہ بخشندہ پروردگار است و بس
اگر حق پرستی زور ہا بست
کہ گر وے بر اند نخواند کسست

ترجمہ : اے سعدی! کسی کے انتظار میں نہ رہ اس لیے کہ روزی بخشنے والا صرف وہی ہے اگر تم حق پرست ہو، تو کسی کے ہاں مت جاؤ اس لیے کہ اگر اس نے اپنی درگاہ سے ہٹا دیا تو پھر کوئی بھی اپنے ہاں نہیں آنے دے گا۔

حکایت موسیٰ علیہ السلام سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جب حکم ہوا کہ فرعون کے ہاں دعوتِ ایمان دینے کے لیے تشریف لے جائیں تو انہیں اپنے اہل و عیال کی فکر دامنگیر ہوئی۔ چنانچہ عرض کی : اے الٰہ العٰلمین! میں فرعون کے ہاں جاؤں تو میرے اہل و عیال کا کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اسی پتھر پر اپنا عصا ماریے۔ آپ نے عصا مارا، تو اسی پتھر سے ایک اور پتھر نکلا پھر اس پر عصا مارا تو اس سے تیسرا پتھر نکلا، اس پر عصا مارا تو اس میں سے ایک کیڑا نکلا جس کے منہ میں اس کے موافق غذا تھی جسے وہ کھا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے کانوں پر سے حجابات ہٹائے تو آپ نے کیڑے کو یوں پڑھتے ہوئے سنا :

سبحان اللہ من یرانی ویسمع کلامی ویعرف مکانی ویذکرنی ولا ینسانی (پاک ہے وہ ذات جو مجھے دیکھتی اور میرا کلام سنتی اور میرے رہنے کی جگہ جانتی اور پہچانتی ہے اور کبھی نہیں بھولتی۔)

حکایت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دن جنگل کی طرف نکلا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک پرندہ بلند آواز سے کچھ کہہ رہا ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بتاؤ یہ کیا کہہ رہا ہے؟

میں نے عرض کی،

اللہ ورسولہ اعلم بذلک۔

(اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانیں)

آپ نے فرمایا: یہ کہہ رہا ہے اے اللہ! تُو نے مجھے اندھا بنایا، میری آنکھیں چھین لیں اب مجھے اپنے فضل وکرم سے کچھ عنایت فرما کیونکہ میں بھوکا ہوں۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ ابھی ہم وہیں کھڑے تھے کہ ایک پرندہ (ٹڈی) اُڑتا ہوا اس بھوکے پرندے کے مُنہ میں داخل ہوگیا جسے اس نے نگل لیا۔ پھر پہلے کی طرح زور زور سے بولنے لگا۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا، اے انس! بتاؤ اب کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے پہلے کی طرح عرض کی، اللہ ورسولہٗ اعلم بذلک۔ آپ نے فرمایا وُہ کہہ رہا ہے:

الحمد للہ الذی لم ینس من ذکرہ۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو اپنے یاد کرنے والے کو نہیں بُھلاتا۔

ایک روایت میں ہے:

من توکل علی اللہ کفاہ۔ جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے وہ اس کی کفایت فرماتا ہے۔

(کذا فی انسان العیون)

حسینی تلوار پر نصیحت

سیدنا حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تلوار پر یہ چار کلمات لکھے ہوئے تھے۔

۱۔ الرزق مقسوم۔ ہر ایک کا رزق پہلے لکھا جا چکا ہے۔

۲۔ الحریص محروم۔ حریص ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

لہ: اس حدیث شریف میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پرندوں کی بولی بھی جانتے ہیں۔

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عقیدہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ علوم باذنہٖ تعالیٰ حاصل ہیں۔

۳۔ کبھی صحابہ کرام سے بطورِ امتحان سوال کر لیتے تھے۔

۳۔ البخیل مذموم ۔ بخیل بدبخت مذموم ہے۔

۴۔ الحاسد مغموم ۔ حاسد ہمیشہ غم میں مبتلا رہتا ہے۔

حدیث شریف جو بندہ بھوکا ہونے کے باوجود اپنی محتاجی کسی پر بیان نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا و قضا پر سرِ تسلیم خم کر دے تو اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرما کر رزق کے دروازے وا کر دیتا ہے۔ (کذا فی روضۃ العلماء)

تفسیر صوفیانہ مشایخ صوفیا۔کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رزق وغیرہ میں حقیقی توکل یہ ہے کہ اسباب دنیوی سے بالکل سہارا ختم کر کے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے (اگرچہ ظاہری اسباب کو استعمال بھی کرتا رہے لیکن بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہو) پہلا حکم خواص کا ہے، دوسرا عوام کا۔ چنانچہ مثنوی شریف میں ہے : ؎

گر توکل میکنی در کار کن

کسب کن پس تکیہ برجبار کن

ترجمہ ، اگر کاروبار میں توکل کرتا ہے تو تجھے سبب بھی بنانا چاہیے لیکن بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔

رزق عام مراد ہے جسمانی غذا ہو یا روحانی ۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

ایں دہان بستی دہانے باز شد

گو خورندہ لقمہا راز شد

گر ز شیر دیو تن را وابری

در فطام او بسے نعمت خوری

ترجمہ : یہ منہ بند کرو گے تو دوسرا کھل جائے گا۔ کھانے والے کو کھو کہ لقمہ بھی ایک راز ہے۔ گر دودھ تیرے لیے رکاوٹ ہوگئی تو حرج کیا ہے، اس لیے دودھ چھوڑنے کے بعد تجھے ہزار نعمت ملے گی۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وہ اللہ تعالیٰ جس نے ساتوں آسمان پیدا فرمائے۔

ساتوں آسمانوں کی تفصیل ۱۔ آسمانِ دنیا فلک القمر کہلاتا ہے۔ موج مکفوف سے مجتمع ہے۔ یہی ارواح مومنین کا مقر ہے۔

۲۔ اسے فلک عطارد کہتے ہیں۔ یہ سفید موتیوں کا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے عباد و زہاد کے ارواح کا مقر ہے۔

۳۔ فلک زہرہ لوہے کا ہے، یہ زاہدوں کے ارواح کی قرارگاہ ہے۔

۴۔ یہ فلک شمس کہلاتا ہے۔ یہ پیتل کا ہے۔ یہ اہلِ معرفت کی روحوں کی قرارگاہ ہے۔

۵۔ یہ فلک مریخ ہے۔ یہ تانبے کا ہے یہ ارواحِ اولیاء کا مقر ہے۔

۶۔ یہ فلک مشتری ہے یہ چاندی کا ہے یہ ارواحِ انبیاء کا مقام ہے۔

۷۔ یہ فلک زحل ہے۔ یہ رسل علیہم السلام کا مقام ہے۔

۸۔ فلک ثوابت۔ اسے کرسی بھی کہتے ہیں۔ یہ ارواحِ اولوالعزم پیغمبروں کا مقام ہے۔ اس کے اُوپر عرش ہے۔ یہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ مقدس کا مقام ہے۔

فائدہ: السمٰوٰت کو جمع لانے کی وجہ ظاہر ہے کہ وُہ ساتوں بالاصالۃ مختلف اور ذاتاً علیحدہ طبقات ہیں اور ہر طبقہ کے درمیان پانچسو سال کی مسافت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے اور ساتویں اور کرسی، اور اسی طرح کرسی اور عرش کے درمیان پانچ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔

نکتہ: آسمانوں کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و قضایا کا منشا و مصدر آسمان ہے۔ اس کے اوامر و نواہی بندوں کے رزق اور اس کے وعدہ وعید کے نزول کا مرکز بھی وہی ہے۔ یعنی بندوں کو جن احکام کا مامور اور جن باتوں سے روکا جاتا ہے اور جو کچھ انھیں دنیا میں رزق نصیب ہوتا ہے یا جو کچھ آخرت کے لیے وعدہ وعید بتائے گئے وہ سب آسمان میں مقدر و مکتوب ہیں یا اس لیے کہ آسمان یا اس کے اندر جتنے آثار متعددہ ہیں وُہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ باہرہ پر زیادہ دلالت کرتے ہیں اور اس کی عظمت و کبریائی پر زیادہ روشن دلیل ہیں۔

وَالْاَرْضَ اور سات زمینیں پیدا فرمائیں۔

سوال: الارض واحد کا صیغہ ہے تم نے سات کہاں سے ثابت کیں؟

جواب: آسمان کی جمع اسی معنے پر دلالت کرتی ہے۔ چونکہ تمام زمینیں ایک جنس ہیں اس لیے اسم جنس الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جواب۲: قرآن پاک میں دوسرے مقام پاک پر من الارض مثلھن میں صراحۃً سات زمینوں کا ذکر ہے۔ ساتوں آسمانوں کی طرح زمینیں بھی سات ہیں۔ زمین کو ہفت اقلیم سے تعبیر کرتے ہیں۔ (کذا فی حواشی سعدی المفتی)

ف: ۱۔ مشرق سے مغرب تک پانچسو سال کی مسافت ہے۔ جیسے پہلے آسمان سے دُوسرے آسمان تک پانچسو سال کی مسافت ہے۔

۲۔ زمین پر اکثر جنگل، پہاڑ، دریا ہیں۔ تھوڑے حصہ پر آبادی ہے۔ اسی آباد زمین میں اکثر کافر ہیں، تھوڑے مومن ہیں۔ مسلمانوں میں اکثر اہل بدعت سیئہ اعتقاداً جیسے شیعہ، نجدی، وہابی و دیگر اہلِ بدعت عملاً جیسے عوام کالانعام ان میں اللہ والے نیک آدمی تھوڑے ہیں یعنی اہلسنت وجماعت اعتقاداً وعملاً بہ نسبت اہل بدعت کے بہت تھوڑے ہیں۔

الجوبہ دنیا کے گرد تاریکی، پھر تاریکی کے گرد کوہ قاف ہے وہی تمام عالم دُنیا کو محیط ہے۔ کوہ قاف سبز زمرد کا ہے۔ اسی پر آسمان کے اطراف پٹے ہوئے ہیں۔

ف: زمین کا درمیانہ حصہ آباد ہے اور زمین کا قبر ویران ہے۔ زمین کے تبے سے وُہ معتدل حصہ مراد ہے جہاں گرمی سردی اور دن رات برابر ہوتے ہیں کبھی بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں۔

سوال: لوگ کہتے ہیں کعبہ معظمہ زمین کی ناف ہے تمہاری تقریر اس کے خلاف ہے۔
جواب: واقعی کعبہ معظمہ زمین کی ناف ہے لیکن زمین سے آباد حصہ مراد ہے نہ کہ کل زمین۔

اعجوبہ زمین کا بلند ترین حصہ جو آسمان سے قریب تر ہے وہ ہند میں ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام آسمان سے زمین پر اترے تھے وہ ایک پہاڑی ہے۔ بحری سفر کرنے والے اسے دُور سے دیکھ لیتے ہیں۔

اعجوبہ دیگر یہاں پر حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان ہے جو ایک صاف ستھرے پتھر میں ہے۔ ہر رات اس جگہ پر چمکتی ہوئی بجلی نظر آتی ہے حالانکہ چار سُو بادلوں کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ وہاں روزانہ بارش ہوتی ہے جس سے وہ قدم مقدس دُھل جاتا ہے۔ وہ پہاڑی بہ نسبت دوسرے پہاڑوں کے آسمان سے قریب تر ہے۔ (کذا فی انسان العیون)

فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ چھ دنوں میں۔ ان میں دو دن آسمانوں کو، دو دن زمینوں کو، باقی دو دنوں میں زمین کی اشیاء جیسے حیوانات، نباتات اور جمادات وغیرہ وغیرہ کو پیدا فرمایا جیسے سورۂ دخان میں تفصیل کی گئی ہے۔

سوال: زمین کی اندرونی اشیاء کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟
جواب: چونکہ وہ زمین کی اُوپر والی اشیاء میں داخل ہیں اس لیے بطور تتمہ کے اسی میں شامل ہوگئیں۔

تحقیقِ ایام ۱۔ ان سے اوقات مراد ہیں جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ یوم سے شان و آن مراد ہے اور آن ہر اس گھڑی کو کہا جاتا ہے جو ناقابلِ تقسیم ہے۔ ہم نے اسے پیشتر ازیں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ (فلا حاجۃ لذکرہ)

۲۔ اس سے دُنیا کے ایام کی یہی مقدار مراد ہے جس کا پہلا دن ہفتہ اور آخری جمعہ ہے۔ اگرچہ اس وقت یہ ایام نہیں تھے اس لیے کہ ایام کی مقدار سورج کے زمین پر چمکنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس وقت نہ زمین تھی نہ آسمان، نہ سورج تھا نہ چاند، لہٰذا وہاں دن اور رات کا تصور کیسا۔

۳۔ اس سے وہ آخرت کے ایام کی مقدار مراد ہے کہ وہاں کا ایک دن دنیا کے ہزار برس کے برابر ہوگا۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

نکتہ: اگرچہ وہ خلاقِ کائنات تمام کائنات کو ایک لمحہ سے بھی کم وقت میں پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن چونکہ بندوں کے لیے تدریج و تاخیر مفید ہے۔ اسی لیے اس طرف بندوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے فی ستۃ ایام فرمایا۔
نکتہ: چھ دنوں کی تخصیص بھی اسی لیے ہے کہ مخلوق کے اصولی اصناف چھ ہیں:

۱۔ جماد

۲۔ معدن

۳۔ نبات

۴۔ حیوان

۵۔انسان

۶۔ارواح

وَّكَانَ عَرْشُهٗ ۔ عرش لغت میں سریر (تختہ، تخت ، چارپائی وغیرہ) کو کہتے ہیں۔اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے میں اس کی عظمت کا اظہار ہے کہ وہ اس قدر عظیم اور اعظم المخلوقات ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک معمولی کرشمہ ہے۔

ف : حضرت مقاتل نے فرمایا کہ عرش کے چار ارکان ہیں۔ ہر رکن کے درمیان کئی چہرے ہیں۔ان کی گنتی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اجمالی طور پر یوں سمجھیے کہ وہ آسمان کے ستاروں اور زمین کی مٹی اور ریت کے ذرات اور اشجار کے پتوں سے بھی زیادہ ہیں ۔نہ اس کے طول کی انتہا کی خبر، نہ اس کی عرض کے منتہیٰ کا پتہ ، سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

سوال : اللہ تعالیٰ نے عرش کو کیوں پیدا فرمایا اسے تو کسی شے کی ضرورت ہی نہیں ۔

جواب : ۱۔اپنے خاص فرشتوں کو اپنی خدمت کا مرکز بنایا ہے کما قال :

وتری الملٰئکۃ حافین من حول العرش ۔ فرشتوں کو دیکھو تو وہ عرش الٰہی کو گھیرے ہوئے ہیں ۔

۲۔ اپنی قدرت وعظمت کا اظہار فرمایا ہے ۔حضرت مقاتل نے فرمایا کہ ساتوں زمین وآسمان کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے جنگل میں ایک حلقہ ہو۔ایسے ہی کرسی اور زمین وآسمان عرش کے سامنے ہیں۔ ایسے سارے ملا کر تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے ذرہ برابر بھی نہیں۔اس طرح اللہ تعالیٰ کی عظمت مخلوق کو واضح ہوتی ہے۔

۳۔ عرش کو اس لیے پیدا فرمایا تھا کہ وہاں سے شاہی احکامات کا اجرا فرما کر اپنے بندوں کو دعوتِ حق دے۔کما قال ؛

یخافون ربھم من فوقھم۔ اپنے سے اوپر کے شاہی احکام ربانی سے ڈرتے ہیں

۴۔ **شانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار** عرشِ الٰہی اس لیے پیدا کیا گیا تا کہ محبوبِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت اور بزرگی کا اظہار ہو ۔کما قال ؛

عسٰی ان یبعثک ربک مقاماً محمودا۔ عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود کے لیے اٹھائے گا۔

ف : وہ مقام محمود عرش الٰہی کے نیچے ہے ۔

۵۔ عرشِ الٰہی کو اولیاء اللہ کے اعمال ناموں کا مخزن بنایا ہے ۔کما قال تعالیٰ :

ان کتاب الابرار لفی علیین۔ علیین میں ابرار کے اعمال نامے ہیں۔

ف : اس میں اولیاءِ کرام اور ان کے اعمال نامے کی عظمت کا بیان ہے ۔

۶۔ عرشِ الٰہی ملائکہ کرام کے لیے بمنزلہ شیشے کے ہے کہ وہ دنیا والوں کے اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں تاکہ قیامت میں ان کے اعمال کی گواہی دیں اس لیے کہ عرشِ الٰہی عالمِ مثال کی تصویر ہے اور کرسی کی مانند صاف وشفاف ہے۔

۷۔ عرشِ الٰہی اسم رحمٰن کا مقامِ استوا ہے یعنی وہی فیض وتجلی اور ایجادِ احدی کا مرکز ہے جیسے شرع مطہر کا مرکز عرشِ الٰہی ہے

کہ وہاں سے امرِ تکلیفی وارشادی کا نزول ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہُوا کہ عرش اللہ تعالیٰ کی ذات کا مقامِ استواء نہیں بلکہ اس کے اسمِ رحمٰن وغیرہ کا مقامِ استوٰی ہے[1] وھو عن ذالك علواً کبیرا۔

عَلَى الْمَآءِ یعنے پانی پر تھا۔ (کذا فی انسان العیون)

اعجوبہ حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ یہ پانی دراصل سبز یاقوت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نظرِ ہیبت سے دیکھا تو وہ پانی پانی ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگا اور تا حال پانی کانپتا ہے۔

ف : اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پیدا فرمایا۔ ہوا کی پشت پر پانی کو ٹھہرایا پھر عرش کو اسی پانی پر رکھا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا کہ وہ تینوں ایک دُوسرے سے چمٹے ہوتے ہیں بلکہ ہر ایک علیحدہ علیحدہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے قایم ہیں۔

ف : اس سے ثابت ہُوا کہ آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے عرش پانی پر نظر آتا تھا۔

سوال : پہلے تم نے کہا ہے کہ پانی کے نیچے ہوا بھی پیدا کی گئی، اب کہتے ہو کہ عرش پانی پر نظر آتا تھا، ہوا کا نام کیوں چھوڑ دیا؟

جواب : ہوا کی لطافت عرش اور پانی کے دیکھنے کو حائل نہیں تھی شے کے موجود ہونے کے باوجود محسوس نہ ہوتا اس کے نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا ہم نے اس کے حائل نہ ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیا۔

ف : اس سے ثابت ہوا کہ عرش اور پانی آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے پیدا ہُوتے۔

اوّل کائنات کون؟ جمہور کا مذہب ہے کہ اجسام میں سب سے پہلے عرش اور ارواح میں سب سے پہلے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ اقدس پیدا کی گئی۔ اسی نسبت سے **ہمارے نبی مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم** آپ کو عقلِ اوّل اور فلکِ اعلیٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔

ف : اس سے ثابت ہُوا کہ خلا بھی ہے۔ خلاء ان دو مکانوں کے درمیان کی فراغ کا نام ہے جو ایک دُوسرے سے مس نہ کریں۔ عرش اور پانی کے درمیان کوئی ایسی شے ثابت نہیں کہ جس سے ایک دوسرے کو مس کرنا ثابت ہو۔ جس سے معلوم ہُوا کہ اسی درمیانی شے کا نام خلاء ہے۔

ف : اس سے حکماء فلاسفہ کا رد ہوگیا اس لیے کہ وُہ خلاء کے منکر ہیں لیکن متکلمین علمائے اسلام خلا کے قائل ہیں ان کی وہی دلیل ہے جو مذکور ہُوئی۔

ف : کتبِ ہیئت میں مذکور ہے کہ فلک اعظم کی سطح کا مقعر فلک ثوابت کے محدب کو مس کرتا ہے لیکن اس کے محدب کو کوئی شے مَس نہیں کرتی اس لیے کہ اس کے ماوراء نہ خلاء ہے نہ ملاء، بلکہ یہاں پر تمام عوالم کے امتدادات منقطع ہو جاتے ہیں بعض کے نزدیک اس کے ماوراء انوار کے افلاک غیر متناہیہ ہیں فلک اعظم کے ماتحت کوئی خلا نہیں بلکہ وہ ملا ہی ملا ہے۔

---

[1] اس سے ابن تیمیہ اور اس کے چیلوں وہابیوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کے لیے مکان اور جہت ثابت کرتے ہیں۔ ۱۲

ف : مولانا ابوالسعود نے فرمایا کہ آسمان وزمین کی تخلیق سے پہلے عرش اور پانی کے سوا اور کوئی شے نہیں تھی اور عرش پانی پر تھا خواہ یوں کہو کہ عرش پانی کی پشت پر تھا یا یوں کہو کہ ان کے درمیان کوئی شے نہیں تھی جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ عرش پانی کی پشت پر تھا اس سے خلاء کا وجود ثابت نہیں چہ جائیکہ اس کا امکان ہو۔ اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ عرش کے بعد سب سے پہلے پانی پیدا ہوا۔ ہاں یوں کہنا جائز ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق سے پہلے پانی پیدا ہوا۔ اس میں یہ ضروری نہ مانا جائے کہ عرش کے بعد پانی پیدا ہوا۔

ف : کاشفی صاحب نے فرمایا کہ عرش پانی پر اور پانی ہوا پر ٹھہرانے سے اہلِ معرفت کو تدبر و تفکر کا بہترین موقع فراہم ہوتا ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ ۔ یہ لام خلق کے متعلق ہے۔ عقلاً یہ لام علت کی ہے اور شرعاً حکمت و مصلحت کی ہے۔ اب معنٰی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فعل مذکور کیا۔ اگر کوئی مصلحت کی رعایت کرتے ہوئے یہ فعل کرتا تو یونہی کرتا جیسے اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور اس کے اندر کی مخلوقات (تم بھی اسی میں شامل ہو) کو پیدا فرمایا۔ انہی میں ان تمام امور کو مرتب فرمایا جن کے تم محتاج ہو اور ان کے متعلق تمہیں بہت زیادہ ضرورت ہے کہ اس سے اپنے وجود کو برقرار رکھ سکو اور اپنی معاش کے اسباب تیار کر دو اور انہی میں عبرتیں اور صنائع کے عجائبات پیدا فرمائے کہ جن سے تم اپنے دینی امور کی مصلحتوں پر استدلال کر سکو۔ پھر اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جو کسی کی آزمائش کی جاتی ہے اور اس کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط تم میں کون اچھے عمل والا ہے۔ جب کوئی نیک یا بد ثابت ہوگا تو نیک کو ثواب اور بد کو سزا ملے گی۔

سوال : امتحان تو سب کا ہوتا ہے کوئی نیک ہو یا بد۔ لیکن آیت میں صرف نیک لوگوں کے امتحان کا کہا گیا ہے جیسے کہ احسن عملا سے واضح ہے اس طرح سے بدعملوں کی آزمائش نہ ہوتی حالانکہ آزمائش میں عموم ضروری ہے جس میں نیک بھی اور بد بھی، دونوں کا شامل ہونا ضروری ہے۔

جواب : اگرچہ آزمائش ہر نیک و بد کے لیے عام ہے لیکن چونکہ مقصود صرف نیک ہیں تاکہ تنبیہ ہو کہ تخلیق انسانی کا اصلی مقصد یہ ہے کہ نیک عمل کر کے نیک جزا حاصل کی جاسکے۔ اور واضح ہو کہ قبائح و افعال مذمومہ سے پرہیز کیا جائے۔

ف : عمل صالح سے مراد ہے اعمال جوارح ہوں یا قلوب۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے احسن عملا کی احسن عقلا واورع عن محارم اللہ واسرع فی طاعۃ اللہ تفسیر فرمائی ہے۔ یعنی احسن عمل یہ ہے جو عقلاً احسن اور محارم اللہ سے بچنے والا اور طاعتِ الٰہی میں سبقت کرنے والا ہو اس لیے کہ عقلاً اعضاء و قلوب میں سے ہر ایک کے اعمال مخصوص ہیں جیسے قلب اعضاء سے اشرف ہے اسی طرح اس کے اعمال بھی اعضاء کے اعمال سے افضل و اعلیٰ ہیں اور کوئی عمل معرفتِ الٰہی کے بغیر درست نہیں۔ اور معرفتِ الٰہی کا حصول بندوں پر واجب ہے اور وہ تفکر فی عجائبات صنع باری تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے اور جب تک بندہ اوامر و نواہی کی معرفت حاصل نہ کرے اسے طاعت کا کوئی فائدہ نہیں۔

حدیث شریف : حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حضرت یونس بن متی علیہ السلام پر فضیلت مت دو،

کیونکہ ان کا ایک دن کا عمل تمام روئے زمین کے اعمال کے برابر آسمانوں پر جاتا تھا۔
نکتہ: وہ صرف اسی لیے کہ وہ تفکر فی امر اللہ بہ نظر رکھ کر عبادت کرتے تھے اور تفکر قلب کے اعمال میں سے ہے ورنہ اعضاء کا کام نہیں کہ روئے زمین کے لوگوں کے اعمال کے برابر عمل کر سکیں۔
تنبیہ: ذاتِ حق میں تفکر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے عجائبات صنع و اوامر و نواہی میں تفکر کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ہم مامور ہیں۔
مثنوی شریف میں ہے، ؎

بے تعلق نیست مخلوق بدو
آں تعلق ہست بیچوں اے عمو
ایں تعلق را خرد چوں رہ برد
بستہ فصلست و وصلست ایں خرد
زیں وصیت کرد مارا مصطفیٰ
بحث کم جوئید در ذاتِ خدا
آنکہ در ذاتش تفکر کرد نیست
در حقیقت آں نظر در ذات نیست
ہست آں پندار او زیرا براہ
صد ہزاراں پردہ آمد تا الٰہ

ترجمہ، اس کے تعلق کے بغیر یہ مخلوق نہیں۔ اس تعلق کو کسی مثال سے نہیں سمجھایا جاتا۔ اس تعلق کی طرف عقل نہیں جا سکتی اس لیے کہ عقل صرف فصل و وصل جانتی ہے۔ اسی لیے ہمیں نبی علیہ السلام نے تاکید فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں بحث نہ کرو۔ اگر کسی وقت اس کی ذات میں فکر کیا جاتا ہے تو وہ اس کی ذات میں نہیں سینکڑوں گمان و وہم درمیان میں حائل ہوں گے اور ہزاروں پردے۔ تب کہیں ذات اللہ کی معرفت نصیب ہوگی۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ آزمائش دو قسم کی ہے:
۱۔ سعادت مندوں کی آزمائش بھی پُر سعادت ہوتی ہے اس لیے کہ سعادت مند دنیا کی کسی چیز کو اپنا مقصود و مطلوب نہیں سمجھتا بلکہ ان تمام جملہ امور کو ذاتِ حق کا وسیلہ اور سبب بناتا، مولیٰ کے سوا تمام اوامر و نواہی کو اسی کے قرب کا وسیلہ مانتا اور انہی کے ذریعہ سے کمالات حاصل کرتا ہے۔
۲۔ بدبختوں کی آزمائش بھی بہت بُری ہوتی ہے کیونکہ وہ صرف دنیوی امور کو اپنا مطلب و مقصد سمجھتا ہے اور ہر وقت لذات

شہوات میں مبتلا رہتا ہے۔ اس پر ہر وقت حرص سوار رہتی ہے۔ اسے نیک باتوں کے ضائع ہونے سے کبھی حسرت اور افسوس نہیں کرتا بلکہ جتنے امور اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب و کمال کا وسیلہ بناتے ہیں وہ شہوات نفسانیہ و لذات فانیہ دنیویہ کے حصول میں ضائع کر دیتا ہے اسی کو اسوءُ عملاً سے تعبیر کرتے ہیں۔

صاحب روح البیان کے پیرومرشد کی تقریر دلپذیر

صاحب رُوح البیان قدس سرّہٗ نے فرمایا کہ میرے پیرومرشد شیخ کامل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ انسان کی نیت کا تعلق زبانی و قلبی دنیوی امور سے متعلق ہو تو وہ شخص نیتہً و عملاً بہت برا ہے اور جس کی زبان پر تو اُخروی اُمور کی رٹ ہو لیکن دل دنیوی کاموں سے لگا ہوا ہو تو ایسا شخص نیت قلبی کے لحاظ سے بہت بُرا ہے تیسرا وہ شخص کہ جس کی نیت و زبان اُخروی امور میں شاغل ہوں تو یہ شخص عملاً و نیتہً احسن الانسان ہے۔ اگر کسی کے دل اور زبان پر صرف ذاتِ الٰہی کا تصور مستحکم ہو تو ایسا شخص بہت ہی اعلیٰ واکمل ہے عملاً بھی نیتہً بھی۔

مذکورہ [illegible] بیان میں پہلا حال کفار کا ہے، دوسرا منافقین کا، تیسرا ابرار کا اور چوتھا مقربین و عارفین کا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آیت انا جعلنا [illegible] علی الارض زینة لها لنبلوهم ایهم احسن عملا میں مقربین و عارفین کا حال صراحةً اور دُوسروں کا اشارۃً بیان [illegible]

شیخ کی یہ اجمالی [illegible] تھی تفصیل کسی دُوسرے مقام پر بیان کی جائے گی۔ حضرت حافظ قدس سرّہٗ نے فرمایا: ؎

صحبت حور نخواہم کہ بود عین قصور
با خیال تو اگر با دگرے پردازم

ترجمہ: حُور کی صحبت مجھے پسند نہیں اس لیے کہ یہ میرا بہت بڑا قصور ہو گا کہ میں تیرے تصور کے ساتھ دوسروں کا خیال لاؤں۔

اے اللہ! ہمیں ان لوگوں سے بنا جو تیری طرف حاضری دے کر تیرے حضور میں دائمی حضوری حاصل کر لیتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ

وَلَئِنْ قُلْتَ اور اگر آپ فرمائیں اِنَّكُمْ ۔ اے عبادت کے لائقو! مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ مرنے کے بعد قیامت میں اُٹھائے جاؤ گے لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا البتہ ان میں سے کافر کہیں گے یہ قسم کا جواب ہے اور شرط کا جواب محذوف کیا گیا ہے کیونکہ اس پر جواب قسم دلالت کرتا ہے اِنْ هٰذَآ یہ قرآن مجید جو قیامت میں اٹھنے کی باتیں کرتا ہے نہیں ہے اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝ مگر کھلا جادو کہ جیسے جادو میں باطل اور غلط قسم کی باتیں ہوتی ہیں ایسے ہی (معاذ اللہ) قرآن مجید میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جادو باطل اور تصورات و خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے اور کافر قیامت میں اُٹھنے کے منکر تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک غلط تصور اور محض خیالی امر تھا اسی لیے قرآن کے مضامین کو جادو خیال کر کے رد کر دیا وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اور البتہ اگر ہم ان سے عذاب موعودہ موخر کر دیں

اِلٰٓی اُمَّۃٍ مَّعْدُوْدَۃٍ گنتی کے تھوڑے سے دنوں تک۔

ف: جو عدد گنتی میں محصور ہو وہ قلیل ہے اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کتنا ہی زیادہ ہو۔

لَّیَقُوْلُنَّ تو کفار کہیں گے مَا یَحْبِسُہٗ ط کونسی شے عذاب کے نزول کو روکتی ہے۔ گویا ان کا یہ خیال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تو ان کے عذاب کا ارادہ کرتا ہے لیکن کوئی شے اسے روک لیتی ہے اور ان کی یہ طلب عجلت بھی استہزاء تھی دراصل وہ استہزاً سے عذاب کا انکار کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عذاب آئے گا ہی نہیں۔ ان کا اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ عذاب کب آئے گا، اور اگر آنا تھا تو کیوں رک گیا وغیرہ وغیرہ۔ اَلَا خبردار یقین کرو یَوْمَ یَاْتِیْھِمْ جب عذاب ان کے ہاں آئے گا جیسے بدر میں ان پر آیا تھا لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْھُمْ تو ان سے کبھی نہیں ہٹے گا اور نہ ہی کوئی اسے ہٹا سکے گا، بلکہ جب آئیگا تو ان پر واقع ہو کر رہے گا۔

ف: یوم، لیس کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لیس کی خبر کا لیس پر مقدم کرنا جائز ہے اس لیے کہ جب اس کی خبر کی تقدیم بھی جائز ہے کیونکہ معمول ہمیشہ عامل کے تابع ہوتا ہے جو بات عامل کے لیے جائز ہو جاتے گی وہ بطریق اولیٰ معمول کے لیے بھی جائز ہوگی۔

وَحَاقَ بِھِمْ اور ان پر نازل ہو کر انہیں گھیر لے گا۔ حاق بمعنے یحیق ہے۔ مضارع کو ماضی سے تعبیر کر کے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ یقیناً واقع ہوگا مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ ؁ وہ جو اس سے استہزا کرتے ہیں۔ یعنی وہ عذاب جس کے مطالبہ پر عجلت کر رہے ہیں۔

ف: عذاب کا موجب استہزاء اور ان کا استہزاء انکار و تکذیب کی وجہ سے تھا۔

ف: لوگ دو قسم ہیں:

۱۔ ایمان و اعمالِ صالح سے عذابِ الٰہی سے بچنے والے۔

۲۔ اتباعِ نفس و ترکِ اعمالِ صالح اور کفر سے عذابِ الٰہی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غضبِ حق میں مبتلا ہونا۔ ایسے لوگ عذاب عاجل و آجل میں واقع ہوں گے۔

حدیث قدسی شریف

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت کی قسم میں اپنے بندے پر دو خوف اور دو امن جمع نہیں کرتا۔ وہ یہ کہ جو بندہ مجھ سے دنیا میں ڈرتا ہے میں اسے قیامت میں بے خوف کرتا ہوں، اور جو مجھ سے دنیا میں بے خوف ہو کر بسیرا کرتا ہے اسے آخرت میں خوف میں مبتلا کرتا ہوں۔

آخرت کے عذاب کی شدت

حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہ مجھے ملائکہ مقربین کے مراتب پر رشک آتا ہے نہ کسی نبی مرسل اور نہ ہی کسی ولی کامل پر، بلکہ مجھے ان بندوں پر رشک ہے جو سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے، کیونکہ نہ پیدا ہوتے نہ آخرت کا عذاب چکھیں گے۔

حکایت حضرت سری سقطی ؒ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ میری موت بغداد سے باہر کہیں غیر معروف شہر میں واقع ہو اس لیے کہ اگر مجھے قبر قبول نہ کرے تو غیر معروف لوگوں میں ندامت نہ ہوگی۔

سبق دانا وُہ ہے جو واقعہ کے وقوع سے پہلے تدبیر بنا لے۔ ؎

علاج واقعہ پیش از وقوع باید کرد

ترجمہ: واقعہ کی تدبیر وقوع سے پہلے چاہیے۔

اور سمجھدار وُہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور ہر وقت گناہوں کی معافی چاہے اور گناہوں کے اصرار سے احتراز کرے۔

حدیث شریف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو گناہوں سے استغفار کر کے گناہ پہ اصرار کرتا ہے وُہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استہزاء کرتا ہے۔

ف: اللہ تعالیٰ نے انسانی اجزا کے جس جزء کو جس کام کے لیے پیدا فرمایا ہے اس سے اسی کے لائق کام لینا چاہتا ہے۔ مثلاً دل سے معرفت حق و توحید بر حق اور زبان سے ذکر وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی بندہ اس کے خلاف کرے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استہزاء کرتا ہے۔

اختیارِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اور لسانِ کُن

منقول ہے کہ بعض اوقات ابو جہل حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل کر آپ کی نقلیں اتارتا تھا۔ چنانچہ کبھی ناک چڑھاتا کبھی منہ چڑاتا، کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ آپ نے ایک دفعہ مڑ کر دیکھا تو اس نے اپنی صورت بگاڑی ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا:

کُن کذٰلک۔ (اسی طرح ہو جا)

چنانچہ وُہ مرتے دم تک اسی ٹیڑھی صورت میں رہا۔ (لعنۃ اللہ علیہ)

اختیارات ومعجزات کا بیان

۱۔ مروی ہے کہ عقبہ بن ابی معیط نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر تھوکا تو اس کی اپنی تھوک مُڑ کر اس کے اپنے چہرے پر لگی تو برص کی بیماری میں مبتلا ہو گیا اور تا مرگ اسے اس سے چھٹکارا نہ ملا۔

۲۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لیجا رہے تھے تو کافروں کی ایک جماعت آپ کو دیکھ کر اشاروں سے کہتی: نبوت مدعی یہی ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی انگلیاں ان کے اجسام پر لگائیں تو سارے کا فر زخمی ہو گئے اور ان کے زخموں سے بدبو آنے لگی۔ اسی ہیبت سے وہ حضور علیہ السلام سے قریب نہ آسکے اور وہ اسی تکلیف میں مرے۔

وہابیوں دیوبندیوں کو تنبیہ اسی طرح ان کا حال بُرا ہو گا جو اہلِ حق کو پریشان کرتے ہیں بالخصوص سادات صوفیاء کرام کے منکرین کو گریبان میں جھانکنا چاہیے۔ وہ ان حضرات کا انکار

یا ان کے ساتھ دشمنی کر کے یقین کر لیں کہ صوفیا کرام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن ان کی عداوت سے اپنا بیڑا غرق کر لیں گے۔ بہت سے بدقسمت صوفیا کرام کے دشمن (وہابی دیوبندی) بہت سی مہلک بیماریوں سے ذلیل و خوار ہو کر مرتے ہیں۔ لیکن انھیں محسوس تک نہیں ہوتا کہ وہ کس وجہ سے ایسے عذاب میں مبتلا ہو کر مر رہے ہیں۔ غور و فکر سے کام لیں تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ واقعی یہ ذلت اہلِ ولایت سے عداوت کا نتیجہ ہے۔

ف: ہر عمل کا نتیجہ دنیا میں ہی اس کے عامل کو ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن اسے وہ سمجھ نہیں سکتا۔ البتہ اس کا نتیجہ آخرت میں جب دیکھے گا تو اسے یقین ہو جائے گا کہ واقعی یہ سزا یا جزا فلاں عمل کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید۔ (ہم پردے اٹھا دیں گے تو اس وقت وہ دیکھیں گے کہ ماجرا کیا ہے۔

ف: اہلِ غفلت کو اب بھی حجابات کی سزا مل رہی ہے لیکن انھیں اس کا درد محسوس نہیں ہو رہا اس لیے کہ اب وہ غفلت کی نیند میں ہیں۔ مرنے کے بعد ہی بیدار ہوں گے تب وہ درد کا مزہ چکھیں گے۔

تفسیر صوفیانہ اگر بدبختوں کو کہو کہ شریعت اور طریقت پر عمل کر کے مرو گے تو حقیقی حیات پاؤ گے کیونکہ حیات طبیعہ سے مرنے کے بعد ہی حیات حقیقی نصیب ہوتی ہے تو اس کے جواب وہ لوگ (جن کی فطری استعداد کائنات کے تعلقات اور ان سے محبت سے مٹ گئی ہے) کہتے ہیں کہ یہ تمہاری من گھڑت باتیں ہیں ان کا کوئی اصل نہیں[1] (کذا فی التاویلات النجمیہ)

شیخ سعدی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ؎

بگو آنچہ دانی سخن سود مند
وگر ہیچ کس را نیاید پسند
کہ فردا پشیمان بر آرد خروش
کہ آوخ چرا حق نکردم بگوش

ترجمہ: جو کچھ تجھے حق کہنا آتا ہے کہہ دے، کسی کو پسند ہو یا نہ۔ قیامت میں حق قبول نہ کرنے والا فریادی ہو گا کہ افسوس کہ میں نے حق کو نہ مانا۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

منقبض گردند بعضے زیں قصص
زانکہ ہر مرغے جدا دارد قفس

(بر صفحہ ۲۲)

---

[1] غور کرو، یہی جواب وہابی دیوبندی دیتے ہیں۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ○ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ
بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ○ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَ
ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ
وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا
اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي
الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى
بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ
اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ
اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي
الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَ
الْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○

وقف لازم

ع ٢

ترجمہ: اور اگر ہم انسان کو کسی رحمت کا مزہ چکھائیں پھر اسے اس سے چھین لیں بیشک وہ نا امید ناشکرا ہے
اور اگر ہم اسے نعمت کا مزہ دیں۔ اس مصیبت کے بعد جو اسے پہنچی تو ضرور کہے گا کہ جو برائیاں مجھے پہنچیں وہ
دور ہوئیں بیشک وہ خوش ہونے والا اترانے والا ہے مگر جن لوگوں نے صبر کیا اور نیک کام کیے ان کے لیے
بخشش اور بہت بڑا ثواب ہے تو کیا وہ وحی جو آپ کے ہاں بھیجی جاتی ہے اس میں سے کچھ آپ چھوڑ دیں گے

اور اس پر آپ دل تنگ ہو گے ان کے کہنے پر کہ ان کے ہاں کوئی خزانہ کیوں نہیں اترا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا بے شک آپ تو ڈرسنانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا محافظ ہے۔ کیا یہ کافر کہتے ہیں کہ انہوں نے کہ اسے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے تو آپ فرمائیے تم ایسی من گھڑت دس سورتیں لے آؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جنہیں تم اپنے ساتھ ملا سکتے ہو انہیں بھی بلاؤ اگر تم سچے ہو۔ پس اے مسلمانو! اگر وہ تمہارے اس چیلنج کا جواب نہ دے سکیں تو یقین کر لو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم سے ہی نازل ہوا ہے اور یہ کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں تو کیا اب تم مانو گے۔ جو کوئی دُنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم انہیں ان کے عمل اسی زندگی میں پورے دے دیں گے اور وہ اس میں کوئی کمی نہیں کیے جائیں گے یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور اکارت گیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا اور جو کچھ وہ دنیا میں عمل کرتے تھے وہ باطل ہوتے۔ تو کیا وہ جو اپنے رب تعالیٰ سے روشن دلیل رکھتا ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہ آتا ہو اور اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی وہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور تمام فرقوں میں جو بھی اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ سو تو اس میں کسی قسم کے شک میں نہ ہو بیشک وہ تیرے رب تعالیٰ کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔

(بقیہ صفحہ)

کودکاں گرچہ بیک مکتب درند
در سبق ہر یک زیک بالا ترند
مرگ پیش از مرگ اینست اے فتیٰ
ایں چنیں فرمودہ مارا مصطفیٰ
گفت موتوا کلکم من قبل ان
یاتی الموت تموتوا بالفتن

ترجمہ: بعض ایسے قصوں سے پریشان ہوتے ہیں اس لیے کہ ہر پرندے کا جُدا جُدا پنجرہ ہے۔ اگر مدرسہ میں تمام طلبہ بیک وقت سبق پڑھتے ہیں لیکن قسمت جُدا جدا۔ مرنے سے پہلے مرنا اچھا ہے۔

ایسے ہی حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
موتوا کلکم .... الخ

تفسیر عالمانہ وَلَئِنْ یہ لام قسم کی توطئہ کے لیے ہے اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً بخدا کہ جس وقت ہم کسی انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں یعنی اپنی نعمت صحت و فراغت سے اسے نوازتے اور اسے ایسے درجہ تک پہنچاتے ہیں کہ وہ اس کی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اس سے مطلق انسان مراد ہے، مومن ہو یا کافر۔ جیسا کہ آگے کے مضمون میں حرفِ استثنا سے معلوم ہوتا ہے۔

ف: مِنَّا رَحْمَةً سے حال ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ انسان کی اپنی ذاتی کوئی لیاقت نہیں اور نہ ہی ذاتی طور پر وہ اس کا مستحق ہے اسے جو کچھ نصیب ہوا یا ہوتا ہے محض اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ہے۔

ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ پھر ہم اس سے نعمت چھین لیتے ہیں اور تب وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے۔

ف: لفظ نَزَعْ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ نعمت گویا جبراً چھیننی پڑی۔ یہ انسان کی دنیوی امور میں حرص کی دلیل ہے۔

ف: سعدی مفتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

لفظ مِنْ صلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی نعمت جڑ سے کاٹی جاتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ یہ مِنْ تعلیلیہ ہو۔ یعنی ان سے نعمت کا چھن جانا ان کے اپنے نفس کی شامتِ اعمال ہے کہ اس نے نفسانی خواہش پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی نعمت چھین لی۔

اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ بے شک وہ مایوس ہوتا ہے کہ پھر اسے وہی نعمت نہیں ملے گی۔ یعنی قلتِ صبری سے سمجھتا ہے کہ اس سے نعمت منقطع ہو گئی حالانکہ اسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرنا لازمی تھا۔ لیکن اس نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ چھوڑا تو اسے اللہ تعالیٰ نے یئوس (مایوس) نام رکھا۔ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ جواب قسم شرط کی جزا کے قائم مقام ہے۔

كَفُوْرٌ ۝ ناشکرا ہے کہ اسے جس قدر نعمتیں پہلے نصیب ہوئی تھیں وہ سب بھلا کر اب ناشکری کرتا ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ؎

سگے را لقمہ گر دادی فراموش
نگردد گر زنی صد نوبتش سنگ
وگر عمرے نوازی سفلہ را
بکمتر تندی آید با تو در جنگ

ترجمہ: کتے کو اگر کسی وقت صرف ایک لقمہ کھلا دو تو وہ اسے کبھی نہیں بھولتا خواہ اسے پھر بارہا پتھر مار مار کر بھگاؤ۔ اور اگر کسی نالائق شخص کو عمر بھر ہزاروں نعمتوں سے نوازتے رہو تو تھوڑی سی کمی پر نہ صرف سختی سے پیش آئے گا بلکہ جنگ پر اتر آئے گا۔

ف: کفر بمعنے نعمت کی ناشکری۔ اسی طرح نیکی چھپانے اور ترکِ شکر و حمد و ثنا کو بھی کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔

ف : اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان سے نعمت اس لیے چھینی گئی کہ انہوں نے نعمت پر اللہ تعالیٰ کے شکر کی بجائے ناشکری کی۔
وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ اور اگر ہم اسے نعمت چکھائیں دکھ کے بعد جو اُسے پہنچا تھا۔ یعنی اسے بیماری کے بعد تونگری شدت کے بعد فرحت عطا ہو۔
مسئلہ : نعمت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اور دُکھ اور تکلیف کو اپنے غیر کی طرف اسی لیے منسوب فرمایا تاکہ تنبیہ ہو کہ رحمتِ حق عطا ہو تو اس کا فضل محض ہے اور دُکھ تکلیف شامتِ اعمال ہے۔ جو بداعمالی کی وجہ سے اسے سزا مل رہی ہے۔ کما قال تعالیٰ :

ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سيئة فمن نفسك۔
جو تمہیں بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو تمہیں بُرائی پہنچتی ہے وُہ تمہارے نفس کی شامت ہے۔

قاضی بیضاوی نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔
ف : دو فعلوں کو علیحدہ طریقہ سے بیان کرنے میں عجیب نکتہ ہے۔
نکتہ : نعمت کو اذقنا سے اور ضرا کو مَسّ سے تعبیر کرنے میں اشارہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں رحمت وزحمت پہنچتی ہے وہ آخرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے اذقنا ذوق بمعنے چکھنا اور مَسّ بمعنے پہنچنا ہے اور ان کا دنیا میں انسان کو پہنچنے کا حال ظاہر ہے کہ گویا اتنی بڑی نعمتیں یا بہت بڑے دُکھ دُنیا میں بطور نمونہ ملتے ہیں۔
لَيَقُوْلَنَّ تو انسان کہے گا ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ مجھ سے برائیاں گئیں یعنے وُہ دکھ اور تکالیف جو مجھے پہنچے کہ جن سے میرا عیش مکدر اور میرا جی منغص تھا اِنَّهٗ لَفَرِحٌ بے شک وہ مغروروں کی طرح خوش ہوتا ہے۔ یہ از فعل لازم اسم فاعل کا صیغہ ہے۔
قاعدہ : قرآن مجید میں ہر جگہ یہ صیغہ مذمت کے لیے استعمال ہوا ہے مگر جہاں اسے کسی امر سے مقید کیا جائے مدح کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرحین بما اٰتاهم الله من فضله۔ (کذا فی حواشی سعدی المفتی) لیکن یہ قاعدہ آیت اذا فرحوا بما اوتوا اخذناهم بغتةً سے ٹوٹ جاتا ہے۔
فیصلہ : اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ یہ دونوں مدح و ذم کے لیے مستعمل ہیں جس طرح کا قرینہ ہوگا اسی معنے میں مستعمل ہوگا۔
تنبیہ : منعم کی مہربانی کو فراموش کر کے نعمت سے خوش ہونا غافلین کا کام ہے۔ دکھ اقرب الی السلامۃ ہے اسی طرح اہانت کرامت سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس طرح سے نفس کی سرکوبی ہوتی ہے۔
نکتہ : صاحبِ رُوح البیان فرماتے ہیں کہ میرے پیر و مرشد قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ محبوب لذاتہٖ ہے وہ اس لیے کہ وہ عطائے نعمت فرماتا ہے ہاں ہم اس کی نعمت کو اس لیے محبوب سمجھتے ہیں کہ وہ محبوب کی عطا ہے۔ اس سے ثابت ہُوا کہ نعمت محبوب لنفسہٖ نہیں بلکہ اس لیے محبوب ہے کہ وہ محبوب سے منسوب ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت سے خوش ہونا لازم ہے وہ نعمت رحمت کے رنگ میں ہو یا تکلیف سے۔

فَخُوْرٌ o وہ بندہ تنگ نعمت کی وجہ سے دُوسروں پر فخر و تکبر کرتا ہے ۔ اور بجائے نعمت پر شکر کرنے کے اسی کے ناز و نعم میں مشغول رہتا ہے ۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

چوں منعم کند سفلہ را روزگار

نہد بر دل تنگ درویش بار

چو بام بلندش بود خود پرست

کند بول و خاشاک بر بام پست

ترجمہ : جب کسی کمینے کو اللہ تعالیٰ نعمت بخشتا ہے تو وہ غریبوں کو پریشان کرتا ہے ۔ اگر کسی شر پسند خود پرست کے مکان کی چھت بلند ہو تو وہ کیچڑ وغیرہ نیچے والوں پر ڈالتا رہتا ہے ۔

اور فرمایا : ؎

کہ اندر نعمتے مغرور و غافل

گہے از تنگ دستی خستہ و ریش

چو در سرا و ضرا حالت اینست

ندانم کہ بحق پردازی از خویش

ترجمہ : نعمت سے مغرور و غافل بندہ کبھی تنگ دستی سے پریشان ہو جاتا ہے ۔ جب اس کا اپنے متعلق یہ حال ہے تو وہ حق سے کیسے مشغول ہو سکتا ہے ۔ یعنی جب وُہ اپنے میں مشغول ہے تو اسے اللہ تعالیٰ سے مشغولیت کب نصیب ہو سکتی ہے ۔

اِلَّا الَّذِیْنَ یہ استثناء متصل ہے صَبَرُوْا مگر جو لوگ مصائب و تکالیف پر قضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر کے صبر کرتے ہیں ۔

حدیث شریف تین ایسے ہیں جنہیں دُنیا و آخرت کی ہر طرح کی تکلیف و مصیبت سے حفاظت رہے گی ؛

۱ ۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان رکھنے والا ۔

۲ ۔ ستاروں کی تاثیر پر اعتماد نہ کرنے والا ۔

۳ ۔ میری سنت پر پابندی کرنے والا ۔

مسئلہ : تقدیر پر ایمان رکھنے کا معنیٰ یہ ہے کہ بندہ یقین کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات سے پہلے ہی ہر خیر و شر کو اب جو کچھ ہو رہا ہے یہ اسی کی قضا و قدر اور اس کے ارادہ پر ہو رہا ہے ۔

ف : ستاروں کی تاثیر کو ادریس علیہ السلام کے زمانہ سے سلیمان علیہ السلام کے زمانہ تک شرعی حیثیت حاصل تھی۔ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں اس کا شرعی حکم منسوخ ہو گیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے:

فنظر نظرة فی النجوم۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھ کر فرمایا کہ میں بیمار ہو جاؤں گا۔ یہ آپ نے ستاروں کی تاثیر کے پیش نظر فرمایا تھا۔ (کذا فی بحر العلوم)

مسئلہ : کتاب تعلیم المتعلم میں ہے کہ ستاروں کی تاثیر کا علم سیکھنا بھی ایک مرض ہے۔ اسی لیے اس کا سیکھنا حرام ہے اس لیے کہ اس سے نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے کون بھاگ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے بھاگنا ممکن ہے۔

مسئلہ : نجومیوں کی کسی بات کا اعتبار نہ کرنا چاہیے جبکہ وہ ستاروں کے اجتماع و انفصال سے اندازہ کر کے کہتے ہیں کہ جہان میں یہ ہونے والا ہے۔ آج یہ ہوگا، کل وہ ہوگا وغیرہ۔

حکایت عماد الکاتب فرماتے ہیں کہ ۵۸۲ ہجری میں تمام ممالک کے منجموں نے متفقہ طور پر اعلان کیا کہ شعبان کی فلاں تاریخ کی شب کو تمام دنیا فنا ہو کر مٹ جاتے گی کیونکہ اسی رات کو برج میزان میں چھ ستارے جمع ہو رہے ہیں۔ اور علم نجوم کا قاعدہ ہے کہ جب وہ چھ ستارے برج میزان میں جمع ہوں تو شدید آندھی اور سخت طوفان دنیا کو گھیر کر فنا کر دیتا ہے۔ منجموں نے اپنے اس نظریہ سے دنیا کے بادشاہوں کو بہت سخت ہراساں کیا۔ بہت سے بادشاہ اس سے گھبرا گئے۔ چنانچہ عجم و روم کے بادشاہوں نے غاریں کھدوائیں اور اسی میں اسباب خورد و نوش لے کر چھپ گئے اور یقین کر لیا اب زمین پر رہنا مشکل ہو جاتے گا۔ لیکن ان کی مقرر کردہ شب میں ہم کسی قسم کے خطرے سے دوچار نہ ہوتے۔ ہم اس رات اپنے بادشاہ کے ہاں بیٹھے تھے۔ ہماری شمعیں بدستور جلتی رہیں، ہوا کا معمولی جھونکا بھی نہ آیا جو شمعوں پر اثر انداز ہوتا، حالانکہ منجم کہتے تھے کہ قوم عاد کی طرح اسی رات آندھی و طوفان آتے گا جو دنیا کو تہ و بالا کر دے گا۔ اس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ منجمین کا کہنا اور، اور تقدیر ربانی کا حکم کچھ اور ہے۔

(ذکرہ الامام الیافعی)

ف : انسان العیون میں ہے کہ علم نجوم کا استخراج سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام نے کیا یعنی انھیں حوادثِ زمانہ کے متعلق ستاروں کی چال سے معلوم ہو جاتا۔

ف : حضرت الشیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ نے فرمایا کہ:

علم نجوم فی نفسہٖ صحیح علم ہے لیکن حساب لگانے والے سے غلطی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ ستاروں کی رفتار کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکتا۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک عمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکرانہ میں ظاہری نعمتیں مراد ہیں یا باطنی قدیمی یا حالی۔

ف : عمل صالح سے وُہ عمل مراد ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا پر کیا جاتے۔

ف : حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

صبر اور شکر دُو سواریاں ہیں جس پر چاہو سواری کرو۔

ف : اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ ہے کہ یہ دونوں موصل الی اللہ ہیں۔

اُولٰٓئِكَ صفات حمیدہ مذکورہ کے موصوف لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ ان کے لیے مغفرت ہے یعنی کتنے بڑے گناہ ہوں وَّاَجْرٌ اوران کے اعمال حسنہ پر اجر و ثواب ہے كَبِيْرٌ٥ بہت بڑا۔ ان میں ادنیٰ ثواب بہشت ہے۔ (کذا فی تفسیر بیضاوی) اور تفسیر کواشی میں ہے کہ اجر کبیر سے بہشت مراد ہے۔

نکتہ : سعدی المفتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اجر کو کبیر سے موصوف کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس سے سرمدی نعمت اور رفع تکالیف اور امن من الخوف اور ان سے رضائے الٰہی اور ذات حق کی زیارت مراد ہے۔

ف : صاحب روح البیان نے فرمایا کہ اجر کبیر سے بہشت مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ادنیٰ نعمت متاع دنیا اور اعلیٰ رضوان ہے۔ کما قال تعالیٰ :

و رضوان من اللہ اکبر۔

اور اوسط بہشت اور اس کی نعمتیں، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی رضوان کو اکبر سے موصوف کرتا ہے تو اس سے لازماً بہشت کبیر مراد ہے۔

ف : شیخ الاسلام نے فرمایا کہ بہشت میں ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے مقابلہ میں بہشت کی تمام نعمتیں حقیر و لاشئے ہیں یعنی مشاہدہ انوار لقائے حق۔ ؎

مارا بہشت بہر لقائے تو در خورست

بے پرتو جمال تو جنت محقر است

ترجمہ : تیرے دیدار سے بہشت واقعی بہشت ہے لیکن تیرے دیدار کے بغیر بہشت کچھ نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

دونوں آیتوں میں دُو اشارے ہیں :

۱۔ جسے مقامات الٰہیہ کا ذوق اور بعض مشاہد ربانیہ کا مشاہدہ ہو لیکن اس کی کسی خطا یا سوء ادب سے اس سے وہ مقامات و مشاہدات چھن جائیں تو اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہونا چاہیے اور نہ ہی نعمت کی ناشکری کرنی چاہیے جیسے ابلیس خبیث نے ناشکری کی۔ بلکہ جب کسی خطا سے باب الٰہی کے سامنے حجابات آجائیں تو شرط عبودیت یہ ہے کہ اپنے رب تعالیٰ کے حضور میں اپنے گناہوں سے توبہ کرے جیسے حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی کہ اس طرح سے اس کا رب تعالیٰ اسے معاف کرکے اسے مراتب علیا سے نوازے گا۔

۲۔ جسے عفو و معافات کا ذوق اور حلاوتِ طاعت نصیب ہو تو اسے معصوم و طاہر و مطہر نہ سمجھے اور اس ناز میں نہ رہے کہ اس سے کل حجاب اپنے آپ اٹھ گئے اور عجب میں آجائے کہ اس جیسا اب جہان میں کوئی نہیں۔ اس طرح سے دوسروں کو حقیر و لاشئی سمجھنے لگے اور خوفِ خدا دل سے اٹھا دے، اس لیے کہ دونوں مذکورہ حالتیں سخت مذموم ہیں یعنی نہ تو بالکل نا امیدی ہو اور نہ ہی نعمتِ الٰہی کی ناشکری اسی طرح نفس کو عُجب سے بچاتے۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہر وقت خوف میں رہے اور اللہ جل وعلا کی رحمت سے بھی نا اُمید نہ ہو۔

حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ
رند از رہ نیاز بدارالسلام رفت

ترجمہ: زاہد غرور سے مارا گیا۔ رند نیاز و عجز سے بہشت میں پہنچ گیا۔

اور: ؎

زاہد ایمن مشو از بازیٔ غیرت زنہار
کہ رہ از صومعہ تا دیر مغاں اینہمہ نیست

ترجمہ: اے زاہد! غیرتِ الٰہی سے بے خوف مت رہ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو صومعہ و دیر میں تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

ف: دونوں آیتیں صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ نفس کمینے کے اوصافِ رذیلہ ہیں۔ ان سے بچنا لازمی ہے۔ بلکہ جتنا ہو سکے مجاہدات و ریاضات شاقہ سے نفس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی اصلاح فرما دے گا۔

تفسیر عالمانہ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ امید ہے کہ آپ بعض احکام کو چھوڑنے والے ہیں۔

شانِ نزول مروی ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہمارے ہاں ایسا قرآن مجید لاتے جس میں ہمارے بتوں کی مذمت نہ ہو اور نہ ہی اس میں ہمارے آباؤ اجداد کے خلاف باتیں ہوں۔ اس سے آپ کا ارادہ ہوا کہ آپ ان کے بتوں کی ظاہری طور پر مذمت کرنا چھوڑ دیں تو یہی آیت نازل ہوتی۔

تحقیق لفظ لَعَلَّ لعل ترجی کے لیے آتا ہے۔ امر مرجو کے حصول کی توقع میں ہونا کہ جس کے حصول کا مکمل وثوق نہ ہو۔ کما قال تعالیٰ:

لعلکم تفلحون یا اشفاق کے لیے آتا ہے، یعنی ڈرانے امر کی توقع۔

کما قال تعالیٰ: لعل الساعۃ تکون قریبا۔

ف : رجاء یا اشفاق دونوں مخاطبین سے متعلق ہوں گے نہ کہ اللہ تعالیٰ سے۔ یہاں پر اگر رجاء کا معنیٰ مراد لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی باتوں سے جو آپ کے دل پر اثر ہوا ہے بظاہر وہم ہوتا ہے کہ آپ وحی کے بعض احکام کی تبلیغ نہ کر سکیں گے۔

ازالۂ وہم
اس سے کوئی یہ وہم نہ کرے کہ واقعی حضور علیہ السلام کفار کی باتوں سے اثر پذیر ہو سکتے ہیں۔ ایسا وہم غلط اور سراسر غلط ہے اس لیے کہ ایسے وہ امور جو آپ کی عصمت کے خلاف ہوں انھیں ذاتِ نبی علیہ السلام سے دُور رکھا جاتا ہے تاکہ عصمت نبوت پہ دھبہ نہ آئے۔ اگر اس طرح کا امکان مان لیا جاتے تو نبوت سے تبلیغ کی امان اٹھ جائے اگر لعل کا اشفاق کا معنیٰ ہو تو اب مطلب یہ ہوا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اپنے نفس سے خطرہ کیجیے کہ آپ سے کفار کی باتوں سے کہیں آپ سے بعض احکام الٰہی کی تبلیغ نہ چھوٹ جائے۔ یہی پہلے معنے سے اولیٰ ہے۔ (کذا فی بحر العلوم للسمرقندی)

ف : بعض احکام سے مراد وہی ہیں جو کفار نے کہا تھا کہ آپ کفار کے بُتوں کی مذمت اور ان کے آبا کی مخالفت نہ کریں اور ان سے خوف کا مطلب یہی تھا کہ کہیں وہ آپ کی باتیں ردّ نہ کر دیں اور آپ کے ساتھ استہزاء کریں۔

ف : کاشفی نے اس کا ترجمہ کیا ہے :

فلعلك تارك - پس شاید کہ تو ترک کنندہ باشی۔

یعنی شاید کہ آپ ترک کرنے والے ہوں۔

ف : امام ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ استفہام بمعنی نہی ہے یعنی ترک نہ کرنا۔

وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اور اس سے آپ کا سینہ تنگ ہو یعنی جس وقت آپ انھیں قرآن پاک اور احکام تبلیغیہ سناتے ہیں تو آپ کے سینۂ اقدس پر تنگی عارض ہو جاتی ہے۔

ف : ضیق کے بجائے ضائق اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ عارضہ یعنی سینہ کی تنگی آپ کو حقیقی نہیں عارضی تھی اور وہ بھی کسی مصلحت کے تحت، ورنہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخالفین مانتے تھے کہ "کان افسح الناس صدرًا۔ یعنی آپ تمام لوگوں سے کشادہ سینہ والے تھے۔" یہ اس محاورہ سے ہے جو اہلِ عرب کہتے ہیں :

فلان سائد ۔

یہ اس شخص کے لیے کہتے ہیں جسے عارضی سرداری حاصل ہو ورنہ جس کو دائمی سرداری نصیب ہوتی ہے اسے سید کہا جاتا ہے۔

اَنْ یَّقُوْلُوْا آپ کا سینہ اس لیے تنگ ہوتا ہے کہ آپ کو خیال گزرتا ہے کہ شاید وہ جھٹلانے والے آپ سے کہیں لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اس پر کوئی نہیں ڈالا جاتا كَنْزٌ آسمان سے مال اور خزانہ کہ جس کے ذریعے وہ (نبی علیہ السلام) اپنا کاروبار چلا سکیں اور بادشاہوں کی طرح آپ کے ہاں بہت سا مال خزانہ کیوں نہیں کہ جسے وہ اپنے نوکروں چاکروں اور دُوسری ضروریات پر خرچ کر سکیں۔

ف : ابن الشیخ نے فرمایا کہ کنز سے مال کثیر مراد ہو اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ نبی علیہ السلام کی شان یہ ہو کہ اس کے ہاں مال کا پوشیدہ خزانہ موجود ہو یعنی مال مدفون ہو کہ جسے بر وقت وہاں سے مال اٹھا کر ضروریات و حوائج پوری کریں۔

ف : کنز کے اس ترجمہ سے ابن الشیخ کا مطلب یہی ہے کہ اسے آسمان سے نازل ہونے کا معنیٰ مراد لینا مناسب نہیں اس لیے کہ کنز زمین میں مدفون ہوتا ہے نہ کہ آسمان سے نازل ہوتا ہے۔

ف : کبھی کنز سے مطلق مالِ کثیر مراد ہوتا ہے اور تقریباً یہی معنیٰ مراد ہے۔

اَوْجَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ط یا ان کے ہاں فرشتہ حاضر ہو اور گواہی دے کہ واقعی وہ نبی ہیں یا بوقتِ تکلیف فرشتہ آپ کی معاونت کرے۔ اس سے ان کے شبہات دُور ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ کفارِ مکہ کے بعض لیڈروں نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو ہمارے لیے مکہ کے پہاڑوں کو سونے کا بنا دے۔ دُوسروں نے کہا کہ فرشتوں کو لائیے تاکہ وہ آپ کی نبوت کی گواہی دیں۔ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ط بے شک آپ تو ڈرانے والے ہیں۔ یعنی آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ آپ کے ہاں جو احکامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں وُہ انھیں پہنچا دیں اور دوزخ سے انھیں ڈرائیں۔ یہ آپ کے لوازمات سے نہیں کہ جو مطالبات وُہ کرتے جائیں آپ پُورے کرتے جائیں یا اگر وہ بطور تضحیک و استہزاء آپ سے کچھ کہیں تو آپ اس سے ملال کرنے لگیں ایسے آپ کو تکلیف ہو گی آپ اپنی ذمہ داری کو ہی دیکھیں۔ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ط اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا وکیل ہے فلہٰذا آپ بھی ان پر بھروسہ کریں۔ وہی ان کے حال کو جانتا ہے اور وہی ان کے اقوال و افعال کی سزا دے گا۔

ف : کواشی نے اس کا معنیٰ یہ بیان فرمایا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اپنی ذمہ داری کے احکامِ رسالت پہنچا دیں آپ ان کی باتوں کو خیال میں نہ لائیں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہے۔ ؎

در شبِ مہتاب مہ را بر سماک
از سگان دعوعو ایشاں چہ باک

ترجمہ : رات کے وقت چمکنے والے چاند کو کتوں کے بھوں بھوں کرنے سے کیا خطرہ۔

ف : مفاتیح میں ہے کہ وکیل وُہ ہے جو بندوں کے امور کا انتظام کرے اور وُہ بندے اپنی ضروریات میں اسی کے محتاج ہوں۔ بعض کہتے ہیں وکیل وہ موکول الیہ ہے جس کے ہاں بندوں کے جملہ امور کی تدابیر سپرد ہوں۔ اور حقیقی بندہ بھی وہی ہے جو اپنے جملہ امور اسی کے سپرد کر دے اور صرف اسی پر بھروسہ کرے اور اپنی ہر مشکل کے وقت اسی سے مدد طلب کرے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ط ضمیر مایوحیٰ الیک کی طرف راجع ہے اور اَمْ منقطعہ ہے۔ اس سے قبل بَل اور ہمزہ مقدر ہیں اور ہمزہ توبیخ و انکار و تعجب کے لیے ہے۔ توبیخ کا معنیٰ ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ گویا اللہ تعالیٰ انھیں فرماتا ہے کہ کیا وُہ کفار حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف افترا کی نسبت کر کے ہلاک و برباد ہو رہے ہیں اور ساتھ یہ بھی اقرار کرتے ہیں

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے بہت بڑے افترا، (جو افحش اور بدتر فعل ہے) کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ یعنی جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر بہتان تراشی ہے۔ اگر (معاذ اللہ) واقعی ایسی بات ہے تو پھر صرف وہی اس افترا پر قادر ہیں دوسرے اہلِ عرب اس جیسا افترا نہیں کر سکتے تو یہ فعل حضور علیہ السلام کا معجزہ ہوگا اس لیے کہ وہ خرقِ عادت کے قبیل سے ہو جاتے گا (جبکہ دوسرے اس جیسا افترا نہیں کر سکتے) جب یہ افترا (معاذ اللہ) بطور معجزے کے ہُوا تو اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ حضور علیہ السلام کے اس فعل کی (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ علیم وحکیم خود تصدیق کر رہا ہے اور کافروں کو بھی اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ کاذب کی تصدیق نہیں کرتا۔ جب اللہ تعالیٰ کاذب کی تصدیق نہیں کرتا تو نتیجہ نکلا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مفتری اور کاذب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی اور رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) اب آیت کا معنیٰ یہ ہُوا کہ کیا کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن رسول علیہ السلام نے خود گھڑا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہُوا۔

قُلْ فرمائیے اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم، اگر ایسی بات ہے جیسے تم کہتے ہو فَاْتُوْا تو تم بھی بنا کر لاؤ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ اس جیسی دس سورتیں، جن کی فصاحت و بلاغت اور حسنِ نظم و ترتیب قرآن مجید کی سورتوں جیسا ہو۔

سوال: سورۃ بقرہ اور یونس میں صرف ایک سورۃ اور یہاں پر دس سورتوں کا مختلف فرمان کیوں؟

جواب: یہ سورۃ (ھود) ان دونوں (بقرہ ویونس) سے پہلے اتری تھی اور انہیں پہلے دس سورتوں سے معارضہ کا چیلنج کیا گیا۔ جب اس سے عاجز ہوئے تو پھر ایک سورۃ کا چیلنج کیا گیا۔

ف: مثلہ 'سُوَرٍ' کی صفت ہے۔

سوال: سُوَر جمع ہے اور مثلہ واحد اور یہ ناجائز ہے اس لیے کہ موصوف وصفت میں مطابقت ضروری ہوتی ہے۔

جواب: یہاں پر مثل بمعنے امثال ہے۔ یہاں مضاف محذوف ہے در اصل کل واحد مثلہ۔ الخ

ف: سعدی مفتی نے فرمایا کہ سُوَر کے مضاف مقدر کی صفت ہے اس لیے کہ یہ در اصل بقدر سور مثلہ تھا۔

مُفْتَرَيٰتٍ یہ سُوَر کی دوسری صفت ہے۔ یعنی دس سورتیں لاؤ جو اس قرآن کی بلاغت کی ہم مثل ہوں جنہیں تم اپنی تم اپنی طرف سے بناؤ اگر یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنی طرف سے قرآن بنا کر (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ پر افترا کر رہا ہوں تم بھی میری طرح عربی فصیح ہو جس طرح میں عبارات بنا سکتا ہوں تم بھی بنا سکتے ہو بلکہ بظاہر تم میرے سے زیادہ قدرت رکھتے ہو اس لیے کہ تم قصص و اشعار اساتذہ سے پڑھتے سنتے ہیں پھر نظم و نثر میں آپس میں طبع آزمائی بھی کیا کرتے ہو اور میں ہر دو باتوں سے فارغ ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ میرا مقابلہ تم ہرگز نہیں کر سکتے اور نہ کر سکنے کا امکان ہے۔

مسئلہ: آیت سے ثابت ہُوا کہ اللہ تعالیٰ صفات میں بے مثل ہے جیسے ذات میں اس کی کوئی مثل نہیں ہو سکتا۔

وَّادْعُوْا اور بلاؤ حضور علیہ السلام کے لاتے ہوئے قرآن کے مقابلہ کے لیے مَنِ اسْتَطَعْتُمْ جنہیں تم بلا سکتے ہو یعنی اپنے معبودوں کو بلاؤ جن کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ تمہارے مددگار ہیں اور سمجھتے ہو کہ ہر آڑے وقت میں وہ تمہارے کام آ سکتے ہیں مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ کے ماسوا۔ یعنی درانحالیکہ تم اللہ تعالیٰ سے تجاوز کرنے والے ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِیْنَ ٥ اگر تم سچے ہو اس دعویٰ میں جبکہ میرے متعلق کہتے ہو کہ میں قرآن اپنی طرف سے بناتا ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ جیسے ایک انسان بنا سکتا ہے دوسرا بھی بنا سکتا ہے فلہٰذا سب مل کر اس جیسے قرآن کی چند سورتیں بنا کر دکھاؤ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ، لَکُمْ کی ضمیر حضور علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے اور جمع حضور علیہ السلام کی تعظیم کے لیے ہے یا حضور علیہ السلام اور آپ کے تمام متبعین کے لیے ہے۔ اس لیے کہ کفار سے قرآن مجید کے معارضہ میں آپ کے متبعین بھی آپ کے تابع ہیں۔

مسئلہ : اس میں لطیف تنبیہ ہے کہ اے مومنو! حضور علیہ السلام کا ساتھ نہ چھوڑو اور جیسے جہاد میں ان کے ساتھ ہر وقت رہتے ہو ایسے ہی قرآن کیلئے معارضہ میں ان کے ساتھ رہو۔

قاعدہ : ہر خطاب میں حضور علیہ السلام اُمت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں یا نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام اُمت کے خطاب میں شامل نہیں ہوتے لیکن حنفیہ اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام اُمت کے خطاب میں شامل ہوتے ہیں۔ ہاں جب کوئی قرینہ ان کے عدم شمولیت کے لیے موجود ہو تو شامل نہیں ہوں گے۔ (کذا قال سعدی المفتی)

اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ اے محبوب علیہ السلام! اگر یہ مشرک آپ کے چیلنج کو قبول نہیں کرتے یعنی جب تم ان کافروں کو قرآن مجید کے معارضہ کے لیے بلاتے ہو اور انھیں کہتے ہو کہ قرآن مجید جیسی دس آیتیں بنا لاؤ۔ اور تم انھیں کہتے ہو کہ اس معارضہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے تمام مددگاروں سے مدد طلب کرو۔ لیکن ان کا عجز ظاہر ہوگیا۔

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ اَنَّمَا میں ما، کافہ کا ہے اور انزل کی ضمیر ما یوحیٰ کی طرف راجع ہے اور بعلم اللہ حال ہے، متلبساً کے متعلق ہے یعنی جان لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم پر نازل ہوا ہے یعنی اس کے خواص و کیفیات وغیرہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

ف : کاشفی نے لکھا کہ یہ صرف خاص اللہ تعالیٰ کے علم سے متلبس ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مصالح جانتا ہے یعنی معاش و معاد میں جو امور ان کے لیے مفید یا مضر ہیں صرف وہی جانتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ بعلم اللہ یعنی قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا علم لے کر آیا ہے اسے مخلوق کے علم سے کسی قسم کا تعلق ہے اس لیے کہ یہ جس قدر مستقبل کی خبریں دیتا ہے اسے غیب سے تعلق ہے اور غیب کا علم خاصہ خدا ہے [۱]

اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ اے مومنو! تم اسی علم قرآن پر مداومت کرو اور اسی پر ثابت قدم رہو تاکہ تمہارے یقین میں اضافہ ہو اور تمہارے ایمان میں مضبوطی ہو کہ یہ قرآن منزل من اللہ ہے۔

مسئلہ : قرآن مجید حضور علیہ السلام کے اعلیٰ معجزات سے ہے کہ آپ کے دعویٰ رسالت پر قرآن مجید

---

[۱] اس سے معلوم ہوا کہ جو غیب خاصۂ خدا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے نبی علیہ السلام کو عنایت فرمایا ہے۔

معجزہ کی طرح دلالت کرتا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اور بے شک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یعنی اس پر بھی یقین کرو کہ اس کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اس کے سوا اور کوئی وحی نازل نہیں کر سکتا فلہذا اس معنے پر اس کے سوا اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ پس کیا تم جانتے ہو یا نہیں، یعنی اسلام پر مضبوط ہو جاؤ اور اسی پر ثابت قدم رہو اور اس میں بہت زیادہ اخلاص پیدا کرو۔

وحی کی اقسام آیت سے ثابت ہوا کہ وحی کی تین اقسام ہیں:

۱۔ ایک قسم وُہ ہے کہ اس کے لیے حضور علیہ السلام کو حکم ہے کہ وہ کسی کو نہ بتائیں[1]۔

۲۔ دُوسری قسم یہ ہے کہ اس کے لیے آپ کو اختیار ہے کہ جسے چاہیں راز سے آشنا کریں جسے چاہیں راز نہ بتائیں۔

۳۔ تیسری قسم وُہ ہے کہ اسے ہر خاص و عام ہر انس و جن کو بتائیں اس لیے کہ اس قسم سے بندوں کے معاش و معاد کے مصالح کو تعلق ہے۔

اور پہلی قسم میں چونکہ سوائے حضور علیہ السّلام کے اور کوئی متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے اسے مخفی رکھنا ضروری ہوا۔

اور تیسری قسم کے لیے آپ کو حکم ہے کہ وُہ کسی وقت بھی ترک نہ کریں اگرچہ اس میں آپ کو نقصان بھی اٹھانا پڑے کیونکہ یہ قسم زبان سے ادا کرنا ہے اور اس کے ترک کی اجازت نہیں اگرچہ کتنا ہی خوف و خطرہ ہو۔

مسئلہ: صاحب تیسیر نے فرمایا کہ یہ ہم احناف کی دلیل ہے کہ انسان کو مجبور کر کے طلاق و عتاق زبان سے کہلوائی جاتے تو طلاق و عتاق واقع ہو جاتے ہیں کیونکہ ہر دو کا دل سے نہیں زبان سے تعلق ہے۔ اور اکراہ (مجبور کرنا) زبان کے فعل کو نہیں روک سکتا اسی لیے اس کے حکم کے نفاذ کے لیے بھی وُہ مانع نہیں۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مجھے اللہ تعالیٰ نے پیغام بھیجا جس سے مجھے ملال ہوا اس کے بعد وحی نازل فرمائی کہ اگر آپ نے میرے احکام کی تبلیغ نہ فرمائی تو میں ناراض ہوں گا اور عذاب دُوں گا۔ بعد ازیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کی حفاظت میرے ذمۂ کرم ہے اس سے میرا دل مضبوط ہو گیا۔

مسئلہ: اس سے علماء کرام کو خوشی ہونی چاہیے کہ وُہ اپنے علم کے مطابق امر و نہی فرمائیں اور بلا خوف و خطر ہر چھوٹے بڑے کو حق بات کہہ دیں تو حق تعالیٰ ان کی حفاظت کرتا ہے۔ بڑے سے بڑا ظالم ان کا بال بیکا نہ کر سکے گا۔

حکایت ایک زاہد نے سلیمان بن عبد الملک (بادشاہ) کے شراب کے بہترین برتن شرع محمدی کے حکم کے مطابق

---

[1] اس سے وہابیہ کا رد ہے کیونکہ وُہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے لیے کسی قسم کی وحی کو مخفی رکھنے کا حکم نہیں۔ ۱۲

توڑ ڈالے۔ سلیمان بن عبدالملک بادشہ نے گرفتاری کا حکم کیا، جب وہ گرفتار ہو کر حاضر ہوا تو وزرا سے اس کی سزا کے متعلق مشورہ لیا۔ وزیروں نے کہا کہ وُہ گھوڑا کہ جو بھی اس کے آگے آتا ہے اسے مار ڈالتا ہے اس زاہد کو اسی گھوڑے کے آگے ڈال دو، اور دروازے بند کر دو۔ یہ گھوڑا اس کا کام تمام کر دے گا۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا۔ رات کو زاہد گھوڑے کے آگے ڈالا گیا تو وہ گھوڑا زاہد کے سامنے جھک گیا اور نہایت نرمی سے پیش آیا۔ صبح کو دروازہ کھولا گیا تو وُہ زاہد صحیح سالم آرام سے بیٹھا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کو خبر دی گئی تو اس نے زاہد سے معافی چاہی اور باعزت بری کر دیا۔ ؎

گرت نہی منکر بر آید ز دست
نشاید چو بے دست و پایاں نشست

ترجمہ: اگر تجھ سے امر و نہی کا کام ہو سکتا ہے تو بے دست و پا لولے لنگڑے ہو کر مت بیٹھو۔

مسئلہ: آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ وُہ اپنے مقتداؤں اور پیشواؤں کی دینی امور میں معاونت کریں۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد و دیگر امور دین میں ہاتھ بٹایا۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن اپنے بھائی مسلمان کے لیے دیوار کی طرح ہے کہ اس کا حصّہ دُوسرے حصّے کو مضبوط کرتا ہے یعنی مومن دینی دنیوی کام میں مدد کرتا ہے تو اس دُوسرے بھائی کا کام مضبوط ہو جاتا ہے۔ (کذا فی مشارق الانوار لابن الملک)

شاعرِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل امین حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو مسجدِ نبوی میں منبر بچھا دیتے تھے۔ وہی منبر پر کھڑے ہو کر ان کافروں کی ہجو کرتے جو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے تھے[1] اور مسلمانوں کی حمایت میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ شعر پڑھتے تھے جس سے کفار کے دل کمزور اور مسلمانوں کے دل مضبوط ہوتے تھے۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی مدد فرماتے۔ یعنی جبریل علیہ السلام حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو کفار کے جواب کا الہام فرماتے۔ ؎

ہجا گفتن ازچہ پسندیدہ نیست
مبادا کسے کآلت آں ندارد
چہ آں شاعرے کو ہجا گو نباشد
چو شیرے کہ چنگال و دندان ندارد

---

[1] اہل سنت مجالس نعت خوانی قائم کر کے اس سنت پر عمل کرتے ہیں۔ ۱۲

ترجمہ: ہجو کہنا اگرچہ ناپسندیدہ امر ہے تاہم ایسا شخص بھی اچھا نہیں جو ایسے ہتھیار نہیں رکھتا۔ وہ بھی کوئی شاعر ہے جو ہجو کہنا نہیں جانتا۔ وہ شیر کسی کام کا نہیں جس کا پنجہ اور دانت نہیں۔

مسئلہ: توحید پر ثابت قدمی کا التزام ضروری ہے۔ اس کی علامات ہیں سے ایک یہ ہے کہ ہر وقت خلوت وجلوت مجمع اور تنہائی میں اس کا ذکر زبان پر جاری رہے۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اپنے ایمان تازہ رکھو"

یعنی مراتب توحید کے ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے پر ترقی کرو، اس لیے حقیقی ایمان تو وہی ہے جس کا پہلے اقرار کیا ہے اب ترقی صرف مراتب کے لیے ہوگی۔ (کذا فی الواقعات المحمودیہ)

حضرت عارف جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

دلت آئینہ خدائے نماست
روئے آئینہ تو تیرہ چراست
صیقلے دار صیقلے مزن
باشد آئینہ ات شود روشن
صیقل آں اگر نہ آگاہ
نیست جز لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ترجمہ: تیرا دل خدا نما آئینہ ہے۔ پھر تیرے دل کا آئینہ سیاہ کیوں ہے۔ دل کا صیقل ہر وقت اپنے پاس رکھو ممکن ہے اس سے تمہارا آئینۂ دل روشن ہو جائے۔ اگر تم دل کے صیقل سے بے خبر ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دل کا صیقل لا الٰہ الا اللہ ہے۔

حدیث شریف جو شخص مرتا ہے اور وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہراتا تھا تو وہ جہنم میں جائے گا، اور جو مرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا تھا وہ بہشت میں داخل ہوگا۔

فائدہ صوفیانہ لا الٰہ الا ھو اسم تام ہے اور وہ اسم اللہ کا قائم مقام ہے۔ اسی لیے بعض صوفیاء کرام قدست اسرارہم نے بعض اوقات اسی لا الٰہ الا ھو کو اپنا ورد رکھا۔

فائدہ عجیبہ لفظ اللہ کے کسی حرف کو حذف کر دیا جائے تو بھی ذات اللہ پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً الف حذف کیا جائے تو للہ باقی رہتا ہے۔ اگر پہلی لام حذف کرکے الف باقی رکھا جائے تو بھی الہ باقی رہتا ہے۔ اگر لام اور الف کو حذف کیا جائے تو لہٗ باقی رہتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا استعمال یوں ہوا، لہٗ ملک السمٰوٰت والارض۔ اگر ان تینوں کو

حذف کیا جائے تو "ہ" باقی رہتا ہے جسے ھُوَ سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ بھی قرآن مجید میں مستعمل ہے۔ کما قال "ھو اللہ الحی القیوم" اور "لا الٰہ الا ھو"۔

تفسیر عالمانہ مَنْ كَانَ وہ شخص جس کی ہمت نہایت کمزور ہو۔

ف: کان، من کا صلہ اور زائد ہے۔ (کذا فی التبیان)

اور الارشاد میں ہے کہ:

یہ کان استمرار کے لیے ہے۔

يُرِيدُ جو اعمال بر و احسان میں ارادہ کرتا ہے الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا حیوٰۃ دنیا اور اس کی زینت کا۔ یعنی وہ جو کام بھی کرتا ہے اس سے رضائے الٰہی مطلوب نہیں ہوتی بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ اسے صحت و عافیت اور دنیا میں امن و سکون، راحت و آسائش، اولاد اور رزق کی فراخی اور مرتبہ وجاہ و جلال حاصل ہو۔

مسئلہ: اس ارادہ سے محض ارادۂ قلبی نہیں بلکہ ارتکاب فعل مراد ہے۔ جیسا کہ نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا سے ثابت ہوتا ہے۔ یعنی ہم اسے دنیا میں اس کے اعمال کا مکمل ثمرہ اور نتیجہ یعنی صلہ عطا کریں گے۔

مسئلہ: اس سے اس کے تمام اعمال مراد نہیں بلکہ یہ مشیتِ ایزدی پر موقوف ہے اس لیے کہ ممکن ہے کہ بہت سے امور کو وہ دنیوی معاملہ سمجھتا ہو حالانکہ درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہوں ایسے ہی بہت سے امور کو ہم دینی یعنی آخرت کے لیے سمجھتے ہوں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید۔

یعنی جو اپنے اعمال کی جزا دنیا میں چاہتا ہے تو ہم اسے دنیا میں عنایت فرماتے ہیں جس کے لیے جتنا چاہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ اس سے اس کے بعض اعمال مراد ہیں کہ جن کی جزا اسے دنیا میں ملے گی۔

وَهُمْ فِيْهَا اور وہ اسی حیوٰۃ دنیا میں لَا يُبْخَسُوْنَ ○ گھاٹے میں نہیں ہوتے۔ یعنی ان کے اعمال کا صلہ انھیں پورا ملتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ وہ لوگ جو دنیا میں ہی اپنے اعمال کا صلہ چاہتے ہیں ہم جیسے چاہتے ہیں انھیں ان کے اعمال کا صلہ حسب منشا دے دیتے ہیں۔ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وہی ہیں جنہیں آخرت میں سوائے جہنم کے اور کچھ نصیب نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنے اعمال کے لیے صرف یہی چاہتے تھے کہ دنیا کا معاملہ صحیح ہو۔ بنا بریں آخرت میں انھیں سوائے عذاب دائمی کے اور کیا حاصل ہو۔ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا اور ضائع ہو گیا وہ جو انہوں نے دنیا میں کیا یعنی دنیا کے اعمال کا اجر ضائع ہو گیا اس لیے کہ جو عمل وہ دنیا میں کرتے رہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ صرف دنیا کے حصول کی نیت پر تھا وَبٰطِلٌ اور باطل ہو گیا مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وہ عمل جو ریا اور شہرت کی غرض سے کرتے تھے۔

ترکیب : باطل خبر مقدم اور ما کانوا یعملون مبتدا مؤخر ہے اور وہ جملہ اسمیہ ہو کر ماقبل کے جملہ فعلیہ پر معطوف ہے۔

ف : یہ آیت صرف کفار کے لیے ہے کیونکہ نار انہی کے لیے ہے اور بس۔

مسئلہ : وہ لوگ جو کفر کے گڑھے سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں ان کی ہر نیکی یعنی صلہ رحمی، جود و احسان، صدقہ و خیرات، سڑکوں اور پُلوں کی تعمیر، نہروں کی کھدائی، شرور کا دفع کرنا وغیرہ مقبول اور اللہ کے ہاں اس کا بڑا اجر و ثواب ہے۔

مسئلہ : کفر کی حالت میں جو نیکیاں کرتے ہیں ان کا انہیں کسی قسم کا ثواب نہیں ملے گا اور نہ ہی ان سے ان کے عذاب میں تخفیف ہو گی۔ اس پر تمام اُمت کا اجماع ہے البتہ بعض جرائم کی وجہ سے بعض کے عذاب میں شدت اور بعض کے عذاب میں نرمی ہو گی۔

مسئلہ : امام فقیہ ابوبکر بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار کو نیک اعمال کا کوئی ثواب نہیں ملے گا اور نہ ہی ان اعمال صالح سے دوزخ سے نجات پا سکیں گے۔ ہاں اتنا انہیں فائدہ ہو گا کہ کفر کے علاوہ دُوسرے گناہوں کی سزا سے نیک کام ان کو بچائیں گے۔ حضرت مازری نے ابوبکر بیہقی سے اس مسئلہ میں اتفاق کیا ہے۔ (کذا فی مشارق الانوار لابن الملک)

شانِ نزول یہ آیت اہلِ ریاء کار اہل قبلہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ ایسے لوگ جہنم کے لائق ہیں یا ریاء کی جزا جہنم ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

فجزاهم جهنم۔

یعنی ان کی جزا جہنم ہے۔ (کذا قال ابن عباس)

پھر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے فضل و کرم سے انہیں آغوشِ محبت میں لے لے بہرحال آیت سے ایسے لوگوں کے لیے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا کوئی ثبوت نہیں۔

مسئلہ : ظاہریہ کہتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے اس میں مومن کافر اور منافق سب داخل ہیں۔ (کذا فی زاد المسیر)

ف : الریاء، رؤیت سے مشتق ہے۔ جاہ و مرتبہ کی اس طلب کو کہا جاتا ہے کہ لوگ دیکھ کر اپنے دلوں میں اس کی قدر و منزلت کا اقرار کریں لیکن یہ امورِ خیر پہ مستعمل ہے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مجھے تم سے شرک اصغر کے متعلق زیادہ خطرہ ہے۔ عرض کی گئی کہ شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا : الریاء شرک اصغر ہے کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ریاکار لوگوں کو فرمائے گا، جاؤ، اپنے اعمال کی جزا ان لوگوں سے طلب کرو جن کے لیے تم دنیا میں ریاء کرتے تھے۔ اب خیال کرو کہ کیا ان کے ہاں کوئی جزا ہو گی۔

مُرائی ہر کسے معبود سازد
مُرائی را ازان گفتند مشرک

ترجمہ : ریاء کار چونکہ ہر ایک کو معبود بناتا ہے اسی لیے اسے مشرک کہا جاتا ہے۔

مسئلہ: ترغیب کی شرح میں لکھا ہے کہ ہر کافر بُت پرست اور مجوسی و یہودی اور نصرانی اور مرتد و زندیق اور ریا۔کار کو مشرک کہا جاتا ہے اگرچہ ریا۔کار کے شرک کا نام شرک اصغر ہے۔ لیکن ہے وہ بھی مشرک کیونکہ وہ شرک خفی کا ارتکاب کرتا ہے۔

ریاکاروں کی سزا

حدیث شریف ۱: قیامت میں ریاکار قاری کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو گا کہ تیرا ارادہ یہی تھا کہ دُنیا میں تجھے قاری کہا جاتے۔ چنانچہ دُنیا میں تیرا نام قاری مشہور ہُوا۔ پھر شہید کو کہا جائے گا کہ دنیا میں تیرا بھی مقصد یہی تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے۔ چنانچہ تجھے لوگ بہادر کہتے تھے۔ اس کے بعد صلہ رحمی کرنے والے سخی سے کہا جائیگا کہ تیرا خیال بھی یہی تھا کہ لوگ سخی کہیں، چنانچہ تجھے سخی کہا گیا۔ پھر ان تینوں کو تمام لوگوں سے پیشتر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

حدیث شریف ۲: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے کے نیک اعمال محافظ فرشتے ساتویں آسمان تک لے جاتے ہیں۔ یعنی اس کی نماز، روزہ، سخاوت، صدقہ و دیگر عبادات اور تقویٰ وغیرہ جب اسی آسمان کے فرشتے کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو وہ فرماتا ہے یہ اعمال اس بندے کے منہ پر دے مارو کیونکہ اس کا ارادہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہے۔ بعض بندوں کے ایسے اعمال بھی ہوتے ہیں کہ جب ان کی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وعمرہ، خوش خلقی اور خاموشی، اور ذکرِ الٰہی وغیرہ محافظ فرشتے آسمانوں پر لے جاتے ہیں تو اعمال کے اعزاز میں ساتوں آسمانوں کے فرشتے استقبال کرتے ہیں یہاں تک کہ ان اعمال کے لیے تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ جب انھیں بارگاہِ حق میں پیش کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان اعمال میں بندے نے خالصتاً میرے لیے ارادہ نہیں کیا۔ یعنی ریاء کیا ہے۔ اس لیے انھیں واپس لے جاؤ۔ اور اس بندے پر میری لعنت ہو۔ تمام فرشتے عرض کرتے ہیں تیری اور ہم سب کی اس پر لعنت۔ بعد ازاں تمام آسمانوں کے فرشتے اس بندے پر لعنت بھیجتے ہیں۔

حضرت حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ؎

گویا باور نمی دارند روز داوری
کیں ہمہ قلب و دغل در کار داور می کنند

ترجمہ: گویا یومِ قیامت کسی حساب میں نہ لکھا جائے گا ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دنیا میں دھوکا دہی کرتا تھا۔

مسئلہ صوفیانہ

حضرت فضیل رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگوں کے لیے کوئی نیکی کا کام نہ کرنا یہ بھی ریا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے دکھاوے پر عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص ان دونوں سے بچنے کا نام ہے۔ حضرت فضیل رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کا مطلب یہ ہے کہ کسی بندے نے عبادتِ الٰہی کا ارادہ کیا لیکن اس خوف سے نہیں کرتا یا کرتے ہوئے چھوڑ دی کہ شاید لوگ مطلع ہو جائیں تو کہیں گے لو یارو! فلاں بھی نیک، نمازی، تہجد گزار وغیرہ ہو گیا ہے تو ایسے شخص کو بھی صوفیاء کرام ریاکار کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اگر وہ نیکی کرتا تو لوگوں کی اطلاع اسے کون سا نقصان پہنچاتی۔

اسی طرح وہ شخص جو اس ارادہ پر عبادت کرتا ہے کہ اسے لوگ نیک سمجھیں تو اس نے گویا اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دوسرے کو شریک ٹھہرایا ہے۔

مسئلہ: جس شخص کو لوگوں کے سامنے عبادت کرنے میں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اسے ستائیں گے یا اس کا گلہ و شکوہ و غیبت کریں گے۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر ان کے سامنے عبادت نہیں کرتا، تو اس معنے پر ایسے شخص کو ریاکار نہیں کہا جاسکے گا بلکہ ایسے نیک انسان کو ان لوگوں کے لیے رحیم و شفیق سمجھا جائے گا اس لیے کہ اس نے اپنی روش بدل کر ان لوگوں کو گناہ سے بچایا ہے۔ (کذا فی فتح القریب)

صوفی سے شیطان کی شرارت اور اس سے بچنے کا طریقہ

شرح الطریقہ میں ہے کہ شیطان کی منجملہ شرارتوں سے ایک شرارت یہ ہے کہ خدا کا کوئی نیک بندہ اوراد اور وظائف کا شغل رکھتا ہے۔ مثلاً اشراق یا تہجد کا پابند ہے یا قرآن پاک کی تلاوت کرنے کا عادی ہے یا ادعیہ ماثورہ پر مداومت رکھتا ہے لیکن اسے کسی ایسی جگہ جانے کا اتفاق ہوا کہ وہ لوگ اعمال صالح سے محروم ہیں تو یہ بھی اپنے معمولات کو اس نیت پر ترک کر دیتا ہے کہ شاید یہ لوگ مجھے ریا کار سمجھیں۔ یہ اس کا وہم اور شیطان کی شرارت ہے اس لیے کہ پہلے سے ان اعمال میں اس کا خلوص تھا۔ پھر اس کے دل میں ریاء کا خیال آنا جو اس کے اپنے اختیار سے نہیں تھے اور نہ ہی اس نے قبول کیا ہے تو پھر ریا کیسا اور اس کے اخلاص میں کمی کیسی۔ ہاں اس کا نیک عمل کا ترک کرنا شیطان کے وسوسے سے ہوا۔ اس سے شیطان کی غرض پوری ہوگئی۔ یہی اس کی شرارت تھی جو ایک بندۂ خدا کا کام کر گئی۔

مسئلہ: ایسے شخص کے لیے ریاء کی صورت یوں تھی کہ وہ ان لوگوں میں آکر ان کے دکھاوے کی نیت سے اپنے معمولات سے بڑھ کر عمل شروع کر دے جبکہ وہ اضافہ صرف ریاء کی نیت سے ہو۔ اگر اس میں ریاء کی نیت نہ ہو تو بھی ریاء میں شامل نہ ہوگا۔

مسئلہ: جو شخص ریاء کے خوف سے نہیں بلکہ اس خطرہ سے نیک عمل چھوڑتا ہے کہ لوگ اسے ریاکار نہ کہیں تو شرعاً و طریقۃً ریاء یہی ہے کیونکہ وہ عمل لوگوں کی نظروں میں گر جانے کے خطرہ سے چھوڑا بلکہ یہ دوہرا گناہ ہے کہ لوگوں پر بدگمانی کی حالانکہ اسے کیا پتہ ہے کہ ممکن ہے وہ اسے ریاکار نہ سمجھیں بلکہ خالص مخلص سمجھتے۔

مسئلہ: کبھی کبھار بعض لوگ کہیں جا کر نیکی اس نیت سے ترک کر دیتے ہیں کہ لوگ اسے نیکی کرتے ہوئے دیکھ کر اس کا گلہ و غیبت کریں گے، وہ سمجھتا ہے کہ نیکی نہ کروں تاکہ لوگ میرا گلہ و غیبت نہ کر کے گناہ سے بچ جائیں وہ اس خطرے سے نیکی نہیں چھوڑتا کہ وہ اپنی کسی مذمت سے بچ رہا ہے یا لوگوں کی نظروں سے گرنے کا خطرہ ہے بلکہ مذکورہ بالا ارادہ پر نیکی ترک کرتا ہے۔ تو یہ بھی شرعاً و طریقۃً ریاء ہے۔ کیونکہ اگر وہ بظاہر دوسروں کو گناہوں سے بچانے کی نیت سے نیکی کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر رہا ہے کیونکہ دوسروں کو گناہ سے بچانے کے لیے مباحات کو ترک کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سنن و مستحبات کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔[1]

---

[1] مذکورہ بالا طریقوں کو علماء و مشایخ اور عوام (دین پسند) غور سے پڑھیں کیونکہ آجکل کے جدت پسند کے غلبے سے ہمارا دین پسند طبقہ مرعوب ہو کر مذکورہ مرض میں مبتلا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا یعنی جس قدر ان کے اعمال صالح ہوتے ہیں سب ضائع ہوجاتے ہیں فِیْھَا جو دنیا میں دُنیا کے لیے کیے وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ اور ان کے سب اعمال اگرچہ حق اور صحیح تھے باطل ہوجائیں گے کیونکہ انہوں نے وُہ اعمال غیر اللہ کے لیے کیے اور جو عمل غیر اللہ کے لیے کیا جائے وُہ باطل ہوتا ہے۔ چنانچہ صُوفیاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"جو شخص غیر اللہ کی طلب میں عمل کرتا ہے اس کا عمل بھی باطل ہے اور اس کا مطلوب بھی"۔ چنانچہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عربوں کے تمام اقوال میں سب سے زیادہ سچا قول لبید شاعر کا وُہ کلمہ ہے جو اس نے کہا کہ: ؏

الا كل شئ ما خلا الله باطل

خبردار اللہ تعالیٰ کے سوا سب کا سب باطل ہے۔

تقریر وحدۃ الوجود از شیخ اکبر قدس سرّہٗ سیدنا محی الدین شیخ اکبر قدسنا اللہ بسرہ الاطہر نے فرمایا: کل موجودات اگرچہ باطل سے موصوف ہوں تب بھی من حیث الوجود حق ہیں لیکن جس پر سلطان المقام (ولی اللہ) کا غلبہ ہوتا ہے وُہ تمام ماسوی اللہ کو باطل سمجھتا ہے کہ من حیث ھو ذاتی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں بنا بریں وُہ عدم کے حکم میں ہے۔ لبید شاعر کے قول "ماخلا اللّٰہ باطل" میں باطل سے یہی مراد ہے یعنی ماسوی اللہ باطل کی طرح ہے اس لیے عالم کا ذرّہ ذرّہ اپنے طور نہیں بلکہ وُہ وجودِ باری تعالیٰ سے قائم ہے۔ اسی اعتبار سے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ وُہ عارف باللہ جو مقامات قرب میں عرفان کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اسے بسا اوقات تمام موجودات لاشئے نظر آتے ہیں اور وُہ اسی عرفان کی وجہ سے مشاہدۂ خلق سے محجوب ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اس دوران وجود سے بالکل فارغ ہوجاتا ہے۔ ہاں جب اس کے عرفان کی منزلیں مکمل ہوجاتی ہیں تو وہ آنِ واحد میں خالق و مخلوق کے وجود کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن یاد رہے کہ اس مقام کو ہر کوئی نہیں حاصل کر سکتا بلکہ خاص بندوں کو یہ مرتبہ نصیب ہوتا ہے کیونکہ اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں اگر خلق کا مشاہدہ ہوتا ہے تو خالق کا مشاہدہ نہیں ہوتا اور اگر خالق کا مشاہدہ ہوتا ہے تو مخلوق کا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ اور وحدۃ الوجود کا مسئلہ اسے سمجھ آجائے گا جسے اجتماع الضدین کا ادراک حاصل ہو۔

ف: استاد شیخ ابوالحسن بکری قدس سرّہٗ نے ماسوی اللہ سے توبہ کی۔ اغلباً یہ ان کا ابتدائی مقام ہوگا ورنہ وہ تو منتہی اولیاء کے مقتداء اور امام تھے ورنہ وہ ماسوی اللہ سے توبہ کیے کرتے کیونکہ ماسوی اللہ سے باطل (ناقص المرتبہ) اثبات الوجود لذاتہ سے توبہ کرتا ہے۔

(کذا فی انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون)

حضرت شیخ ابن العربی قدس سرّہٗ نے فرمایا:

سایۂ ہستی می نماید لیک اندر اصل نیست
نیست را از ہست ار بشناختی یابی نجات

ترجمہ: تمہیں ہستی کا سایہ نظر آتا ہے حالانکہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ تم نیست کو ہست سے جب تک نہیں پہچانوگے نجات نہیں پاسکوگے۔

نیز فرمایا:

بیدار شو از خواب کہ ایں جملہ خیالات
اندر نظر دیدۂ بیدار چو خوابیست

ترجمہ: خواب سے بیدار ہو کیونکہ تمام خیالی باتیں ہیں۔ جو تمہیں بیدار نظر آتا ہے درحقیقت وہ خواب ہی ہے۔
ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ وُہ ہمارے مقصود سے پردے اٹھادے اور ہر موجود سے ہمیں اپنے جمال کا جلوہ دکھائے۔ وہی رحیم و ودود اور صاحب فضل وفیض وجود ہے۔

تفسیر عالمانہ أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ کیا وہ جو اپنے رب تعالیٰ سے روشن دلیل پر ہو۔ ہمزہ انکاری اور بینۃ بمعنے حجت وبرہان اور علیٰ استعلائیہ کا مجازی معنیٰ ہے یعنی وہ حجت قایم کرنے اور اپنے مقصد پر استدلال کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ مَنْ شرطیہ یا موصولہ ہے۔ مبتدا اور اس کی خبر محذوف ہے۔ اصل عبارت یُوں تھی: افمن کان علیٰ برھان ثابت من ربه الخ یعنی جسے رب تعالیٰ سے بُرہان و دلیل نصیب ہوتی ہے وہ حق وصواب پر استدلال کرسکتا ہے۔ ایسی بُرہان و دلیل سے معلوم ہوجاتا ہے کہ کون سی بات عمل کرنے کے لائق ہے اور کون سا امر عمل کے لائق نہیں۔ اس سے ہر وُہ نیک بخت مراد ہے جو مخلص ہو۔ یعنی یہ اس بدبخت کی طرح ہوسکتا ہے جو برہان و دلیل سے محروم ہے۔ یعنی اے مخاطب! بتاؤ کیا یہ دونوں ہم مرتبہ ہوسکتے ہیں بلکہ یقین کرو کہ پہلا سعادت اور نیک انجام پائے گا۔ اور دُوسرے کو شقاوت اور بُرا خاتمہ نصیب ہوگا۔
وَيَتْلُوهُ یہ تلوٌ سے مشتق ہے بمعنے کسی کے پیچھے آنا۔ یعنی برہان۔ وہ دلیل جو عقل سے حاصل ہو۔

سوال: یتلوہ کی ضمیر مذکر بینۃ کی طرف راجع کیسے۔ حالانکہ ضمیر اور مرجع میں مطابقت ضروری ہے۔

جواب: بینۃ تاویلاً بمعنے دلیل ہے۔

شَاهِدٌ مِّنْهُ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل آتی ہے جو اس کی صحت کی گواہی دیتی ہے اس سے قرآن مجید مراد ہے وَمِن قَبْلِهِ اور اس قرآن کی شہادت سے پہلے كِتَابُ مُوسَىٰ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب، اس سے تورات مراد ہے کیونکہ وہ بھی برہان عقل کے بعد اس کی تصدیق کی گواہی دیتی تھی إِمَامًا وہ ایسی کتاب تھی کہ جس کی دینی امور میں اقتدا کی جاتی تھی۔ اس معنے پر وُہ سب کی مقتدا تھی۔ اماما حال ہے۔ وَرَحْمَةً اور رحمت تھی۔ یعنی وہ کتاب جن لوگوں کے لیے نازل ہوئی ان کے لیے نعمتِ عظمیٰ تھی بلکہ قیامت تک اُن احکام کے لحاظ سے رحمت ہے جن احکام کی تصدیق قرآن مجید سے ہُوئی۔

ف : انسان العیون میں ہے کہ تورات وُہ سب سے پہلی کتاب ہے جو احکام و شرائع پر مشتمل تھی ورنہ اس سے پہلے جتنی کتابیں نازل ہوئیں ان میں احکام و شرائع نہیں تھے۔ اگرچہ ان میں ایمان و توحید کا بیان تھا اسی لئے انھیں صحف کہا جاتا۔ اگر انہیں کتب کہا جاتا تو وُہ ان کا مجازی معنیٰ مراد ہوتا۔

اُولٰٓئِكَ یہ اشارہ ان حضرات کی طرف ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے بُرہان و دلیل پر ہیں يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ط وہ اس پر ایمان لاتے یعنی قرآن مجید کی تصدیق کرتے ہیں وَمَنْ يَّكْفُرْ اور وہ جو قرآن کا انکار کرتا ہے مِنَ الْاَحْزَابِ کفارِ مکہ کے گروہ اور وہ لوگ جنھوں نے ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ج تو جہنم ان کا وعدہ ہے یعنی ان کے وعدہ کا وُہ مکان جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے وُہ جہنم ہے۔

نکتہ : جہنم کو ان کے وعدہ کے مکان بتانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس میں منکرین کو کئی طرح کا عذاب ہوگا۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ پس اس میں شک نہ کرو۔ یعنی اے مخاطب! تمہیں قرآن کے متعلق شک نہ ہو بلکہ یقین کرو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نازل ہُوا اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ بے شک وُہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔ یعنی اس رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے جو تمہاری دینی اور دنیوی تربیت کرتا ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے کہ واقعی وُہ حق ہے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ اس سے انہیں ڈرانا اور ان کے افکار میں خلل اندازی مطلوب ہے یا ان کے انکار و استکبار کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ یہی قاضی بیضاوی اور اس کے تبعین اور اکثر مفسرین نے اختیار فرمایا۔ لیکن مولانا ابو السعود نے ارشاد میں کچھ اور فرمایا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بینة سے وہ دلیل مراد ہے جو اسلام کی حقانیت پر دلالت کرتی ہے یعنی قرآن، اور بینة من الله سے مراد یہ ہے کہ صرف اسی سے تمسک لازم ہے یتلوہ یعنی اس کے بعد قرآن سے ہی شاہد آئے گا جو اس کی حقانیت کی گواہی دے گا اس سے قرآن کا اعجاز اور اس کی غیبی خبریں مراد ہیں یا شاهد سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات مبارکہ مراد ہیں کہ وہ اسلام کی حقانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

ف : برہان کے بعد شاہد کے آنے سے یہ مراد ہے کہ اس سے اسلام کی صحت اور قرآن کا من عند اللہ نازل ہونا ثابت ہو جائے اور وہ اسلام کی حقانیت کے تابع بایں معنیٰ ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت سے کسی وقت بھی جُدا نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن رہتی دنیا تک اپنے شاہد کے ساتھ رہے گا اور اسلام کی حقانیت کی تاقیامت گواہی دیتا رہے گا۔ جب تک اس کے ماننے اور نہ ماننے والے موجود رہیں گے وہ بھی موجود رہے گا۔ کتابِ موسیٰ کو و من قبله كتاب موسىٰ يتلوه کے فاعل پر عطف ڈالا ہے۔

سوال : تورات کا نزول تو قرآن سے پہلے ہوا۔ یہ اہل حق یعنی نبی علیہ السلام کی اُمت کے لیے شاہد کیسے ہوا۔

جواب : آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو اہلِ حق ہیں ان کی حقانیت کی دلیل قرآن مجید کے علاوہ اور بھی ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے اگرچہ وُہ پہلے نازل ہُوئی لیکن ان اہلِ حق کی حقانیت کے دلائل اس میں بھی موجود ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

آیت کے ظاہر سے ثابت ہوتا ہے کہ افمن کان علیٰ بینۃ من ربہ سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ویتلوہ شاھد سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے مراد ہیں اس لیے کہ جونہی حضور علیہ السلام نے اعلانِ نبوت فرمایا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ فوراً آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی نبوت کی تصدیق فرمائی جیساکہ آیت والذی جاء بالصدق وصدق بہ سے واضح ہے کیونکہ الذی جاء بالصدق سے حضور علیہ السلام اور وصدّق بہ سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ علاوہ ازیں غار میں بھی ثانی اثنین سے بھی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ مراد ہیں اور بوقتِ وصال بھی حضور علیہ السلام کی خصوصی امانت کے حامل بھی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ چنانچہ مروی ہے بوقتِ وصال حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مُروا ابا بکر فلیصل بالناس یعنی ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے کہو کہ وہی لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

اسی طرح باتفاق جملہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور علیہ السلام کے خلیفہ ہوتے اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لیے فرمایا کہ :

انھما منی بمنزلۃ السمع والبصر۔

وہ دونوں میرے لیے بمنزلہ کان اور آنکھ کے ہیں۔

ومن قبلہ یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ان کی گواہی سے پہلے تھی۔ کتاب موسیٰ، موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات اماما امام بایں معنیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان کے وصال کے بعد اقتداء کرتی تھی بلکہ خود حضور علیہ السلام کے زمانہ میں بھی اس کی اقتدا کرنے والے موجود تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام اور سلمان رضی اللہ عنہما اور دیگر احبارِ یہود اور اس میں حضور سرورِ عالم کی نبوّت و رسالت کا تفصیلی بیان تھا ورحمۃ اور وہ کتاب اہلِ حق کے لیے رحمت تھی اور اہلِ رحمت سے وُہ لوگ مراد ہیں جو اس پر ایمان رکھتے تھے۔ چنانچہ فرمایا : اولٰئک یومنون بہ یعنی اہلِ رحمت اس پر ایمان رکھتے ہیں ومن یکفر بہ اور جو اس کتاب کا انکار کرتے ہیں ومن الاحزاب اور ان کے دیگر گروہ جیسے اہلِ کتاب (منکرین) اور حزب المنافقین وغیرہ اگرچہ وُہ مدعی تھے کہ وہ بھی مسلمان ہیں لیکن صرف زبانی دعویٰ کسی کام کا نہیں جب تک اس کے ساتھ قلب کی تصدیق نہ ہو اور پھر اسی زبان کے دعوے کے ساتھ عمل صالح بھی ہوں فلا تک فی مریۃ منہ آپ اس میں شک نہ کیجئے کہ جو بھی آپ سے انکار کرے گا وہ ضرور جہنم میں جائے گا کیونکہ جو آپ کا منکر ہے وہ درحقیقت میرا منکر ہے اور جو آپ کا مطیع ہے وُہ میرا مطیع ہے۔ آپ دل میں یہ خیال تک نہ لائیے کہ جو آپ کا منکر ہے میں اس پر اپنی وسعتِ رحمت کی وجہ سے اسے بخش دُوں گا۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ آپ کے دشمن کے لیے میری رحمت کے دروازے بند ہیں ان کے لیے وہ کبھی وا نہیں ہوں گے۔ انہ الحق من ربک یعنی تیرے رب سے یہ حق ثابت ہے کہ جو صفاتِ قہر کے مظہر ہیں ان کے لیے قہر لازم ہو چکا اور جو صفاتِ رحمت کے مظہر ہیں انھیں رحمت لازماً نصیب ہوگی۔ ولٰکن اکثر الناس لا یؤمنون لیکن اکثر لوگ صفاتِ قہر پر ایمان نہیں رکھتے جیسے انھیں صفاتِ رحمت پر ایمان ہے وُہ ایسی اُمید سے مذمت کے لائق ہیں اور انھیں غلط خیالی سے

کرم الٰہی پر غلط امید ہوئی ہے۔ اور ایسے خیال میں انھیں شیطان نے دھوکا دیا ہے۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بُو لہب نباشد

ترجمہ: عشق کے کارخانہ میں کفر ضروری ہے کیونکہ آگ کسے جلاتے گی اگر بُو لہب (کافر) نہ ہو تو۔

ف: قرآن مجید اسی لیے نازل ہوا ہے تاکہ اہلِ لطف واہلِ قہر کے درمیان امتیاز ہو۔ اسی لیے یہ قرآن اعلیٰ برہان اور بہترین اور روشن معجزہ ہے۔ اسی سے ہی پتا چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا فرمانبردار کون ہے اور اس کا باغی کون۔

ف: اور چونکہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ صفاتِ قدیمہ سے ہے اسی لیے اہلِ کشف نے فرمایا کہ:

افمن کان علیٰ بیّنۃ من ربہ سے مراد یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کا کوئی جلوہ نصیب ہوا تو وہی اللہ تعالیٰ کے برہان پر ہے ویتلوہ شاھد منہ اور ایسے شخص کو کشف کے بعد شواہدِ حق نصیب ہوتے ہیں اس لیے کشف کبھی شہود سے ہیں اور کبھی شہود کے بغیر بھی۔ اب آیت کا معنیٰ یہ ہُوا کہ کیا جو شخص کشوفِ حق مع شواہد سے نوازا گیا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو صرف عقلی و نقلی دلائل رکھتا ہے جن میں سہو و غلطی کا احتمال ہے۔ اسی لیے حضرت حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ؎

عشق می ورزم وامید کہ ایں فن شریف
چو ہنرہائے دگر موجب حرماں نشود

ترجمہ: میں نے عشق اس لیے اختیار کیا کہ یہ ایسا مبارک فن ہے کہ دوسرے فنون کی طرح محرومی کا سبب نہیں بنتا۔

حضرت صائب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ؎

طریقِ عقل را بر عشق رجحان می دہد زاہد
عصائے بہتر از صد شمع کافوری اعمیٰ را

ترجمہ: زاہد عقل کو عشق پر ترجیح دیتا ہے اس بیچارے کو کیا خبر کہ نابینا کے لیے یک صد کافوری شمع سے ایک لاٹھی بہتر ہے۔

اور فرمایا: ؎

جمعے کہ پشت گرم بعشق ازل نیند
ناز سمور و منت سنجاب میکشند

ترجمہ: جن لوگوں کو عشق کی گرمی ازل سے نصیب نہیں وہی سمور و سنجاب کے ناز کی سختیاں اُٹھاتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو شواہدِ حق کی نگاہ نصیب فرمائے اور ہم سب کو نورِ مطلق کا مشاہدہ عطا فرمائے اور ہم سب کو سبقت والے فریق کے جھنڈے تلے جگہ دے۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ وَمَنْ اَظْلَمُ اور اس سے اور کون بڑا ظالم ہوگا۔ یعنی اس جیسا اور کوئی ظالم نہیں۔ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ط جو اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی نسبت کرتا ہے یعنی اس کی طرف ایسی باتیں کرتا ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں۔ مثلاً کافروں کا کہنا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی لڑکیاں ہیں یا ان کا کہنا کہ ان کے بت اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت کریں گے۔ اُولٰٓئِكَ وہی لوگ یعنی جو اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتے ہیں يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ اپنے رب تعالیٰ کے ہاں پیش کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش کیے جانے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ قیامت میں حساب کے لیے حاضر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں حساب کے لیے کھڑا کر دے گا یہاں تک کہ لوگوں کا حساب ہو جائے گا تو پھر ان سے اس افتراء کے متعلق سوال ہوگا۔ ہم نے یہ معنیٰ اس لیے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکان میں رہنے سے پاک ہے اور کسی کے سامنے پیش ہونا پہلے اس کے لیے مکان ثابت کرتا ہے۔

سوال: کافروں کے پیش کیے جانے کا کیا مطلب حالانکہ ان کے اعمال پیش ہوں گے۔

جواب: حاکم کے سامنے اپنی حاضری سے دل پر دہشت رہتی ہے۔ مجرم کو حاکم کے سامنے پیش کرنے کے بجائے صرف اس کے اعمال پیش کیے جائیں تو اس طرح سے مجرم کو اتنا خطرہ محسوس نہیں ہوتا جتنا اس کے دل میں حاکم کے سامنے پیش ہونے سے ہوتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ اور اُن کی حاضری کے وقت گواہ، یعنی ملائکہ کرام اور انبیاء کرام علیہم السلام اور اہلِ ایمان کہیں گے۔

ف: اشہاد شاہد یا شہید کی جمع ہے جیسے صاحب کی اصحاب اور شریف کی اشراف جمع آتی ہے۔

هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ج یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کریم محسن عظیم پر الزام باندھا۔ اور وہ مالک اتنی بڑی قدرت رکھتا ہے کہ اس افتراء پر ان کی سخت گرفت فرمائے گا۔

ف: هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ ان کی تحقیر اور ان کے بُرے عمل پر دلالت کرنے سے ہے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ خبردار اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کا عذاب اور غضب عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ ظالموں پر۔ افتراء مذکور کی وجہ سے انھیں ظالم کہا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، عذاب اور غضب ہوگا۔

حدیث شریف قیامت میں اللہ تعالیٰ کسی ایک بندے کو اپنے قریب کر کے اس کی ستر پوشی کر کے فرمائے گا بتا اے میرے بندے! تُو اپنے فلاں فلاں گناہ یاد رکھتا ہے یا نہیں۔ عرض کرے گا: اے

میرے رب! مجھے یاد ہے۔ جب بندہ اپنے گناہوں کا پورے طور پر اقرار کرے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "اے میرے بندے! دنیا میں میں نے تیرے گناہوں کی پردہ پوشی کی، آج آخرت میں تیرے گناہ بخش دیتا ہوں۔ جا میں نے تجھے معاف کیا" اور نیکیوں کا اعمالنامہ اس کے سیدھے ہاتھ میں تھما دے گا۔ اور کفار و منافقین کے لیے بھرے مجمع میں عام اعلان ہوگا اور ملائکہ گواہی دیتے ہوئے کہیں گے:

هٰؤلاءِ الذین کذبوا علیٰ ربهم الا لعنة الله علی الظّٰلمین۔ دنیا میں ان کے برے اعمال کی وجہ سے انہیں رسوا کیا جائے گا۔ علی الاعلان انھیں کہا جائے گا کہ یہی لوگ لعنتی ہیں کیونکہ انھوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ پر غلط نسبت قائم کر کے ظلم کیا۔

حدیث شریف جو شخص اپنی شہرت کا خواہاں ہے اللہ تعالیٰ اس کی شہرت یوں کرے گا کہ اس کے اعمال ریاء کے طور عوام کے سامنے ظاہر کر دے گا۔ لیکن قیامت میں لوگوں کے سامنے اس کی نیت فاسد ظاہر کر کے اسے دنیوی اعمال کی وجہ سے رسوا کرے گا۔ اور رسوا کرنے والے اس کے گواہ ہوں گے۔ اور گواہوں سے اس کے نگران فرشتے یعنی کراماً کاتبین مراد ہیں۔

ف: بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ گواہوں سے عام فرشتے مراد ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے تمام مخلوق مراد ہے۔

ربط: اب ان کی وہ برائی بیان کی جا رہی ہے جو دنیا میں رہ کر نیک کاموں سے روکا کرتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ وہ لوگ جو روکتے ہیں یعنی جن پر انھیں قدرت ہے مضامین تورات کی تحریف کر کے اور احکام الٰہیہ میں شک و شبہ ڈال کر روکتے ہیں **عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** اللہ تعالیٰ کے راستے یعنی دینِ حق اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے **وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا** ط اور وہ حق کو ٹیڑھا کرنے کی تلاش میں رہتے ہیں۔

سوال: سبیل مذکر ہے اس کے لیے ضمیر مؤنث کیوں لائی گئی۔

جواب: سبیل مونث سماعی ہے اگرچہ صیغہ کے لحاظ سے مذکر ہے۔

حل لغات: یبغون البغی سے مشتق ہے یعنی طلب کرنا۔ اہلِ عرب کہتے ہیں:

بغیت الشیٔ، ای طلبتهٗ۔ یعنی میں نے اسے طلب کیا۔

اور کہتے ہیں:

بغیتك۔ میں نے تیرے لیے طلب کیا۔

نیز اور شر دونوں کے لیے مستعمل ہے اور اسے کبھی انحراف عن الحق والصواب (حق اور صواب سے روگردانی) کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس معنے پر اطلاق السبب علی المسبب یعنی سبب بول کر مسبب مراد لینے کے قبیل سے ہوگا۔

ف: الارشاد میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ اس عمومی معنے میں کافروں کی تکذیب القرآن کو بھی شامل ہے یعنی ان کا کہنا کہ قرآن اللہ تعالیٰ سے نازل نہیں ہوا یہ بھی ان کی منجملہ بغاوتوں میں سے ایک ہے۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ یہی لوگ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ راہِ حق کے لیے ٹیڑھے پن کی کوشش کرتے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ وہ آخرت کا انکار کر رہے ہیں۔ انہیں آخرت پر ایمان والے ہرگز نہیں کہا جا سکتا اگرچہ وہ سَو بار کہیں کہ ہمیں آخرت پر ایمان ہے اور ہزار بار دعویٰ کریں کہ ہم صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں اور لاکھ بار ہمیں ہم لوگوں کو راہِ حق دکھا رہے ہیں۔

سوال: اس جملہ میں هُمْ ضمیر کا تکرار کیوں؟

جواب: محض تاکید کے لیے ہے تاکہ پتا چلے کہ وہ اپنے اس عقیدہ اور کردار کی وجہ سے یقیناً کافر ہیں بلکہ اس تاکید سے واضح ہو جائے گا کہ یہ دیگر تمام کافروں کے سرغنے ہیں۔ ان کے کفر کے بالمقابل دوسروں کا کفر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

اُولٰٓئِكَ وہی تکذیب کرنے والے لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے کہ اگر وہ انہیں عذاب دینا چاہے تو یہ لوگ اسے عذاب نہ کرنے دیں فِي الْاَرْضِ زمین پر یعنی باوجودیکہ زمین وسیع میدان ہے اور یہ کہیں بھی ہوں اللہ تعالیٰ وہیں پر انھیں عذاب دے سکتا ہے وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ ان کے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی مددگار نہیں کہ وہی غیر انہیں مدد کے طور پر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکیں۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں دنیا میں عذاب نہیں دیتا، یہ صرف مہلت کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ فرمایا:

امهلهم رويدا ۔ یعنی کافروں کو عذاب سے چند روز مہلت دیجئے۔

سوال: اَولیاء جمع کرکے کیوں لایا گیا۔

جواب: کفار کے کثیر افراد کی وجہ سے گویا یوں کہا گیا کہ،

وماكان لاحد منهم من ولى۔

یعنی کافروں کے کسی ایک فرد کا کوئی ایک بھی مددگار نہیں۔

يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ یہ جملہ مستانفہ ہے گویا سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال کی تقریر یہ ہے کہ جن لوگوں کا اُوپر ذکر ہُوا ان کا انجام کیا ہوگا اور آخرت میں ان کا کیا حال ہوگا؟ جواب دیا کہ انہیں دائمی طور پر دوہرے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وہ نہ تو سمع نافع کی طاقت رکھتے تھے وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝ اور نہ ہی حق کو دیکھتے تھے حالانکہ انفس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی کئی آیات ان کے سامنے ہر وقت موجود رہتی تھیں لیکن وہ انھیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ یہ بھی جملہ مستانفہ ہے۔ یضعف لھم العذاب کی علت واقع ہوا ہے۔

ازالہ وہم یہاں پر مضاعفۃ سے ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبے تک پہنچنا مراد نہیں بلکہ عذاب کے جمیع مراتب کو شامل ہونا مراد ہے۔ (کذا فی الحواشی السعدیہ)

سوال: سمع میں استطاعۃ کی نفی ہے اور بصر میں صرف نفی پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔

جواب : قرآن کو سُن کر اس کی حقانیت پر ایمان لانے میں سخت انکار کرتے تھے بخلاف باقی ان آیات کے انکار کے جو ان کی آنکھوں سے تعلق رکھتا تھا۔ بنا بریں اوّل کو نفی استطاعت اور ثانی کو صرف نفی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ یعنی اللہ کی عبادت بیچ کر بتوں کی پرستش کی خرید میں سخت گھاٹا پایا۔

ف : البحر میں ہے کہ یہاں مضاف . . . . راحۃ یا سعادۃ محذوف ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے نفوس کی راحت و سعادت کو ضائع کر کے خسارہ پایا۔ ہم نے مضاف اس لیے محذوف مانا ہے کہ ان کے نفوس ضائع تو نہیں ہوئے تھے بلکہ وُہ تو بدستور باقی تھے اور انھیں آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا۔

نکتہ : مضاف محذوف کرنے کے بجائے خود نفوس کو ضائع کرنے کا مفہوم بلیغ تر ہے اس لیے کہ انہیں باقی رکھ کر عذاب میں مبتلا کر کے عدم بقاء کے مفہوم میں لانا موزوں ہے کیونکہ درحقیقت باقی رہنے کے لائق وہ ہے جو اپنی بقاء سے نفع پائے اور جسے اس سے عذاب ہو اس کے لیے وہ بقاء فنا سے بھی بدتر ہے۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ اور ان سے دُور یعنی ضائع ہو جائے گا مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ وُہ جو افتراء کرتے تھے یعنی ان کے تمام منصوبے ملیامیٹ ہو کر رہ جائیں گے جبکہ دنیا میں سمجھتے تھے کہ بُتوں کی پرستش مفید ثابت ہوگی اور وہی قیامت میں ان کی سفارش کریں گے۔ لَا جَرَمَ اس میں تین صورتیں ہیں :

۱۔ ماسبق کے لیے لا نافیہ ہے اور جرم فعل ماضی بمعنے حق ہے۔ اس کے بعد ان اپنے متعلقات سے مل کر اس کا فاعل ہے اب معنیٰ یُوں ہوگا کہ انھیں اپنا کردار کوئی نفع نہ دے گا بلکہ ان کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وُہ آخرت میں بہت زیادہ خسارہ پائیں گے۔ یہ قاعدہ سیبویہ کے مذہب کا ہے۔

۲۔ جرم بمعنے کسب ہے۔ اس کا ما بعد اس کا مفعول ہے۔ اس کا فاعل کلام کا مدلول ہے یعنی کسب ذٰلك خسرانهم۔ اب معنیٰ یُوں ہوگا کہ انھیں سوائے خسران کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔

۳۔ لا جرم بمعنے لابد ہے ای لابد انهم فی الاٰخرة هم الاخسرون۔ مذکورہ بالا صورتوں میں کوئی بھی ہو تب بھی اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی لوگ سخت ترین خسارہ میں ہیں۔

ف : کاشفی نے لکھا کہ بیشک وُہ لوگ آخرت میں بہت بڑے خسارے میں ہوں گے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بجائے بتوں کی پرستش اختیار کی جس کی وجہ سے وہ دُنیائے فانی کی چند روزہ چہل پہل پر آخرت کی بہترین نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ بنا بریں ان کا یہ سودا گھاٹے کا ہُوا۔

مایہ این را بدنیا دادن از دون ہمتیست
زانکہ دنیا جملگی رنج است و دین آسائش است

نعمت فانی ستانی دولت باقی دہی
اندریں سودا خرد داند کہ غبن فاحش است

ترجمہ : آخرت کا سرمایہ دے کر دنیا خریدنا بیوقوفوں کا کام ہے اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ دنیا رنج اور دین میں آسودگی ہے۔ جو بیوقوف نعمت فانی دے کر نعمت باقی دیتا ہے عاقل کو معلوم ہے کہ یہ سودا سراسر گھاٹے کا ہے۔

حکایت و روایت ابن ابی الدنیا ضحاک سے روایت کرتے ہیں کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی :

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! دُنیا میں سب سے بڑا زاہد کون ہے ؛

آپ نے فرمایا :

جو قبر کو اور مرنے کے بعد اپنے جسم کے گل سڑ جانے کو نہیں بھولتا۔ اور دُنیا کی زیب و زینت پر دیوانہ نہیں ہوتا۔ اور فانی دنیا کو آخرت کی باقی رہنے والی نعمتوں پر ترجیح نہیں دیتا اور آنے والے دن کو اپنی زندگی کا جز و نہیں سمجھتا۔ یعنی یقین رکھتا ہے کہ اسکی زندگی عارضی ہے نہ معلوم کل ہو گا یا نہ، بلکہ وہ اپنے آپ کو اہلِ اموات میں شمار کرتا ہے۔ تو وہی سب سے بڑا زاہد ہے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
اعمال صالح میں جلدی کرو کیونکہ کالی رات کالی گھٹاؤں سے بھی زیادہ سیاہ ہے، تیز فتنے تمہارے آگے منہ کھولے کھڑے ہیں، بہت سے بدبخت صبح کو مومن ہوتے ہیں تو شام کو کافر ہو جاتے ہیں، بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو شام کو مومن ہوتے ہیں تو صبح کو کافر ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو دُنیا کی لالچ میں دین بیچ ڈالتے ہیں۔

صُوفیائے خام کی نشانی بہت سے غلط کار صُوفی دین بیچ کر دنیا لینے والے ہوتے ہیں ان کی علامت یہ ہے کہ وہ بڑی بیباکی سے اپنے آپ کو خدا رسیدہ بزرگ کہتے ہیں اس سے ان کا زر اندوزی اور حصولِ مراتب اور لوگوں کی نظروں میں جاہ و جلال مقصد ہوتا ہے جو اپنے آپ کو زاہد و عابد ظاہر کر کے شیخی بگھار کر دنیا کو لُوٹنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ اولیاء اللہ کے نزدیک لعنتی ہیں اور اولیاء اللہ ہی اللہ تعالیٰ کے حقیقی شاہد ہیں۔ یہ لوگ لعنتی اس لیے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے برگزیدہ لوگوں کا ہمسر ظاہر کیا اور وُہ بہت بڑا ظالم ہے اسی بنا پر وہ لعنت کا مستحق ہے۔

مثنوی شریف میں ہے :

ے

تو لاف از مشک کان بوئے پیاز
از دم تو میکند مکشوف راز

کاشکر خوردم ہمی گوئی و بوی
میزند از سیر کہ یادہ مگوی

ترجمہ: پیاز کی بدبُو سے بھرپور ہو کر اپنے لیے عطر کا دعویٰ مت کر، کیونکہ تیری بدبُو تیرا راز خود منکشف کرتی ہے۔
اور تھوم کھا کر یہ بھی نہ کہنا کہ میں نے شکر کھائی ہے کیونکہ تھوم کی بدبُو تیرا دعویٰ غلط کر دے گی۔

صُوفی خام کی دُوسری نشانی دوسری علامت یہ ہے کہ غلط دعویٰ کر کے سالکین کو راہِ سلوک بتاتے ہیں حالانکہ وُہ خود گم کردہ راہ ہیں تو دُوسروں کی رہنمائی کیسے کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر ان سالکوں کو دوسرے کاملین تک پہنچنے سے محروم رکھتے ہیں، نہ خود انھیں سلوک طے کرا سکتے ہیں نہ دوسروں سے استفادہ کرنے دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اگر کہا جاتے:

وھم بالاٰخرۃ ھم کافرون۔

تو روا ہے کیونکہ جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے یقین ہے کہ بارگاہِ حق میں حاضر ہونا ہے اور اس کے اعمال کا حساب و کتاب ہوگا تو طریقت کا مدعی ہو کر جرأت کر کے سالکینِ راہِ خدا کو محروم نہ کرتا۔ ایسے لوگوں کو ایسی گمراہی پر سخت عذاب ہوگا کیونکہ دنیا کی خاطر شیخی بگھاری، دُوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کیا کہ وہ بیچارے مشایخِ حق سے فیضیاب نہ ہو سکے۔ بنا بریں ایسے صوفیائے خام کو اپنی گمراہی کا عذاب الگ، دُوسروں کو گمراہ کرنے اور انھیں کاملین کی صحبت سے محروم رکھنے کی سزا الگ ہوگی۔ یہی لوگ اپنے کردار کی وجہ سے بہت خسارے میں ہیں۔ ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کین رہ کہ تو میروی بترکستانست

ترجمہ: اے اعرابی! کعبہ تک نہیں پہنچ سکو گے کیونکہ جس راہ پہ تم چل رہے ہو یہ کعبہ کے بجائے ترکستان جاتا ہے۔

تفسیرِ عالمانہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بے شک وُہ لوگ کہ جن چیزوں پر ایمان لانا واجب ہے ان پر ایمان لاتے ہیں۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک عمل کرتے ہیں یعنی حقوق العباد و حقوق اللہ کی ادائیگی میں کمی نہیں کرتے۔ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ الاخبات سے مشتق ہے بمعنے خشوع و خضوع۔ یہ فعل حرف لام سے مستعمل ہے۔ کہا جاتا ہے: اخبت للہ۔
لیکن یہاں پر الی سے مستعمل ہے تو اطمینان و انقطاع کے معنے کو متضمن ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ وہ اللہ جل و علا کے ذکر سے مطمئن ہیں اور اسی سے ہی انھیں سکون اور چین نصیب ہوتا ہے، اور نہایت خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مستغرق رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ وہی لوگ جن کے اوصاف اُوپر مذکور ہوئے اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا

خٰلِدُوْنَ ○ بہشتی ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

نکتہ : وھم بالاٰخرۃ الخ کی طرح یہاں پر ضمیر فعل کی اس لیے نہیں لائی گئی تاکہ اشارہ ہو کہ بہشت صرف انہی لوگوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ مومن اگرچہ عمل صالح نہ بھی کر سکے تب بھی وہ بہشت میں جا کر اس میں مداومت اختیار کرے گا۔ (واللہ اعلم) یہی اہلسنت کا مذہب ہے۔ (کذا فی حواشی سعدی المفتی)

تفسیر صوفیانہ بے شک وہ لوگ جو اللہ کی طلب پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی طلب کے لیے معاملات صالحات سے طلب کرتے ہیں۔ اور وہ معاملات ایسے مفید ہوتے ہیں کہ جو مطلوب تک پہنچنے کے لیے مفید ہیں۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طلب میں بہت خشوع و خضوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ صرف اسی کو طلب کرتے اور اسی طلب میں مطمئن ہیں۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہی لوگ بہشتی ہیں یعنی بہشت کے مالک یہی لوگ ہیں۔ یہ اس محاورہ سے ہے کہ کہا جاتا ہے، فلان صاحب الدار۔ یعنی دار کا مالک۔ ایسے لوگ بہشت کے مطلوب کہلاتے ہیں نہ کہ طالب، کیونکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے طالب ہیں اور بہشت میں ہمیشہ اسی کے طالب ہو کر رہیں گے۔

تفسیر عالمانہ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ کافر و مومن کا عجیب حال۔

سوال : تم نے مثل کا عجیب حال کیوں بیان کیا؟

جواب : مثل کا اطلاق بنا بھی ان چیزوں پر ہے جن کے احوال و صفات عجیب ہوں۔

ف : ابن الشیخ نے فرمایا کہ :

حقیقت عرفیہ میں مثل اس کہاوت کو کہتے ہیں جو کسی خاص واقعہ کی مشابہت سے بیان کی جاتے۔ پھر استعارہ کے طور پر حال و صفت عجیبہ پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ یہ دونوں عجیب ہونے میں اسی کہاوت سے تشابہ رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ بھی وہاں بولے جاتے ہیں جہاں غرابۃ ہو۔

كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ط نابینا، بہرا، بینا اور سننے والے کی مانند ہے، یعنی جیسے ان کی ذاتیں برابر نہیں ویسے ہی مذکورہ بالا فریقین یعنی مومن و کافر برابر نہیں۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ ایک شئے کے حال کو دوسری شے کے حال سے تشبیہ دینا اس بات کو مستلزم ہے کہ شئے اول کو شئے ثانی سے مشابہت ہے۔ اعمٰی و اصم سے کافر اور بصیر و سمیع سے مومن مراد ہیں۔ اور ان کے درمیان ایک صفت کو دوسری صفت پر عطف ڈالنے کے لیے واو عاطفہ واقع ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے :

ھو الجواد و الشجاع۔

اور اس میں مناسب ترین یہی ہے کہ کافر کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جاتے جو اندھا بھی ہو اور بہرا بھی۔ اور یہ کیفیت مُردہ کی ہے اسی لیے کافر کو اس سے تشبیہ دی گئی کیونکہ کافر نہ تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ آیات کو تدبر سے دیکھتا ہے اور نہ ہی اس کی

کی نازل کردہ آیات کو غور و فکر سے سُنتا ہے۔ اس معنے پر اس کا دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر اور سُننا نہ سننے کے برابر ہے۔ گویا کافروں کا حال اس جیسا ہے جو آنکھ اور کان دونوں قوتوں سے محروم ہو۔ اور یہ کیفیت مُردہ کی ہے کہ وہ بظاہر ان ہر دو قوتوں سے محروم ہوتا ہے۔

نکتہ: ابن الشیخ نے فرمایا کہ صرف اعمٰی یا اصم کافروں کو نہیں فرمایا کہ اعمٰی بات سن کر کام چلا لیتا ہے۔ اسی طرح بہرہ بھی اشاروں سے کام لیتا ہے اور جو ان ہر دو قوتوں سے محروم ہو وہ ہر طرح سے بیکار سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کافر کا حال ہے کہ وہ دونوں قوتوں کی محرومی سے تمام سعادتوں کے دروازے اس پر بند کر دیے جاتے ہیں۔ پھر اس کا حال واضح ہے جس کی آنکھ اور کان میں کسی قسم کا خلل نہ ہو تو وہ اپنے جملہ امور میں ہشیار اور دانشمند ہوتا ہے ایسے ہی مومن کا حال ہے کہ اسے ہر قسم کی سعادت سے نوازا جاتا ہے۔

نکتہ: اعمٰی کو اصم پر مقدم کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ نابینا بہرے سے دنیوی معاملات میں ذلیل تر اور بہت زیادہ خوار ہوتا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ ط کیا مذکورہ بالا دونوں گروہ برابر ہو سکتے ہیں۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ مثلاً: حال و صفت کے لحاظ سے یہ یستویٰن کے فاعل سے تمیز ہے اور یہ تمیز فاعلیت سے منقول ہے۔ در اصل عبارت "ھل یستوی مثلھما" تھی۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ کیا تم نصیحت نہیں پاتے۔ یعنی اس کے باوجود اب بھی شک کرتے ہو کہ کیا وہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں، حالانکہ تم سب کو معلوم ہے کہ جیسے ان دو گروہوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایسے مومن و کافر ہیں۔ یا معنٰے یہ ہے کہ کیا تم غفلت کر رہے ہو حالانکہ تمہارا فرض ہے کہ جُونہی ہم نے تمہیں مثالیں دے کر سمجھایا ہے تم فوراً سمجھ جاتے اور ہماری بیان کردہ مثالوں پر غور و فکر کر کے نصیحت پاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انکار دونوں معطوفوں پر وارد ہے یا اس کا معنٰی یہ ہے کہ اے کافرو! کیا تم سُن کر نصیحت نہیں پکڑتے۔ اس معنے پر مفہوم یوں ہوگا کہ اُن کے ہاں نصیحت پانے کے جمیع اسباب سامنے تھے۔ لیکن باوجود اینہمہ انہوں نے ان سے نصیحت نہ پاتی۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اعمٰی وُہ ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں دیکھتا۔ اور اصم وُہ ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں دیکھتا۔ اور بصیر وُہ ہے جو حق کو حق دیکھ کر اس کی اتباع کرتا ہے اور باطل کو باطل دیکھ کر اس سے اجتناب کرتا ہے۔ اور سمیع وُہ ہے جس کی سماعی قوت تجلیاتِ حق ہیں انہی سے سُنتا ہے اور یہ بھی صوفیاء کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی تجلیات سے دیکھتا ہے اس کی آنکھ میں غیر اللہ نہیں سماتا، نہ اس کے لیے غیریت ہے نہ اس سے سُنتا ہے۔ یعنی اس خوش قسمت کو جو کچھ سُنائی دیتا ہے وہ حق سے ہوتا ہے اور دنیا میں اس کی نظروں میں غیر اللہ ہے ہی نہیں، پھر وہ دیکھے تو کسے دیکھے۔ اسی لیے اس کا ہر کام حق کے ایما سے ہوتا ہے۔

حکایت صوفی عارف باللہ

حضرت خیر نساج رحمہ اللہ تعالیٰ کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں انھیں کوئی ناواقف انسان ملا۔ اس نے کہا: تم میرے غلام ہو اور تمہارا نام خیر (دین) ہے۔ فلہذا چلو اور میرا کام کرو۔ حضرت خیر نساج کو یہی آواز اس بندے سے خود ذاتِ حق سے سنائی دے رہی تھی۔ اسی لیے سرِ تسلیم خم کر کے اس ناواقف انسان کے ساتھ چل پڑے۔ اس نے آپ کو نوکر بنا کر کئی سال تک خوب کام لیا۔ لیکن حضرت خیر نساج نے کبھی اُف تک نہ کی۔ ایک دن اسی شخص نے حضرت خیر نساج سے فرمایا جاؤ تم میرے غلام ہو اور نہ ہی تمہارا نام خیر نساج ہے۔ ؎

کوشی کہ بحق باز بود در ہمہ جائے
از ہیچ سخن نشنود الا از خدائے
وان دیدہ کز نور پذیرد او را
ہر ذرہ بود آئینہ دوست نمائے

ترجمہ: جدوجہد کر کے ایسا مقام پیدا کرو کہ ہر جگہ سے تمہیں اللہ تعالیٰ سے براہِ راست بات سُنائی دے اور ایسی آنکھ پیدا کرو کہ ہر ذرہ دوست نمائی کا آئینہ بن جاتے۔

سبق ۱

ہر مقام و رتبہ پر ہزاروں آزمائشیں درپیش ہوتی ہیں۔ طالب صادق وُہ ہے جو اپنے لیے قایم کردہ حدسے تجاوز نہیں کرتا اور وُہ خدا تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور نہ ہی کبھی غلط کام کا ارتکاب کرتا ہے۔ مثلاً شراب خوری وغیرہ۔ اگرچہ اسے کوئی کہنے والا غائب سے کہے کہ شراب پی لے۔ کیونکہ یہ آواز بھی اس کے لیے بطورِ آزمائش سُنائی دے رہی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو آزماتا ہے کہ کیا میرا بندہ میری حدود پر قائم ہے یا ان سے تجاوز کرتا ہے۔

سبق ۲

سالک پر لازم ہے کہ وہ سلوک کے راہ پر سنبھل کر چلے اور صرف اپنے مولیٰ کے احکام کا پابند رہے۔ نفس و شیطان کی شرارتوں کا ہر وقت خیال رکھے، لحہ بھر بھی ان کی بات نہ مانے اور نہ شہوات رانی کرے اور نہ ہی نفس کے ارادوں کو پُورا کرنے کے درپے رہے۔ اسی کا نام محقق ہے اسی کو اپنے مولیٰ کا حقیقی فرمانبردار کہا جاتا ہے۔ لیکن اس میں جدوجہد کے ساتھ کسی کامل شیخ کا دامن پکڑنا ضروری ہے۔

؎

ان سوار یکہ سپہ را شد ظفر
اہلِ دین را کیست سلطان بصر
با عصا کوران اگر رہ دیدہ اند
در پناہ خلق روشن دیدہ اند

(باقی بر صفحہ ۵۵)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّیْۤ اَخَافُ
عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا
مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا
مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ۝ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ
وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝
وَیٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ
طَرَدْتُّهُمْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ
وَلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ
اَنْفُسِهِمْ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا
بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ
بِمُعْجِزِیْنَ ۝ وَلَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ
اَنْ یُّغْوِیَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ
فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور بے شک ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ بے شک میں تمہارے لیے صریح ڈرسنانے والا ہوں یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو میں تم پر ایک دردناک دن سے ڈرتا ہوں تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے نے کہا ہم تو تمہیں اپنی مثل ہی ایک بشر دیکھتے تھے اور ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تیری تابعداری کی ہو مگر ہمارے سے خسیس تریں لوگوں نے وہ بھی سرسری نظر سے اور ہم تم میں اپنے اُوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ ہم تمہیں جھوٹا تصور کرتے ہیں۔ نوح علیہ السّلام نے فرمایا: اے میری قوم! بھلا بتاؤ اگر میں اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تو تم اس سے اندھے رہے کیا وہ ہم تمہارے گلے پہ چسپاں کردیں حالانکہ تم اس کو ناپسند کرتے ہو۔ اور اے میری قوم میں تم سے اس کے عوض مال نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے اور میں ایمان والوں کو اپنے سے ہٹانے والا نہیں بے شک وہ اپنے رب تعالیٰ سے ملنے والے ہیں لیکن میں تمہیں ایسی قوم دیکھتا ہوں جو بڑے جاہل ہو۔ اور اے میری قوم اللہ تعالیٰ سے مجھے کون بچائے گا اگر میں انھیں اپنے سے دُور کروں تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے اور میں تمہیں نہیں کہتا کہ میرے ہاں

اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ میں ان کے لیے کہتا ہوں کہ جنھیں تمھاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں بھلائی سے نوازے گا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ ایسا کروں تو یقیناً میں ظالموں سے ہوں گا۔ کافروں نے کہا اے نوح (علیہ السلام) تو ہمارے ساتھ جھگڑا اور بہتیرا جھگڑا کر چکا تو لے آ جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اگر تم سچے ہو۔ فرمایا وہ تو تم پر اللہ تعالیٰ ہی لائے گا اگر چاہے گا۔ اور تم تھکا نہیں سکتے۔ اور میری نصیحت تمھیں کوئی فائدہ نہ دے گی اگر میں تمھاری خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کو تمھاری گمراہی کا ارادہ ہو۔ وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ کیا کافر کہتے ہیں کہ انھوں نے اسے خود گھڑا ہے فرمایئے کہ اگر میں نے اسے اپنے سے گھڑا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور تمھارے گناہ سے بیزار ہوں۔

(بقیہ ص ۵۴)

گر نہ بینایان بدندے و شہان
جملہ کوران مردہ اندے در جہان
نے ز کوران گشت آید نے ورود
نے عمارت نے تجارتہا و سود

ترجمہ: بہادر سواروں سے ہی ملک کو فتح ہوتی ہے اہل دین کے لیے بھی رہبر ضروری ہے نابینا اگر صرف ڈنڈے سے رہبری پاتا ہے تو اس کے لیے خلقِ خدا یعنی انسان کی رہبری سے تو بہت فوائد نصیب ہوں گے اگر آنکھ والے اور دین کے بادشاہ نہ ہوتے تو دنیا میں تمام ظاہری باطنی اندھے تباہ و برباد ہو جاتے۔ نہ ان بے چاروں کو گھومنے پھرنے کا موقعہ ملتا اور نہ وہ کہیں آ جا سکتے۔ نہ ہی انھیں مکان میسر ہوتے اور نہ ہی دیگر ضروریاتِ تجارت وغیرہ نصیب ہوتیں

(تفسیر آیاتِ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖٓ واؤ ابتدائیہ اور لام قسمیہ۔ اور جواب قسم محذوف ہے۔

ف: حرف قسم با ہے واؤ حرف قسم نہیں۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں گزرا۔ یہ ہم نے اس لیے کہا ہے تاکہ قسم کے دو حروف کا اجتماع لازم نہ آئے۔ اب عبارت یوں ہوگی: باللہ لقد ارسلنا الخ یعنی بخدا ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

ف: اس سے نوح علیہ السلام بن لمک بن متوشلخ بن ادریس علیہ السلام مراد ہیں۔ یہی حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے نبی ہیں۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جس وقت نبوت ملی اس وقت آپ چالیس سال کے تھے اور اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تبلیغ فرمائی۔ آپ طوفان کے بعد ساٹھ سال (دنیا میں) زندہ رہے۔ آپ کی کل عمر ایک ہزار پچاس سال تھی۔ اس کے

علاوہ اور اقوال بھی ہیں۔

ف : حضرت نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کے زمین پر تشریف لانے کے بعد ایک ہزار چھ سو بیالیس سال میں پیدا ہوئے۔ آپ کی رہائش دمشق میں رہی اور کوفہ میں مدفون ہوئے۔ نوح علیہ السلام کا اسم گرامی شاکر تھا اور بکثرت الحاح وزاری کی وجہ سے آپ کو نوح کہا گیا۔

ف : نوح علیہ السلام کی بکثرت گریہ وزاری تین وجوہ سے تھی :

۱۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ جل وعلا سے عرض کی :

لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔

زمین پر کوئی جھونپڑے والا کافر نہ چھوڑ۔

اگرچہ اس سے اللہ جل شانہٗ کی رضا نہ تھی لیکن اپنے پیارے پیغمبر علیہ السلام کا کہنا مان کر کفار کی غرقابی کا حکم فرمایا[1]۔ رب العزت نے فرمایا : اے شاکر (نوح) ! آپ میں رحمت کی قلت ہے۔ اس پر آپ تازیست روتے رہے۔

۲۔ مروی ہے کہ نوح علیہ السلام کے سامنے سے ایک کتا گزرا، آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا : یہ کتنا غلیظ ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب (محبوبانہ) فرمایا[2]۔ . . . . اسی عتاب کے باعث آپ نے گریہ فرمایا۔ حتیٰ کہ تمام عمر جنگلوں اور پہاڑوں میں روتے ہوئے بسر فرمائی۔

۳۔ جب نوح علیہ السلام کا بیٹا طوفان میں غرق ہونے لگا تو شفقتِ پدری جوش زن ہوئی۔ آپ نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے بارگاہِ حق میں عرض کی :

ان ابنی من اھلی ۔ یہ میرے اہل سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

انہ لیس من اھلک ۔ وہ تیرے اہل سے نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد نوح علیہ السلام بہت روئے، بیٹے کی شفقت کی بنا پر یا اپنے سوال وجواب کے خوف سے[3] (کذا فی التبیان)

وہابیوں کے اعتراض کے لیے صاحبِ روح البیان کی بہترین تقریر

محبوبانِ خدا کی بعض لغزشیں اگرچہ رونے کا سبب بنتی ہیں لیکن ان کا رونا ہماری طرح

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ محبوبوں کی خدا مانتا ہے اگرچہ بظاہر اس کی مرضی نہ ہو۔ اسے ہم نازبرداری سے تعبیر کرتے ہیں۔ آگے کا معاملہ بھی محبوبانہ ہے جسے اہلِ محبت جانتے ہیں۔ تفصیل تفسیر اویسی میں ہے۔

[2] یہ محبوبانہ عتاب غضب سے تعلق نہیں رکھتا۔ جیسا کہ وہابیوں دیوبندیوں نے سمجھ رکھا ہے۔ مزید تفصیل تفسیر اویسی میں دیکھیے۔

[3] یہ ان کے قربِ الٰہی کی دلیل ہے کسی عتاب یا غضب کی نہیں جیسا کہ وہابیہ نے سمجھ رکھا ہے۔

نہیں ہوتا بلکہ وہ توہیبتِ الٰہی اور جلالِ حق کی وجہ سے روتے ہیں۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے قصے میں ہے کیونکہ ان کے قلوب عشقی صفات سے معمور اور عرفانِ حق سے لبریز ہوتے ہیں۔ بنا بریں ان کا گریہ اسی عرفان وعشق سے ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت یحیٰی علیہ السلام باوجودیکہ ان کی عفت وپاکدامنی کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی، انھیں نوح علیہ السلام سے بھی زیادہ گریہ وزاری کرتے دیکھا گیا۔ اسی طرح یعقوب علیہ السلام سے کون سی غلطی سرزد ہوئی کہ یوسف علیہ السلام کے فراق میں رو رو کر آنکھوں کی روشنی دے بیٹھے۔ بظاہر ان کا رونا یوسف علیہ السلام کی جدائی میں تھا لیکن درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے قرب اور عرفان وعشق کی خاطر روتے رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ ہے کہ جب کسی بندے سے رونے کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہے تو اسے کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مثلاً بھوک میں یا کسی عزیز کی جدائی وغیرہ میں۔ چنانچہ اہلِ دل اسے خوب جانتے ہیں۔ دراصل اس میں ان حضرات کی ترقی کی منازل طے ہو رہی ہوتی ہیں جسے ہم نے بارہا اہلِ کمال سے مشاہدہ کیا ہے۔

سوال: یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلامِ الٰہی قدیم ہے ازلی ہے۔ ایسی خبریں دے رہا ہے جبکہ نہ نوح علیہ السلام تھے نہ ان کی قوم۔

جواب: ازل میں نہ ماضی تھا نہ حال نہ مستقبل، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی زمانہ منسوب نہیں ہو سکتا۔ یہ نسبتیں مخاطب سے متعلق ہیں۔ اگر کلام کا تعلق ماضی سے ہے تو مخاطب سے وہ نسبت ماضی کے طور پر ہوگی۔ اسی طرح حال اور مستقبل۔

اِنِّیْ یعنی نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں لَکُمْ نَذِیْرٌ تمھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں مُّبِیْنٌ ۝ واضح طور پر۔ یعنی میرا ڈرسنانا ہر حیثیت سے ظاہر اور واضح ہے۔ یعنی میں تمھیں عذاب کے تمام موجبات بتاتا ہوں اور ساتھ ہی اس سے بچنے کے طریقے بھی ظاہر کرتا ہوں اور میرے بیان میں کسی قسم کا شک وشبہ بھی نہیں۔

سوال: نوح علیہ السلام کو صرف نذیر کیوں فرمایا حالانکہ تمام انبیاء علیہم السلام نذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بشیر بھی ہوتے ہیں۔

جواب: خوشخبری صرف اہلِ ایمان کو دی جاتی ہے۔ جس قوم میں نوح علیہ السلام تشریف لائے اس میں کوئی ایک بھی اہلِ ایمان نہیں تھا۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قم فانذر۔ آپ اُٹھیے اور انھیں ڈرائیے۔

یہ حکم بھی اس وقت ہوا تھا جب حضور علیہ السلام پر کوئی ایک فرد بھی ایمان نہ لایا تھا۔

جواب ۲: پہلے دل کی صفائی کی جاتی ہے اور وہ انذار سے متعلق ہے۔ پھر اسے جلا بخشتا ہے اور وہ ابشار سے ہوتا ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو قلبی صفائی کے لیے یونہی فرمایا۔ ان میں جو بھی ایمان لایا پھر اسے ابشار سے نوازا۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ اس آیت میں اَنْ مصدریہ ہے اور باء، ارسلنا کے متعلق ہے اور وہ باء ان سے پہلے محذوف ہے اور لا ناہیہ ہے۔ یعنی ہم نے انھیں ان کی قوم کو شرک سے روکنے کے لیے بھیجا۔

تفسیر صوفیانہ: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ نوح سے روح اور قوم سے قلب، نفس اور بدن مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے روح کو قلب، نفس اور بدن کی طرف بھیجا تاکہ انھیں تبلیغ کریں کہ ان لا تعبدوا الا اللہ دنیا اور آخرت کی پرستش نہ کرو اور نہ ہی دنیا کے شہوات ودرجات میں پھنسو کیونکہ اللہ کی عبادت دُنیا وآخرت کی کسی علت سے معلل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت

دنیا و آخرت کی کسی علت کے پیش نظر کرتا ہے تو سمجھو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا بلکہ انھیں اسباب کی لالچ میں کر رہا ہے۔ اسی لیے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ایمان و طاعت میں رغبت اگر اس لیے ہو کہ اس سے اجر و ثواب یا عذاب سے چھٹکارا نصیب ہو گا تو ایسا ایمان و طاعت غیر نافع ہے بلکہ ایمان و طاعت ایسے ارادہ پر ہو کہ اس میں صرف رضائے الٰہی مطلوب ہو تو نافع ہے۔

اسی لیے شیخ مغربی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

در جنت دیدار تماشائے جمالت
باشد ز قصور ار بودم میل بحورے

ترجمہ: ہمیں تو بہشت میں صرف تیرے جمال کے دیدار کی تمنا ہے۔ اگر حور کا خیال گزرا تو اس سے قصوروار ٹھہریں گے۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝ بے شک میں تمہارے لیے دردناک عذاب کے دن سے ڈرتا ہوں اس سے قیامت کے طوفان کا دن مراد ہے۔

ترکیب: الیم یا تو یوم کی صفت ہے یا عذاب کی۔

سوال: الیم اگر عذاب کی صفت ہے تو مجرور کیوں۔

جواب: یوم کے قرب کی وجہ سے۔

ف: یوم کو الیم سے موصوف کرنے میں مبالغہ مقصود ہے اور یہ اسناد مجازی ہے جیسے نہارہٗ صائم میں اسناد مجازی ہے۔ اگر الیم کا اسناد عذاب کی طرف ہو تو یہ اسناد الی الوصف کے قبیل سے ہے۔ جیسے جد جدہٗ میں اسناد الی الوصف ہے۔ یہ اس لیے کہ درحقیقت عذاب تو اسی شخص کو ہو گا جو کفر کا مرتکب ہو گا نہ اس کا وصف نہ اس کا زمان، لیسے صفت و ظرف کی طرف اسناد میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ شخص عذاب کے اس مرتبہ کو پہنچ گیا ہے کہ گویا اسی کا عین بن گیا ہے۔ اس معنے پر عذاب کو اس کے زمان اور صفت کی طرف اسناد کیا گیا ہے۔ اس تقریر پر الیم بمعنے مؤلم بصیغہ اسم مفعول ہے ایلام سے مشتق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ بصیغہ فاعل ہو اس لیے کہ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کیونکہ درد و آلام کا پیدا کرنے والا وہی ہے دوسروں کی طرف مجازاً ہے۔

ربط: مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کے ہاں عید کے دن تشریف لائے وہ بتوں کی پرستش، شراب پینے اور جانوروں کی طرح ننگے ہو کر عورتوں سے زنا کرنے میں مشغول تھے۔ آپ نے انھیں زور سے پکار کر کہا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔ قوم آپ سے یہ کلمات سن کر گھبرائی اور کہا کہ (معاذ اللہ) یہ مجنون ہیں۔ انہوں نے آپ کو مارا پیٹا اور کہا کہ تم (معاذ اللہ) جھوٹے ہو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ پس آپ کی قوم کے کفار سرداروں نے کہا۔ الملا سے ان کے وہ سردار مراد ہیں جنہوں نے دوسروں کے قلوب پر رعب ڈالا ہوا تھا اور ان کی ہر مجلس کے سرغنے تھے۔ انھیں کفر سے موصوف کرنے سے ان کی مذمت مقصود ہے۔ دوم یہ کہ سب سے پہلے یہی کافر ہوئے۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے بعض بیدار کافر نہیں تھے۔ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ہم تو تمھیں اپنے جیسا ہی بشر دیکھتے ہیں۔ تمھیں ہم پر کون سی فضیلت ہے جس سے ہم سمجھیں کہ صرف تم نبوت سے نوازے گئے ہو

اور اسی فضیلت کی بنا پر ہم ضرور تمہاری اطاعت کرتے۔

ف: یہاں رؤیت سے رویت بصری مراد ہے اور الا بشرا، ما نرٰىك کے مفعول سے حال ہے یا اس سے رؤیت قلبی مراد ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے۔ اس معنے پر الا بشرا، ما نرٰىك کا مفعول ثانی ہے۔

ردّ وہابیہ دیوبندیہ

ان کی رؤیت کا تعلق صرف مثلیت سے ہوا نہ بشریت سے۔ اسی لیے کاشفی نے فرمایا کہ کفار نے انبیاء کی ظاہری بشریت کو دیکھا لیکن ان کی حقیقت سے محروم رہے۔ (یہی کیفیت وہابیوں دیوبندیوں اور بعض دیگر گمراہ فرقوں کی ہے)

مثنوی شریف میں ہے:

ہمسری با انبیاء بر داشتند
اولیاء را ہمچو خود پنداشتند
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر
ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند از عمیٰ
ہست فرقے درمیان منتہا
ہر دو گون زنبور خوردند از محل
لیک شد زاں نیش و ازیں دیگر عسل
ہر دو گون آہو گیا خوردند و آب
ز ایں یکے سرگیں شد و زاں مشکناب
ہر دو نے خوردند از یک آبخور
ایں یکے خالی و آں پر از شکر

ترجمہ: کفار نے انبیاء علیہم السلام سے برابری کا دم مارا اولیاء کو بھی اپنے جیسا سمجھا اور کہا کہ یہ بھی بشر ہیں اور ہم بھی۔ اس لیے کہ دونوں کھاتے پیتے اور سوتے ہیں۔ لیکن ان اندھوں کو یہ نہیں معلوم کہ ان میں اور ہم میں بے انتہا فرق ہے۔ دیکھیے دو بھڑ ہیں، ایک ہی خوراک کھاتے ہیں لیکن ایک میں نیش ہے دوسرا شہد شیریں سے لبریز ہے۔ ان دونوں ہرنوں کو دیکھ لیجئے کہ وہ ایک ہی خوراک کھاتے ہیں لیکن ایک سے گوبر، دوسرے سے خالص مشک حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں نیشکروں کو دیکھ لو کہ ایک ہی کنویں کا پانی پیتے ہیں لیکن ایک خشک لکڑی ہے دوسرا میٹھی شکر سے پُر ہے۔

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اشارہ ہے کہ نفس سفلی ہے اسی لیے اس کی طبیعت بھی سفلی ہے اور اس کی نظر بھی اور روح چونکہ علوی ہے اسی لیے اس کی طبیعت بھی علوی ہے اور نظر بھی۔ اور وہ اپنی علوی طبع کی وجہ سے دوسروں کو بھی علوی عالم کی

دعوت دیتا ہے۔ اسے اپنی علوی نظر کی وجہ سے جانتا ہے کہ اطاعت میں شرافت اور عزت ہے۔ اور نفس سفلی ہے اسی لیے وہ اپنی سفلی نظر کی وجہ سے علویات کو کچھ نہیں سمجھتا بلکہ وہ سفلیات کی طرف میلان رکھتا ہے۔ الٹا وہ ہر شے کو سفلی سمجھتا ہے۔ اسی لیے وہ ہر ایک کو اپنے سفلی عالم کی دعوت دیتا ہے۔ اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ سفلی اپنی سفلی نگاہ سے علوی کو بھی اپنے جیسا سفلی سمجھتا ہے۔ اسی طرح جو نفس کے سفل میں گرفتار ہے وہ صاحب روح علوی کو اپنے جیسا سفلی مانتا ہے (جیسے وہابی دیوبندی) اسی لیے وہ کہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو ہمارے جیسے بشر اور آدمی ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کو نظر نبوت سے نہیں بلکہ نظر کذب سے دیکھتے ہیں۔ اسی لیے انھیں کبھی ساحر کہتے ہیں کبھی مجنون۔ بنزدہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اتباع کو بھی بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں۔

چنانچہ کفار نے کہا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ یہ رؤیت بصری ہے۔ اتبعك، ما نرٰلك کے کاف سے حال ہے اور اتبعك سے قبل قد محذوف ہے۔ اگر رؤیت قلبی ہے تو یہ اس کا مفعول ثانی ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہاری پیروی کسی نے نہیں کی مگر ہمارے ہیں کمینوں نے سرسری نظر سے۔ اراذل سے خسیس ترین اور نہایت کم مرتبہ یعنی خسیس ترین پیشہ والے۔ یعنی کافروں نے کہا کہ تم سچے ہوتے تو تمہاری پیروی کرنے والے اعلیٰ مرتبہ کے اشراف لوگ ہوتے۔

ف: اراذل، ارذل کی جمع ہے اور افعل التفضیل کا صیغہ ہے جیسے اکابر مجرمیها و أحاسن اخلاقاً میں اکابر و احاسن (افعل التفضیل) اکبر و احسن کی جمع ہیں۔

سوال: اگر اراذل کو ارذل افعل التفضیل کا صیغہ مانا جائے تو معنی یہ ہو گا کہ وہ اشراف و اعلیٰ برادری کے لوگ بھی رذالۃ میں ان کے شریک ہوں۔

جواب: یہاں افعل سے مطلق زیادتی مراد ہے جیسا کہ اہلِ لغت جانتے ہیں اور یہ اضافت توضیحی ہے۔

ف: بادی الرای کا منصوب ہونا علی الظرفیۃ ہے اور اس سے قبل مضاف محذوف ہے کہ دراصل وقت حدوث بادی الرای تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غور و فکر کے بغیر سنتے ہی کسی بات کو مان لیں۔ یہ بدوٌ سے مشتق ہے یا بدأ سے بادی۔ ہمزہ کو یاء سے تبدیل کیا گیا ہے بوجہ اس کے ماقبل کے مکسور ہونے کے۔

سوال: کفار نے انھیں رذیل و خسیس کیوں کہا حالانکہ وہ رذیل و خسیس تو نہیں تھے بلکہ وہ بھی ان کی برادری کے لوگ اور نہایت ہی زیرک زمان اور بڑی سمجھ کے مالک تھے البتہ دنیوی لحاظ سے کمزور ضرور تھے۔

جواب: اسی غربت و افلاس کے پیش نظر کفار نے انھیں اراذل کہا کیونکہ ان کی نظروں میں ذی عزت و وقار وہی تھا جس کے پاس دنیا و دولت ہو جیسے ہر زمانے کے اکثر دنیا و دولت کے پرستاروں کی عادت ہے کہ دنیا داروں کو باعزت اور بے زر کو بے عزت سمجھتے ہیں۔

ے

فلک بردم نادان دہد زمام مراد
تو اہل فضل و دانش ہمیں گناہت بس

ترجمہ : فلک کسی بیوقوف کو دولت اور مال دیتا ہے ۔ ہم تم دنیوی مراتب سے محروم ہیں اور اس میں ہمارا تمہارا گناہ یہی ہے کہ ہم تم اہلِ فضل اور دانشمند ہیں۔ نہ اہلِ فضل و دانش ہوتے نہ دنیا سے محروم رہتے ۔ یہ قاعدہ اکثریہ ہے کلیہ نہیں ۔ ورنہ بہت سے بے وقوف بے چارے دنیوی لحاظ سے بھی کمزور ہوتے ہیں ۔

الجوبہ ان بیوقوفوں کا حال بھی عجیب وغریب تھا کہ اپنے جیسے ایک بشر حضرت انسان کے لیے تو نبوت کو اجنبیت قرار دے رہے تھے اور نہ صرف اس کی اتباع سے نفور تھے بلکہ بدقسمتی سے عام پتھروں کو خدا جان کر ان کی پوجا کر رہے تھے ۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اراذل سے روح کے اتباع مراد ہیں جیسے بدن و دیگر اعضاء ظاہرہ۔ اس لیے کہ عموماً روح کی دعوت کو بدن قبول کرتا ہے اور اعضاء اعمال شرعیہ عمل میں لاتے ہیں لیکن نفس امارہ بدستور اپنی سرکشی اور کفر میں گرفتار رہتا ہے اور بدن کی جان نہیں چھوڑتا اور اسے اعمال شرعیہ دینیہ پر عمل کرنے نہیں دیتا۔ اگر کرنے دیتا ہے تو اس میں کوئی غرض فاسد اور دنیوی مصلحت ضرور مدنظر رکھتا ہے اور یہ کثیر لوگوں کی عادت کے مطابق عرض کیا گیا ہے ورنہ بہت سے اللہ والوں کے نفوس قدسیہ نیکی کے بہت بڑے عاشق ہوتے ہیں ۔

وَمَا نَرٰی لَکُمْ اور ہم تمہیں اور تمہارے تابعداروں کو نہیں دیکھتے ۔ یہاں پر غائبین پر مخاطب غالب ہوگیا ہے ۔ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ اپنے اوپر کوئی فضیلت یعنی ملک و مال میں وہ ہمارے اوپر کوئی زیادہ فضیلت نہیں رکھتے ۔ جس سے تم نبوت کے اہل اور صرف تم تابعداری کے مستحق سمجھے جاؤ، اور ان لوگوں کا تمہارا تابعدار ہوجانا بھی تمہاری نبوت کی دلیل نہیں اور نہ ہی ان کی وجہ سے تم اتباع کے مستحق ہو سکتے ہو جس سے تمہاری اتباع ہمارے اوپر لازم ہو ۔

ف : کواشی میں لکھتے ہیں کہ کافروں نے نوح علیہ السلام سے حجت کے طور پر کہا کہ تم ہمارے اوپر فضیلت کیسے پا سکتے ہو جب تم ہماری طرح بشر ہو کر کھاتے پیتے ہو ۔

بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ ۝ بلکہ ہم تمہیں جھوٹا (معاذ اللہ) سمجھتے ہیں اس لیے کہ تم سب کی بات اور دعویٰ ایک ہے ۔ قَالَ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا ، یٰقَوْمِ اے میری برادری کے لوگو اَرَءَیْتُمْ مجھے خبر دو ۔ ہم نے رؤیت کا معنیٰ خبر اس لیے کیا ہے کہ رؤیت خبر کا سبب ہے اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ اگر میں واضح دلیل پر ہوں مِّنْ رَّبِّیْ اپنے رب تعالیٰ سے ۔ اور وہی دلیل میری نبوت کی صحت کی گواہی دے ۔ وَاٰتٰنِیْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِہٖ اور اس نے اپنی طرف سے مجھے خصوصی رحمت بخشی ۔ اس سے نبوت مراد ہے ۔ فَعُمِّیَتْ عَلَیْکُمْ پس وہ بینۃ تم سے مخفی رکھی گئی ہے یعنی تم اس بینۃ سے اندھے کیے گئے اَنُلْزِمُکُمُوْھَا کیا وہ ہم تمہارے گلے سے چسپاں کردیں ۔ یعنی اسے قبول کرنا تمہارے اوپر لازم کردیں یعنی تمہارے ہاں وحی بھیجیں یا کسی اور ذریعہ سے تمہیں خبر دیں کہ اس سے ضرور ہدایت حاصل کرلو ۔ یہ استفہام انکاری ہے ۔ یعنی نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم ذاتی طور پر تمہارے لیے اس کی قدرت نہیں رکھتے ۔ یہ ارأیتم کا جواب اور شرط جواب کے قایم مقام ہے ۔ وَاَنْتُمْ لَھَا کٰرِھُوْنَ ۝ اور تم بیزار ہو ۔ یعنی تمہارا یہ حال ہے کہ تم اسے نہیں چاہتے اور اور نہ ہی تمہیں اس کی آرزو ہے ۔

خلاصہ یہ کہ نوح علیہ السلام نے کفار سے فرمایا: مجھے بتاؤ کہ اگر میرے دعویٰ کی صحت پر حجت اور واضح دلیل ہو بھی تو وہ تم سے پوشیدہ ہے نہ تم اسے اپنے دل میں جگہ دیتے ہو نہ ہم تمہیں اسے قبول کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تم اسے منہ ہی نہیں لگاتے اور اس میں غور و فکر بھی نہیں کرتے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

ف: سعدی المفتی نے فرمایا کہ یہاں پر الزام سے قتل و غارت وغیرہ مراد ہے ورنہ الزام ایجابی تو ہے ہی۔

ف: قتادہ نے فرمایا کہ اگر انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کو ایمان پر مجبور کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے مگر وہ اس طرح مامور من اللہ نہیں تھے۔[1]

ف

یکے را بخوانی کہ مقبول ماست

یکے را برانی کہ مخذول ماست

بد و نیک امر ترا بندہ اند

بتسلیم حکمت سر افگندہ اند

ترجمہ: یا الٰہی، تو کسی کو اپنا مقبول اور کسی کو اپنے در والے سے محروم کر دیتا ہے حالانکہ نیک اور بد دونوں تیرے بندے ہیں، دونوں تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اور اے میری قوم! میں تم سے تبلیغ رسالت پر کوئی سوال نہیں کرتا۔

سوال: تم نے تبلیغ رسالت کا مفہوم کہاں سے نکال لیا۔

جواب: اگرچہ وہ لفظوں میں مذکور نہیں لیکن انی لکم نذیر مبین الخ سے ایسے ہی ثابت ہوتا ہے۔

مَالًا یعنی میرا تم سے مال کا مطالبہ نہیں کہ میرے اُوپر ایمان لانے اور میری اتباع کے بعد ہی وہی مال تمہیں ادا کرنا لازم ہو اگر ایسی صورت ہو تو یہ سودا بازی ہوگی کہ میں نے تمہیں امورِ دین بتانے کے عوض اجرت لیا اور یہ حرام ہے۔ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ میرا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ یعنی اس سے وہ ثواب مراد ہے جو اللہ تعالیٰ مجھے آخرت میں عطا فرمائے گا۔ یعنی میں نے تبلیغ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کی ہے مجھے اس میں کوئی دنیوی غرض نہیں۔ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور میں اہلِ ایمان کو تو اپنے سے نہیں ہٹا سکتا۔ نوح علیہ السلام نے اس کی اس لیے ضرورت محسوس کی کہ کفار نے آپ سے مطالبہ کیا کہ ہم آپ پر اس شرط پر ایمان لائیں گے کہ آپ ان خسیس لوگوں کو ہٹا دیں تاکہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھیں تو ہمارے ساتھ یہ لوگ نہ ہوں۔ جیسے قریش نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ آپ اپنی محفل سے غرباء و مساکین کو ہٹا دیں تاکہ ہم آپ سے چند باتیں کریں کیونکہ ان کی موجودگی میں ہمیں عار محسوس ہوتی ہے کہ ہم اور وہ کمزور لوگ ایک ہی جگہ اکٹھے بیٹھیں۔

---

[1] یہی ہم اہلسنت کہتے ہیں لیکن دیوبندی وہابی نہیں مانتے۔ ۷

حضرت حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ؎

آنچہ زر میشود از پرتو آن قلب سیاہ
کیمیاتیست کہ در صحبت درویشانست

ترجمہ : قلب سیاہ کو کندن بنانا ہے تو درویشوں کی صحبت اختیار کرو کیونکہ درویشوں کی نگاہ کیمیاگر ہوتی ہے۔

نکتہ : حضور علیہ السلام نے خود فقر اختیار فرمایا تاکہ فقرا حضور علیہ السلام کے فقر کو یاد کرکے تسلی کریں جیسے دولت مندوں کو دنیا و دولت سے اطمینان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ کے عاشق صادق کو یقین ہو کہ دنیا و دولت ایک ذلیل شے ہے ورنہ اگر اچھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور عنایت فرماتا۔[1]

اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ بے شک وہ قیامت میں اپنے رب تعالیٰ سے ملیں گے تو اللہ تعالیٰ ان فقرا پر ظلم کرنے والوں سے قصاص (بدلہ) لے گا۔ (کذا فی الکواشی) یا میں انھیں اس لیے اپنے سے نہیں ہٹاتا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ملاقات اور اچھی جزاء کا وعدہ لے چکے ہیں۔ اس معنے پر وہ تو خدا تعالیٰ کے مقرب اور برگزیدہ ہیں۔ تو پھر میں ایسے برگزیدہ لوگوں کو اپنے سے کیسے دُور کروں اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس قدر عظمت و توقیر بخشی ہے تو پھر میں کیوں انھیں ذلیل و خوار کروں۔ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ بلکہ میں تمھیں ہی جاہل سمجھتا ہوں کیونکہ جو کچھ مَیں کہتا یا جن امور سے روکتا ہوں تم اس کے برعکس کرتے ہو۔ (کذا قال ابو اللیث)

ف : الارشاد میں ہے تم ان امور سے بے خبر ہو جنھیں جاننا لازم ہے منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ تم تا حال بے خبر ہو کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضر ہونا ہے۔ اور یہ بھی تمہارا جہل ہے کہ تاحال تم بے خبر ہو کہ ان غرباء و مساکین (حضرت نوح علیہ السلام کے صحبت یافتہ حضرات) کا اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم مرتبہ ہے۔ اور اس سے بھی جاہل ہو کہ ان کا ہٹانا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اور اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے انتقام سے مجھے کون بچائے گا۔ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ط اگر مَیں انھیں ہٹا دوں بشرطیکہ وہ اسی صفت سے موصوف ہوں کیونکہ اجر و ثواب انہی اوصاف کی وجہ سے تھا اور انھیں وہ قُرب بھی نیک خصائل کی بدولت حاصل تھا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔ یعنی اے بیوقوفو! کیا تم اسی جہل پر مداومت کرکے نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

ف : کفار کے یہ حالات اس لیے ذکر کیے گئے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ جس معاشرے میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں یہ سراسر غلط اور مبنی برخطا ہے۔

اولیاءِ کرام سے محبت و عشق

حدیث شریف میں ہے :

---

[1] لیکن وہابی اس سے حضور علیہ السلام کو بے اختیار ثابت کرتے ہیں۔ ۱۲

حب الفقراء والمساکین من اخلاق الانبیاء و المرسلین وبغض مجالستھم من اخلاق المنافقین[1]
فقراء و مساکین کی محبت انبیاء و مرسلین کی عادات کریمہ سے ہے اور ان کی محفلوں سے بغض رکھنا منافقین کا کام ہے[2]

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ نوح سے مراد روح ہے جیسے کہ صوفیہ کی اصطلاح اوپر مذکور ہوئی۔ یعنی روح نے نفس سے کہا کہ تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب و قہر سے کون بچائے گا اگر بدن طاعت الٰہی سے باز آجائے۔

ازالۂ وہم فلسفیوں کا یہ خیال غلط ہے کہ صرف روح کی اصلاح کر لو بدن اور اعضاء و دیگر ظاہری اعمال صالح کی اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ان کا عناد ہے کہ عبودیت و طاعت کو صرف معرفتِ حق پر منحصر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جمعیت باطن کافی ہے اخلاق حمیدہ سے متصف ہونا ضروری نہیں اور نہ اعمال بدنیہ صالح کی حاجت۔ بلکہ یہ ان کا صریح جھوٹ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کی تکذیب ہے۔ اس سے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ہمارے مشائخ صوفیہ اہلسنت نے کیا خوب فرمایا کہ ظاہر کو اعمال صالحہ سے آراستہ کر دو۔ یہی باطن کی آراستگی کی علامت ہے۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا ایمان مضبوط نہیں ہو سکتا جب تک دل صحیح نہ ہو۔ اور دل صحیح نہیں ہو سکتا جب تک زبان درست نہ ہو۔ اور زبان کی درستگی کا دارومدار اعمال صالحہ پر ہے۔ یعنی اعمال صالحہ بمطابق شریعت مصطفویہ باطن (قلب) پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے اپنا خصوصی نور شریعت[3] میں اور غضب کی تاریکی طبعی خواہشات میں امانت رکھی ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اسی لیے تشریف لائے تاکہ خلقِ خدا کو نفس کی طبعی تاریکی سے نکال کر نور شریعت سے منور فرمائیں۔

تفسیر عالمانہ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اور دعوئ نبوت کے ساتھ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے رزق و اموال کے خزانے ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے تم مجھے جھوٹا کہہ سکو۔ اور کہتے پھرو کہ ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی فضیلت نہیں پاتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انکارِ نبوت کی وجہ سے میں تمہیں جھوٹا سمجھتا ہوں اس لیے نبوت کو ضرورت نہیں کہ اس کے دنیوی اسباب ہوں اور نبوت مال و منال اور جاہ و جلال کے دعوے سے کوسوں دور ہے۔

ف: مفتی سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اے کافرو! میں نبوت کی اتباع کو مال و منال اور جاہ و مراتب پہ موقوف نہیں کر رہا کہ جن کے نہ ہونے سے تم میری نبوت کا انکار کرو بلکہ میں اپنی اتباع کی دعوت اس لیے دیتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کا

---

[1] روح البیان، ج ۴، ص ۱۱۹

[2] ناظرین بتائیں اولیاء و انبیاء سے محبت کس جماعت کو اور بغض کس کو ہے۔

[3] اس سے وہ نئی روشنی کے دلدادگان اور بعض غلط کار پیر متوجہ ہوں کہ جنہیں شریعت مصطفویہ صرف امور انتظامیہ نظر آتی ہے یا بالکل بیکار۔ (معاذ اللہ)

رسول ہوں اور اس پر میں تمہارے ہاں مضبوط اور قوی دلیل لایا ہوں۔ وَلَآ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ اور میں اپنے قول انی لکم نذیر مبین[1] سے دعویٰ نہیں کرتا کہ میں غیب جانتا ہوں کہ جس سے تم انکار کرو اور اسے ایک مشکل اور محال سمجھو۔

ف: حضرت سعدی مفتی نے فرمایا کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے نبوت کا اعلان فرمایا تو کافروں نے آپ سے چند غیبی امور کے متعلق سوالات کیے اور کہا: اے نوح علیہ السلام! اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو فلاں فلاں غیب کی بات بتاؤ۔ آپ نے فرمایا: میں تو نبوت کا مدعی ہوں اور اس دعویٰ پر اللہ تعالیٰ سے قوی دلیل بھی لایا ہوں اور میں نے علم غیب کا دعویٰ نہیں کیا اگرچہ کچھ غیب جانتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے ہوتا ہے نہ کہ ذاتی علم سے۔

سوال: کفار کے سوالات کا مضمون تم نے اپنی طرف سے کیوں گھڑا حالانکہ وہ سوالات مذکور نہیں ہیں۔

جواب: کلام کے تقاضا سے سوالات کا مضمون خود بخود ثابت ہوا ہے اور یہ اصول کا عام قاعدہ ہے۔ جیسے کفار کے نوح علیہ السلام سے مطالبے کا مفہوم ان طودتہم سے خود بخود ثابت ہو گیا تھا حالانکہ وہاں بھی کفار کا مطالبہ مذکور نہیں۔

وَلَآ اَقُوۡلُ اور میں تمہیں نہیں کہتا کہ اِنِّیۡ مَلَکٌ میں فرشتہ ہوں کہ جس سے تم کہتے ہو کہ ما نرٰك الا بشرا مثلنا اس لیے کہ بشریت نبوت کے منافی نہیں بلکہ بشریت نبوت کے مبادی و اصول سے ہے۔ یعنی ان تینوں امور کے فقدان کو تم نے میری تکذیب کا ذریعہ بنا رکھا ہے حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں ان تمام امور کا مدعی نہیں بلکہ ان کے کسی امر متعلق سے بھی میرا دعویٰ نہیں بلکہ میرے دعوے کا تعلق فضائل نفسانیہ سے ہے اور اسی سے بشریت کا فرق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے فضائل ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں۔ ہماری بشریت کو ان کی بشریت سوائے لفظی مماثلت کے اور کسی قسم کی مماثلت کا عقیدہ رکھنا گمراہی اور بے دینی ہے[2]۔ وَلَآ اَقُوۡلُ اور نہیں تمہاری موافقت میں کہتا ہوں لِلَّذِیۡنَ تَزۡدَرِیۡۤ اَعۡیُنُکُمۡ ان لوگوں کے لیے جو تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں۔ تزدری ازدراء سے مشتق ہے بمعنے عابه، یعنی اسے معیوب اور حقیر و ذلیل سمجھا۔ یعنی ان لوگوں کے لیے جو اہل ایمان ہیں جو دنیا و دولت کی کمی سے تمہاری نگاہوں میں حقیر و ذلیل ہیں ان کے حق میں کچھ نہیں کہتا۔

ف: یہ لام اگر تبلیغ کی ہوتی تو آگے لن یؤتیہم کی بجائے لن یؤتیکم فرمایا ہوتا۔

ف: ازدراء کو اعین کی طرف اسناد کرنے میں مبالغہ مطلوب ہے اور تنبیہ فرمائی ہے کہ کافروں نے نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کو سرسری نظر سے دیکھا۔ اگر وہ حقیقت بین نگاہ سے غور و فکر کرتے تو انہیں ان کی حقیقت معلوم ہوتی۔ لیکن انہوں نے تو بندگانِ خدا کی ظاہری فقیری و تنگ دستی اور ظاہری لباس کو دیکھا اس لیے ان کے باطنی کمالات سے محروم رہے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

---

[1] یعنی نبوت بشریت کا خاصہ ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انبیاء کی بشریت بھی ہمارے جیسی ہے۔ یہی غلطی کفار کو لگی اور اس غلطی کا شکار آجکل کے وہابی دیوبندی ہیں۔ ۱۲

[2] جس میں آجکل وہابی دیوبندی مبتلا ہیں۔ ۱۲

معانیست در زیر حرف سیاہ
چو در پردہ معشوق و در میغ ماہ

پسندیدہ و نفر بایدخصال
کہ گاہ آید و گہ رود جاہ و مال

ترجمہ: ان سیاہ حروف میں معانی مخفی ہیں جیسے پردہ میں محبوب اور بادل میں چاند چھپا ہوتا ہے۔ در اصل انسان کو اچھی خصلتیں اور نیک عادتیں لازمی ہیں ورنہ جاہ و مال تو آنی جانی شے ہیں۔

نکتہ از صاحب روح البیان در اصل ازدراء کو اعین کی طرف اس لیے اسناد کیا گیا ہے کہ ازدراء کا ظہور ہوتا ہی آنکھوں سے ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

فلان نظر الی فلان بعین التحقیر دون عن التعظیم۔

(فلاں نے فلاں کو تعظیم کی بجائے بنظرِ حقارت دیکھا)

اور یہ محاورہ قلبی نگاہ کے منافی نہیں۔

لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ط انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز خیر نہیں نوازے گا۔ اس سے دنیا یا آخرت یا دونوں کی بھلائی مراد ہے۔ جیسے نوح علیہ السلام نے فرمایا ویسے ہی ہوا[1]، کیونکہ انبیاء علیہم السلام جو کچھ بولتے ہیں وہ وحی والہام ہوتا ہے نیز اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین اور جملہ دیار کا وارث (مالک) بنایا ہے[2] اور بہت بڑے اعزاز واکرام سے بھی نوازا ہے۔[3] اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ج جسے اللہ جل شانہٗ ان کے دلوں کے راز خوب جانتا ہے اسے ان کی توحید و ایمان و معرفت اور ان میں ان کے رسوخ کا خوب علم ہے۔ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ ان کے حق میں ظلم کرنے والوں سے ہوں جبکہ انہیں ان کے مرتبے سے گھٹاؤں اور ان کے حقوق میں کسی حق کی کمی کروں یا ان کے نفوس پر ظلم کرنے والوں سے ہوں۔ اس لیے اس کا وبال انہیں پر لوٹے گا۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کو (اسی طرح اللہ والوں کو) حقارت کی نگاہ سے دیکھنا ظلم ہے۔

حدیث شریف مع شرح حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ یہاں پر اسلامی اخوت مراد ہے۔ مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر ظلم نہیں کرتا یعنی نہ اس کا کوئی حق کم کرتا ہے اور نہ روکتا ہے اور نہ ہی اسے رسوا کرتا ہے اور نہ ہی اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور نہ ہی اس پر اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے۔

ف: احتقار بمعنے کسی کو ذلیل وخوار کرنا۔ آخر میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التقوٰی ھٰھنا۔ تقویٰ یہاں

---

[1] تیرے منہ سے جو بات نکلی وہ ہو کے رہی۔ [2] وہابیہ دیوبندیہ کا رد ہو گیا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کو محتاج اور مجبور محض سمجھتے ہیں۔ [3] اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان کا رد ہے کہ اس نے لکھا کہ انبیاء علیہم السلام خدا کے آگے چوڑھے چمار سے بھی کمتر ہیں۔

پر ہے۔ حضور علیہ السلام نے یہ اشارہ سینہ کی طرف فرمایا۔

ف: تقویٰ کا لغوی معنی ہے اجتناب۔ یہاں پر گناہوں سے بچنا مراد ہے۔ اور متقی چونکہ تقویٰ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچ کر گناہوں سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ اسی لیے اسے متقی سے تعبیر کرتے ہیں۔

نکتہ: حضور علیہ السلام نے تقویٰ کے لیے سینہ کی طرف اسی لیے اشارہ فرمایا کہ تقویٰ صرف ظاہری اعمال کا نام نہیں۔ جب تک دل میں اللہ تعالیٰ کے جلال کی ہیبت نہ ہو اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عزت و عظمت پیش نظر نہ رہے انسان متقی نہیں کہلا سکتا۔ اور قاعدہ ہے جسے قلب کا تقویٰ نصیب ہوتا ہے وہ کسی کو بنظرِ حقارت نہیں دیکھتا۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف انسان کی شرارت کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو حقیر سمجھے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف مسلمان پر مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں:

○ خون

○ عزت

○ مال

ف: عرض سے انسان کی مدح و ذم کا مقام مراد ہے۔ (کذا فی فتح القریب)

ف: عرضِ انسان کی وہ حیثیت جسے وہ اپنی عزت سمجھ کر محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا کافروں نے کہا اے نوح (علیہ السلام)! تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا اور خواہ مخواہ اسے طول دیا۔

ف: دو بالمقابل انسانوں کا ایک دوسرے کے کلام کو ساقط کرنے کا نام مجادلۃ ہے۔ جدل سے ہے بمعنی شدۃ الفتل یعنی شے کو خوب بٹنا۔

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ جس سے ہمیں تم ڈراتے ہو وہ لاؤ۔ یعنی عذاب لانے میں جلدی کرو اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ اگر تم اپنے دعویٰ اور وعید میں سچے ہو۔ کیونکہ تمہارے مناظرے سے اب اس مطالبہ پر مجبور ہو گئے ہیں۔ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ نوح علیہ السلام نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہارے پاس لائے گا وہ جو تم چاہتے ہو۔ وہ چاہے تو فوراً تمہیں عذاب میں مبتلا کر دے، چاہے تو دیر سے۔ یہ کام میرے سپرد نہیں اور نہ ہی یہ میری قدرت کے تحت ہے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ عذاب بھیجنا اللہ تعالیٰ کی مرضی پر ہے ضروری نہیں کہ بداعمالیوں سے ہی عذاب بھیجے۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ○ اور تم اللہ تعالیٰ کو عذاب دینے سے عاجز نہیں کر سکتے کہ اس سے کہیں بھاگ جاؤ یا اس کے

عذاب کو دفع کرسکو۔ جیسے تم زبانی طور پر کہتے ہو کہ ہم یوں کر دیں گے، ایسے کریں گے، ویسے کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

مسئلہ: امام صاحب نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو عذاب دینا چاہے تو کسی کو طاقت نہیں کہ اس کے عذاب کو روک سکے۔

ف: معجز ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کو عذاب دینا چاہے لیکن کسی کے روکنے سے وہ عذاب نہ دے سکے۔ مثلاً اعجزہ ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے جو مذکورہ بالا طریقے سے کسی پر اپنا کام پورا نہ کرسکے۔

وما انتم بمعجزین یعنی تم اپنی من مانی نہیں کرسکتے جبکہ اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرے یا کسی پر عذاب نازل کرنا چاہے تو تم اسے عاجز نہیں کہہ سکتے۔

وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِيٓ اور تمہیں میری نصیحت کوئی فائدہ نہ دے گی۔

ف: نصیحۃ ہر اس کلمے کو کہتے ہیں جس کے گرد خیر گھومے۔ وہ قول ہو یا فعل اور حقیقت۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس میں بھلائی کا ارادہ ہو یا خیر پر دلالت ہو۔ اس کی نقیض الغش آتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ غش غلط جگہ کا پتا دینے کو کہتے ہیں تاکہ اسے معلوم کر کے غلطی سے بچاؤ ہو سکے۔ اور نصیحۃ بھلائی کی جگہ کی خبر دینا تاکہ اسے پایا جا سکے۔

إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ یہاں جزا محذوف ہے اس پر عبارت ماسبق دلالت کرتی ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی: ان اردت ان انصح لکم لا ینفعکم نصحی۔ یعنی اگر میں تمہاری نصیحت کا ارادہ کروں تو میری نصیحت تمہیں کوئی نفع نہ دے گی۔ پھر یہی عبارت آنے والے کی شرط کے جواب پر دلالت کرے گی إِن كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ ط اگر تمہارے متعلق گمراہ کرنے کا ارادہ ہو تو اسے انبیاء علیہم السلام کی نہ نصیحت نفع دے گی اور نہ ان کی دعوت۔ کیونکہ جملہ امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

مکن بچشم حقارت بر من ست
کہ نیست معصیت و زہد بے مشیت او

ترجمہ: اے زاہد! مجھ مست کو چشم حقارت سے نہ دیکھ کیونکہ معصیت و زہد اس کی مشیت کے بغیر نہیں ہے۔

ازالۂ وہم نوح علیہ السلام نے خود ان کافروں کو جاہل کہا۔ پھر جاہل کو وعظ و نصیحت کب فائدہ دیتی ہے[1]

مثنوی شریف میں ہے: ؎

پند گفتن با جہول خوابناک
تخم افگندن بود در شورہ خاک

---

[1] ان کا ہدایت نہ پانا بھی انبیاء علیہم السلام کی گستاخی کی وجہ سے تھا۔

چاک حمق و جہل نپذیرد رفو
تخم حکمت کم دہش اے پند گو

ترجمہ: غافل جاہل کو نصیحت کرنا ایسے ہے جیسے شور زمین میں بیج ڈالا جائے۔ حماقت و جہالت کے چاک کبھی نہیں سیے جاتے اسے حکمت کے بیج نہ دو اے ناصح۔

هُوَ رَبُّكُمْ وقف وہی تمہارا رب اور خالق اور اپنی مشیت کے مطابق تمہارا متصرف ہے وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ پھر تمہارے اعمال کی تمہیں بالضرور سزا ملے گی أَمْ يَقُولُونَ کیا نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے افْتَرٰىهُ کہ نوح علیہ السلام نے افتراء سے کام لیا ہے اور وحی اپنی طرف سے گھڑی ہے۔ افترٰىہ کی ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف اور ہٗ کی ضمیر وحی کی طرف راجع ہے۔ قُلْ اے نوح علیہ السلام! فرمائیے إِنِ افْتَرَيْتُهُ اگر بفرضِ محال اگر میں نے اس سے افترا کیا ہے۔

سوال: حرف شرط (ان) سے معلوم ہوتا ہے کہ خود نوح علیہ السلام کو بھی اپنی وحی پر شک تھا۔

جواب: ضروری نہیں کہ ایسے کلام میں شک ہو۔ بلکہ یہ کلام اس وقت بولتے ہیں جب مخاطب سے بالکل مایوسی اور ناامیدی ہو تو بطور انکار یونہی کہا جاتا ہے۔

فَعَلَيَّ إِجْرَامِي تو اس جرم کا وبال میرے سر ہوگا۔ اجرام بمعنے گناہ کا ارتکاب۔ یہاں مضاف محذوف ہے۔ گویا نوح علیہ السلام نے فرمایا میں سچا ہوں اور اگر تم میری تکذیب کرتے ہو تو یاد رکھو اس انکار سے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ اور مضاف محذوف اس لیے ہے کہ اس پر وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تُجْرِمُونَ دلالت کرتا ہے یعنی میں تمہارے جرائم کے ارتکاب سے بیزار ہوں اور تم مجھے مجرم ٹھہرا کر یا میرے ساتھ عداوت کرکے میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

تفسیر صوفیانہ آیت سے معلوم ہوا کہ نفس کے گناہوں سے رُوح کی حقیقت نہیں بگڑتی اور نہ ہی ان سے روح کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ روح نفس کے جرائم سے بیزار ہو۔ البتہ نفس کے ذنوب سے دیگر اعضا کو نقصان ضرور پہنچتا ہے۔ جہل روح کو اور میل الی ما سوی اللہ قلب کو اور خواہشات نفسانیہ نفس کو اور شہوت طبیعت کو مکدر کرتے ہیں۔

سبق عاقل پر لازم ہے کہ وہ ان اشیاء کو صاف اور روشن رکھے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ان کا زنگ اتارے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر وقت بارگاہِ حق کی طرف متوجہ رہے اور ہدایت شرعیہ کے مطابق اعمال صالحہ میں جدوجہد کرے اور مشتبہات کو یک لخت ترک کر دے۔

تحقیق انسان اور صاحبِ روح البیان کے پیرومرشد میرے شیخ کامل نے فرمایا کہ انسان کی کئی اقسام ہیں:

۱۔ حیوانی، یہ وہ ہیں جن پر اوصافِ طبیعت اور احوالِ شہوت کا غلبہ ہے۔

۲۔ شیطانی۔ یہ وہ ہیں کہ جن پر اوصاف نفس و احوال شیطنت غالب ہوں۔

۳۔ ملکی : یہ وہ ہیں جن میں اوصاف روح و احوال ملکیۃ کا غلبہ ہو۔

۴۔ صاحب الجانبین : یہ وہ ہیں جن میں طبیعت ، نفس ، ملکیۃ ، رُوح کے اوصاف مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔

۵۔ رحمانی : یہ وہ ہیں جن پر وصف سر و حال کا غلبہ ہو۔

ان میں تین اول الذکر حضرات اگر دنیا سے ایمان بسلامت لے گئے تو وہ بہشت میں ضرور داخل ہوں گے اللہ تعالیٰ کے فضل سے یا عدل سے۔ انہیں اصحاب الیمین و ارباب الجمال کہا جاتا ہے۔ اور جو لوگ دنیا سے ایمان سے محروم ہو کر گئے وہ دوزخ میں جائیں گے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا عدل ہے۔ انہیں اصحاب الشمال اور ارباب الجلال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور چوتھے وہ ہیں جو دنیا سے ایمان لے کر رخصت ہوئے تو یہ اصحاب اعراف ہیں۔ پانچویں ارباب کمال اور السابقون الاولون کے نام سے موسوم ہیں۔ ہمیں ان کے مراتب و کمالات و درجات کا کوئی علم نہیں۔ ان حضرات کو جو نعمتیں نصیب ہوں گی وہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔

حیوانی انسان ، جو مرنے کے بعد شیاطین کے ساتھ اُٹھیں گے۔ اور ملکی صفات رکھنے والے انسان ملائکہ کے ساتھ اور اصحاب الجانبین دو اطراف کے درمیان اٹھائے جائیں گے اور رحمانی حضرات کا قرب رحمان کے ساتھ ہوگا۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : تمہیں موت اسی حالت میں آئے گی جن اعمال پر تم زندگی بسر کرتے ہو اور قیامت میں اسی کیفیت پر اُٹھو گے جس پہ موت واقع ہوگی۔

ف : حضرت یحییٰ بن معاذ رازی نے فرمایا کہ انسان تین طرح کے ہیں :

۱۔ آخرت کی فکر میں معاش سے بے فکر رہنے والے۔

۲۔ معاشی امور میں پھنس کر آخرت سے بے فکر ہو کر زندگی بسر کرنے والے۔

۳۔ نہ معاش کی فکر نہ معاد کی۔

پہلا درجہ فائزین کا ، دوسرا ہالکین کا اور تیسرا مخاطرین کا۔ یعنی بلند و بالا مراتب والے۔

حدیث شریف اللہ تعالیٰ کے بعض ایسے مخصوص بندے ہیں جنہیں ارفع و اعلیٰ مقام میں ٹھہرایا جائے گا۔ یہی لوگ تمام انسانوں سے زیادہ عاقل ہیں۔ عرض کی گئی : یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ لوگ کیسے عاقل ترین ہیں ؟ آپ نے فرمایا : ان کا مطمع نظر اللہ تعالیٰ کی طرف سبقت کرنا ہے۔ اور جن امور سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اس میں محبت کی اور دنیا میں یکسوہ گوش ہو کر گزر رہے۔ یعنی بے سرو سامانی سے زندگی بسر کی۔ نہ انہیں دنیوی جاہ و جلال سے تعلق نہ اس کے عیش و آرام سے واسطہ ، بلکہ دنیوی نعمتیں ان کی نگاہوں میں حقیر تھیں۔ اسی لیے تھوڑی دیر صبر کر لیا۔ لیکن آخرت کی زندگی دائمی طور پر آرام و سکون سے بسر کریں گے۔ ؎

تا کے غم دنیائے دنی اے دل دانا
حیفست ز خوبے کہ شود عاشق زشتے

(باقی بر صفحہ ۷۲)

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝
وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ وَيَصْنَعُ
الْفُلْكَ قف وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ
مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝
حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ
عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا
اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰي نُوْحُۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ
يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَاۗءِ ۭ قَالَ
لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ وَ
قِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَاۗءَكِ وَيٰسَمَاۗءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَاۗءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَي الْجُوْدِيِّ وَ
قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَادٰي نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ
الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ڶ فَلَا
تَسْــَٔـلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ
اَسْــَٔـلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ
بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓي اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا
فَاصْبِرْ ړ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ: اور نوح علیہ السلام کو وحی کی گئی کہ آپ کی قوم سے کوئی ایمان نہیں لائے گا مگر وہی جو ایمان لا چکا،
سو آپ غم نہ کھائیے اس پر جو وہ کرتے ہیں اور ہمارے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائیے اور ظالموں کے بارے
میں مجھے کچھ نہ کہنا وہ ضرور غرق ہوں گے اور نوح علیہ السلام کشتی بناتے تھے اور جب اس کی قوم کے سردار اس پر گزرتے تو
اس پر ہنستے تھے فرمایا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی ایک وقت تم پر ہنسیں گے جیسے آج تم ہم پر ہنس رہے ہو سو تم جان لو گے
کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب اترتا ہے یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور
تنور نے جوش مارا تو ہم نے کہا کشتی میں سوار کر لے ہر جنس کا نر و مادہ کا ایک جوڑا اور اپنے اہل کو مگر جن پر حکم سبقت کر چکا
اور ان کو بھی (سوار کر لے) جو ایمان لائے اور اس کے ساتھ ایمان نہیں لائے مگر تھوڑے اور فرمایا اس میں سوار ہو جاؤ

اللہ تعالیٰ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر ڈالنا بیشک میرا رب تعالیٰ غفور رحیم ہے اور وہ کشتی انھیں پہاڑوں جیسی لہروں میں لیجا رہی تھی اور نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ اس سے کنارہ کش تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ کہا کہ اب میں کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں جو مجھے پانی سے بچالے گا۔ فرمایا آج اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہ رحم کرے اور ان کے درمیان میں ایک موج حائل ہوئی اور وہ غرق ہونے والوں سے ہو گیا۔ اور کہا گیا کہ اے پانی نگل لے اور اے آسمان (بادل) تھم جا اور بیشک پانی خشک ہو گیا اور فیصلہ مکمل ہو گیا اور کشتی کوہ جُودی پر ٹھہری اور فرمایا گیا دوری ہو ظالم قوم کے لیے۔ اور نوح علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کو پکارا اور عرض کی کہ اے میرے رب! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو احکم الحاکمین ہے۔ فرمایا: اے نوح (علیہ السلام) وہ تیرے اہل سے نہیں کیونکہ اس کے عمل بُرے ہیں سو مجھ سے اس کا سوال مت کر جس کا تجھے علم نہیں میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو ناواقفوں سے نہ ہو۔ عرض کی اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں خسارہ والوں سے ہو جاؤں گا۔ کہا گیا اے نوح علیہ السلام! ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ کشتی سے اتر یے جو تجھ پر اور تیرے ساتھ کے چند گروہوں پر۔ اور کچھ ایسے گروہ بھی ہوں گے جنہیں ہم دنیا کا سامان دیں گے پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ یہ غیب کی خبروں سے ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اس سے قبل انھیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ سو صبر کیجئے بیشک متقیوں کا انجام بہتر ہے۔

(بقیہ صفحہ ۷۰)

ترجمہ: اے دل دانا! کب تک خسیس دنیا کا غم کھائے گا۔ اس حسین وجمیل پر بہت افسوس ہے کہ وہ قبیح صورت والے پر عاشق ہو۔ یعنی انسان باوجود ایک حسین ترین مخلوق ہونے کے قبیح شکل دنیا کا عاشق ہو گیا۔

تفسیر عالمانہ

وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اور نوح علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی گئی کہ آپ کی قوم کے وہ لوگ کفر پر مُصر ہیں وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔

ف: اس سے نوح علیہ السلام کو کافروں کے ایمان سے ناامیدی دکھائی گئی ہے۔ آپ کو بتایا گیا ہے کہ ان کا ایمان نہ لانا کالمحال ہے لہٰذا ان سے ہرگز ایمان کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ مگر وہ گروہ جو ایمان لا چکے۔ یعنی جن سے ایمان کی توقع تھی ان سے ایمان کا صدور ہو چکا۔

ف: قد توقع کے لیے آتا ہے۔

ف: مولانا ابوالسعود رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ استثناء الا ما قد سلف کی طرح ہے اور اس کی تفصیل سورۃ النساء کے اواخر میں

گزری ہے۔

سوال : سعدی مفتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کوئی سوال کرے کہ من قد آمن سے ایمان کا حدوث ثابت ہوتا ہے حالانکہ ایمان تو استمرار کا مقتضی ہے پھر اس سے استثناء متصل کا کیا معنیٰ ؟

جواب : علم اصول کا قاعدہ ہے کہ امور مستمرہ کا دوام ابتدا کے حکم میں ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص قسم کھائے کہ میں کپڑے نہیں پہنوں گا حالانکہ وہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ اس پر لازم ہے کہ کپڑے (فوراً) اتار دے۔ اگر نہیں اتارے گا تو حانث ہوگا۔ اور قسموں کی بحث کا دارومدار عرف پر ہے۔

ف : قطب علامہ نے فرمایا کہ الا من قد آمن میں آمن بمعنے استعد للایمان وتوقع منہ کے ہے۔ یعنی مگر وہ لوگ جو ایمان کے لیے مستعد اور ان سے ایمان کی توقع ہے۔ یہاں پر ایمان بالفعل مراد نہیں ورنہ الا من قد آمن کا اصل یوں ماننا پڑے گا فانہ یؤمن یعنی وہ ایمان لاتا ہے۔

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ فلا تبتئس از باب افتعال بؤس سے مشتق ہے بمعنے الحزن فی استکانۃ یعنی خضوع۔ یعنی مسکین عاجز کی طرح غم نہ کھایئے۔ ان کی ان کارروائیوں سے جو وہ آپ کے ساتھ کرتے ہیں یعنی کبھی تکذیب اور کبھی اذیت۔ اور جو صرف دو چار یوم ہی نہیں بلکہ عرصہ دراز تک آپ کی مخالفت کرتے رہے اب ان کی کارروائیوں کے اختتام کا وقت قریب آگیا ہے۔ لہٰذا اب ہم ان سے انتقامی کارروائی شروع کرنے والے ہیں۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم سے مناظرہ کیا تو آپ کی قوم نے آپ کو اتنا مارا کہ آپ بیہوش ہو گئے جب آپ ذرا ہوش میں آئے تو کہا : یاالٰہی ! میری قوم کو ہدایت فرما۔ لیکن جب آیت مذکورہ اتری تو آپ نے ان پر بددعا فرمائی دب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

ناحمولی انبیاء را از امر دان
ورنہ حمالست بدر احمل شان
طبع را کشتند اندر حمل بود
ناحمولی گر کند از حق بود

ترجمہ : انبیاء علیہم السلام کی بے صبری امر الٰہی سے ہوتی ہے ورنہ وہ بہت سخت امور کی قوت برداشت رکھتے ہیں سب سے بڑا بوجھ نفسانیت کے تقاضے ہیں لیکن وہ اسے اٹھا لیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کسی وقت کسی معاملہ میں ان کی عدم برداشت امر ربانی سے ہوتی ہے۔

شیخ اکبر قدس سرّہٗ کی تقریر دربارہ وحدۃ الوجود حضرت شیخ اکبر قدس سرہ الاطہر فرماتے ہیں کہ لوگوں کے ایذاء پر صبر اور حوصلہ کا ابتدائی مرحلہ سالک کے لیے یہ ہے کہ ان کے ایذاء کو ایذاء نہ سمجھے کیونکہ موحد کے نزدیک محسن و مُسی (دکھ دینے والا) برابر ہے۔ اور اس کا انتہائی مقام یہ ہے کہ وہ ایذاء کو احسان سمجھے کیونکہ اسے حقائق کا علم ہے اور تجلیِ حق سے نوازا گیا ہے اس کے لیے کوئی شے بُری نہیں لیکن یہ تحقیق کا ابتدائی حصہ ہے اور مبتدی سالکوں کے لیے یُونہی سمجھا جائے گا ورنہ منتہیوں کا مقام کچھ آگے ہے۔

تفسیر صُوفیانہ نوح سے مراد رُوح ہے جیسے پہلے گزرا ہے، اور کفار سے نفس وغیرہ۔ اب آیت کا معنیٰ یُوں ہوا کہ روح کی قوم سے صرف قلب و سر اور بدن اور جوارح (اعضاء) نے ایمان قبول کیا لیکن نفس تو ہمیشہ کے لیے ایمان نہیں لاتا ہاں انبیاء علیہم السلام اور خواص اولیاء کے نفوس قدسیہ اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کے نفوسِ قدسیہ کسی وقت اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ایمان نہیں لاتے۔ نفوس کا حال اعراب کی طرح ہے جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔

اعرابیوں نے کہا ہم ایمان لائے آپ انہیں فرمائیے کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن کہو کہ ہم اسلام لائے کیونکہ ابھی تمہارے قلوب میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ کیونکہ ایمان کا مخزن قلوب اور اسلام کا مظہر نفوس ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ حقیقی اسلام وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نور من ربہ۔

جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے وہ اپنے رب کے نور پر ہوتا ہے۔ اسلام ایک کرن ہے جو اس نورِ ایمان سے نورانی قلب کے آئینے سے ظاہر ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اعراب کے قلوب میں ایمان داخل نہیں ہوا اسی لیے ان کے اسلام کی کرن صرف کلمۂ توحید اور اعمال صالحہ سے ظاہر ہوئی جبکہ انہوں نے کلمۂ توحید کا اقرار کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ بندگانِ خاص کا ایمان حق تعالیٰ سے نازل ہوتا ہے جو وہ اپنی خاص عنایت سے ان [illegible] پر نازل کرتا ہے جو قلوب بلاواسطہ فیض الٰہی کی استعداد رکھتے ہیں اور عوام کا ایمان ان کے قلوب پر اترتا ہے اقرار باللسان وعمل بالارکان کی وجہ سے۔ فلا تبتئس نفوس سعداء سے نااُمیدی نہ کرو۔ بما کانوا یصنعون ان کے بُرے اعمال کے ارتکاب کی وجہ سے کیونکہ ان کے اجساد میں ایک اکسیر موجود ہے۔ جیسے اکسیر سے لوہا سونا بن جاتا ہے ایسے ہی وہ روح کی سعادت سے مقبولِ خدا بن جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کے توبہ کرنے پر ان کی برائیاں نیکیوں میں بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اولئك یبدل اللہ سیاٰتھم حسنات۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔

ولا تبتئس یعنی اشقیاء کے نفوس سے بھی غم نہ کھائیے بما کانوا یفعلون ان کی برائیوں کے ارتکاب سے، کیونکہ یہی برائیاں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی شقاوت پر حجت ہیں اور یہی برائیاں قیامت میں ان کے لیے بیڑیاں بن جائیں گی جن سے انہیں منہ کے بل گرا کر جہنم میں دھکیلا جائے گا۔ (کذافی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ اور کشتی بنائیے۔

ربط: جب کفار سے ایمان کی بالکلیہ امید منقطع ہوگئی اور دیکھا کہ ان کو دعوت و تبلیغ اب کسی قسم کا فائدہ نہ دے گی اور ادھران پر عذاب کے نزول کا وقت بھی قریب ہوگیا تو حکم ہوا کہ واصنع الفلک یعنی اب کفار کے ایمان کی جد و جہد ختم کر کے کشتی تیار کیجیے۔

ف: یہ امر وجوبی ہے کیونکہ اب رُوح کو بچانے کی اور کوئی تدبیر نہیں رہی۔ پھر جیسے روح کا بچاؤ ضروری ہے تو کشتی کا تیار کرنا بھی لازم۔ اور لام عہدی ہے اس معنے پر ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقاً نوح علیہ السلام سے فرمایا ہوگا کہ آپ کی قوم کو تباہ و برباد کروں گا اور آپکو اور آپ کی قوم کو نجات بخشوں گا لیکن ایک ایسی صنعت سے جس کا میں بعد کو حکم دوں گا اور اسے تیار تمہی نے کرنا ہوگا اور اس کی تیاری کے لیے میرا حکم ہوگا۔ اور صنعت ایسے ایسے ہوگی اور اسس کا فلاں نام ہوگا۔ اب جب موقع آگیا تو فرمایا: تیار کیجیے وہی کشتی جس کے متعلق میں نے پہلے آپ کو بتایا تھا۔ یا الف لام (الفلک میں) جنس کا ہے۔ اسس میں کسی قسم کی خصوصیت نہیں کہ جس میں کچھ بیان کیا جائے۔ اور الصنعۃ بمعنے کام کرنا۔ یہاں لکڑی تراشنا وغیرہ مراد ہے۔ یعنی اے نوح علیہ السلام! لکڑی تراشیے تاکہ اس سے کشتی بن جائے۔

بِاَعْيُنِنَا ہماری نگرانی میں۔ العین ضروری نہیں کہ اسی آلہ کو کہا جائے جس سے کام کرنے کے لیے مدد لی جائے بلکہ یہ تو حفظ شے کا ایک سبب ہے لیکن اسے عین تعبیر کرنا مجازاً ہے۔ اعین کو جمع لانا ضمیر جمع کی وجہ سے ہے اور اسس سے مبالغہ اور کثرت اسباب حفظ مراد ہے۔ اس معنے پر باعیننا بمعنے محفوظاً ہوگا اور وہ اصنع کے ضمیر سے حال ہے۔ یعنی اصنع الفلک محفوظاً کشتی تیار کیجیے آپ کو اس کی تیاری میں دشمنوں سے ہر طرح کی حفاظت دی جائے گی اور اسس کی تیاری میں کوئی آپ کو روک نہیں سکے گا۔ اور آپ اطمینان سے اس کو مکمل کر لیں گے۔ اور تیاری کے بعد اس میں کوئی نقص یا کمی نہیں ہوگی۔

ف: کاشفی نے کہا باعیننا بمعنی ہماری نگرانی یا فرشتوں کی نگرانی میں تیار کیجیے اس لیے جب تک آپ اسے تیار کرتے رہیں گے فرشتے آپ کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ فرشتوں سے آپ کے مؤکل ملائکہ مراد ہیں۔

صاحبِ رُوح البیان کا فیصلہ

یہاں یہی معنی موزوں ہے کہ اعین بمعنے نگرانی اور حفاظت ہو۔ اس لیے کہ سورۂ طور میں واقع ہوا ہے:

فاصبر لحکم ربک فانک باعیننا۔

پس اپنے رب کے حکم پر صبر کیجیے کیونکہ آپ ہماری نگرانی اور حفاظت میں ہیں۔

جیسے سورۂ طور میں باعیننا بمعنے حفاظت و نگرانی ہے ایسے ہی یہاں ہے۔

سوال: سورۂ طور کا خطاب حضور علیہ السلام کو ہے اس سے نوح علیہ السلام کے واقعہ کا کیا تعلق؟

جواب : الفاظ کے معانی کے اتحاد کے لیے ایک واقعہ ہونا ضروری نہیں جیسا کہ علم اصول کا قاعدہ ہے۔

وَوَحْيِنَا اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کیجیے۔ جیسے ہم نے سمجھایا اسے ویسے ہی تیار کیجیے۔ یعنی ہماری تعلیم والہام کے مطابق کشتی تیار کیجیے۔

ف : حضرت ابن عباس نے فرمایا :

نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا علم نہ تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ اسے پرندے کے سینہ اور اس کی بغلوں کی طرح تیار کیجیے۔ آپ نے لکڑی کاٹنے کا آلہ اٹھایا اور لکڑی کو کاٹنا شروع کیا تو لکڑی کشتی کے ڈھانچے کے مطابق کٹتی گئی جبر بھر بھی فرق نہ آیا۔

کشتی بنانے کی عجیب کہانی

اخبار میں آیا ہے کہ جب نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم ہوا تو آپ نے بارگاہِ خداوندی میں لکڑی کے لیے عرض کی۔ حکم ہُوا کہ ساج کا درخت بوئیے، جب یہ بڑا ہو تو اس سے کشتی تیار کرنا۔ آپ نے ساج کا درخت بویا اس کی نشوونما میں بیس سال گزر گئے۔ دریں اثنا کسی کے ہاں لڑکا پیدا نہ ہوا۔ جو چھوٹے بچے تھے وہ جوان ہو گئے تھے۔ شومیٔ قسمت سے وہ بھی نوح علیہ السلام پر ایمان نہ لائے۔ بیسویں سال ساج کا درخت کاٹ کر نوح علیہ السلام کشتی بنانے لگے۔ اس کی تیاری میں آپ کو بیس سال گزر گئے۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ آپ کو کشتی کی تیاری میں چار سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ یاد رہے کہ نوح علیہ السلام نے اس درخت کی کٹائی اور اس سے کشتی کی تیاری میں مزدوروں سے بھی کام لیا اور خود بھی شریکِ کار رہے۔

کُتے کو سب سے پہلے نگران رکھنے والا کون

حیوٰۃ الحیوان میں ایک عجیب وغریب واقعہ مرقوم ہے کہ سب سے پہلے کُتے کو نگرانی کے لیے رکھنے والے نوح علیہ السلام ہیں۔ واقعہ یُوں ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ جل شانہٗ سے عرض کی، یا الٰہ العٰلمین! مجھے کتے کی نگرانی فراہم کیجئے کیونکہ کشتی کی تیاری میں کئی روز لگیں گے۔ دن کو میں کام کروں گا مگر جب رات کو تھکا ماندہ آرام کروں گا تو میرے دشمن موقعہ پا کر مجھے نقصان پہنچائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کشتی کی حفاظت کیلئے کتے کی نگرانی کی اجازت مرحمت فرمائی۔ نوح علیہ السلام دن کو کشتی کی تیاری میں مصروف رہتے اور رات کو آرام فرماتے۔ دشمن رات کو کشتی کا تیار کردہ سامان اٹھانے کے لیے آتے تو کُتا بھونکتا تھا۔ اس سے نوح علیہ السلام بیدار ہو جاتے اور دشمن بھاگ جاتے۔ اسی طرح سے چند روز کے بعد کشتی تیار ہو گئی۔

مثنوی شریف میں ہے :

قابل تعلیم و فہمست ایں خرد
لیک صاحب وحی تعلیمش دہد

جملہ حرفتہا یقین از وحی بود
اول او لیک عقل آنرا فزود
ہیچ حرفت را ببین کین عقل ما
ماند او آموختن بے اوستا
گرچہ اندر فکر موئے اشگاف بود
ہیچ پیشہ رام بے اوستا نبود

ترجمہ: یہ عقل فہم وتعلیم کے قابل تو ہے لیکن اسے صاحبِ وحی تعلیم دیتا ہے۔ یقین جانیے کہ تمام حرفت وصنعت وحی کے ذریعے آئی ہے لیکن اس میں عقل کو بھی دخل ہے۔ چنانچہ ہر حرفت میں عقل سے کام لیا جاتا ہے لیکن استاد کے بغیر کوئی کام نہیں آسکتا اگرچہ عقل وفکر ہر کام میں ضروری ہے۔ لیکن جب تک اس کے لیے کسی استاد سے سبق نہ لیا جائے وہ کام ناتمام اور ناقص ہوتا ہے۔

کشتیٔ نوح کی لمبائی وچوڑائی

نوح علیہ السلام کی کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ (ہاتھ انگلیوں سے کاندھے تک کا نام ہے) اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس گز تھی۔ اس کا دروازہ چوڑائی کی جانب رکھا گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس کی لمبائی ایک ہزار دو سو ہاتھ اور چوڑائی چھ سو ہاتھ تھی۔

عیسیٰ علیہ السلام کے مُردہ زندہ کرنے کی تفصیل

حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کسی ایسے شخص کو زندہ کریں جو نوح علیہ السلام کا ہمعصر ہو اور وُہ اٹھ کر ہمیں کشتیٔ نوح کی پیمایش بتائے۔ آپ انھیں ایک ٹیلے پر لے گئے وہاں سے مٹی اٹھا کر ان سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی: اللّٰہ ورسولہٗ اعلم۔ آپ نے فرمایا: یہ کعب بن حام ہے۔ یہ فرما کر اس مٹی پر اپنا عصا مارا اور فرمایا: قُم باذن اللہ۔ وہ سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اٹھا۔ اس وقت وہ بڑھاپے کی حالت میں اُٹھا۔ آپ نے اس سے پُوچھا: تجھے موت بڑھاپے میں آئی؟ عرض کی: نہیں، بلکہ جب میں مرا تھا تو نوجوان تھا لیکن آپ کی آواز سُن کر میں یہ سمجھا کہ قیامت آگئی۔ اس خوف سے میں بُوڑھا ہو گیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ہمیں نوح علیہ السلام کی کشتی کی پیمایش بتائیے۔ اس نے کہا: اس کا طُول ایک ہزار دو سو ہاتھ اور عرض چھ سو ہاتھ تھی۔ اس کے تین حصّے کیے گئے۔ ایک میں جانور، دُوسرے میں پرندے، تیسرے میں انسان تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا: واپس اپنی حالت میں چلا جا۔ دیکھا تو وہی مٹی کا ڈھیلا تھا۔

ف: کواشی میں ہے کہ نوح علیہ السلام نے اس کشتی کو کالے تیل کا روغن لگایا۔ جب مکمل ہُوئی تو بول اٹھی، لا الٰہ الا اللّٰہ فی الاولین والآخرین انا السفینۃ التی من رکبنی نجا ومن تخلف عنی ھلک ولا یدخلنی الا اھل الایمان والاخلاص۔ اولین وآخرین میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ مَیں وہ کشتی ہوں کہ جو مجھ پر سوار ہوگا نجات پائے گا جو مجھ سے

ہٹ جائے گا وہ تباہ و برباد ہوگا۔ اور اس میں اہلِ ایمان و اخلاص کے سوا کوئی اور داخل نہ ہوگا۔

کشتی سے جب قومِ نوح نے یہ آواز سُنی تو کہنے لگی:

اعجوبہ یہی تو آپ کا جادو و سحر ہے۔

وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ لیکن مجھے ظالموں کے متعلق نہ کہنا اور نہ ہی ان سے عذاب کے دفع کرنے کی دُعا مانگنا۔

نکتہ: ولا تخاطبنی فیھم کے بجائے فی الذین ظلموا لانے میں چند وجوہ ہیں:

۱۔ الظالمین کی تصریح سے ان کا ظلم سے موصوف ہونا یقینی ہو جائے۔

۲۔ معلوم ہو جائے کہ ان کے عذاب کی نجات سے روکنا ان کے اسی ظلم کی وجہ سے ہے۔

۳۔ انھیں عذاب میں مبتلا کیا گیا تو اسی ظلم کی وجہ سے۔

اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○ بے شک وہ غرق کیے جائیں گے۔ یعنی ان پر حکم ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ضرور غرق ہوں گے۔ ان کا غرق ہونا اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ قلم نے جو لکھا سو وہ ہو کر رہے گا اب اس کے برعکس نہیں ہوگا۔ وہ عذابِ الٰہی سے بچ نہیں سکتے۔ ان پر حجت قایم ہو چکی ہے۔ ان پر عذاب آیندہ نسلوں کے لیے عبرت ہوگی اور یہ لوگ ان کے لیے مثال بنیں گے۔

ف: بعض مفسرین نے فرمایا کہ الذین ظلموا سے کنعان بن نوح علیہ السلام مراد ہیں۔ (کذا فی تفسیر ابی اللیث، اور تبیان میں اضافہ کیا کہ الذین ظلموا سے کنعان بن نوح اور کنعان کی ماں مراد ہیں۔ اس کی ماں کا نام وابعہ یا واعلہ تھا یہی زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ زمین نے چیخ مار کر بارگاہِ حق میں عرض کی کہ یا اللہ! تو کیسے حوصلہ کرتا ہے کہ یہ کفار میری پیٹھ پر چلتے ہیں اور تیرا رزق کھاتے ہیں لیکن تیرے غیر کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے بعد درندے بولے اور وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔ جب کفار کا مجادلہ نوح علیہ السلام سے طویل ہوا اور ادھر انھیں معلوم ہو گیا کہ ان میں سے اب کوئی ایمان قبول نہیں کرے گا کیونکہ آپ ان ایمان نہ لانے والوں کی تباہی اور بربادی کے لیے بددُعا کر چکے تھے اب انھیں شرم آتی تھی کہ ان سب کی نجات کے لیے اللہ جل شانہ سے دعا کریں۔

سوال: جب نوح علیہ السلام کافروں کے لیے دُعا سے روکے گئے تھے تو پھر اپنے بیٹے اور اپنی عورت کی نجات کے لیے کیوں دُعا فرمائی حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ دونوں کافر ہیں۔

جواب: محض شفقت کی وجہ سے دُعا فرمائی تھی۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی اولاد اور اہل و عیال پر شفیق تر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر آپ کو ان کے لیے دُعا مانگنے سے پہلے ہی روک دیا گیا۔ اسی لیے الذین ظلموا سے آپ کا بیٹا اور آپ کی اہلیہ مراد ہے۔ اور یہی صواب تر ہے۔ (کذا قال صاحب روح البیان)

(اس کی مزید تحقیق آگے آئے گی)

تفسیر صوفیانہ ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا "تاویلات نجمیہ میں ہے کہ الذین سے نفوس مراد ہیں کیونکہ ظلم کرنا نفس کی فطرت ہے اس لیے کہ ظلوماً جہولاً ہے۔ وہ اشیاء کو غیر محلوں میں رکھنے کا عادی ہے۔ اسی لیے عبادت حق کو اپنی خواہشات اور دنیا اور اس کی شہوات میں ضائع کر دیتا ہے۔ اس آیت میں نفوس سے ایمان نہ لانے کی امیدیں بھی منقطع کر دی ہیں۔ اس آیت سے چند مسائل مرتب ہو سکتے ہیں:

۱۔ اہل کمالات ہمیشہ ترقی کرتے رہتے ہیں۔

۲۔ نفس بڑا مکار ہے اور وہ ہر وقت مکر میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بھی بے خوف ہو جاتا ہے۔

۳۔ اس کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ فتنوں کے طوفان میں غرق ہوتا ہے۔ ہاں جسے اللہ تعالیٰ بچائے اور اسے نجات اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ شریعت کی کشتی میں سوار ہو۔ اس لیے کہ اگر اس کشتی شرعا میں نوح روح نہ ہوتا تو وہ سب غرق ہو جاتے۔

حدیث شریف میری اور میری اُمت کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی مثال ہے جو اس سے تمسک کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو اس سے پیچھے رہ جائے گا غرق ہو جائے گا۔

مثنوی شریف میں ہے:

بہر ایں فرمود پیغمبر کہ من
ہمچو کشتی ام بطوفان زمن
ما و اصحابیم چوں کشتی نوح
ہر کہ دست اندر زند یابد فتوح
چونکہ با شیخی تو دور از زشتی
روز و شب سیاری و در کشتی
مگسل از پیغمبر ایام خویش
تکیہ کم کن بر فن و بر کام خویش
گرچہ شیری چوں روی رہ بے دلیل
خویش رو بہ در ضلالی و ذلیل

ترجمہ: اس لیے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں زمانہ کے طوفان کے لیے کشتی کی طرح ہوں۔ اسی طرح میں اور میرے صحابہ نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہیں کہ جو بھی ہمارے دامن کو پکڑے گا کامیاب ہوگا۔ جب تمہیں کسی شیخ کامل کا دامن نصیب ہو جائے تو سمجھو کہ وہ حفاظت کی کشتی میں سوار ہو گیا۔ تمہیں چاہیے کہ نبی علیہ السلام

سے تعلق نہ توڑنا اپنے کسی فن اور علم و فضل پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا۔ اگر تمہارے اندر شیر کی طاقت بھی ہو لیکن اگر بے دلیل ہو کر چلو گے تو سمجھ لینا کہ لومڑی سے زیادہ ذلیل اور گمراہ ہو کر مرو گے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ - اور وہ نوح علیہ السلام کی کشتی کو گھڑتے تھے۔

سوال: ماضی کو مضارع سے کیوں تعبیر فرمایا؟

جواب: صورت عجیبہ کے استحضار کے لیے ماضی کو حال سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تفسیر عالمانہ وَكُلَّمَا نوح علیہ السلام کشتی گھڑتے تھے تو آپ کی قوم کا یہ حال تھا کہ جس وقت مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ آپ پر آپ کی قوم کے سرداروں کا گزر ہوا مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ط تو نوح علیہ السلام کے ساتھ استہزاء کرنے لگے جب انھوں نے دیکھا کہ نوح علیہ السلام کشتی تیار کر رہے ہیں۔ یا اس لیے ہنسے کہ انھیں کشتی کے بارے علم نہ تھا کہ یہ کیا شے ہے، اسے کیسے چلایا جاتا ہے، اس کے کیا کیا فوائد ہیں۔ نوح علیہ السلام سے پوچھا یہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ ایک گھر بن جائے گا اور دریا میں خود بخود چلا جائے گا۔ نوح علیہ السلام کی بات سُن کر متعجب ہو کر ہنسنے لگے یا اس لیے ہنسے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس کشتی کو ایک گھنے جنگل میں بناتے تھے جہاں کوسوں تک پانی نظر نہیں آتا تھا۔ کافر آپ کو کشتی بناتے ہوئے دیکھ کر کہتے: کیوں صاحب! پہلے آپ نبی تھے اب مستری بن گئے۔ اور یہ بھی کہتے کہ اس کے لیے پانی کہاں سے لاؤ گے۔ یا اس لیے بھی تضحیک کرتے کہ نوح علیہ السلام انھیں غرق ہونے سے ڈراتے تھے لیکن بہت عرصہ گزر گیا نہ کوئی پانی کا چشمہ نظر آیا نہ کہیں پانی کا نشان ملا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ نوح علیہ السلام اسباب خلاص کے درپے ہیں پھر استہزاء وغیرہ سے باز نہ آئے۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہی تھا کہ نوح علیہ السلام سے انکار ہی انکار کیا جائے۔ نوح علیہ السلام سمجھاتے رہے کہ جتنا اس پر میں دُکھ اور مصائب و آلام اٹھا رہا ہُوں اسی قدر اس میں فوائد ہیں۔ سے

من اگر نیکم و بد تو برو و خود را باش

ہر کسے آں درود عاقبت کار کہ کشت

ترجمہ: میں اگر نیک یا بُرا ہُوں تم جاؤ اپنا کام کرو اس لیے کہ جو جو کچھ بوتا ہے وہی اٹھاتا ہے۔

ف: کلما ظرفیہ اور ما مصدریہ ظرفیہ ہے۔ دراصل عبارت یُوں تھی:

ومعنی وقت مرور سخروا۔ یعنی گزرتے ہوئے نوح علیہ السلام سے استہزاء کیا۔ اور اس کا عامل سخروا منہ ہے۔

قَالَ یہ جملہ مستانفہ ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال کی تقریر یہ ہے کہ کفار کے انتہائی ایذا دینے پر نوح علیہ السلام نے کیا کیا تو اس کے جواب میں کہا گیا قَالَ یعنی نوح علیہ السلام نے فرمایا اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا اگر تم ہمارے ساتھ ٹھٹھا کرو گے فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ ہم تمہارے ساتھ کریں گے كَمَا تَسْخَرُوْنَ ○ جیسے تم کر رہے ہو۔ جیسے تم ہمارے ساتھ استہزاء کرو گے ہم بھی ویسے ہی تمہارا تمسخر اڑائیں گے جبکہ تم اسی طوفان میں غرق ہو گے اور آخرت میں بھی تمہیں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

ف: مولانا ابوالسعود نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تمہارے ساتھ وہی معاملہ کریں گے جو استہزاء کرنے والوں سے ہوتا ہے۔

یہ تاویل اس لیے کی گئی کہ نبوت کے منصب پر دھبہ نہ آئے کیونکہ استہزاد تو معمولی آدمی کرتے ہیں اور نبی علیہ السلام کی شان کے شایاں نہیں کہ وہ کسی سے استہزاد کرے۔

مسئلہ : اس سے مقصود صرف اتنا ہے کہ استہزاد کرنے والوں کو استہزاد کی سزا ضرور ملے گی اس لیے کہ ہر جنس کی سزا اسی جنس سے دینا زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اسی لیے نوح علیہ السلام نے انا نسخر فرمایا۔ اس کی نظیر قرآن مجید میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ داروں سے فرمایا:

کلوا واشربوا ھنیئاً بما اسلفتم فی الایام الخالیہ۔

رچتا بچتا کھاؤ پیو تمہیں یہ اس کی جزا نصیب ہو رہی ہے جو تم نے گزشتہ ایام میں نیک عمل کیے۔

یہ قیامت میں ان لوگوں سے کہا جائے گا جو دنیا میں روزے رکھتے تھے۔ گویا انھیں یوں فرمایا جائے گا کہ کھاؤ اے ایمان والو کہ تم نے اپنے پیٹ بھوکے رکھے اور پیو اے ایمان والو کہ تم نے اپنے جگروں کو پیاسا رکھا۔ دوسرے عبادت گزاروں سے کہا جائے گا کہ کلوا یامن قطعوا اللیل واشربوا من ثبتوا یوم الزحف یعنی کھاؤ اے شب بیدارو اور پیو اے جنگ میں ثابت قدم رہنے والو۔ اس لیے کہ ان کے اعمال کو کھانے پینے سے کوئی مناسبت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل کی مناسبت سے اس طرح کا فعل استعمال کیا جاتا ہے۔

اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے:

ان الذین اجرموا کانوا الذین اٰمنوا کانوا یضحکون۔

بے شک مجرم لوگ جو ایمان والوں سے ہنسی مذاق کرتے تھے ان کی جزا میں قیامت میں انھیں کہا جائے گا:

فالیوم الذین اٰمنوا من الکفار یضحکون۔

پس اس دن کافروں پر ایمان لانے والے ہنسیں گے۔

ھل ثوب الکفار ما کانوا یفعلون۔

کیا کافروں کو اپنے کیے کی سزا ملی یا نہ۔

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اشارہ ہے کہ نفس اور اس کی خواہشات کے پرستار شریعت پر عمل کرنے والوں پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ خواہ مخواہ اپنے آپ کو دکھ اور تکلیف میں ڈال رہے ہیں۔ ان ہنسنے والوں کو اہل شریعت کے اسرار و رموز کی کیا خبر اور ان کے انوار کا انھیں کیا پتہ۔ اگر یہ لوگ اپنی جہالت سے شریعت کی کشتی پر سوار ہونے کی وجہ سے ہنستے ہیں تو ایک مدت کے بعد یہی ان تمسخر کرنے والوں پر ہنسیں گے۔ جو بوجہ جہالت استہزاد کرتے تھے وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے اور جو استہزاء کا نشانہ بنے وہ فلاح پائیں گے۔

صاحب روح البیان کے پیر و مرشد کی تقریر

صاحب رُوح البیان رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے شیخ قدس سرہٗ نے فرمایا کہ عالم بے عمل اور جاہل بے عمل ہر دو برابر ہیں کہ دونوں کو بارگاہ سے مطرود و محروم رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح عارف بے عمل اور غافل بے عمل برابر ہیں۔ ان ہر دو کو بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے سے محروم رکھا جاتا ہے کیونکہ صرف علم و عرفان قبولیت اور نجات کا باعث نہیں بن سکتے جب تک ان کے ساتھ تمسک بالکتاب والسنۃ (یعنی قرآن و حدیث پر عمل کرنے) کو نہ ملایا جائے۔ یہی اہل حق کا مذہب ہے لیکن غیر مسلم حکماء کہتے ہیں کہ صرف علم و عرفان فلاح و نجات کے لیے کافی ہیں اور مُسلم حکماء قرآن و حدیث پر عمل کرنے کو فلاح و نجات سمجھتے ہیں۔ یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔ ؎

کارے کنیم ورنہ خجالت بر آورد
روزیکہ رخت جان بجہان دگر کنیم

ترجمہ: دُنیا میں کچھ کام کرلیں ورنہ رُسوائی ہوگی اس وقت جبکہ جان دُوسرے جہان کو لے جائیں گے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ؎

کنون کوش کاب از کمر در گذشت
در وقت سیلابت از سر گذشت

ترجمہ: ابھی کوشش کرو کیونکہ پانی ابھی کمر سے گزرا ہے لیکن سیلاب کے وقت پانی سر سے گزر جائے گا۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ۔ یہاں پر مَنْ سے وہی بننے والے مراد ہیں۔ یہ استفہامیہ اور محلاً مرفوع یا محلاً منصوب، اور سوف تعلمون کا مفعول بہ ہے۔ اور یہ اپنے متعلق سے مل کر دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

ف: سعدی مفتی مرحوم نے فرمایا ہے کہ مَن موصولہ ہے اور تعلمون متعدی بیک مفعول ہے کیونکہ اس کا یک مفعول متعدی ہونا بھی کلام عرب میں آتا ہے۔

یَاْتِیْهِ عَذَابٌ یعنی عنقریب انھیں معلوم کروگے جن پر عذاب آئے گا۔ اس سے طوفان کا غرقابہ مراد ہے یُّخْزِیْهِ جسے وہ عذاب ذلیل وخوار کرے گا۔

نکتہ: عذاب کو رُسوائی و ذلت سے اس لیے موصوف کیا گیا ہے کہ ہنسنے والوں کو جب جوابی کارروائی کرکے کسی عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے تو انھیں عادۃً رسوائی و ذلت اور عار حاصل ہوتی ہے۔

وَیَحِلُّ عَلَیْهِ اور اس پر نازل ہوگا۔

ف: حلول اس قرض کو کہتے ہیں جو کبھی منفک نہیں ہوتا۔ اس معنے پر کلام میں استعارہ مکنیہ ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرت کے عذاب کو ایسے لوگوں کے لیے ایسے قرض سے تشبیہ دی ہے جس کی ادائیگی میعاد مقرر پر لازم ہو۔ پھر اس کے لیے حلول ثابت فرمایا جو ایسے قرض کے لوازم سے ہے۔

عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ○ ہمیشہ کا عذاب یعنی نارِ جہنم۔ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا یہاں تک کہ ہمارا حکم تنور کو اُبلنے کا آنے لگا یعنی حساب کے لیے اُٹھنے کا حکم ہوگا۔

ف: حتّٰی سے کلام کا آغاز ہوتا ہے اگرچہ اب یہ جملہ شرطیہ میں داخل ہوا ہے لیکن ویصنع کی غایت واقع ہوا ہے اور حرف غایت کے لیے یہ بات منافی نہیں کہ اس کا مابعد ماقبل کی غایت واقع نہ ہو۔ اب معنیٰ یوں ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے آنے تک کشتی بناتے رہے۔

وَفَارَ التَّنُّوْرُ اور تنور سے پانی نے جوش مارا۔

ف: تنور عجمی لفظ ہے لیکن عربوں نے اپنی بولی میں استعمال کیا۔

سوال: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ عجمی لفظ ہے۔ ممکن ہے عرب کی لغت میں بھی یہ لفظ موجود ہو۔ لیکن ہمیں معلوم نہ ہو۔

جواب: اس کا مادہ تنر ہے اور کلام عرب راء سے قبل نون کے ساتھ مستعمل نہیں۔ (کذا ذکرہ القرطبی)

ف: تنر بمعنے نبع منه الماء وارتفع بشدة۔ یعنی تنور سے چشمہ کی طرح پانی اُبلا اور جوش کے ساتھ اُوپر کو چڑھا۔ جیسے ہانڈی جوش مارتی ہے اور تنور ہر گھر میں روٹی تیار کرنے کے لیے موجود تھا۔

ف: حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ربانی تھا کہ جونہی تنور سے پانی جوش زن ہو آپ مع اپنی جماعت کشتی میں سوار ہو جانا۔ جب تنور سے پانی نے جوش مارا تو ایک عورت نے نوح علیہ السلام کو اطلاع دی تو آپ فوراً اپنی جماعت کی معیت میں کشتی میں سوار ہو گئے۔

ف: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ تنور حضرت آدم علیہ السلام کا تھا اور وہ پتھر کا تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کو وراثت میں ملا تھا۔ اس سے پانی کا نکلنا بظاہر محال تھا لیکن خرقِ عادت کے طور اس سے پانی نکلا۔

ف: جیسے تنور کے متعلق اختلاف ہے ایسے ہی اس کے مکان میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں وہ تنور کوفہ میں تھا مسجد شریف کی دائیں جانب کنیسہ کے متصل۔ بعض کہتے ہیں غرق ہونے والے مسجد کوفہ کے قریب ہی تھے کیونکہ غرق ہونے کا مقام یہی تھا یعنی مسجد شریف کے کونہ سے پانی جوش زن ہوا۔ (کذا فی القاموس) بعض کہتے ہیں کہ وہ تنور طوفان ہند میں تھا، بعض کہتے ہیں ملک شام میں چشمۂ وردہ کے مقام پر۔ بعض کہتے ہیں تنور زمین کے عام حصے سے یا کسی اُونچے مقام سے اُبلا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ تنور طلوعِ فجر کے وقت جوش زن ہوا۔

قُلْنَا یہ اذا کا جواب ہے اگر حتّٰی کو جارہ قرار دے کر یصنع کے متعلق کیا جائے تو اس وقت اذا شرطیہ نہیں بلکہ حتّٰی کا مجرور ہے اور قلنا جملہ مستانفہ ہے۔ احْمِلْ فِيْهَا ہم نے کہا اس میں سوار کیجئے ھا کا مرجع الفلک ہے۔ بتاویل السفینۃ کے مونث کی ضمیر لائی گئی ہے۔ مِنْ كُلٍّ حیوانات کی ہر قسم سے یعنی زمین پر جتنے حیوانات آپ کی ضرورت کے ہیں ان سب کو کشتی میں بٹھائیے۔

زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ یہ احمل کا مفعول بہ ہے اور اثنین زوجین کی تاکید ہے اور مزید بیان کے لیے لایا گیا ہے جیسے قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے لا تتخذوا الٰهين اثنين۔

سوال: اگر زوجین یا الٰہین کے بعد اثنین آگیا تو کیا حرج ہے جبکہ تم نے اس کی تاویل میں اتنی طوالت کر دی ہے۔

جواب: زوجان میں خود ہی تثنیہ کا معنیٰ ہے۔ علاوہ ازیں ہر دو جوڑوں کو ایک دوسرے سے ایسا تعلق ہے کہ ان میں ایک کا دوسرے کے بغیر

مفہوم ظاہر ہی نہیں ہوتا۔ پھر ہر دو کو زوج کہتے ہیں۔ مثلاً زوج' موزے کا جوڑا ، زوجِ نعل یعنی جوتے کا جوڑا۔ جب من زوجین میں تثنیہ کا مفہوم پایا جاتا ہے تو پھر اثنین کا لایا جانا محض عبث ٹھہرتا ہے۔ اسی لیے ہمیں تاویل کرنا پڑی اور وہ تاویل سوال سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔

ف : الارشاد میں ہے کہ زوج ہر اس شے کو کہتے ہیں جسے اپنے نوع سے مشاکلت ہو۔ مثلاً مذکر' مؤنث کا زوج ہے۔ جیسے مؤنث اپنے مذکر کے لیے زوج کہلاتی ہے۔ کبھی ان ہر دو مرد اور عورت کو زوج کہتے ہیں۔ اس وقت یہ مفرد کا بالمقابل ہوگا۔ اسی وہم کے ازالہ پر بھی اثنین لایا گیا ہے تاکہ وہم مذکور پیدا نہ ہو۔

سوال : من کل زوجین اثنین کو مقدم اور اھلک اور جملہ مومنین کو کیوں موخر کیا۔

جواب : چونکہ حیوانات کشتی پر سوار ہونے میں انسان کے محتاج ہوتے ہیں بنابریں پہلے ان کو سوار کرنے کا ذکر فرمایا بعد از ان خود اور دیگر انسان۔

ف : مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی کہ یا اللہ! میں حیوانات کو کیسے اکٹھا کروں۔ اللہ جل شانہٗ نے تمام درندے اور پرندے جمع کر کے نوح علیہ السلام کے آگے کھڑے کر دیے۔ آپ اپنے دونوں ہاتھ ان پر مارتے۔ آپ کا دایاں ہاتھ نر پر اور بایاں ہاتھ مادہ پر لگتا تھا۔ اسی طرح تمام حیوانات کشتی میں جمع ہو گئے۔

ف : حضرت حسن نے فرمایا کہ آپ نے کشتی میں صرف وہ حیوانات بٹھائے جو بچے جنتے اور انڈے دیتے تھے۔ باقی وہ حیوانات جو مٹی سے پیدا ہوتے تھے جیسے کیڑے مکوڑے، مچھر اور پشو وغیرہ کو کشتی میں نہیں بٹھایا گیا۔

ف : شیخ سمرقندی نے بحر الکلام میں لکھا کہ حیوانات میں سب سے پہلے کشتی میں چیونٹی اور آخر میں گدھا بٹھایا گیا۔ جب گدھے نے اپنا اگلا حصہ کشتی میں رکھا تو پیچھے سے شیطان اس کی دم سے چمٹ گیا۔ اس سے گدھے کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا : اے گدھے! تجھے کیا ہے؟ وہ بے ساختہ کھڑا ہو جاتا لیکن باقی حصے کو اندر کرنے سے قاصر تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا : اے گدھے! داخل ہو، کہیں شیطان تو نہیں ہے تیرے ساتھ! شیطان نے اپنا نام سنتے ہی گدھے کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد گدھا کشتی میں بیٹھ گیا تو شیطان بھی اس کے پیچھے کشتی میں چلا گیا۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا : اے دشمنِ خدا! یہاں سے نکل جا۔ شیطان نے کہا : آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ اے گدھے! تیرے ساتھ شیطان ہے۔ اس سے مجھے کشتی میں داخل ہونے کی اجازت ہوئی تو میں داخل ہو گیا۔ پھر بھی نوح علیہ السلام نے اسے نکلنے کو کہا۔ اس نے ضد کی اور وہاں سے اٹھ کر کشتی کے پچھلے حصے سے چمٹ گیا۔

ف : تبیان میں ہے کہ شیطان نے بھی کشتیِ نوح میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا تھا لیکن چونکہ وہ بلا اجازت کشتی میں داخل ہونے کا مستحق نہیں تھا اسی لیے وہ گدھے کی دم سے چمٹ گیا۔ جب گدھا کشتی میں داخل ہونے لگا تو پچھلا حصہ کشتی میں نہ جا سکا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اسے غصے سے کہا : داخل ہو اے ملعون۔ یہ سنتے ہی شیطان بھی کشتی میں چلا گیا اور گدھا بھی۔ جب نوح علیہ السلام نے شیطان کو دیکھا تو فرمایا اے بدبخت! تو میری اجازت کے بغیر کیسے آ گیا۔ عرض کی : آپ نے اجازت بخشی ہے تبھی تو حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے کب اجازت دی تھی؟ جب آپ نے گدھے سے فرمایا : ادخل یا ملعون (اے ملعون! داخل ہو جا۔) اس وقت وہاں میرے

سوا وہاں اور کوئی ملعون نہیں تھا۔ نوح علیہ السلام نے اس کی اسی خدمت پر اسے کشتی میں بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم گدھے کو ہینگتا ہوا سنو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو کیونکہ گدھا شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے۔ اور جب مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ کا فضل مانگو کیونکہ مرغ فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے۔

مسئلہ: ہر حیوان اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتا ہے ماسوائے گدھے کے۔ وہ شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ گدھا خبیث ترین جانور ہے اسی لیے تو شیطان نے کشتی نوح میں سوار ہونے کے لیے اس کی دُم کا سہارا لیا اور اسے اپنا ساتھی بنایا۔ مرغ شیطان کا دشمن ہے کیونکہ وہ نماز کے اوقات کے لیے آواز (اذان) دیتا ہے۔ عرش معلیٰ پر بیٹھنے والا فرشتہ جب بولتا ہے تو اس کی تقلید میں زمین کے تمام مرغ بولتے ہیں۔ انسان کی طرح دیگر حیوانات میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ صرف خچر کے لیے آتا ہے کہ اس کی نسل منقطع ہو چکی ہے۔

گستاخِ نبوت کی سزا کا بیان

مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ سلگائی گئی تو لکڑیاں اٹھانے میں خچر پیش پیش تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ سزا مقرر فرمائی کہ تاقیامت اس کی نسل ہی منقطع کر دی۔ گویا اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بد دعا ہے۔

گستاخِ نبوت کو مارنا کارِ ثواب ہے

مروی ہے کہ گرگٹ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ کو زیادہ تیز کرنے کے لیے پھونک مارتا تھا۔ اس لیے حدیث شریف میں ہے: جو گرگٹ کو ایک ہی وار میں قتل کر دیتا ہے اس کے لیے ایک سو نیکی لکھی جاتی ہے۔

شیطان ابلیس

مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی میں ایک معمر شخص دیکھا لیکن تھا وہ غیر متعارف۔ آپ نے اس سے پوچھا تو کون ہے، کیوں آیا ہے۔ اس نے کہا: تمہاری کشتی میں اس لیے آیا تاکہ تبعین کا اثر ڈالوں۔ ان کے دل میرے ساتھ ہوں گے اور ظاہری جسم آپ کے ساتھ۔ آپ نے فرمایا: نکل جا یہاں سے ابلیس ملعون۔ شیطان نے کہا: یا حضرت! آپ کو معلوم ہو کہ پانچ امور ایسے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان تباہ و برباد ہو جاتا ہے لیکن میں آپ کو صرف تین عرض کیے دیتا ہوں اور دو آپ سے مخفی رکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغام بھیجا کہ اسے پیارے نوح (علیہ السلام)! اسے فرمائیے مجھے ان تینوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تو کچھ بتانا چاہتا ہے تو وہی دو بتا دے۔

شیطان نے کہا،

ان میں سے ایک حسد ہے۔ اسی سے میں ملعون ٹھہرا، اسی نے مجھے شیطان رجیم بنایا۔

دوسرا حرص ہے۔ اس کی شامت آدم علیہ السلام پر پڑی کیونکہ بہشت کی ہر نعمت آدم علیہ السلام کے لیے مباح تھی۔ میں نے اسی حرص کی وجہ سے اسے بہکایا تھا۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

حرص تو در کار بد چوں آتشست
اخگر از رنگ خوش آتش خوشست
آں سیاہی فحم در آتش نہاں
چوں شد آتش آں سیاہی شد عیاں
اخگر از حرص تو شد فحم سیاہ
حرص چوں شد ماند آں فحم تباہ
آں زماں آں فحم اخگر می نمود
آں نہ حسن کار نار حرص بود
حرص کارت بیا راتیدہ بود
حرص رفت و ماند کار تو کبود

ترجمہ: بُرے کام میں حرص آگ کی طرح ہے کوئلہ صرف آگ کی سُرخ رنگی سے خوش ہے۔ حالانکہ اس کی سیاہی اس کی سُرخی میں پوشیدہ ہے۔ جب اس کی حرص ختم ہُوئی تو وہ کوئلہ سیاہ ہوگیا اس وجہ سے کہ حرص تھی تو کوئلہ کو سیاہی نصیب ہُوئی۔ اسی طرح حرص کئی قسم کی رنگینیاں دکھاتی ہے لیکن حرص کے بعد حال بُرا ہوتا ہے۔

نوح علیہ السلام کے ہاں سانپ اور بچھو حضرت نوح علیہ السلام کے ہاں سانپ اور بچھو حاضر ہوئے اور عرض کی ہمیں بھی کشتی میں بٹھا لیجیے۔ مگر آپ نے فرمایا: تم کشتی میں بیٹھنے کے قابل نہیں کیونکہ تم سراپا زہر و ضرر ہو۔ ان سب نے عرض کی: ہم آپ کو ضمانت دیتے ہیں اور آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

سانپ اور بچھو سے حفاظت کا وظیفہ جسے سانپ اور بچھو سے خطرہ ہو وہ سلام علی نوح فی العالمین پڑھے گا تو وہ ان کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔

اجتماع الضدین حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہُوا کہ آپ کشتی میں تمام جانوروں کے دو دو جوڑے بٹھائے۔ نوح علیہ السلام نے عرض کی: اے الٰہ العٰلمین! شیر، گائے، بھیڑیے، بکری، بلی اور کبوتروں کو آپس میں سخت عداوت ہے۔ یہ کشتی میں کیسے ایک جگہ کشتی میں گزارہ کرسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان کے درمیان بغض و عداوت کس نے ڈالی ہے! نوح علیہ السلام نے عرض کی: تُو نے ہی ان میں عداوت پیدا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جیسے میں ان میں عداوت پیدا کرسکتا ہُوں ایسے ہی ان میں محبت بھی پیدا کرسکتا ہوں۔ آپ مشوش نہ ہوں وہ آپس میں راضی خوشی رہیں گے۔

بلی کیسے پیدا ہوئی مروی ہے کہ کشتی میں چوہے بہت ہو گئے۔ یہاں تک کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ یہ کشتی کی رسیاں کاٹ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ شیر کے ماتھے پر ہاتھ پھیریئے۔ آپ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو شیر کو چھینک آئی۔ اس کے منہ سے دو بلیاں نکلیں جنہوں نے تمام چوہے کھا ڈالے۔ اس کے بعد کشتی میں بدبو پھیل گئی۔ عرض کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہاتھی کی دُم پر ہاتھ پھیریے۔ آپ نے ہاتھ پھیرا تو اس سے دو خنزیر نکلے جنہوں نے تمام بدبو چاٹ لی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک خنزیر نکلا تھا۔ (کذا قال وہب بن منبہ)

ف: حضرت وہب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بلی خنزیر سے پہلے نکلی۔ اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کو نکلی۔ ان دونوں کے درمیان تطبیق یوں ہوگی کہ یہ واقعہ بلی سے بعد کو ہوا لیکن بلی کا شیر کی ناک سے پیدا ہونا ثابت ہے۔ واللہ اعلم

وَاَهْلَكَ اس کا عطف زوجین پر ہے۔ اس لیے کہ نوح علیہ السلام کی دو گھر والیاں تھیں ایک مومنہ، دوسری کافرہ جو کنعان کی ماں تھی۔ اسی طرح اہل سے آپ کے تمام گھرانے والے مرد و زن مراد ہیں۔ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ہاں جس پر تقدیر ربانی اور اس کا حکم سبقت کر گیا کہ وہ ضرور غرق ہوگا اور وہ اپنی شامتِ اعمال کی وجہ سے نہیں بچ سکے گا۔ اس سے کنعان اور اس کی والدہ واعلہ مراد ہیں کیونکہ وہ دونوں کافر تھے۔ اس معنے پر یہ استثناء منقطع ہوگا۔ اگر اہل سے اہلِ ایمان مراد ہوں اور یہی معنیٰ زیادہ ظاہر ہے چنانچہ انه ليس من اهلك سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ یا اہل سے رشتہ دار مراد ہوں تو یہ استثناء متصل ہے۔

ف: استثناء کے متعلق تعین اس وقت ہو سکتا ہے جب مستثنیٰ کے احوال و اعمال معلوم ہوں۔

نکتہ: علیہ میں لفظ علیٰ سے معلوم ہوا کہ ان پر تقدیر کی سبقت ضرر کے لحاظ سے تھی اس لیے کہ لفظ علیٰ ضرر کے لیے آتا ہے جیسے لام نفع کے لیے آتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے رُسل کرام کے لیے فرماتا ہے:

ولقد سبقت كلمتنا لعبادنا المرسلين۔

اور فرمایا:

ان الذين سبقت لهم منا الحسنىٰ۔

وَمَنْ اٰمَنَ یہ اس کا عطف واهلك پر ہے۔ یعنی اپنے اہل یعنی ایمان والوں اور دیگر تمام مومنوں کو کشتی میں بٹھائیے اور اھل میں اگرچہ تمام اہلِ ایمان شامل تھے۔ لیکن چونکہ پہلے اھل سے استثناء مقصود تھا اسی لیے اسے علیٰحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اور نوح علیہ السلام پر تھوڑے سے لوگ ایمان لائے۔ یعنی نوح علیہ السلام کی تھوڑے سے لوگوں نے موافقت کی۔

نوح علیہ السلام کی اُمت کی تعداد حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کل آٹھ تھے: نوح علیہ السلام، آپ کی زوجۂ مومنہ، تین آپ کے صاحبزادے اور تین ان کی بیویاں۔

ف : روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اپنی زوجۂ مومنہ، اپنے صاحبزادوں اور ان کی بیویوں اور تمام حیوانات کے دو دو جوڑے کشتی میں بٹھا لیجئے۔ اس کے بعد میں چالیس شب و روز بارش برساؤں گا جس سے تمام دنیا کے لوگ جمع ہوجائیں گے اور اسی میں غرق ہوں گے۔ (کذا روی العقبی عن التوراۃ)

ف : مقاتل نے فرمایا کہ وہ کل اسّی تھے۔ بہتّر دیگر اور آٹھ نوح علیہ السلام کے کنبے کے افراد۔ ان میں آدھے مرد اور آدھی عورتیں تھیں۔

ف : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ کل اسّی مرد اور عورتیں تھیں۔ ان میں ایک جرہم تھا۔ یوں بھی مروی ہے کہ موصل کے کنارے ایک گاؤں ہے جس کا نام ثمانین ہے۔ اس لیے کہ جب وہ کشتی سے نکلے تو وہاں پر اپنی ایک بستی آباد کی جس کا نام ثمانین پڑ گیا۔

تفسیر صوفیانہ آیت حتّٰی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا سے انسان کی بلوغت کا سن مراد ہے کہ اس وقت سے وہ شریعت کی کشتی میں سوار ہوتا ہے وَفَارَ التَّنُّوْرُ اور جسم کے قالب سے شہوت کی آگ جوش مارتی ہے قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا ہم نے کہا کہ کشتی میں سوار کیجیے مِنْ كُلٍّ نفس کے تمام صفات میں سے زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ اس کی ہر صفت اور اس کے بالمقابل کو، مثلاً شہوات اور اس کے بالمقابل عفت اور حرص، قناعت اور بخل اور اس کے بالمقابل سخاوت اور غضب اور اس کے بالمقابل حوصلہ اور کینہ اور اس کے بالمقابل سینہ کی صفائی اور عداوت اور اس کے بالمقابل محبت اور تکبر اور اس کے بالمقابل عجز اور حوصلہ اور اس کے بالمقابل عجلت کو۔ وَاَهْلَكَ اور اپنے ساتھ اپنے اہل یعنی روح کے صفات کو بھی کشتی میں ساتھ بٹھائیے اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ مگر جس نفس پر قضا وقدر سبقت کر گئی وَمَنْ اٰمَنَ اور وہ جو تیرے ساتھ ایمان لائے جیسے قلب اور سر وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اور اس کے ساتھ ایمان نہیں لاتے اِلَّا قَلِیْلٌ تھوڑے سے قلب کے صفات۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان صفات اور ان کے بالمقابل جتنی صفتیں ہیں جو بھی شریعت کی کشتی پر سوار نہ ہو سکا وہ فتنوں کے طوفان میں غرق ہو جائے گا۔

غیر مسلم فلاسفہ اور مغربیت زدہ مسلم کا ردّ اس سے ثابت ہوا کہ غیر مسلم فلاسفہ اور اہلِ اسلام کا ایک گروہ اباحیہ (اسی طرح ہمارے دور کے بعض مغربیت زدہ اسلام کے مدعی) کا پردہ فاش ہو گیا۔ جبکہ وہ کہا کرتے ہیں اخلاقِ ذمیمہ کا اخلاقِ حمیدہ سے علاج کرنا اور شریعت کا دامن تھامنے اور اس کی کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو اصلاح و علاج طبیعت سے ظاہر ہو وہ نجات کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتے کیونکہ طبیعت اصلاح وعلاج کی کیفیت نہیں جانتی اور نہ ہی اسے تزکیہ و تحلیہ نفس کی مقدار کی خبر ہے۔ اگر طبیعت نفس کی اصلاح و فساد سے واقف ہوتی تو ابتداءً ہی اس کا علاج کرتی اور نہ ہی نفس اپنے امراض کے لیے طبیب اور عالم بالامراض یعنی انبیاء علیہم السلام کا محتاج ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم اٰیٰته۔

تاکہ وہ امراض کو معلوم کر کے صحت کا پروگرام بنائیں اور بیماری پر اطلاع پا کر دوائی عنایت فرمائیں۔ ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة۔ یعنی حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تزکیہ سے صفاتِ طبعیہ کا تصفیہ کر کے اخلاقِ شرعیہ ربانیہ کے تحلیہ کے مستحق بناتے ہیں۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ

وَقَالَ اور نوح علیہ السلام نے ان اہلِ ایمان سے فرمایا جو آپ کے ساتھ تھے۔ اور یہ اس وقت فرمایا جب ہر حیوان کے جوڑے کشتی میں داخل کر لیے تو پھر اہلِ ایمان سے فرمایا: ارْكَبُوْا فِيْهَا۔ اس میں سوار ہو جاؤ۔

ف: کاشفی نے کہا کہ نوح علیہ السلام ان سب کو کشتی میں لائیں۔ ایک بڑا ستر پوش کشتی کے برابر تیار کیا ہوا تھا۔ اسے کشتی کے اُوپر ڈال دیا۔ اس کے بعد زمین سے پانی نے جوش مارا اور آسمان سے بھی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

ف: مروی ہے کہ نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کا تابوت کشتی میں لے گئے اور وہ بطور آڑ کے مرد و زن اور عورتوں کے درمیان رکھ دیا۔

ارْكَبُوْا فِيْهَا یعنی کشتی میں سوار ہو جاؤ فیھا ارکبوا سے متعلق ہے اور اسے فی سے اسی لیے متعدی کیا گیا ہے کہ ادخلوا کے معنے کو متضمن ہے یعنی کشتی میں داخل ہو جاؤ درانحالیکہ تم سوار ہو۔

ف: الارشاد میں لکھا کہ: الرکوب بمعنے متحرک شے کے اوپر ہونا اور یہ متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے اور یہاں پر فی سے متعدی ہونے میں اس طرف اشارہ ہے کہ نوح علیہ السلام کے اندر بیٹھنے کا حکم تھا اس لیے کہ ماموربہ یعنی کشتی کی سواری سے اس کے اوپر چڑھنا مطلوب نہیں بلکہ اس کے اندر بیٹھ کر جان بچانا مقصود تھا۔ چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ کشتی تین حصوں پر منقسم تھی؛ نچلے حصے میں درندوں، وحشی جانوروں اور دیگر حشرات الارض کو رکھا گیا۔ درمیانی حصے میں دواب اور عام جانور رکھے گئے۔ اوپر والے آخری طبقہ میں خود نوح علیہ السلام، آپ کے رفقا اور سامانِ خورد و نوش تھا۔ کشتی میں ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق جگہ ملی۔ یاد رہے کہ مرکوب بمعنی شے متحرک کے اوپر ہونا۔ جیسے پہلے گزرا۔ پھر وہ اس شے کی حرکت بالارادہ ہوتی ہے جیسے حیوان یا قسری، جیسے کشتی اور دھکے، مجلت کی حرکت وغیرہ وغیرہ۔ جب پہلے معنے کا اعتبار ہو تو متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے۔ جیسے رکبت الفرس۔ اگر دُوسرے یعنی محلیۃ کا اعتبار ہو تو لفظ فی سے متعدی ہو گا، جیسے رکبت فی السفینۃ۔

کشتی میں بیٹھنے اور اترنے کی تاریخ

منقول ہے کہ دس رجب کو کشتی میں سوار ہوئے، جمعہ کا دن تھا۔ ایک ہفتہ بیت کے گرد گھومتی رہی۔ ڈیڑھ سو دن تیرتی رہی۔ بعد ازاں ایک ماہ تک جودی پہاڑ پر رُکی رہی۔ جب کشتی سے اُترے تو ۱۰ محرم (یومِ عاشوراء) تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ ارکبوا کے متعلق اور اس کے فاعل سے حال ہے۔ دراصل عبارت یوں ہے: ارکبوا مسمین اللہ او قائلین اللہ۔ کشتی پر سوار ہو جاؤ درانحالیکہ تم اللہ کے نام لیوا ہو۔

ف: سعدی مفتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دراصل ملتبسین یا متبرکین باسم اللہ تھا۔ پہلی اور اس تاویل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بہرحال یہ حال مقدرہ ہے اس لیے کہ کشتی کا جاری ہونا اور اس کا کھڑا ہونا اس پر سوار ہونے کے بعد ہُوا۔

مَجْرٖىهَا بفتح المیم جرٰی سے وبکسر الراء امالہ کر کے پڑھنا ہو گا (یعنی راء کو مجہول کر کے) اور اس کا منصوب ہونا علی الظرفیہ ہے ای وقت مجرٖیھا یعنی کشتی کے جاری ہونے کے وقت۔ وَمُرْسٰىهَا ط اور اس کے کھڑا ہونے کے وقت۔ مُرْسٰی بمعنے الحبس والثبوت ہے۔

ف : کواشی میں ہے کہ بسم اللہ مجرىها خبر بتدا ہیں اور مرسٰها کا مجرىها پر عطف ہے۔ ان کا معنیٰ یوں ہوا کہ بسم اللہ اجرائها وارسائها۔

ف : مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی کو چلانا چاہتے تو پڑھتے بسم اللہ۔ اس کلمہ کی برکت سے کشتی چل پڑتی۔ اور جب چاہتے کہ وہ ٹھہر جائے تو بھی بسم اللہ پڑھتے۔ اس کلمہ کی برکت سے کشتی ٹھہر جاتی۔ مجری بضم المیم ہو یا بفتح المیم بمعنے اجراء (مصدر) ہے مثلاً کہا جاتا ہے:

اَجْرَیْتُهٗ وجریتُ بِهٖ۔ یعنی میں نے اسے جاری کیا (چلایا)۔

ہر دو لغات مستعمل ہیں جیسے اذهبة و ذهبت بهٖ۔ دونوں طرح آیا ہے۔ اسی طرح مُرسٰی بضم المیم ارسٰت السفینة ترسی (بمعنے ٹھہر گئی کشتی اور ٹھہر جاتی ہے) سے ہے۔

اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ بے شک میرا رب ذنوب وخطایا بخشتا ہے جو رحیم ہے۔

یہ اس کی رحمت ہی تو تھی کہ اس نے تمہیں ایسی بڑی مصیبت سے بچایا ورنہ تمہیں نجات کب نصیب ہوتی۔

مسئلہ : اس سے ثابت ہوا کہ انھیں ان کے کسی استحقاق کی وجہ سے نصیب نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائی۔ یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔

حکایت

ایک بڑھیا کا نوح علیہ السلام پر گزر ہوا جب آپ کشتی تیار کر رہے تھے اور وہ بھی انھی لوگوں سے جو نوح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے۔ بڑھیا نے پوچھا : یا حضرت ! آپ کیا کر رہے ہیں؟ نوح علیہ السلام نے فرمایا : ایک وقت آئے گا اللہ تعالیٰ کفار کو طوفان سے غرق کر دے گا اور اہل ایمان کو اس کشتی کے ذریعے بچائے گا۔ بڑھیا نے عرض کی : یا حضرت ! جب طوفان آئے تو مجھے بھی مطلع فرمانا تاکہ میں بھی آپ کی رفاقت کی برکت سے نجات پاؤں اور کشتی میں سوار ہو سکوں۔ جب طوفان آیا تو نوح علیہ السلام خلق خدا کو کشتی پر سوار کرنے میں مشغول رہے اور آپ کو بڑھیا یاد نہ رہی۔ اور تھی بھی وہ نوح علیہ السلام کے دولت کدہ سے بہت دور۔ لیکن طوفان آیا اور گزر گیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام بحفاظت نیچے اترے۔ چند دنوں کے بعد وہی بڑھیا حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی : یا حضرت ! ابھی طوفان نہیں آیا؟ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا : طوفان تو آیا تھا مگر تو کہاں رہی ! عرض کی : اپنے جھونپڑے میں۔ قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بڑھیا کو اس جھونپڑے میں ہی نجات بخشی۔ ادھر پانی جودی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گیا اور ادھر بڑھیا کی جھونپڑی تک نہ پہنچ سکا۔ اور بڑھیا کو طوفان کا علم بھی نہ ہوا۔

سبق : اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے بندوں کی خبرگیری اور حمایت فرماتا ہے۔

ف : بعض اہل کشف فرماتے ہیں بلدۂ بروسہ میں اسی جامع مسجد کبیر کے مقام پر اس بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ (کذا فی الواقعات المحمودیہ)

مثنوی شریف میں ہے : ؎

کاملان از دور نامت بشنوند
تا بقعر باد و بود در روند
بلکہ پیش از زادن تو سالہا
دیدہ ات باشندت ترا با حالہا
ہر کسے اندازۂ روشن دلے
غیب را بیند بقدر صیقلے

ترجمہ: کامل دور سے تیرا نام سُن کر بہت دور تک چلے جاتے، تمہارے حال سے واقف ہوتے ہیں بلکہ ہماری پیدائش سے پہلے کئی سال ہمارے حالات جانتے ہیں اور ہر ایک اپنے دل کی روشنی کے مطابق غیبی باتیں جانتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ شریعت کی کشتی کی علت غائی بھی یہی ہے کہ اپنے سوار کو نفس و دنیا کے طوفان سے نجات دلائے۔ ارکبوا میں اسرار شریعت کا کشف مراد ہے وہ اس لیے کہ جو بھی شریعت کی کشتی پر محض آباء و اساتذہ کی تقلید میں بیٹھتا ہے تو اس سے اسے کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں صرف اسے فائدہ ہے جو مقامِ ادب کو مدنظر رکھ کر کشتی شریعت پر بیٹھتا ہے۔ بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا میں اشارہ ہے کہ بندے کی سیر بھی اللہ تعالیٰ کی جانب ہے اور اس کی منزلِ مقصود بھی وہی۔ لہٰذا فرمایا:

ان الی ربک المنتھٰی۔

ان ربی لغفور یعنی جو کشتی پر سوار ہوتا ہے اس کو نجات دینے میں میرا رب غفور ہے۔ رحیمٌ جو اپنی طبعی خواہش سے نہیں بلکہ حکم ربانی سمجھ کر کشتی پر سوار ہوتا ہے اس کے لیے رحیم ہے۔

تفسیر عالمانہ وَہِیَ اور یہ کشتی تَجۡرِیۡ چلتی تھی۔ مضارع بمعنے ماضی استمراری ہے۔ بِہِمۡ یہ تجری کے فاعل سے حال ہے۔ یہ دراصل وھم فیھا تھا۔ یعنی درانحالیکہ وہ اسی کشتی میں تھے اور وہ کشتی ان کو لے جا رہی تھی۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہ با تعدیہ کی ہو۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

اجریتہٗ وجریت بہ۔ یعنی میں نے اسے جاری کیا۔

جیسے: اذھبت و ذھبت بہ۔

اب معنی یوں ہُوا کہ وُہ کشتی انھیں لے کر جا رہی تھی اور جملہ کا عطف جملہ مقدرہ پر ہے جس پر ارکبوا دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ فرکبوا فیھا مستبین ہے۔ یعنی وُہ لوگ بسم اللہ پڑھ کر کشتی میں سوار ہو گئے اور وہ کشتی انھیں اٹھا کر چل پڑی۔ فِیۡ مَوۡجٍ طوفان کی موجوں میں۔ اور اس وقت طوفان زوروں پر تھا۔ ہر جگہ کو ہر سمت سے موسلا دھار بارش کی طرح گھیرے ہوئے تھا۔

ف: الموج، موجہ کی جمع ہے۔ وُہ پانی جو زمین سے اُوپر زور سے اُچھلے اور اس کے ساتھ سخت ہوا بھی چلے۔

كَالْجِبَالِ پہاڑوں کی طرح ۔ طوفان کی ہر موج کو پہاڑ کی موٹائی اور اس کی بلندی اور اسے تہ بہ تہ ہونے میں تشبیہ دی ہے۔

سوال : کشتی تو طوفان کی موج کے اُوپر چل رہی تھی۔ اس کا موج کے اندر جاری ہونے کا کیا معنیٰ۔

جواب : دراصل طوفان کی موجیں کشتی کو ارد گرد سے گھیر چکی تھیں اور کشتی کا کچھ حصہ موج کے اندر تھا۔ اسے اعتبار سے اسے فی موج سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سوال : پانی اتنا زیادہ تھا کہ اس نے زمین و آسمان کا درمیانی حصہ بھر دیا تھا۔ اس صورت میں کشتی کا چلنا کیسا۔

جواب ۱ : یہ اس وقت کی بات ہے جب پانی کی ابتدا تھی اور ابتدا میں کشتی چلتی رہی۔

جواب ۲ : یہ کشتی مچھلی کی طرح اس طوفان کے اندر چلتی رہی لیکن پانی اسے نقصان نہ پہنچاتا تھا اس لیے کہ قادر مطلق اپنی قدرت سے پانی کشتی کے اندر نہ جانے دیتا تھا۔ جیسے مچھلی پانی کے اندر غوطے لگاتی رہتی ہے لیکن اسے پانی نقصان نہیں دیتا۔ ایسے ہی کشتی کو ، کما قال تعالیٰ اتخذ سبیلہ فی البحر سربا۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی ہے کہ وہ اپنی قوم کو لے کر دریا میں چل پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے دریا کے اندر دریچے کھول دیے اور سڑکیں بھی بنا دیں۔ اور وہ اس میں چلتے رہے۔ لیکن دریا نے انہیں کچھ نقصان نہ پہنچایا۔

وَنَادٰی اور آواز دی نُوْحُ نِ ابْنَهٗ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو۔ جس کا نام بعض کے نزدیک کنعان اور بعض کے نزدیک یام تھا۔ اور مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ وہ کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا پروردہ تھا یا حقیقی بیٹا۔ اکثر علمائے ظواہر تو کہتے ہیں کہ وہ ان کا پروردہ تھا کیونکہ نبی معصوم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ کافر ہو۔ اور وہ اپنی تائید میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے یہاں نادیٰ نوح ابنہا پڑھا ہے یعنی انہوں نے اپنی عورت کے لڑکے کو ندا دی۔ اور ابنہا کی ضمیر آپ کی زوجہ واعلہ (بالعین المہملہ) یا واعلہ کی طرف راجع ہے۔ (کذافی التبیان)

ان کی دُوسری دلیل یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے عرض کیا تھا :

ان ابنی من اھلی۔ یعنی وہ میرے اہل سے ہے۔

اگر ان کا حقیقی لڑکا ہوتا تو آپ من اھلی کی بجائے مِنی کہتے۔ لیکن جمہور علمائے محققین (اہلِ حق) قدست اسرارہم فرماتے ہیں کہ وہ ان کا حقیقی لڑکا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابنہ : نوح کا بیٹا اور خود نوح علیہ السلام نے کہا ؛ یا بنی اے میرے بیٹے۔ اس سے واضح ہے کہ وہ ان کا حقیقی بیٹا تھا۔

جن لوگوں نے اسے نوح علیہ السلام کا پروردہ کہہ کر دلیل قایم کی کہ معصوم نبی کا بیٹا کافر نہیں ہو سکتا۔ اس وہم

ازالۂ اوہام کا ازالہ صاحب روح البیان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارا یہ کلیہ غلط ہے کیونکہ آدم علیہ السلام نبی تھے ، ان کا بیٹا قابیل کافر تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے زندہ کو مردہ سے اور مردہ سے زندہ کو پیدا کرتا ہے۔ اور یہ بھی اس کی حکمت ہے کہ وہ

اپنے جمال و جلال کے مظاہر مختلف پہلوؤں سے ظاہر فرماتا ہے۔ اور یہ بھی اپنے مقام پہ صاحب رُوح البیان کے نزدیک ثابت ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین[1] اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کافر تھے۔ جب نبی کے والدین کافر ہوتے ہیں تو ان کی اولاد کیوں کافر

---

[1] صاحب روح البیان کا یہ قول غیر معتبر ہے کیونکہ جمہور کا مذہب ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدگرامی مومن موحد تھے۔ اس کے متعلق مندرجہ ذیل دلائل ملاحظہ ہوں۔

ہم خود صاحبِ روح البیان (ج ۱، ص ۱۴۰) پہلے پارہ سے عربی عبارت کی بجائے اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے اپنے قول کا رد اسلاف کے اقوال سے ہو۔ فرماتے ہیں کہ علمائے سلف صالحین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے درباره ابوین شریفین نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اختلاف کیا ہے۔ کیا ان کی وفات شریف کفر کی حالت میں ہوئی ہے یا نہیں۔ ایک گروہ نے قول اول اختیار کیا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب تیسیر ہیں۔ اور ایک جماعت نے قول ثانی کی طرف رجوع کیا ہے۔ ان لوگوں نے ان احادیث شریف سے استدلال کیا ہے جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب شریف کی طہارت اور پاکیزگی ثابت ہوتی ہے شرک کی پلیدی اور کفر کی ذلت سے۔ پہلی جماعت سے بعض لوگ ان کی نجات از نارِ جہنم کے قائل ہیں، ان میں امام قرطبی کی شخصیت بلند ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ خداوند کریم نے ابوین شریفین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے زندہ کیا۔ پھر وہ ایمان لا کر زمرۂ مسلمین میں داخل ہو گئے۔

الغرض علمائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین گرامی کا ایمان اور ان کی نجات تین طریقوں سے ثابت کی ہے:

۱۔ ایک گروہ علماء نے ان آیات واحادیث شریف سے استدلال کیا ہے جو حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی طہارت نسبی پر دال ہیں۔ ان لوگوں نے حضور پُرنور کے والدین گرامی سے لے کر تا سیدنا آدم صفی اللہ اور اُم البشر حوا صاحبہا علیہما السلام تک تمام سلسلہ نسب گرامی کے جملہ مرد و زن کو کفر و شرک کی نجاست سے بری قرار دیا ہے۔ اور فرمایا کہ وہ سب ملتِ توحید پر قایم تھے۔ مجدد مائۃ عاشر علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیفات میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

۲۔ علمائے کرام کے ایک گروہ نے احادیث احیاء ابوین شریفین سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین گرامی بعد از وفات بوقت حجۃ الوداع حضور علیہ السلام کی دعا سے زندہ کیے گئے اور دعوتِ اسلام قبول کرنے کے معاً بعد فوت ہو گئے۔ اجلۂ علمائے ماوراء النہر سے شیخ شمس الدین کردی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ قرطبی کا یہی مسلک ہے۔

۳۔ بعض علمائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اثبات ایمان ابوین گرامی میں ذکر کیا ہے کہ ہمارے آقائے نامدار تاجدار مدنی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین زمانۂ فترت انبیاء میں تھے۔ ان دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ نہیں پایا۔ آپ کے زمانۂ طفولیت میں فوت ہو گئے۔ اس لیے وہ موافق قاعدہ اصول اسلام معذور اور سزاوار عذاب کے نہیں۔ لقولہ تعالیٰ:

وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔ (بنی اسرائیل۔ پ ۱۵)

اور ہم ان کو عذاب کرنے والے نہیں یہاں تک کہ ہم رسولوں کو مبعوث کریں۔

بنابراں وہ دونوں تحت احکام اہالیان زمانۂ فترت انبیاء کے شمار کیے جائیں گے۔ اہالیان زمانۂ فترت بالکل معذور ہیں، اور قابل مواخذہ نہیں۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ نوح علیہ السلام کا اپنا بیٹا کافر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت بھی ہمارے منافی نہیں اس لیے کہ لے ماں کے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آباءِ کرام کے مومن ہونے کے دلائل قرآنی مع تفاسیر

۱۔ الذی یراك حین تقوم وتقلبك فی الساجدین۔ (سورۃ شعراء۔ پ ۱۹)

ترجمہ: جو دیکھتا ہے تجھ کو جب تُو کھڑا ہوتا ہے نماز کو۔ اور تمہارا گردش کرنا بیچ سجدہ کرنے والوں کے۔

۲۔ قال ابن عباس رضی اللہ عنہ اراد تقلبك فی الاصلاب الانبیاء من نبی الی نبی حتی اخرجك فی هذه الامة۔

ترجمہ: (حضرت عبداللہ) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیہ تقلبك سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کا پشتِ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں گردش کرنا مراد ہے۔ یعنی ایک نبی کی پشت سے دُوسرے نبی کی پشت مبارک میں نقل کرنا مراد ہے۔ یہاں تک کہ حضور پُرنور اس امتِ مرحومہ میں مبعوث ہوئے۔ (خازن ص ۱۰۰۔ جلد ۵۔ مدارج النبوت ج ۱، ص ۵)

۳۔ معالم التنزیل مصری برحاشیہ خازن ج ۵ ص ۱۰۰ محی السنۃ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قوله تعالیٰ وتقلبك فی الساجدین شعراء والساجدون هم الانبیاء قال عطاء وابن عباس رضی اللہ عنهما اراد وتقلبك من نبی حتی اخرجتك فی هذه الامة۔

ترجمہ: اور تمہارا ساجدین میں گردش کرنا مراد ہے اور ساجدین سے مراد حضرات انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، عطاء اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی کا ایک نبی سے دُوسرے نبی کی پشت مبارک میں گردش کرنا اور انتقال کرنا مراد ہے یہاں تک کہ آپ کو اس امت مرحومہ میں پیدا کیا۔

۴۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ساجدین کی تفسیر انبیاؑ سے کی ہے۔ آپ نے قول کی تصدیق اور تائید میں عطاء اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل کی ہے۔

۵۔ امام قاضی عیاض مالکی صاحب کتاب الشفاء فی حقوق المصطفیٰ مصری جلد اول ص ۱۲ پر رقمطراز ہیں:

قوله تعالیٰ وتقلبك فی الساجدین قال ابن عباس رضی اللہ عنه من نبی الی نبی حتی اخرجتك نبیا۔

ترجمہ: اور گردش کرنا تمہارا بیچ سجدہ کرنے والوں کے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ساجدین سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نبی سے دُوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پشت مبارک میں گردش کرنا مراد ہے۔ یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم ارواح میں ہمیشہ انبیاء کرام علیہم السلام کی پشتوں میں گردش کرتے چلے آئے ہیں۔ نسیم الریاض ترجمہ شفائے عیاض۔ ص ۱۶)

(باقی برصفحہ آئندہ

منسوب کرنے میں اشارہ تھا کہ وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح کافرہ اور نوح علیہ السلام کے طریقۂ حق سے رُوگرداں تھی۔ اور مناسب بھی یہی ہے کہ کافر کو کافر سے منسوب کیا جائے نہ کہ اہلِ ایمان سے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت کا مفہوم یہی بتاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ وہ نوح علیہ السلام کا بیٹا نہیں تھا۔ اور اہلِ ظواہر کا یہ کہنا کہ انہٗ لیس من اهلك ایک وہم ہے ورنہ اس سے نوح علیہ السلام کے حقیقی بیٹے کی نفی کیسے ہوئی۔ نیز ان ابنی من اهلی نوح علیہ السلام نے کہا تو انہٗ لیس من اهلك کی مناسبت پر جیسا کہ اہلِ فن سے مخفی نہیں۔

سوال: حضرت نوح علیہ السلام نے جب خود دعا مانگی تھی:

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

۶۔ تفسیر جامع البیان حاشیہ جلالین مجتبائی دہلی ص ۳۱۴ میں ہے:

قولہ تعالیٰ وتقلبك فی الساجدین ای تقلبك فی اصلاب اٰباءك الانبیاء من نبی الی نبی حتی اخرجك نبیا۔

ترجمہ: اور گردش کرنا تمہارا بیچ سجدہ کرنے والوں کے کہا اس سے مراد حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے آباؤ اجداد حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مبارک پشتوں میں پھرتے آنا مراد ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی کرکے نکالا۔

۷۔ تفسیر صاوی علی الجلالین ج ۳، ص ۲۸۷

تحت قول اللہ تعالیٰ وتقلبك فی الساجدین والمراد بالساجدین المؤمنون والمعنی یراك متقلبًا فی اصلاب وارحام المؤمنون من لدن اٰدم الی عبد اللہ فاصولہٗ جمیعًا مؤمنون۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور گردش کرنا تیرا بیچ سجدہ کرنے والوں کے، ساجدین سے مراد اہلِ ایمان ہیں۔ معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ حضور پُرنور فداہ روحی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بیچ عالم ارواح کے ہمیشہ اصلاب آباء کرام اور ارحام امہات اہل الایمان میں انتقال پذیر ہوتے دیکھتا رہا ہے سیدنا حضرت آدم صلوٰۃ اللہ علی نبینا وعلیہ التسلیم سے لے کر حضور پرنور کے والد ماجد سیدنا حضرت عبد اللہ تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء و اجداد اور سب امہات وجدات مع آپ کے والدین گرامی کے سلسلہ بسلسلہ سیدنا آدم و مائی صاحبہ حوا علیہما السلام تک سب کے سب ایمان دار تھے۔ کوئی شخص ان میں سے کافر و مشرک نہ تھا۔ یہ آیہ کریمہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصول مرد و عورت کی طہارت پر شاہد ناطق ہے۔

اکثر مفسرین کرام اور علمائے عظام نے اس آیہ شریفہ سے جناب سرورِ کائنات فخرِ موجودات سید الکونین نبی الحرمین امام القبلتین سیدنا و شفیعنا حضرت محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام مع آبائہٖ والکرام الی یوم القیام کی طہارت نسبی پر استدلال کیا ہے، بلکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اہل بیت نبوت سے مفسر قرآن سیدنا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ تفسیر ہے۔

مزید تفصیل کے لیے رسائل سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ اور اعلیٰحضرت کا رسالہ "شمول الاسلام" دیکھیے۔

رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔

اے اللہ! زمین پر کسی کافر کا جھونپڑا نہ چھوڑ۔

اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کا لڑکا کافر ہے، تو پھر اسے کشتی میں بیٹھنے کے لیے کیوں پکارا؟

جواب[1]: شفقتِ پدری نے آپ کو اس کے کفر سے غیر متوجہ رکھا۔ علاوہ ازیں الا من سبق علیہ القول بھی اجمالی طور پر کہا گیا تھا۔ اس اجمال سے آپ نے شفقتِ پدری کی وجہ سے اپنے بیٹے کو ان میں داخل نہ سمجھا۔ (کذا فی حواشی ابن الشیخ)

وَكَانَ اور نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا فِیْ مَعْزِلٍ علیحدہ مکان میں یا علیحدہ ان کے دین سے کیونکہ وہ کافر تھا۔ (کذا فی الکواشی)

ف: الارشاد میں ہے کہ وہ اپنے باپ، بھائیوں بلکہ جملہ قوم سے الگ تن تنہا ایک مکان میں رہتا تھا۔ اسی لیے وہ ارکبوا کی آواز نہ سن سکا تھا یہی وجہ ہے کہ اسے علیحدہ آواز دینے کی ضرورت پیش آئی۔

ف: فی معزل کا محل نصب ہے کیونکہ ابنہ سے حال ہے اور حال منادی سے بھی واقع ہو سکتا ہے کیونکہ منادی درحقیقت مفعول ہوتا ہے اور المعزل بکسر الزاء عزل اسم مکان ہے بمعنے علیحدگی اور دور رہنا۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

عزلہ عنہ۔

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کو کسی جگہ یا عہدے سے دور کرے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے شفقتِ پدری سے فرمایا: يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا بار کو میم میں مدغم کر کے پڑھنا چاہیے کیونکہ باء اور میم قریب المخرج ہیں اور قریب المخرج الفاظ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ اے میرے بیٹے! کشتی میں ہمارے ساتھ سوار ہو جائیے۔

سوال: ارکب فی الفلک کیوں نہ فرمایا۔ یعنی الفلک کا ذکر کیوں نہ کیا۔

جواب: چونکہ وہ کشتی میں سوار ہو چکے تھے۔ اسے اپنی معیت کی دعوت دے رہے تھے۔ اسی لیے الفلک کی تصریح کی ضرورت محسوس نہ فرمائی۔

وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اور کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ ہلاک ہو جائے گا۔ یعنی زمین پر کافروں کے ساتھ ضد کر کے نہ کھڑا ہو۔ کشتی میں آجائیے اس سے باہر نہ رہو۔

سوال: یہاں دین کی تبلیغ نہ فرمائی صرف کشتی میں بلانے کا کیا فائدہ؟

جواب: چونکہ اسے تباہی و ہلاکت سے بچانا مطلوب تھا اسی لیے اسے ڈرایا ورنہ کفر سے نکلنے کے لیے تو پہلے بھی بارہا فرما چکے تھے۔ اب اس کا واحد علاج یہی تھا۔ (کذا فی الارشاد) لیکن اس کی بدقسمتی کہ اس نے یہ بھی نہ مانا تو تباہ و برباد ہوا۔

صاحبِ روح البیان کی تقریر صاحبِ روح البیان فرماتے ہیں کہ اس نے اس وقت علیحدہ مکان میں اس لیے

---

[1] یہ جواب وہابیہ کے سوال کے لیے بھی ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

قیام کیا کہ اگر طوفان آیا بھی تو دوسرے ساتھیوں سمیت پہاڑ پر چڑھ جائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: اے بیٹا! ایمان کی دولت قبول کر کے ہمارے ساتھ کشتی میں آجایئے۔ اس طرح سے ایک طرف تم ایمان کی دولت سے مالامال ہو جاؤ گے اور دوسری طرف ہلاکت و تباہی سے بچ جاؤ گے۔ کافروں کی رفاقت نہ کرو کیونکہ جو ان کا رفیق ہوگا وہ انہی کی طرح عذاب میں مبتلا ہو جائے گا اس لیے کہ القرین فی حکم قرینہ ہر ساتھی اپنے ساتھی کے حکم میں ہوتا ہے۔ کما قال فی مقام آخر۔ وکونوا مع الصادقین۔ اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

سوال[1]: جب نوح علیہ السلام واوحی الی نوح انہ لن یومن من قومك الا من قد امن کا ارشاد گرامی سن چکے تھے اور اس سے ہر کافر سے امیدیں منقطع ہو چکی تھیں تو پھر اپنے کافر بیٹے کو کیوں کشتی پر سوار ہونے کو کہا؟

جواب[1]: اس میں تصریح تو نہیں کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی کافر ہے۔ یہ اسی طرح مجمل ہے جیسے الا من سبق علیہ القول۔ اور اسکی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

جواب[2]: اولیاء کاملین اور انبیاء معظمین علیہم السلام کے لیے ہر وہ امر محال نہیں ہوتا جسے عوام ناممکن یا ممتنع سمجھتے ہوں جب تک اللہ تعالیٰ ان کے لیے تصریح نہ فرمائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو خصوصاً ان کے بیٹے کے لیے تصریح نہیں فرمائی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے معاملہ میں پُر اُمید رہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا کہ آپ کا بیٹا قابلِ بخشش نہیں۔ اس کے بعد نوح علیہ السلام نے اپنی جد وجہد ترک کر دی۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سی ہے کہ انھوں نے دیدارِ الٰہی کا مطالبہ کیا حالانکہ اس کے استحالہ کی کیفیت اپنی قوم کے متعلق دیکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود مطالبہ کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ امر محال ہے تب کہیں خاموش ہوئے اور اپنے مطالبے سے باز آئے۔

قَالَ نوح علیہ السلام کے بیٹے نے کہا سَاٰوِیۡۤ میں پناہ لوں گا اِلٰی جَبَلٍ کسی ایک پہاڑ سے یَّعۡصِمُنِیۡ وہ مجھے بچائے گا (یعنی طوفان کی موجوں سے بچ کر پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا) مِنَ الۡمَآءِ پانی سے۔ اس بنا پر میں غرق نہیں ہوں گا۔ آپ اپنا کام کیجئے نہ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں نہ کشتی پر سوار ہوتا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ پانی بھی دوسرے عام پانیوں کی طرح ہوگا۔ یا اسی قدر سیلاب ہوگا جیسے عموماً دنیا میں سیلاب آتے رہتے ہیں۔ اسی لیے اس نے پہاڑ کے سہارے کی بات کی کیونکہ ایسے سیلابوں سے وہ لوگ پہاڑوں پر چڑھ جایا کرتے تھے۔ مگر یہ سیلاب عام نہ تھا بلکہ یہ تو خصوصاً کفار کو غرق کرنے کے لیے تھا اور اس سے بچاؤ کا واحد راستہ یہی تھا کہ وہ ایمان لا کر کشتی میں سوار ہو جاتے۔ لیکن وہ نہ مانا اور پہاڑ کا سہارا بتایا تو قَالَ نوح علیہ السلام نے فرمایا لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ آج کوئی کسی کو نہیں بچا سکے گا۔ الیوم کی قید اس لیے بڑھائی تاکہ اشارہ ہو کہ یہ دن دوسرے دنوں کی طرح نہیں ہے کہ مصائب آئے اور گئے ان کے مصائب سے بچنے کی تدبیریں کام آسکتی ہیں لیکن آج کے دن سے بچنا مشکل ہے کہ یہاں سب تدبیریں بیکار ہو کر رہ جائیں گی مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کے حکم سے

---

[1] وہابی دیوبندی اسی قسم کے سوال کرتے ہیں لیکن ان کی طرز نرالی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اگر علم و اختیار ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کے لیے دعا نہ مانگتے۔ [2] اگر مانگی تو پھر قبول نہ ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے لیے یہ جوابات کام دیں گے۔ ایک پہلے گزرا، دوسرا یہ ہے۔ تفصیل تفسیر اویسی میں دیکھیے۔

یعنی اس کے عذاب جسے طوفان کی شکل میں بھیجا گیا۔ اس میں نوح علیہ السلام کے بیٹے کو تنبیہ ہے کہ وہ طوفان کو عام پانی سمجھ رہا تھا اور اسی خیال میں تھا جیسے عام سیلابوں سے حفاظتی تدابیر کر کے بچا جا سکتا ہے یہاں بھی کوئی تدبیر کام دے جائے گی۔ مثلاً پہاڑ یا کسی دیگر اونچے مکان پر چڑھ جائے گے وغیرہ وغیرہ۔ اور ساتھ یہ بتانا بھی مطلوب ہے کہ اس طوفان سے نجات صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور کسی کو اس سے نکلنے بچانے کا اختیار نہیں۔ چنانچہ حرف الا سے بطور حصر بیان فرمایا۔ گویا یوں کہا:

لا عاصم من امر اللہ الا ھو۔

اللہ تعالیٰ کے عذاب سے سوائے اس کے اور کوئی بچانے والا نہیں۔

کما قال اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ج بمعنے الا الراحم۔ اس سے اللہ تعالیٰ مراد ہے۔ اس کی عظمت شان کی وجہ سے مبہم طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر تفسیر کی گئی ہے یا پہلے بطور اجمال پھر اس کی تفصیل بتائی۔ اور اشارہ فرمایا کہ اس کے غضب وقہر پر اس کی رحمت غالب ہے اور یہ استثناء متصل ہے۔ عاصم اور راحم مفہوم کے لحاظ سے ایک ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہاں عاصم بمعنے معصوم ہے جیسے ماء دافق بمعنے ماء مدفوق اور عیشۃ راضیہ بمعنے مرضیۃ ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ لا معصوم من عذاب اللہ الا من رحم اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا ہوگا مگر وہ کہ جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ عاصم بمعنے ذو عصمۃ ہے۔ یعنی لا ذا عصمۃ یہاں مضاف محذوف ہے اس میں سے نسبت کا معنیٰ مراد ہے اور ذو عصمۃ عاصم اور معصوم دونوں کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں بمعنی معصوم ہے۔ اس اعتبار سے عصمۃ مصدر مبنی للمفعول ہوگا جیسے پہلے دو استثناء متصل میں کیونکہ مرحوم بھی معصوم کی جنس سے ہوتا ہے۔ وَحَالَ اور حائل ہوئی بَیْنَہُمَا الْمَوْجُ باپ بیٹے کے درمیان طوفان کی موج۔ اس کے بعد ان کی آپس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ○ پس ہو گیا منجملہ ان لوگوں کے جو پانی میں غرق ہو کر تباہ و برباد ہوئے۔ اس جملہ سے نوح علیہ السلام کے بیٹے کا غرق ہونا ثابت ہوا وہاں دوسرے کافروں کا تباہ و برباد ہونا بلیغ ترین طریقہ سے واضح ہوا۔ کیونکہ یہ وہ طریقہ ہے کہ جس کا وقوع یقینی ہے جس کے لیے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

ف: صار کے بجائے کان میں ابن نوح علیہ السلام کے کافروں سے ہونے کے متعلق اظہار میں مبالغہ مطلوب ہے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

ہمچو کنعان کاشنا میکرد او
کہ نخواہم کشتی نوح عدو
ہین بیا در کشتی بابا نشین
تا نہ گردی غرق طوفان ای مہین
گفت نی من آشنا آموختم
من بجز شمع تو شمعی افروختم

ہین مکن کین موج طوفانِ بلاست
دست و پائے آشنا امروز لاست

باد قہرست و بلائے شمع کش
جز کہ شمع حق نمی پاید خمش

گفت می رفتم بران کوہ بلند
خاصہ آنکہ مرا از بر گزند

ہین مکن کہ کابست این زمان
جز حبیب خویش را ندہد امان

گفت من کے پند تو بشنودہ ام
کہ طمع کردی کہ من زین دودہ ام

خوش نیامد گفت ہرگز مرا
من بری ام از تو در ہر دوسرا

این دم سرد تو در گوشم نرفت
خاصہ اکنون کہ شدم دانا و زفت

گفت بابا چہ زیان دارد اگر
بشنوی یکبار تو پند پدر

ہمچنیں می گفت او پند لطیف
ہمچناں می گفت او دفع عنیف

نی پدر از نصح کنعاں سیر شد
نی دمی در گوشِ آں ادبیر شد

اندریں گفتن بدند و موج تیز
بر سر کنعان زدو شد ریز ریز

ترجمہ: ایسے ہی جواب دیتے ہوئے کنعان نے کہا کہ میں نوح علیہ السلام کی کشتی کے قریب بھی نہ جاؤں گا۔ لیکن اسے کہا گیا کہ آجائیے اور اپنے باپ کی کشتی میں بیٹھ جائیے۔ طوفان کے غرقاب سے بچ جاؤ گے۔ کنعان نے کہا میں تیرا جانا نہیں۔ اے ابا! میں تیری شمع کے علاوہ اپنی شمع جدا جلاتا ہوں۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا:

بیوقوف مت بن کہ یہ طوفان عذابِ الٰہی ہے اس میں تیرنا وغیرہ کام نہیں دے گا اور یہ وُہ قہری ہُوا ہے کہ سوائے حق کی شمع کے باقی تمام شمعیں بجھ جائیں گی۔ کنعان نے کہا کہ میں اس بڑے پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا وہی مجھے ہر نقصان سے بچا لے گا۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ آنے والے طوفان کے سامنے یہ پہاڑ لاشئ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی اس کے نقصان سے تجھے نہیں بچا سکے گا۔ کنعان نے کہا میں آپ کی بہت نصیحتیں سُن چکا ہُوں مجھے اپنے ماننے والوں سے مت سمجھیے مجھے آپ کی کوئی بات بھی پسند نہیں آتی۔ آپ سے ہر دو جہان میں بیزار ہوچکا ہُوں۔ آپ کی کوئی نصیحت میرے کانوں میں اثر نہیں کر سکتی کیونکہ میں آپ سے زیادہ باشعور ہُوں۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا: بیٹے! کیا ہی اچھا ہو اگر ایک بار تُو میرا کہا مان لے اس سے تیرا کون سا نقصان ہوتا ہے۔ نوح علیہ السلام اسی طرح میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے لیکن شومیٔ قسمت سے اس کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔ مگر باپ، بیٹے کی نصیحت سے کب سیر ہوتا ہے۔ اسی طرح باپ اور بیٹا باہم مصروفِ گفتگو تھے کہ طوفان کی موج کی ٹکر لگی اور کنعان ریزہ ریزہ ہوگیا۔

کنعان کا انجام

مروی ہے کہ اس نے پہاڑ کی بلندی پر ایک اُونچا قبہ بنایا جو اس قدر مضبوط تھا کہ اس میں ہوا کا گزر بھی مشکل تھا۔ پیشاب نے تنگ کیا۔ اسی قبہ کے اندر پیشاب کر دیا۔ وہ پیشاب بجائے نکلنے کے یا وہیں پر جذب ہونے کے، بڑھنے لگا۔ پیشاب اس قدر بڑھا کہ کنعان اپنے اسی پیشاب میں غرق ہوگیا اور دیگر کفار طوفان کی موج میں۔

طوفانی بارش کا بیان

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ چالیس شب و روز مسلسل موسلادھار بارش ہوتی رہی اور ساتھ ساتھ زمین بھی پانی اُگلتی رہی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ففتحنا علیھم ابواب السماء بماء منھمر وفجرنا الارض عیونا فالتقی الماء علی امر قد قدر[1]

پس ہم نے تیز رفتار پانی کے آسمان سے دروازے کھول دیے اور زمین کے چشمے بہا دیے۔ اس طرح سے پانی چلا اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو ان کے لیے مقدر ہوچکا تھا۔

وہاں کے سب سے اونچے پہاڑ کے اُوپر پندرہ یا تیس یا چالیس گز پانی چڑھ گیا اور کشتی اس پانی کے اُوپر پانچ ماہ تک تیرتی رہی۔

بیت اللہ طوفان سے محفوظ رہا

کشتی پانی پر تیرتی ہُوئی حرم شریف پہنچی۔ کیں بھی زمین کا کوئی حصہ خالی نہ تھا کہ وہاں پہنچ قرار پکڑتی۔ لیکن حرم شریف کو اللہ تعالیٰ نے طوفان سے محفوظ رکھا تھا کشتی اس کے گرد سات دن چکر کاٹتی رہی۔ (کذا فی البحر العلوم)[2]

اعجوبہ بیت اللہ جسے آدم علیہ السلام نے تیار فرمایا طوفان کے وقت اللہ تعالیٰ نے اسے چھٹے آسمان پر اُٹھا لیا۔ اسی کا نام

---

[1] سورۃ القمر۔ ع ۱

[2] یہ البحر العلوم تفسیر ہے شرح مثنوی مولانا لکھنوی کا نام بھی بحر العلوم ہے لیکن یہ بعد کی شرح مثنوی ہے اور وہ تفسیر ہے۔ اویسی غفرلہ

بیت المعمور ہے۔ اور حجرِ اسود کو اللہ تعالیٰ نے جبلِ ابوقبیس میں بطورِ امانت چھپا دیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک اسی میں مخفی رہا۔ ابوقبیس جرہم قبیلے کے ایک مرد کا نام ہے چونکہ وہ اس پہاڑ میں ہلاک ہوا اس لیے اس پہاڑ کا نام ابوقبیس پڑ گیا۔ (کذا فی انسان العیون عن تفسیر ابی اللیث)

قوسِ قزح حکیم نے کہا کہ یہ قوسِ قزح[1] طوفان کے بعد اہلِ ارض کے لیے بطورِ امان ظاہر ہوئی ورنہ جمیع اہلِ ارض کسی وقت کسی طوفان میں غرق ہو جاتے۔ اسے قوسِ قزح اس لیے کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں سب سے پہلے اس کا ظہور جبلِ قزح پر ہوا جو مزدلفہ میں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ قزح شیطان کا نام ہے اس لیے سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا: اسے قزح مت کہو، کیونکہ قزح شیطان کا نام ہے۔ ہاں اسے "قوس اللہ" کہو کیونکہ یہ ایک علامت ہے جو اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو بخشی۔ اور یہ اہلِ زمین کے لیے امان ہے اس کی برکت سے وہ بارش کے پانی میں غرق نہیں ہوں گے۔ (کذا فی الصواعق لابن حجر)

اعجوبہ حضرت الشیخ الشہیر با فتادہ آفندی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کے طوفان کی تاثیر اب بھی موجود ہے کہ ہر تیس سال کے بعد ہر جگہ بارش طوفان کے طور آتی ہے لیکن اس طوفان کی طرح نہیں بلکہ عام بارش سے معمولی طور پر زیادہ[2] کہ جس کے سیلاب سے بعض دیہات اور مکانات بہہ جاتے ہیں[3]

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ سے میں نے تین چیزوں کا سوال کیا۔ دو مجھے عنایت ہوئیں اور ایک سے روک دیا گیا:
۱۔ میں نے عرض کی: یا اللہ! میری اُمت کو قحط سے تباہ نہ کرنا۔ (اس سے ہمہ گیر قحط مراد ہے) میرا یہ سوال پورا ہوا۔

۲۔

۳۔ میں نے عرض کی کہ ان میں خونریزی نہ ہو۔ اس سے مجھے روک دیا گیا۔

تفسیرِ صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وھی تجری یعنی شریعت کی کشتی اٹھا کر لے جاتی ہے بھم ان لوگوں کو جو امرِ الٰہی سے سوار ہوتے ہیں فی موج فتنوں کی موج میں کالجبال جو عظمت میں پہاڑوں کی طرح ہیں ونادیٰ نوح اور نوح یعنی رُوح نے پکارا ابنہ اپنے بیٹے کنعان یعنی نفس کو جو رُوح وقلب سے پیدا ہوا ہے۔ وکان فی معزل اور تھا وہ معرفت اور طلبِ الٰہی سے علیحدگی اختیار کرنے والا یٰبنیّ ارکب معنا اے بیٹے! ہمارے

---

[1] قزح بضم قاف وفتح زاد معجمہ وحاء مہملہ وہ شکل رنگین جو ہوائے ابر میں آسمان پر ظاہر ہوتی ہے۔ مزید تحقیق فقیر اویسی کی تفسیر میں دیکھیے۔
[2] یہ صحیح ہے غور کرنے سے معلوم ہوگا۔
[3] جیسا کہ ہمارے شہر بہاولپور وغیرہ میں ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء میں ہوا۔

ساتھ شریعت کی کشتی میں سوار ہوجا۔ ولا تکن من الکفرین اور نہ ہو سرکش شیاطین اور ابلیس لعینوں راندگانِ درگاہِ حق سے قال کنعان نفس نے کہا ساٰوی الیٰ جبل میں عقل کے پہاڑ کی پناہ لوں گا یعصمنی من الماء مجھے فتنوں کے پانی سے بچا لے گا۔ قال لا عاصم الیوم من امر اللہ نوح روح نے کہا کہ جب ارضِ بشریہ سے شہوات کا پانی بہہ نکلتا ہے اور زمان تمنا و غدر سے جب دُنیا کی محبت کا پانی برستا ہے تو اس وقت سوائے کشتیِ شریعت کے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی اور اس وقت شریعت کی کشتی کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہوتا الا من رحم مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے کہ اسے شریعت کی کشتی کے تمسک کی توفیق بخشے وحال بینھما الموج کنعان نفس جو عقل کا دامن پکڑے ہوئے تھا اور عقل کے درمیان شہوات نفسانیہ حیوانیہ اور دنیا کے نقش و نگار کے فتنوں نے موج ماری فکان من المغرقین تو وہ نفس غرق ہونے والوں سے ہوگیا۔ یعنی ہر وہ نفس جو شریعت کی کشتی سے تمسک نہیں کرتا بلکہ عقل کا دامن تھامنا چاہتا ہے تو وہ مہلک فتنوں کے طوفان سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ جیسے فلاسفہ قدیم اور مغربیت زدہ نئی روشنی کے دلدادگان اور بعض جاہل صوفیوں کا حال ہے۔ یہ لوگ شریعت سے رُوگردانی کر کے کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتے بلکہ تباہ و برباد ہوجاتے ہیں۔

مثنوی شریف میں ہے، ؎

پس بکوشی و باخر از کلال

خود بخود گوئی کہ العقل عقال

ہمچو آں مرد مفلسف روز مرگ

عقل را می دیدی بس بے بال و برگ

بے غرض میکرد آں دم اعتراف

کز ذکاوت راندیم اسپ از گزاف

از غروری سرکشیدیم از رجال

آشنا کردیم در بحرِ خیال

آشنا ہیچست اندر بحرِ روح

نیست آنجا چارہ جز کشتی نوح

ہمچو کنعاں سوئے ہر کوہے مرد

از نبی لا عاصم الیوم شنو

می نماید پست آں کشتی ز بند

می نماید کوہ فکرت بس بلند

در بلندی کوہ فکرت کم نگر

کہ یکے موجش کند زیر و زبر

گر تو کنعانی نداری باورم
گر دو صد چندیں نصیحت آورم

گوش کنعان کے پذیرد ایں کلام
کہ بر او مُہر خدایست و ختام

آخر ایں اقرار خواہی کرد ہین
ہم زوال روز آخر را ببین

ہر کہ آخر بین بود مسعود پور
نبودش ہر دم برہ رفتن عثور

گر نخواہی ہر دمے ایں خفت وخیز
کن ز خاک پائے مردے چشم تیز

ترجمہ: جدوجہد کیجیے ورنہ بالآخر تمہیں اقرار کرنا پڑے گا کہ عقل قید ہے۔ اُس فلسفی کی طرح تمہیں موت کے وقت ماننا پڑے گا کہ عقل بے سروسامان ہے۔ جو موت کے وقت اقرار کرتا تھا کہ ہم نے خواہ مخواہ عقل کے گھوڑے دوڑائے۔ تکبر کرکے بزرگوں سے منہ موڑا۔ خیالی دریا میں ہم تیرتے رہے۔ بحر روح میں تیرنا بیکار ہے اس میں کشتیٔ نوح کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کنعان کی طرح پہاڑوں کی طرف مت جاؤ۔ نبی علیہ السلام سے لاعاصم الیوم سُنو۔ تجھے پہلے تو وہ کشتی معمولی نظر آتی ہے اور اپنے فکر کے پہاڑ تمہیں بلند نظر آتے ہیں۔ اپنے فکر کے پہاڑ تمہیں بلند نظر آتے ہیں۔ اپنے فکر کے پہاڑ کی بلندی کو مت دیکھ اس لیے کہ اسے موج کی ایک ہی ٹکر پاش پاش کردے گی۔ اگر تو کنعان کی پیروی میں میری بات پر اعتبار نہیں کرے گا، چاہے تمہیں ہزارہا نصیحتیں کروں تو نہیں سُنے گا کیونکہ تیرے دل پر اللہ تعالیٰ نے مُہر لگادی ہے۔ بالآخر تمہیں اقرار کرنا پڑے گا۔ پہلے سے ہی اپنے انجام پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ نیک بخت اپنے انجام پر نگاہ رکھتا ہے وہ سیدھے راہ پر چلنے کو سعادت سمجھتا ہے۔ اگر تمہیں اپنا انجام سعید چاہیے تو نیک لوگوں کے قدموں کی خاک آنکھوں پر ملو۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

یار مرداں خدا باش در کشتی نوح
ہست خاکے کہ بآبے نخرد طوفاں را

ترجمہ: نیک بخت لوگوں کی طرح کشتیٔ نوح میں آجا کہ اس کے اندر طوفان کی موج نقصان نہیں پہنچاتی۔

حضرت امیر خسرو دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا شعر اس موقع پر لطیف نکتہ کا حامل ہے: ؎

از دریائے شہادت چوں نہنگ لا بر آرد سر   تیمم فرض گردد نوح را در وقت طوفانش

شرحِ شعر: 'دریائے شہادت' سے مومن کا کلمہ شہادت مراد ہے۔ 'چوں نہنگ لابرآرد سر' سے مراد لفظ 'لا' کا ارتفاع مراد ہے اور نیم سے دو ضربیں مراد ہیں:

۱۔ضرب الّا

۲۔ضرب اللّٰہ

جو ان کی ضرب لگاتا ہے وہ نجات پاتا ہے اور جو نہیں لگاتا وہ غرق اور برباد ہوجاتا ہے اور درمیان میں وقف۔ سے کہنا مراد ہے کہ اس وقف سے طوفان میں غرق ہوجاتا ہے۔ (کذا شرحہ حضرۃ الشیخ بالی الصوفیوی شارح الفصوص قدس سرہٗ)

یعنی جب دریائے شہادت لا سر اٹھاتا ہے تو نوح کی ضرب طوفان کے وقت اُس کی سرکوبی کرتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَقِیْلَ بصیغہ مجہول یعنی مبنی للمفعول آنے والے اپنے ہمجنسوں کی طرح اسے بھی بصیغہ مجہول لایا گیا کیونکہ اس کا فاعل (اللہ تعالیٰ) متعین ہے۔ اس لیے ایسا فعل عجیب اور امر غریب سوائے اس کے اور کوئی نہیں لا سکتا یعنی طوفان کو بہت بڑی مدت گزرجانے کے بعد زمین و آسمان کو بمنزلہ ایسے منادی کے ندا کی جس میں ندا کی صلاحیت ہو انھیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا یٰٓاَرْضُ اے زمین۔

سوال: زمین سے ندا کی ابتدا کیوں۔

جواب: طوفان کا آغاز اسی سے ہوا تھا۔

ابْلَعِیْ نگل لے یعنی پانی پونچھ لے۔ دراصل قوتِ جاذبہ سے طعام کو حلق میں اتارنے کو عربی میں بلع کہتے ہیں۔ اس معنے پر یہاں پانی کے زمین میں دھنس جانے کے لیے استعارہ کیا گیا ہے اور وجہ تشبیہ یہی ہے کہ جیسے طعام منہ سے پیٹ کے گڑھے میں چھپ جاتا ہے۔ ایسے زمین کا اوپر والا حصہ زمین کے پیٹ میں چلا گیا۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

نشف الثوب العرق۔ (بحرالشین) یعنی کپڑے نے پسینہ پی لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نشف عرفی معنے کے لحاظ سے نہ تھا بلکہ زمین نے یک لخت تمام پانی ہڑپ کرلیا۔

مَآءَكِ اپنا وہ پانی جو طوفان کی وجہ سے تیرے اوپر چڑھا ہے وہ پانی نہروں اور چشموں وغیرہ کا نہیں ہے۔

سوال: صرف ابلعی کہنے سے بھی کام چل جاتا تھا ماءک کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی۔

جواب: عموماً زمین پر ٹھہرنے والی اشیاء میں پہاڑ، ٹیلے اور ندی نالے وغیرہ شامل ہیں یہاں وہ مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے عظمتِ الٰہی اور شانِ کبریائی کا اظہار مطلوب ہے کہ قادرِ مطلق کے حکم پر زمین کے اندر اس قدر قوت بھردی گئی ہے کہ وہ نہ صرف پانی کو ہڑپ کرنے کی قدرت رکھتی ہے بلکہ پہاڑوں، ندی نالوں اور جملہ اشیاء کو نگل سکتی ہے۔ (کذا فی المفتاح)

صاحبِ رُوح البیان فرماتے ہیں کہ تفسیر الارشاد میں ہے کہ ماء کو زمین کے کاف خطاب کی طرف مضاف کرنے میں اشارہ ہے کہ زمین کو اسی پانی کے نگلنے کا حکم تھا جو اس سے نکلا تھا اور وہ پانی جو آسمان سے اُترا اسے نہروں، دریاؤں اور چشموں وغیرہ کی صورت میں

ذکر کر دیا گیا۔ (کذا فی تفسیر التیسیر)

اور فرمایا کہ میں نے بعض معتبر کتابوں میں اسی کے موافق دیکھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا تو وہ چالیس شب و روز بڑے زور سے برستا رہا اور زمین کے چشموں کو حکم ہوا کہ وہ بھی بہتے رہیں۔ زمین و آسمان کے پانیوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ آسمان کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا اور سفید اور زمین کا پانی گرم تھا۔ یہ دونوں مل کر دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کے اسی گز اوپر چڑھ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین سے فرمایا کہ اپنا پانی اپنے اندر جذب کرلے۔ چنانچہ زمین نے اپنا پانی جذب کرلیا اور آسمان کا پانی بچ گیا جسے دریاؤں اور نہروں میں بہایا گیا۔

ف: بحر المحیط کو اس سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے زمین سے الگ ایک حصّے کے طور پر پیدا فرمایا۔

وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ اور اے آسمان! تو اپنا پانی روک لے۔ یہ اقلع الرجل عن عملہ سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی اپنے کام سے رک جائے۔ اقلعت السماء یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بارش برستی ہوئی رک جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ اقلاع حیوانات و جمادات دونوں کے لیے مستعمل ہے۔

ف: بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ مجاز مرسل بمعنے ارادہ ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ میرا ارادہ ہے کہ زمین سے جو پانی نکلا ہے وہ واپس اس کے اندر چلا جائے۔ اور جو آسمان سے موسلا دھار طوفانی بارش ہو رہی ہے وہ رک جائے۔

ف: یہ حکم چالیس روز کے بعد ہوا۔ جیسے پہلے متعدد بار عرض کیا گیا ہے کہ یہ طوفان مسلسل چالیس شب و روز رہا۔

اعجوبہ: مروی ہے کہ بارش کا کوئی قطرہ سیدھا زمین پر نہیں گرتا بلکہ اس کے لیے مخصوص کیل و وزن مقرر ہے۔ لیکن اس طوفان میں کسی پیمانے کی قید نہیں تھی۔

ف: یہ عبارت در اصل ایک طویل عبارت کا خلاصہ ہے۔ در اصل عبارت یوں تھی:

یا ارض ابلعی مائک فبلعت و یسماء اقلعی عن ارسال الماء فاقلعت عن ارسالہ وغیض الماء النازل من السماء فغاض۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین سے فرمایا کہ اپنا پانی جذب کرلے۔ اس نے جذب کرلیا۔ اور آسمان سے فرمایا اپنا پانی روک لے۔ اس نے روک لیا۔

سوال: اتنی لمبی عبارت کو مختصر کیوں کیا گیا؟

جواب: چونکہ اس اختصار میں مفہوم و معنیٰ پورا ادا ہو جاتا ہے اس لیے طویل عبارت کا اختصار نہ صرف جائز بلکہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

وَغِيْضَ الْمَآءُ اور آسمان و زمین کا پانی کم ہو گیا یہاں تک کہ پہاڑ اور زمین کی مٹی ظاہر ہو گئی۔

حل لغات: الغیض بمعنے النقصان (کمی)، مثلاً کہا جاتا ہے:

غاض الماء بمعنے قل یعنی پانی کم ہو گیا۔

اور غیض و غاض ہم معنی ہیں اور لیتے ہیں:

غاضہ اللہ ۔ اسے اللہ تعالیٰ نے کم کیا۔

یعنی یہ فعل متعدی بھی ہے اور لازم بھی چنانچہ آیت میں صیغۂ مجہول کو بلا واسطہ حرف جر کے لانے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فعل متعدی بھی ہوتا ہے اس لیے کہ ہر وہ فعل جو متعدی بنفسہ ہوتا ہے اس کے لیے کسی واسطۂ حرف جر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وَقُضِيَ الْاَمْرُ اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ کفار کو ہلاک اور برباد کر دوں گا اور اہل ایمان کو نجات دوں گا۔ وہ وعدہ پورا ہو گیا۔

ف: یہاں پر القضاء بمعنے الفراغ ہے گویا یوں کہا گیا کہ کافروں کا کام تمام ہوا۔ اب اللہ جل وعلا انہیں غرق اور ہلاک کر کے فارغ ہوا۔

سوال: مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں امر نوح کہنا چاہیے تھا۔ لیکن نوح علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا۔

جواب: اختصار مطلوب ہے۔ حرف تعریف یعنی الف لام اس کے ذکر سے مستغنی کرتا ہے۔

قاعدہ: نحوی کوئی کہتے ہیں کہ کبھی الف لام مضاف الیہ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے محذوف ہونے میں حرج نہیں ہوتا۔ (کذا قال السید)

قاعدہ: الف و لام کا اشارہ بھی مضاف الیہ سے مستغنی کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ الف لام عہدی کہلاتا ہے۔

وَاسْتَوَتْ اور برابر یعنی ٹھہر گئی کشتی۔

سوال: مجہول کے صیغے چلے آرہے ہیں ان کی مناسبت سے فعل مجہول سوّیت ہونا چاہیے تھا یہاں پر استوت بمعنے استوت لانے کا کیا فائدہ۔

جواب ۱: چونکہ کشتی کے لیے پہلے تجری کہا گیا تھا اور جریان سے استقرار کو مناسبت ہے کہ وہاں بھی فاعل کشتی کو بنایا گیا اور یہاں بھی۔

جواب ۲: استوت، سُوّیت سے زیادہ مختصر ہے اور خیر الکلام ما قل و دل کلام وہ بہتر ہوتا ہے جو قلیل ہو کر مقصد کو پورا کرے۔

عَلَى الْجُوْدِيِّ جودی پہاڑ پر۔

ف: جودی اس پہاڑ کا نام ہے جو موصل یا شام یا آمد کے ایک جزیرے میں واقع ہے۔

لطیفہ: مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو خوشخبری سنائی کہ تمہارے اوپر نوح علیہ السلام کی کشتی مبارک کا نزول ہو گا۔ یہ سن کر تمام پہاڑ فخر سے پھولے نہ سمائے۔ لیکن جودی پہاڑ عجز و انکساری سے جھک گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عاجزی کو دیکھ کر کشتی مبارک کو اس پر نازل ہونے کا حکم فرمایا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

طریقت جز این نیست درویش را
کہ افگندہ دارد تن خویش را
بلندیت باید تواضع گزیں
کہ آں نام را نیست راہے جزیں

ترجمہ: درویش کی طریقت یہی ہے کہ وہ ہمیشہ عاجز و منکسر رہے۔ اگر تمھیں بلندی چاہیے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ تواضع اختیار کرو۔

فضائلِ تواضع تواضع اولیاء اللہ کا آخری مقام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عبودیت نفس کے جاننے کا نام تواضع ہے۔ یعنی جب ریاست اور عبودیت کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ آپس میں نقیضین ہیں۔ اسی سے مشائخ نے فرمایا کہ صدیقین کے دل سے آخر میں حبِ ریاست کا خروج ہوتا ہے۔

ازالۂ وہم تواضع اس کا نام نہیں جو اکثر لوگوں میں یا بعض صوفی نما یا کاروں میں پائی جاتی ہے۔ یہ تو تملق یعنی چاپلوسی اور خوشامد ہے اور اس مرتبہ کے حصول کے لیے جو اسے حاصل نہیں اور جو کسی غرض کے لیے تواضع کرتا ہے اس کا نام تملق (چاپلوسی) اور خوشامد ہے ورنہ دراصل تواضع تو اسرارِ ربانیہ سے ایک راز ہے اور یہ کمال صرف نبی علیہ السلام یا صدیق (ولی کامل) کو نصیب ہوتا ہے۔ (کذافی المواقع)

نکتہ: عالمِ دنیا میں سب سے زیادہ سخت پہاڑ ہیں لیکن اس سے سخت تر ہے کیونکہ لوہے سے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ لوہے سے آگ سخت تر ہے کیونکہ لوہے پر غالب آجاتی ہے۔ لیکن آگ پر پانی کا غلبہ ہے اور پانی پر بادل کا غلبہ ہے کیونکہ بادل پانی کو اٹھاتے ہیں اور ہوا بادل پر غالب ہے کیونکہ ہوا بادلوں کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔ اور ہوا پر انسان کا غلبہ ہے اور انسان نیند سے مغلوب ہے لیکن ان سب پر موت غالب ہے۔

ف: ہفت اقلیم میں کل ایک سو اکہتر پہاڑ ہیں۔ لیکن زہرۃ الریاض میں چھ ہزار چھ سو تہتر (۶۶۷۳) پہاڑ بتائے گئے ہیں۔ یہ ان کے سوا ہیں جو صرف ٹیلوں کی طرح ہوتے ہیں ان کو ملایا جائے تو پھر گنتی سے باہر ہیں۔ ان بڑے پہاڑوں میں سے بعض کا طول ساٹھ میل ہوتا ہے بعض کا تین سو اور بعض کا ہزار میل۔

ف: اسئلۃ الحکم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو اپنے انبیاء علیہم السلام کے لیے بمنزلہ کرسی کے بنایا ہے۔ مثلاً اُحد ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور طور حضرت موسیٰ کے لیے اور سراندیپ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے اور جُودی نوح علیہ السلام کے لیے۔ انھیں یہی شرافت و بزرگی کافی ہے۔

ف: جیسے انسانوں میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ ایسے ہی پہاڑوں کو ایک دوسرے پر۔ ان کی پختگی و مضبوطی کے پیشِ نظر مضبوط اور پختہ انسان کو جبل پہاڑ کہا جاتا ہے۔

ف : علماء کا اختلاف ہے کہ سب سے افضل کون سا پہاڑ ہے۔ بعض کے نزدیک ابُوقبیس افضل ترین ہے کیونکہ زمین پر سب سے پہلے لے رکھا گیا تھا۔ بعض کے نزدیک جبل عرفات، بعض کے نزدیک کوہِ طُور، بعض کے نزدیک کوہ قاف۔ لیکن امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

افضل الجبال جبل اُحد ٌ

پہاڑوں سے جبلِ اُحد افضل ہے۔

یہ پہاڑ مدینہ طیبہ میں ہے اسے اُحد اس لیے کہتے ہیں کہ یہ باقی پہاڑوں سے علیٰحدہ اور منفرد ہے۔ اسی پہاڑ کی زیارت کے لیے اہلِ اسلام ہمیشہ جایا کرتے ہیں[1]۔ کیونکہ حضرت حمزہ اور دیگر شہدائے اُحد (رضی اللہ عنہم) مدفون ہیں۔

ف : جبل اُحد شریف مدینہ طیبہ سے دو یا تین میل دُور ہے۔ امام سیوطیؒ نے اس کی افضلیت کا استدلال قرآن مجید سے کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جبلِ اُحد کا نام خصوصیت سے آیا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

اذ تصعدون ولا تلوون علیٰ اُحد۔

یہ اس قرأۃ کے مطابق ہے کہ احد کو بضمتین پڑھا جائے اور احادیث مبارکہ میں بھی اس کی فضیلت مذکور ہے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احد رکن من ارکان الجنۃ۔

جبلِ اُحد بہشت کے ستونوں سے ایک ہے۔

یعنی بہشت کے اطراف سے ایک عظیم طرف ہے۔ اور فرمایا:

ان احد اھذا جبل یحبنا و نحبہ فاذا مررتم فکلوا من شجرہ ولو من عضاھہ۔

بے شک اُحد ایک ایسا پہاڑ ہے جو ہمارے ساتھ محبت کرتا ہے اور ہم بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ جب تم اس سے گزرو تو اس کے درختوں سے کچھ کھایا کرو اگرچہ اس کے کانٹوں میں سے ایک کانٹا۔

ف : عضاہ ایک بہت بڑے درخت کو کہتے ہیں جسے بہت زیادہ کانٹے ہوں۔

مسئلہ : حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے درخت سے کچھ نہ کچھ کھانے کی ترغیب دلائی ہے تاکہ اُحد کو متبرک سمجھ کر اس کے تبرکات سے شرف حاصل کیا جائے[2]۔

---

[1] اس سے ثابت ہوا کہ اولیاء کرام کے مزارات کی زیارت کا طریقہ قدیم الایام سے ہے۔ اسے بدعت کہنا خود بدعت کا ارتکاب کرنا ہے۔

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تبرکات کا عمل ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہے۔ اسے بدعت و شرک گردانا نبوت کے ارشادات سے مُکر جانے کے مترادف ہے جیسے وہابیوں دیوبندیوں نے تبرکات پر فتویٰ بازی کی ہوئی ہے۔

ف: اس سے ثابت ہوا کہ اُحد اگرچہ ایک پہاڑ (جماد) ہے لیکن اسے بھی ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور یہ محبت مبنی برحقیقت ہے اسے مجازی معنی پر محمول کرنا ناموزوں ہے۔ چنانچہ صاحبِ روح البیان مندرجہ ذیل دلائل سے وضاحت فرماتے ہیں:

ولا مانع ان تکون المحبۃ من الجبل علی حقیقتہا وضع الحب فیہ کما وضع التسبیح فی الجبال مع داؤد علیہ السلام وکما وضعت الخشیۃ فی الحجارۃ کما قال تعالیٰ وان منہا لما یہبط من خشیۃ اللہ (کذا فی انسان العیون وروح البیان ج ۴ ص ۱۳۹، مطبوعہ مصر)

اس سے شرعاً کوئی شے مانع نہیں کہ احد پہاڑ کی محبت مبنی برحقیقت ہو اس میں اللہ تعالیٰ نے محبت پیدا فرمادی ہو جیسے داؤد علیہ السلام کی پہاڑوں میں تسبیح اور عام پتھروں خوف وخشیت کما قال تعالیٰ وان منہا لما یہبط من خشیۃ اللہ یعنی ایسے پتھر ہیں جو خدا کے خوف سے گرتے ہیں۔

اس کے بعد صاحبِ رُوح البیان نے فرمایا کہ:

للجمادات حیاۃ حقانیۃ عند اہل اللہ۔

اولیاء اللہ کا مذہب ہے کہ جمادات میں حقیقی حیات ہوتی ہے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

باد را بے چشم اگر بینش نداد
فرق چوں میگردد اندر قوم عاد
گر نبودے نیل را آں نور دید
از چہ نبطی را ز سبطی میگزید
گر نہ کوہ سنگ با دیدار شد
پس چرا داؤد را او یار شد
ایں زمیں را گر نبودے چشم جان
از چہ قارون را فرو خوردی چناں

ترجمہ: ہوا کو اگر چشم بینا نہ ہوتی تو وہ قوم عاد کے لیے مومن وکافر کیسے کرتی۔ اگر نیل کو آنکھوں کا نور نہ ہوتا اسے نبطی وسبطی کا فرق کیسے معلوم ہوتا۔ اگر پتھروں کو آنکھیں نہ ہوتیں انھیں داؤد علیہ السلام کی یاری کیسے نصیب ہوتی۔ زمین کے اندر بینائی نہ ہوتی تو وہ قارون کو کیسے نگلتی۔

ف: مذکورہ دلائل سے ثابت ہوا کہ عارفین باللہ کا قول حق ہے کہ یا ارض ابلعی کا خطاب مبنی برحقیقت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے

بنا دریں قیل سے ہی تاکید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجازی محض سے مجازی کلام کے ساتھ تکلم نہیں فرمایا بلکہ حقیقی کلام سے اسے ارشاد ہوا تھا۔

حضرت الشیخ الاکبر قدس سرہٗ کی عجیب و غریب دلیل

حضرت محی الدین ابن العربی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق کسی شے پر جلوہ افگن ہوتا ہے تو اسی طرح اس کا کلام بھی بے صوت بے حرف ہوتا ہے اور ظاہر ہے کلام متکلم کا عین ہے نہ غیر (جیسا کہ صوفیہ کرام کا مذہب ہے اور متکلمین کہتے ہیں صفاتہ تعالیٰ لا عین و لا غیر) اور یہاں متکلم کا عین ہونا مرتبہ معنیٰ میں ماننا ضروری ہے اور وہ اسی کے ساتھ قائم ہونا بغیر ہے۔ اسے کلام نفسی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور وہ کلام جو عالم مثال و عالم حس میں ہوتا ہے اس میں حروف بھی ہوتے ہیں، اصوات بھی اور ترکیب بھی۔ (کذا فی الدرۃ الفاخرۃ للمولیٰ الجامی قدس سرہ السامی)

ف: حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے جبل جودی پر عاشورا (دسویں محرم) کے دن اُترے تھے۔

ف: حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ دسویں رجب کشتی میں بیٹھے اور کشتی ڈیڑھ سو دن تک طوفان میں رہی۔ جبلِ جودی پر ایک ماہ تک کشتی ٹھہری رہی۔ اس طرح کل چھ ماہ ہوئے۔ یعنی زمین پر دس محرم (عاشورا) کے دن اترے تھے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ اور کہا گیا کہ ہلاکت ہو ظالم قوم کے لیے۔

ف: بُعْدًا مصدر ہے فعل مقدر کی تاکید کے لیے ہے دراصل بعدوا بعداً تھا یعنی ہلاک ہوجائیں یہ بعداً بعداً کے معنی میں ہے اس کلام سے اہلِ عرب مراد لیتے ہیں کہ وہ شخص بہت دور جا پڑا یعنی موت کے گھاٹ اُتر گیا اور تباہ و برباد ہوا۔ اس تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جملہ ان کے لیے بددعا کے طور کہا گیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعلیم کے طور فرمایا ہے کہ وہ ان کے لیے بددعا کے طور کہیں کہ خدا کرے کہ ظالم قوم تباہ و برباد ہو۔ اور للقوم کی لام یدعوا علیہم کے بیان کے لیے ہے جیسے ھیت لک و سقیا لک میں لام بیانیہ ہے اور وہ فعل محذوف کے یا قیل کے متعلق ہے۔

مسئلہ: اس میں اشارہ ہے کہ جو قوم بھی کسی نبی علیہ السلام سے اس طرح بغاوت کرے گی وہ ایسی ہلاکت اور تباہی و بربادی اور ایسی بددعا کی مستحق ہے۔

ف: مفتاح میں ہے کہ کلام کو بددعا پر ختم کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اگرچہ تباہ و برباد ہو چکے لیکن آنے والی نسلوں کو معلوم ہو کہ وہ اس تباہ و بربادی کے مستحق تھے۔ اگرچہ وہ فنا ہو گئے لیکن بعد مرگ بھی ان پر غضبِ الٰہی اور لعنت نامتناہی جاری ہے۔

عوج بن عنق کی کہانی

مروی ہے کہ طوفان میں تمام کفار غرق ہوکر تباہ و برباد ہو گئے۔ صرف عوج بن عنق بچ گیا۔ اسے طوفان کا پانی صرف کمر تک پہنچا تھا کیونکہ اس کا قد تین ہزار تین سو تینتیس گز لمبا تھا۔ اس کی تفصیل ہم نے سورۂ مائدہ میں بھی بیان کی ہے۔

عوج بن عنق طوفان سے کیسے بچا

مروی ہے کہ عوج بن عنق کے بچنے کا سبب یوں ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو ساگوان کی لکڑی کشتی کے لیے ضرورت پڑی۔ آپ اسے (اسباب ظاہری کے تحت) نہ اٹھا سکے

عوج بن عنق اسے علاقہ شام سے اکیلا لایا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کی خدمت کی برکت سے اسے نجات بخشی۔

موسیٰ علیہ السلام کے ایک نقال کی کہانی

مروی ہے کہ فرعون کے دور میں ایک فرعونی موسیٰ علیہ السلام کی نقل اتارا کرتا تھا موسیٰ علیہ السلام کی طرح ٹوپی پہنتا تھا اور بطور استہزاء کے موسیٰ علیہ السلام کی نقلیں اتارتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بحر القلزم سے محض موسیٰ علیہ السلام سے معمولی مشابہت پر غرق ہونے سے بچا لیا۔

ف: یہ ظاہری نقل کی برکت تھی۔ اگر وہ سچے دل سے تائب ہو کر موسیٰ علیہ السلام کی نقل (اتباع) کرتا تو دائمی نجات سے ہمکنار ہوتا۔

قبر آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے ابلیس نے انکار کر دیا

حضرت ابو العالیہ سے مروی ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے قرار پکڑا تو دیکھا کہ ابلیس کشتی کے پچھلے حصے پر بیٹھا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا، اے بدبخت! تیری وجہ سے تو ساری قوم تباہ و برباد ہوئی تو خود زندہ بچ گیا۔ ابلیس نے پوچھا تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ بارگاہ رب العزت میں سچے دل سے تائب ہو جا۔ عرض کی مجھے کون سا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اجازت لیجئے میں حاضر ہوں۔ نوح علیہ السلام نے بارگاہ حق میں التجا کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسے کہیے کہ وہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرلے میں اسے معاف کر دوں گا۔ نوح علیہ السلام نے شیطان سے کہا: تجھے مبارک ہو میں تیرے لیے معافی کا پیغام لایا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم مزار آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ ابلیس لعین نے کہا: جب وہ زندہ تھے میں نے انہیں سجدہ نہ کیا۔ اب مردہ کو کیسے سجدہ کروں۔

سبق: آدم علیہ السلام جیسے عالم دنیا میں زندہ تھے اور ان کو سجدہ روا رکھا گیا ان کے وصال کے بعد بھی ان کے سجدے کا حکم ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اپنے مزارات میں زندہ ہیں[1]۔ اسی طرح اولیاء کاملین بھی اپنے مزارات میں زندہ ہیں۔ حضرت صائب علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ؎

مشو بمرگ ز امداد اہل دل نومید
کہ خواب مردم آگاہ عین بیداریست

ترجمہ: اہل دل اولیاء و انبیاء کی موت سے ناامید نہ ہو کیونکہ ان کی موت ظاہری ان کی عین حیات ہے۔

(ولکن الوھابیۃ قوم لا یعقلون) لیکن شیطان ملعون اس نکتہ سے بے خبر رہا کہ اس نے حق کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

وہابی غیر مقلدین اور دیوبندی پارٹیاں

صاحب روح البیان شیطان کے لیے اوپر کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

مثلہ من ینکر الاولیاء و زیارۃ قبورھم، والاستمداد منھم[2]

---

[1] وہابی اور بعض دیوبندی یعنی غلام خانی اسی جسمانی زندگی (انبیاء و اولیاء) کے منکر ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ ابلیس ملعون کی پیروی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

[2] روح البیان ج ۲، ص ۳۰

وہ لوگ جو اولیا کے کمالات اور ان کے مزارات کی زیارت اور ان سے مدد مانگنے کے منکر ہیں شیطان کے چیلے ہیں۔[1]

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں شیطان کے ان چیلوں سے بچائے اور اولیاء و انبیاء کے کمالات کے انکار سے محفوظ رکھے۔ آمین

قرآن مجید معجزہ ہے قرآن مجید کی ہر سُورۃ اور ہر آیت اپنی جگہ پر ایک بہت بڑا معجزہ ہے اور فصاحت و بلاغت کے انتہائی مقام کو محیط ہے کہ وہاں کسی فرد بشر کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے بعض آیات ایسے بھی ہیں جن کی فصاحت و بلاغت میں اور مزید خصوصیات و کمالات ہیں جو دُوسری آیات سے نمایاں ہیں کیونکہ قرآن کے بعض مقامات ایسے بھی ہیں جو دُوسرے مقامات کی نسبت عجیب لطائف اور مزید مخفی اسرار کے حامل ہیں۔ مثلاً آیت کریمہ[2] یا ارض ابلعی کو لیجئے اس میں فصاحت و بلاغت کے کیسے اسرار و رموز مندرج ہیں کہ قحطان کے بلند پایہ فصحاٗ اور عدنان کے نامور خطباٗ نے جب اس آیت کو سُنا تو اپنی فصاحت و بلاغت کے ہتھیار ڈال کر تسلیم خم کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی فصاحت و بلاغت کے دعاوی یکسر ختم کر کے قرآن مجید کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور اپنے بڑے فصاحت و بلاغت سے لبریز قصائد پھاڑ کر قرآن مجید کی غلامی کو اپنی ناموری و سعادت سمجھنے لگے۔ کسی نے ان کی حالت دیکھ کر کیا خوب فرمایا: ؎

در بیان و در فصاحت کے بود یکساں سخن
گرچہ گوینده بود چوں جاحظ و چوں اصمعی
از کلام ایزد بے چُوں کہ وحی منزلست
کے بود تبت یدا چوں قیل یا ارض ابلعی

ترجمہ: بیان و فصاحت میں کلام یکساں نہیں ہوتا اگرچہ متکلم جاحظ و اصمعی جیسے نامور فصحا و بلغا ہوں۔ قرآن مجید بھی اگرچہ وحی منزل من اللہ ہے لیکن تبت یدا اور ارض ابلعی کی فصاحت و بلاغت میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔

مثال کے طور پر انبیاء علیہم السلام نبوت کے درجہ میں برابر ہیں لیکن ان کی اُمتوں کی استعداد مختلف ہے اور ان کی وہ استعداد ان کی اپنی ہے ورنہ انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ میں تعلیم میں کسی قسم کا فرق نہیں۔

سوال: جب قرآن مجید کلامِ الٰہی ہے تو اس میں فصاحت و بلاغت کا فرق کیوں؟

جواب: چونکہ آیاتِ آفاقیہ و انفسیہ جن کا بیان قرآن مجید میں ہے مختلف ہیں اسی لیے آیاتِ قرآنیہ بھی متفاوت طور پر مندرج ہوئیں گویا فصاحت و بلاغت کا فرق بہ نسبت مخلوق کے ہے ورنہ کلامِ الٰہی فی نفسہٖ فصاحت و بلاغت کے یکساں ہے پھر چونکہ قرآن مجید

---

[1] اس مسئلہ کی بنیاد ابن تیمیہ نے رکھی جس کی محمد بن عبد الوہاب نجدی نے اور پھر وہابیوں اور دیوبندیوں نے پیروی کی۔ تفصیل "الفیضان" میں دیکھئے۔

[2] صرف اسی آیت پر متقدمین نے بڑی بڑی تصانیف یادگار چھوڑیں۔

جمیع حقائق امکانیہ و وجوبیہ کا جامع ہے۔ اسی لیے اس نے ہر مرتبے کا لحاظ رکھا ہے خواہ وہ مراتب علمیہ ہوں یا اعیانیہ۔ یہ قرآن مجید کے بہت بڑے کمال کی دلیل ہے کہ وہ ہر مرتبہ کے بیان کو محیط ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ واللہ غالب علیٰ امرہ۔

تفسیر صوفیانہ "تاویلات نجمیہ میں ہے کہ یا ارض ابلعی ماءک اے بشریت کی زمین! اپنی شہوات کے پانی کو اپنے اندر جذب کرلے و یسماء اقلعی اور اے قضاو قدر کے آسمان! تو بھی آفات کے پانی کو روک لے وغیض الماء اور فتنوں کا پانی کم ہو گیا یعنی نورِ شرع سے بشریت کی ظلمت مٹ گئی اور اس کے غلط جوش ختم ہو گئے وقضی الامر اور وہ طوفانی فتنے جو آزمائش کے طور انسان پر آنے تھے وہ پورے ہو گئے۔ واستوت اور شریعت کی کشتی ٹھہر گئی علی الجودی جودی پہاڑ یعنی مقام تمکین پر[1]۔ چونکہ طوفان سالک کے لیے مقام تلوین تھا کہ وہاں سے اسے بہت بڑی آفات اور ہلاکتوں میں مبتلا ہونا تھا لیکن وہاں سے

---

[1] اس مقام پر تمکین و تلوین دو لفظ استعمال ہوئے۔ صوفیہ کرام کی اصطلاح میں تلوین سے مراد کشف اور پردہ پوشی کے درمیان اوقات اور صفات نفس کی غیبت اور اس کے ظہور سے قلب کا غلبہ پیدا کرنا ہے۔ اور تمکین سے مراد مقام قرب خداوندی میں قلب کی قدر کی درجہ، بہ حقیقت کا ظاہر ہونا ہے اور صوفیہ کرام اس وقت تک صاحب تلوین نہیں کہلا سکتے جب تک وہ نفس کی حد کو عبور نہ کرلے اور قلب کے عالم صفات کو نہ پہنچے کیونکہ تلوین احوال مختلفہ کے تعاقب کا نام ہے۔

جب تک کوئی شخص صفاتِ نفس میں مقید ہے منسوخ اس وقت تک اسے صاحبِ حال نہیں کہتے۔

تلوین صرف ان ارباب کے لیے ہو سکتی ہے جنہوں نے تمام صفاتِ خداوندی سے تجاوز نہ کیا اور علم ذات کو نہ پہنچے، کیونکہ یہ بے شمار صفات ہیں۔ تلوین اس جگہ ممکن ہے جہاں پر شمار یا تعدد ممکن ہو۔ ارباب کشف ذات حد تلوین سے گزر کر مقام تلوین میں پہنچے ہیں کیونکہ ذات وحدت کی وجہ سے تغیر اختیار نہیں کرتی۔

تلوین سے اس شخص کو خلاصی ہوتی ہے جس کا دل مقامِ قرب۔ سے مقامِ روح پر عروج کرتا ہے۔ صفات کے تصرف کے تحت سے نکل آتا اور وجود ذات باری تعالیٰ کے قرب کی فضا میں متمکن ہو جاتا ہے۔

جب قلب مقامِ قلبی سے مقامِ روحی میں پہنچتا ہے نفس بھی مقامِ نفسی سے مقامِ قلبی میں انتقال کرتا ہے۔

وہ تلوین جو اس سے پہلے قلب کی تھی اس مقام میں نفس کو بذریعہ قبض (حزن و سرور) اور بسط (خوف اور امید) کے عارض ہوتی ہے۔ اس وقت نفس قلب کا خلیفہ اور صاحبِ تلوین ہو جاتا ہے۔

اس تلوین کے وجود کے باعث کشف و یقین کا نور در پردہ نہیں ہوتا۔ یہ تلوین در حقیقت وہ ذیل تمکین نہیں ہے جس کے وجود سے کشف و یقین کا نور پس پردہ ہو جاتا ہے۔

جب تک رسم بشریت باقی ہے غیر ممکن ہے کہ طبیعت سے کامل طریقہ پر تغیر زائل ہو جائے۔ صاحبِ تمکین کے متعلق یہ ہے کہ اسے تغیر مقامِ تمکین سے خارج نہیں کرتا۔

بچ گیا اور اس کے بُرے دن گزر گئے۔ اب اسے مقامِ تمکین سے نوازا گیا اور اسی مقامِ تمکین پر سالک کو نجات نصیب ہوگی اور یہیں پر اسے
ثابت قدمی ملے گی۔ اور یہی اس کے درجاتِ علیا پر پہنچنے کا مقام ہے وقیل بعدًا اور کہا گیا کہ تباہی و بربادی ہو للقوم الظّٰلمین
ان لوگوں کے لیے جنہوں نے شریعت کی کشتی پر سوار ہونے سے سُستی کرکے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔

تفسیر عالمانہ وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّہٗ اور نوح علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کو پکارا فَقَالَ فاء تفصیل ہے اس
اجمال کی جو نداء میں ہے رَبِّ اے میرے پروردگار اِنَّ ابْنِیْ میرا بیٹا کنعان۔

ف : ابن کو اس لیے ابن کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کی بناء ہوتا ہے۔

مِنْ اَھْلِیْ میرے اہل سے ہے۔ اور تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تمہارے اہل کو نجات دوں گا۔ یہ من تبعیضیہ ہے کیونکہ کنعان
نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا جیسا کہ راجح قول ابھی گزرا اگر وہ پروردہ ہو تو بھی آپ کے اہل میں شمار ہوتا تھا۔

ف : اھل کا اطلاق ازواج، اولاد، غلاموں، لونڈیوں، اصحاب، عزیز واقارب اور مجموعہ متعلقین پر ہوتا ہے۔ (کذا فی شرح
مشارق الانوار لابن الملک)

اور ابن الکمال نے فرمایا کہ اہل خاصۃ الشیٔ وما ینسب الیہ۔ (یعنی شے کا مخصوص اور جو اس کی طرف منسوب ہوں)
کو کہا جاتا ہے۔ اسی سے ہے قول باری تعالیٰ حکایۃً لنوح علیہ السلام ان ابنی من اھلی۔

وَاِنَّ وَعْدَكَ اور تیرا وعدہ کریمہ

ف : وقوع سے پہلے منفعت پہنچانے کی خبر دینے کو وَعْدٌ کہا جاتا ہے۔

الْحَقُّ حق اور ثابت ہے کہ اس میں خلاف ہو نہیں سکتا اور نہ ہی اس کے ایفاء میں شک ہو سکتا ہے۔

ف : اس سے ثابت ہوا کہ یہ نداء کنعان کے غرق ہونے سے پہلے کی گئی اس لیے کہ واؤ ترتیب کے لیے نہیں (جیسا کہ احناف کا
مذہب ہے) اور اس سے کنعان کی نجات کی درخواست ہے نہ یہ کہ نوح علیہ السلام اس کے غرق ہونے کی حکمت پوچھ رہے ہیں۔
جب یہ مانا جائے کہ غرق ہونے کے بعد نوح علیہ السلام نے ندا دی تھی آپ نے حکمت کیا پوچھنی تھی کیونکہ نبی علیہ السلام حکمت کے انکشاف
کا سوال نہیں کرتے بلکہ اس سے واضح ہوا کہ آپ نے کنعان کی نجات کا سوال کیا۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ نوح علیہ السلام نے
یہ ندا کس وقت دی، کیا کنعان اور آپ کے درمیان طوفان کی موج کے حائل ہونے کے وقت یا اس کے بعد بعض پہلے کے قائل ہیں
بعض بعد کے اس لیے کہ موج کے حائل ہونے سے ضروری نہیں کہ کنعان فوت بھی ہو چکا ہو کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے
کہ موج کے حائل ہونے کے باوجود کنعان کو زندہ رکھے۔ اس میں صحیح یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے یہ سوال موج کے حائل ہونے سے
پہلے کیا جیسا کہ آنے والے مضمون فلا تسئلن سے ثابت ہوتا ہے۔ (کذا فی بحر الکلام)

وَاَنْتَ اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْنَ ○ اور تُو احکم الحاکمین ہے اس لیے کہ تمام حکام سے آپ کا علم وسیع تر ہے اور ان سب سے
تو ہی زیادہ عادل ہے اس لیے کہ ہر حاکم دوسرے سے فضیلت پاتا ہے تو علم وعدل کی وجہ سے۔

ہمارے دور سے بہت بڑے جاہل دینی علم سے بالکل کورے اور غضب کے ظالم ہیں لیکن ان کو اقضی القضاۃ اور احکم الحکمین کا لقب دیا جاتا ہے۔ (پناہ بخدا) **اعجوبہ**

جار اللہ زمخشری نے کیا خوب فرمایا: ؎

قضاۃ زماننا صاروا لصوصاً

عموما فی القضایا لاخصوصا

خشینا منہموا لوصافحونا

للصوا من خواتمنا فصوصا

ترجمہ: ہمارے دور کے حاکم سب کے سب چور بن گئے اور ان کے تمام فیصلے مبنی برظلم ہوتے ہیں بلکہ ہمیں تو ان سے مصافحہ کے طور ہاتھ ملانے میں بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ہاتھ ملاتے ہوئے ہماری انگشتریوں سے نگینے نہ چرالیں [1]

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حاکم (قاضی) کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ بہشتی

۲، ۳۔ دوزخی

بہشتی وہ ہے جو حق پہچان کر فیصلہ دے۔

ایک دوزخی حاکم وہ ہے کہ جو حق پہچان کر ظلم کے طور پر کسی کا حق تلف کرے۔

دوسرا دوزخی وہ ہے جسے فیصلہ کا علم نہ ہو جہالت سے فیصلہ کرے۔ یہ دونوں بلاحساب جہنم میں جائیں گے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے فرمایا: ؎

مہا زور مندی مکن بر کہان

کہ بر یک نمط می نماند جہان

ترجمہ: اے سردار! غریبوں پر زبردستی نہ کر (اس لیے کہ) جہان ایک طریقہ پر نہیں رہے گا۔

اور فرمایا:

لب خشک مظلوم را گو بخند

کہ دندان ظالم بخواہد کند

---

[1] ہمارے دور کے بعض حکام اس سے بھی نمبر لے گئے۔ اویسی غفرلہ

ترجمہ : مظلوم کو کہہ دیجیے کہ غم نہ کھا بلکہ خوش ہو کیونکہ ایک دن ظالم کے دانت نکالے جائیں گے۔

قَالَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یٰنُوْحُ اِنَّهٗ اے نوح (علیہ السلام) بیشک تیرا بیٹا لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ تیرے اہل سے نہیں۔ اور میں نے تیرے اہل کے لیے وعدہ کیا تھا وہ پورا ہوگیا اور اس کے بعد جو ہم نے استثناء کیا تھا وہ اسی استثناء سے تیرے اہل میں نہیں رہا۔ کیونکہ اھل سے میری مراد قرابتِ دینی تھی کیونکہ مومن و کافر کی کسی قسم کی قرابت داری نہیں ہوتی اور وہ کنعان تمہارے دین میں داخل نہیں ہوا بلکہ وہ کافروں میں شامل رہا ہے اسی لیے وہ آپ کا اہل نہیں ہے۔

ف : حضرت ابن عباس و مجاہد و عکرمہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا لیکن عملی (دینی) لحاظ سے ان کے خلاف تھا۔ (اسی لیے مارا گیا)

لطیفہ حکماء نے فرمایا ہے کہ جو بیٹا اپنے (نیک) باپ کی پیروی نہ کرے، سمجھو وہ اپنے باپ سے گیا۔ اسی طرح وہ اُمت جو اپنے نبی علیہ السلام کی متابعت نہ کرے وہ بھی تباہ و برباد ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم و عمل کے بغیر نسب پر فخر کرنا بے سود ہے۔ اسی نکتہ کو حضرت شیخ سعدی قدس سرہ نے بیان فرمایا کہ ؎

چو کنعان را طبیعت بے ہنر بود
پیمبر زادگی قدرش نیفزود
ہنر بنمائے اگر داری نہ گوہر
گل از خار است و ابراہیم از آزر[1]

ترجمہ : چونکہ کنعان بے ہنر تھا اسی لیے پیمبر زادگی سے اسے کوئی قدر و منزلت نصیب نہ ہوئی۔ تمہیں چاہیے کہ کوئی ہنر (علمی) حاصل کرو اگرچہ نسب ادنیٰ ہی ہو۔ دیکھیے گل خار سے اور ابراہیم علیہ السلام آزر سے پیدا ہوئے۔ لیکن ہنر (علمی وغیرہ) نے قدر و منزلت کو چار چاند لگا دیے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قرابت داروں سے فرمایا اے بنی ہاشم! لوگ میرے ہاں اعمال لے کر آئیں گے اور تم اپنا نسب نامہ!

ف : اس سے حضور علیہ السلام نے واضح فرما دیا کہ نسب پر فخر اور بھروسہ کرنا بیوقوفوں کا کام ہے۔ اسی لیے فرمایا : اے بنو ہاشم! غور کرو کہ عوام اعمال کی برکت سے میرے حضور حاضر ہوں گے لیکن تم اپنے نسب کے خیال میں رہو گے۔

؎

ما ینفع الاصل من هاشم اذا کانت النفس من باهله

---

[1] آزر ابراہیم کا باپ نہیں تھا بلکہ چچا اور مربی تھا۔ شیخ سعدیؒ نے اسی تربیت کی مناسبت سے فرمایا ہے۔ ۱۲

ترجمہ: کیا ہوا اگر اصل نسب قبیلہ ہاشم سے ہو جبکہ نفسانی عادت قبیلہ باہلہ سے متعلق ہو۔

ف: باہلہ عرب میں ایک خسیس ترین قبیلہ ہے جو مردار کی ہڈیوں کا نچوڑ کھاتا پیتا تھا۔

إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ یہ دراصل انه ذو عمل غیر صالح تھا یعنی وہ غیر صالح عمل والا ہے۔

سوال: مضاف کیوں محذوف کیا گیا۔

جواب: مبالغہ مطلوب ہے کہ وہ اتنا بدبخت ہے کہ بدعمل کا عین ہے۔

سوال: اس کے بجائے عمل فاسد کہا جاتا تو نہایت موزوں تھا وہ بھی غیر صالح کا ہم معنی ہے۔

جواب: مقصد یہ ہے کہ نجات کا دارومدار صلاحیت پر ہے اور وہ لفظ عمل فاسد سے واضح نہیں جتنا غیر صالح سے واضح ہے۔

نکتہ: صاحب روح البیان فرماتے ہیں کہ فقیر کو یہاں پر انکشاف ہوا ہے کہ عمل بمعنے الکسب والفعل ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ کنعان آپ کا غیر صالح کسب ہے۔ اس تقریر کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہاں پر مضاف محذوف نہیں ماننا پڑتا اور اولاد کو حدیث شریف میں کسب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اطيب ما ياكل الرجل من كسبه و ان ولده من كسبه۔ — پاکیزہ ترین انسان کا وہ مال ہے جو اپنی کمائی سے حاصل کرتا ہے اور اولاد بھی اس کے کسب سے ہے۔

اور فرمایا:

انت ومالك لابيك۔ — تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

حکایت: کسی دانا کو کسی نے اپنی عورت سے جماع کرتے دیکھ کر پوچھا، کیا کر رہے ہو؟ اس نے وہیں پر جواب دیا کہ ایسا کام کر رہا ہوں کہ اگر پورا ہو گیا تو میری اس کمائی سے انسان پیدا ہوگا۔

ف: ان دلائل سے معلوم ہوا کہ کسب بمعنے اولاد ہوتا ہے۔

فَلَا تَسْأَلْنِ حضرت نوح علیہ السلام کی ندا کو سوال سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی اس ندا میں ایک سوال اور طلب مضمر تھی[1] یعنی جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ کنعان کا معاملہ سنگین ہے تو آپ اس کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کیجئے۔ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ایسا سوال نہ کیجیے جس کے متعلق تمہیں علم نہیں یعنی جس کے متعلق تمہیں یقین نہیں کہ وہ مطلب عین صواب یا حکمت کا موافق ہے تو ایسا سوال نہ کیجئے۔ إِنِّي أَعِظُكَ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں أَنْ تَكُونَ اس سے خطرہ ہے کہ تم ہو جاؤ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ جاہلوں سے۔

ف: ترک اولیٰ کو جہل سے تعبیر کرنے میں اشارہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو الا من سبق عليه القول کے استثناء میں واضح طور

---

[1] اس سے ثابت ہوا کہ نوح علیہ السلام نے عرفی دعا نہیں بلکہ صرف ندا دی تھی۔ اس سے وہابیوں دیوبندیوں کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے دعا مانگی تھی۔

سمجھا دیا گیا کہ کنعان بہر حال کافروں کی جماعت میں سے ہے۔ اس سے ضرورت باقی نہیں رہی تھی کہ نوح علیہ السلام کنعان کے بارے میں کچھ کہتے لیکن شفقت پدری سے ایسے مغلوب ہوئے کہ استثناء کا مضمون آپ کے ذہن سے محو ہو گیا۔ اسی لیے سوال کر بیٹھے جس وجہ سے آپ پر عتاب نازل ہوا کہ جو بات نہ کہنے کی تھی آپ نے کیوں کہہ دی [1]

قَالَ نوح علیہ السلام نے فرمان سن کر عرض کی: یا الٰہ العالمین! میں نے تیرا حکم مان لیا اس کے بعد میں ایسا سوال نہیں کروں گا۔ لیکن میں اس پر قدرت نہیں رکھتا سوائے تیری امانت کے۔ میرے اس وعدہ پر بھی تیری ہدایت شامل ہونی چاہیے اسی بنا پر کہا رَبِّ اِنِّیٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ اے میرے رب! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ پھر اس جیسا سوال کروں مَا لَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ کہ جس کا مجھے علم نہ ہو یعنی ایسا سوال کر بیٹھوں جو مقتضائے حکمت کے منافی ہو۔ یعنی مجھے آئندہ ایسا سوال کرنے سے بچانا۔

ف: حضرت نوح علیہ السلام تا وصال (موت) اسی وجہ سے استغفار کرتے رہے۔

مسئلہ: نیک لوگوں کا یہی طریقہ ہے کہ انہیں جس بات کی نصیحت کی جائے اسے قبول کر لیتے ہیں اور انہیں جس غلطی پر متنبہ کیا جائے اس پر استغفار کرتے اور ہمیشہ پناہ مانگتے رہتے ہیں۔

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے یہ حکایت اس لیے بیان فرمائی تاکہ بندوں کو نوح علیہ السلام کی اقتداء نصیب ہو اور باوجود بہت بڑی خطا کے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی۔ کما قال:

یا نوح اھبط بسلٰم منا و برکٰت۔ حکم ہوا اے نوح علیہ السلام! ہماری طرف سے سلام اور برکات نازل ہوں۔

حقیقی توبہ کی دو نشانیاں ہیں:

حقیقی توبہ ۱۔ آئندہ اس فعل کے ترک پر پختہ ارادہ کر لینا۔ نوح علیہ السلام کے واقعہ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے عرض کی: انی اعوذ بک الخ

۲۔ اظہارِ ندامت اور استغفار پر مداومت۔

وَاِلَّا یہ لفظ ان شرطیہ اور لا نافیہ سے مرکب ہے۔ پھر نون کو لام میں مدغم کیا گیا ہے تَغْفِرْ لِیْ اور اگر تو میری غلطی سے سوال کی خطا کو نہ بخشے گا وَتَرْحَمْنِیْٓ اور میری توبہ پر رحم نہیں فرمائے گا تو اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ ہو جاؤں گا میں عملی لحاظ سے خسارہ پانے والوں سے۔ اس لیے اس قدر بڑے انعامات (۱۔ نجات ۲۔ دشمنوں کی ہلاکت) پر شکر نہ کرنا اور لایعنی امور (مثلاً جس کے متعلق کہا گیا کہ اس کے عمل غیر صالح ہیں اس کی نجات کا سوال کرنا) میں مشغول ہو جانا گھاٹے کا سودا ہے۔

مسئلہ: توبہ، استغفار، التجاء الی اللہ الملک الغفار مومن کا موت تک معمول بن جانا چاہیے اور اسے ان اوراد میں شامل رکھے کہ

---

[1] دورِ حاضرہ میں انبیاء علیہم السلام کی قدر و منزلت گھٹانے کی ناکام کوششیں جاری ہیں۔ چند آیات رٹ کر عوام کو بہکایا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے تفسیر اویسی دیکھیے۔ ان میں ایک آیت یہ بھی ہے۔

مرتے دم تک جاری رہیں اس لیے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ کبھی ترقی کرتا ہے کبھی گر جاتا ہے اور سالک ہوتا بھی وہی ہے کہ کبھی تجلیات سے نوازا جاتا ہے کبھی اس کے آگے حجابات آجاتے ہیں۔ اور کامل وہ ہوتا ہے جو عالمِ صفات اور ذات کی طرف سیر کرتا چلا جاتا ہے۔ دیکھیے نوح علیہ السلام بیٹے کے لیے کچھ سوال کر بیٹھے۔ پھر اس پر تائب ہوئے۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کا مطالبہ کر لیا۔ پھر اس سے توبہ کر لی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے کرشمے ہیں جب اس کا ورود ہوتا ہے تو بندہ کی تمام تدبیریں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

ایں ہم از تاثیر حکمت و قدر
چاہ می بینی و نتوانی حذر
نیست خود از مرغ پران ایں عجب
کو نہ بیند دام و افتد در عطب
ایں عجب کہ دام بیند ہم وتد
گر بخواہد ور نخواہد مے فتد
چشم باز و گوش باز و دام پیش
سوئے دامے می پرد با پر خویش

ترجمہ: یہ بھی حکم اور تقدیر الٰہی کی تاثیر ہے کہ کنویں کو دیکھنے کے باوجود اس میں گر جاتا ہے اس سے بچنے کی تدبیر کرتا بھی ہے لیکن بچ نہیں سکتا۔ اس پرندے پر تعجب نہیں جو اڑنے کی قدرت نہیں رکھتا وہ دام کے بغیر گرفتار ہو جاتا ہے۔ البتہ اس پرندے پر تعجب ہے کہ دام کو دیکھ رہا ہے لیکن جب تقدیر آتی ہے وہ چاہے نہ چاہے گرفتار ہو جاتا ہے اس کی آنکھ بھی کھلی ہے جانتا بھی ہے کہ یہ دام ہے لیکن اپنے پروں سے اڑ کر اسی دام میں پھنستا ہے یہ تمام کرشمے تقدیر کے ہیں۔

یہی حال حضرت نوح علیہ السلام کا ہے کہ انھیں باوجود بار بار تنبیہ کرنے کے کہ کنعان ناری ہے لیکن پھر بھی اس کی نجات کے لیے سوال کر لیا۔

تفسیر صوفیانہ

ونادیٰ نوح اور نوح یعنی روح نے ندا دی ربہٗ فقال رب ان ابنی من اھلی اپنے رب کو، اور کہا کہ میرا بیٹا یعنی نفس جو روح و جسم کے اجتماع سے پیدا ہوا وہ میرے اہل سے ہے وان وعدک الحق اور وعدہ یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے ارواح مقدسہ علویہ کو اپنے قرب و جوار اعلیٰ علیین سے اسفل سافلین کے قالب میں اتارنے کا ارادہ فرمایا تو انبیا علیہم السلام اور اولیاء کرام اور خواص مومنین کی ارواح نے عرض کی کہ اے الٰہ العٰلمین! ہمیں اپنے قرب کے اعلیٰ مقام سے اسفل درجات کے بعد میں اور عالمِ بقا سے عالمِ فنا کی طرف اور دار السرور واللقاء سے دار الحزن والبلاء کی طرف اور تجرد و وصل کی منزل سے توالد و تناسل کی منزل کی طرف اور رتبۂ اصطفاد و اجتباد سے رتبۂ اجتہاد و ابتلا کی طرف اتار کر تکلیف میں ڈال رہا ہے

اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ میں اپنی مہربانیوں اور کرم نوازیوں سے تمہیں نہیں بھولوں گا اور تمہاری تمام مشکلات حل کروں گا اور ہر دُکھ سے نجات دُوں گا۔ تمہیں اور تمہارے اہل کو بھی ہلاکتوں سے بچاؤں گا۔ پھر تقدیر الٰہی کی حکمت پر جیسے نوح علیہ السلام کے چار بیٹوں سے تین مومن اور ایک کافر تھا ایسے ہی روح کے چار بیٹوں میں سے تین (قلب، سر، عقل) مومن اور ایک (نفس) کافر ہے۔ پھر جیسے ان کے تینوں مومن صاحبزادے ان کے ساتھ کشتی میں موجود تھے اور ایک کافر کنعان کشتی سے دور الگ کھڑا ہو گیا۔ ایسے ہی روح کے تین بیٹے قلب، سر اور عقل اس کے ساتھ کشتیِ شریعت میں موجود رہتے ہیں لیکن نفس روح اور دین و شریعت سے دُور بھاگتا ہے۔ پھر جیسے نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کنعان کو غرق ہوتے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو وعدہ یاد دلایا ایسے ہی جب رُوح نے نفس کو بحرِ دنیا اور طوفانِ فتن میں غرق ہوتے دیکھ کر عرض کی:

اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝

اور تو احکم الحاکمین ہے اگر تو اسے نجات دے۔ تو اعدل العادلین ہے اگر تو اسے غرق کرے۔ تُو جو کچھ کرتا ہے درحق ہے۔ کیونکہ حکیم احکم الحکام ہے تیرا ہر فعل عدل ہے اور تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے تو ہر ایک کے معاملات کو بہتر جانتا ہے۔

قَالَ اللہ تعالیٰ نے رُوح سے فرمایا: یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ؕ اے نوح یعنی رُوح! یہ نفس تیرے دین وملت سے نہیں کیونکہ اہلیت دو قسم کی ہے:

۱۔ اہلیت قرابت

۲۔ اہلیت ملت و دین

یہاں پر اس کی اہلیت قرابت کی نفی نہیں کیونکہ نفس روح سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے بعد اہلیت دینی کی نفی کی علت بتائی کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ؗ بے شک وہ نااہل ہے اس کے عمل اچھے نہیں۔ یعنی وہ تمہارے دین پر نہیں اور نہ ہی وہ تمہاری ملت اختیار کرتا ہے اسی لیے وہ امارت بالسوء سے بھرپور ہے اور وہ اس کی جبلی اور دائمی عادت ہے۔ اس کے بعد روح کو آدابِ طریقت سکھائے۔ چنانچہ فرمایا:

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ پس آئندہ مجھ سے سوال نہ کرنا کیونکہ تجھے علم حقیقی حاصل نہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ اہل قرابت کے لیے ایسی نوازشیں کی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اے رُوحِ قدس! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں اَنْ تَكُوْنَ اتنی نوازشات سے ہو جاؤ گے مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ جاہلوں سے یعنی ان نفوس سے جو ظالم و نااہل ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ روح نفس کی متابعت اور اس کی خواہشات پر عمل کرنے سے جاہل، سفلی الطبع اور دنی الہمۃ ہو جاتا ہے۔ قَالَ رُوح نے کہا رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اے اللہ! میں پناہ چاہتا ہوں کہ آئندہ ایسا سوال کروں کہ جس کا مجھے علم نہ ہو۔ یعنی ایسے نفس کی نجات کا سوال کر بیٹھوں جسے تو نے آزمائش میں ڈالا ہو۔ اور وہ آفاتِ دنیا اور طوفانِ فتن سے شہوات میں پھنسا ہو۔ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ اور اگر تو نہیں بخشے گا یعنی انوارِ مغفرت سے میری نابینائی کو دور نہ فرمائے گا وَتَرْحَمْنِیْۤ اور میرے عجز پر

رحم نہیں فرمائے گا اور تیری ہدایت کے بغیر میرا ہدایت پر پہنچنا مشکل بھی ہے أَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ تو میں خسارہ والوں سے ہو جاؤں گا۔
اس میں اشارہ ہے کہ روح کو خسارے سے صرف رحمتِ حق بچا سکتی ہے۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

تفسیر عالمانہ

قِيْلَ اس کا قائل اللہ تعالیٰ ہے يٰنُوْحُ اهْبِطْ هبط لازم اور متعدی دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ لازم کا مصدر هبوط اور متعدی کا مصدر هبط آتا ہے جیسے رجوع و رجع ۔ یہاں لازم مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے فرمان ہوا کہ اے نوح (علیہ السلام) کشتی سے جبل جودی کی طرف اتر جائیے۔ جودی پہاڑ پر آپ کی کشتی ایک ماہ ٹھہری رہی۔ یا حکم ہوا تھا کہ جودی پہاڑ سے زمین کی طرف اتر جائیے۔ بِسَلٰمٍ درانحالیکہ تمہیں دکھ اور تکالیف سے سلامتی ہو مِّنَّا ہماری طرف سے۔ سلٰم بمعنے سلامۃ اور اهبط کے فاعل سے حال ہے اور مِنَّا اسی کی صفت ہے جو اس کی عظمت و کمال پر دلالت کرتی ہے کیونکہ جو شے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو وہ لازماً باکمال اور عظیم الشان ہوتی ہے یا سلام سے تحیّہ مراد ہے یعنی ہم تمہیں (نوح علیہ السلام کو) السلام علیکم کہتے ہیں۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا:

سلامٌ علیٰ نوح فی العالمین۔

اس معنے پر سلام بمعنے تسلیم ہوگا۔ لیکن پہلا موزوں تر ہے۔ کیونکہ مقام کا تقاضا اس طرح ہے کہ وہ اس وقت غرقابی سے بچ کر کشتی سے اترے تھے۔ وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ اور تم پر برکتیں اور تمہاری نسل اور تمہارے معاشی امور میں زیادہ سے زیادہ بھلائیاں ہوں۔ یعنی آل اولاد اور مال اسباب اور رزق وغیرہ میں برکتیں ہی برکتیں ہوں وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ط اور ان لوگوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری تبلیغ قبول کر کے تمہاری جماعت میں شامل ہیں یہاں پر من ابتدائیہ ہے۔ اس سے ان کی اپنی امت مراد ہے جو ان پر ایمان لائے تھے ان کے لیے بھی ان کی آل اولاد اور رزق وغیرہ کی تاقیامت دعا کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے امم عام لیکن مراد خاص نوح علیہ السلام کی امت ہے۔ یہ اس روایت پر تقریر ہوگی جو قائل ہیں کہ کشتی میں آپ کی اولاد کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جیسا کہ پہلے کشتی میں جانے والوں کی گنتی کا اختلاف ہم نے بیان کیا ہے اور جن کے نزدیک یہ قول مختار ہے کہ کشتی میں صرف آپ کی اولاد اور ان کی عورتیں اور آپ کی ایک اہلیہ تھی جو کل آٹھ افراد تھے۔ ان کے قول پر تاویل کی ضرورت نہیں۔

ف: پہلے قول کے مطابق باقی جتنے لوگ تھے سب فوت ہو گئے۔ اس کے بعد ہم جتنے ہیں سب نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اس لحاظ سے نوح علیہ السلام ابو الخلق کہلاتے ہیں۔ انہیں آدم ثانی اور آدم اصغر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اب جتنی مخلوق ہے وہ سب انہی کی اولاد سے ہے اور اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے کہ وہ قلیل سے کثیر پیدا فرماتا ہے جیسے سادات کرام حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے ہیں۔ کربلا کے میدان میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا تمام کنبہ شہید ہو گیا صرف سیدنا امام زین العابدین بچ گئے اگرچہ اس وقت صغیر السن تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کی اولاد میں وہ برکت بخشی کہ اقالیم سبعہ کا کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں سادات کرام نہ ہوں۔

ف: نوح علیہ السلام نے اقالیم سبعہ اپنے تین صاحبزادوں میں تقسیم فرما دی۔ سام کو بلادِ حجاز، یمن اور شام عطا فرمایا۔ اسی لیے

انھیں ابوالعرب کہتے ہیں۔

حام کو بلاد سودان عطا فرمایا۔ اسے ابوالسودان کہا جاتا ہے۔

یافث کو بلادِ مشرق عطا فرمایا۔ انھیں ابوالترک کہتے ہیں۔

ف : مامون کے زمانے میں اقالیم سبعہ کی گنتی کی گئی تو کُل سلطنتیں تین سو تینتالیس (۳۴۳) ہوئیں۔ ان میں بعض کا حدود اربعہ صرف تین دنوں کا تھا۔ اور یہ سب سے چھوٹی سلطنتیں تھیں۔ اس وقت ان میں سب سے بڑی سلطنت تین ماہ کی تھی۔ ان سے ایک مملکت خطِ استوا میں واقع ہے وہاں سال میں دو بار ربیع اور دو بار خریف آتا ہے اور بعض ملک ایسے بھی ہیں جہاں چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات رہتی ہے۔ ان کے بعض مہینے گرم اور بعض سرد ہوتے ہیں۔ اس وقت اقالیم سبعہ کے کل شہر چار ہزار پانچ سو چھپن تھے۔ بعض نے اس سے کم و بیش بھی بتائے ہیں۔

اعجوبہ کل آبادی، ویران اور غیر آباد کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے ہاتھ کی ہتھیلی کے مقابلہ میں رائی کا دانہ۔

دنیا کا بسیار خور جانور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ملک میں ایک ایسا جانور بھی ہے جو عالم کائنات کی خوراک کے برابر روزانہ کھاتا ہے۔ یعنی دوسرے جن، انسان، حیوان، چرند، پرند، حشرات الارض وغیرہ جتنی خوراک روزانہ کھاتے ہیں اتنی روزانہ وہ اکیلا کھاتا ہے۔

سبق اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمت پر غور کیجئے کہ وہ کیسے اپنی رحمت سے مخلوق کو رزق عطا فرماتا ہے۔ پھر ہم تم کیوں روزی کی فکر کریں۔ مثنوی شریف میں ہے : ؎

جملہ را رزاق روزی میدہد
قسمت ہر کس کہ پیشش میدہد
سالہا خوردی و کم نامد زخور
ترک مستقبل کن و ماضی نگر

ترجمہ : سب کو رزاق روزی دیتا ہے۔ جتنا کسی کا مقسوم ہے اسے ضرور ملتا ہے۔ کتنے سال تم نے کھایا کبھی کمی نہیں ہوئی۔ اب تمہیں مستقبل کی کیا فکر ہے تم ماضی کو دیکھو۔

وَ اُمَمٌ امم مبتدا اور سَنُمَتِّعُهُمْ اس کی صفت اور خبر محذوف ہے جو کہ منہم ہے۔ یعنی تمام لوگ جو ان سے پیدا ہوں گے ان سب پر برابر طور برکات وسلامتی نازل نہیں ہوگی بلکہ بعض ان میں ایسے ہوں گے کہ انھیں ہم دنیا میں دنیا کے عیش وعشرت کا نفع دیں گے۔ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا پھر ہماری طرف سے پہنچے گا انھیں عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ عذاب دردناک آخرت میں یا دنیا و آخرت دونوں میں۔ ان سے کفار اور بعض مجرم گنہگار مراد ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے منافی ہے کہ تمام لوگ سعادت مند ہوں یا تمام بدبخت بلکہ ان میں بعض نیک بخت اور بعض بدبخت کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جمال و جلال کو امانت کے طور پر رکھا ہے۔ جیسے اس نے

چاہا ہے اسی لیے ان دونوں کا ظہور لازمی ہے۔ کسی میں جمال کا ظہور، کسی میں جلال کا۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بو لہب نباشد

ترجمہ: عشق کے کارخانے میں کفر کا ہونا لازمی ہے ورنہ آگ کسے جلاتی اگر ابولہب نہ ہوتا۔ یعنی برائیوں کا صدور ہوگا۔ اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ بندہ کفر اور برائیوں پر مجبور ہے۔

کوّے کو بد دُعا اور کبوتر کو انعام

تفاسیر میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب کشتی کو جودی پہاڑ پر ٹھہرایا تو آپ نے کشتی کا وہ حصّہ کھولا جہاں پرندے رہتے تھے۔ آپ نے کوّے سے فرمایا کہ زمین کو دیکھ کہ اس پر باقی کتنا پانی ہے (کذا فی تفسیر ابی اللیث) یا کتنا شہر غرق ہو چکا ہے (کذا فی حیٰوۃ الحیوان)۔ کوّے کو ایک مردار ملا۔ وہ اسی کے کھانے میں مست ہو گیا، واپس نہ آیا۔ اسی سے عرب کی ایک مشہور کہاوت ہے:

ابطاء من غراب۔

فلاں تو کوّے سے بھی زیادہ دیر لگاتا ہے۔

چونکہ نوح علیہ السلام کو خشک اور سخت زمین کی ضرورت تھی اس لیے اس کے دیر کرنے پر کبوتر کو بھیج دیا۔ اسے زمین کا کوئی خطہ بھی نظر نہ آیا اسی لیے زیتون کا ایک پتہ لے کر حاضر ہو گیا۔ اس سے نوح علیہ السلام نے اندازہ لگایا کہ پانی کم ہو گیا ہے جس سے درخت ظاہر ہو گئے ہیں لیکن زیرِ آب ہے۔ چند دن ٹھہر کر پھر اسی کبوتر کو بھیجا وہ زمین پر پہنچا تو زمین کی کیچڑ میں اس کے پاؤں بھر گئے۔ واپس آیا تو نوح علیہ السلام نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اب پانی زمین میں جذب ہو گیا ہے لیکن زمین خشک نہیں ہوئی۔ حضرت نوح علیہ السلام کبوتر کی اس کارروائی پر بہت خوش ہوئے اور اس کے گلے میں سبز طوق پہنایا۔ آج وہی طوق کبوتر کی اس خوش بختی کی خبر دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی نوح علیہ السلام نے کبوتر کے لیے امان و سلامتی کی دعا فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ کبوتر انسانی آبادی سے مانوس ہے۔ اور کوّے کو خوف کی بددعا دی۔ یہی وجہ ہے کہ کوّا انسانی آبادی سے ہراساں رہتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ آج تک اسے منحوس سمجھتے ہیں[1]۔ اس کے نام سے لفظ الغربۃ اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ غراب البین کی کہاوت بھی مشہور ہے۔ اس لیے کہ وہ نوح علیہ السلام سے جُدا ہو گیا تھا۔

فضائل یوم عاشورا

مروی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام دسویں محرم میں اپنے ساتھیوں سمیت کشتی سے اترے تو آپ نے اسی دن شکر کا روزہ رکھا اور اپنے تمام ساتھیوں کو بھی روزے کا حکم دیا۔

ف: چھ ماہ کے طویل عرصے میں خرچ ختم ہو چکا تھا آپ نے آج کے روز افطار کے لیے ساتھیوں کو حکم فرمایا کہ جو شے بھی ملے، لاؤ۔ تاکہ

---

[1] لیکن دیوبندی اسے حلال سمجھ کر کھانا ثواب سمجھتے ہیں (فتاویٰ رشیدیہ) اور وہابی غیر مقلد بھی۔ (فتاویٰ ثنائیہ)

اسی سے افطار کیا جائے۔ کوئی گندم، کوئی مسور اور کوئی چنے لایا، یہاں تک کہ کل سات دانے ہوئے۔ آپ نے انہیں پانی میں ابال کر ساتھیوں سمیت روزہ افطار کیا۔ نوح علیہ السلام کی برکت سے اس تھوڑے سے طعام سے سب سیر ہو گئے۔

ف: طوفانِ نوح کے بعد زمین پر سب سے پہلے یہی طعام پکایا گیا۔

اہلسنت کے لیے یوم عاشورا کو طعام پکا کر غرباء و مساکین کو کھلانے کی سند

اہلسنت اسی عاشورا کے روز طعام پکا کر غرباء و مساکین کو کھلاتے ہیں۔ اس پر وہابی طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ صاحبِ روح البیان نے مذکورہ بالا واقعہ لکھ کر تحریر فرماتے ہیں کہ:

فاتخذ الناس سنة یوم عاشوراء و فیه اجر عظیم من یفعل ذلك و یطعم الفقراء و المساکین[1] (روح البیان ج ۴ ص ۱۴۲)

اسی وجہ سے لوگ (اہلسنت) عاشوراء کے دن طعام پکا کر غرباء و مساکین کو کھلاتے ہیں۔ ان کی سند یہی نوح علیہ السلام کا فعل ہے۔

تمام بیماریوں سے شفا کا علاج

مروی ہے کہ عاشورا کی رات آبِ زمزم دنیائے عالم کے تمام پانیوں میں اللہ تعالیٰ ملاتا ہے۔ فلہٰذا اسی عاشورا کے دن جو بھی غسل کرے گا سال بھر تمام بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ (کذا فی الروض الفائق)

مسئلہ: جو اسی عاشورا کے دن اپنے اہل و عیال کو اکل و شرب کی وسعت دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے سال بھر کے رزق میں وسعت بخشتا ہے۔ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے جیسے لکھا گیا ہے بحمدہ تعالیٰ ویسے ہی ہے (کذا فی الاسرار المحمدیہ)، یہ بھی اہلسنت کی دلیل ہے۔

مسئلہ: عقد الدرر واللآلی میں ہے کہ اسی عاشورا کے دن نیک کام کرنا مستحب ہے۔ مثلاً صدقہ، خیرات، روزہ، ذکر، فکر وغیرہ۔

شیعوں کی مشابہت سے بچو

مومن (سنی) پر لازم ہے کہ بعض امور میں یزید ملعون کی مشابہت اور شیعہ و روافض و خوارج کے تبلہ امور سے بچے۔ یعنی یزید اور خارجیوں کی طرح اس دن عیدسی خوشی نہ منائے اور نہ ہی شیعوں کی طرح ماتم کرے نہ ہی ان کے تعزیوں اور ماتمی جلوسوں میں شمولیت کرے۔

یوم عاشورا کا سرمہ

عاشوراء کے دن آنکھوں میں سرمہ نہ لگانا چاہیے کیونکہ اس دن خوشی سے یزید نے سرمہ لگایا اور یزید کی تشبیہ سے بچنا لازم ہے۔ اگرچہ عاشورا کے دن سرمہ لگانے کے متعلق روایت صحیح ہے لیکن کبھی تشبیہ سے بچنے کے لیے ترکِ سنت بھی سنت ہے جبکہ اہل بدعت (سنیہ) سے تشبیہ ہوتی ہے۔ مثلاً دائیں ہاتھ میں انگشتری پہننا حدیث سے ثابت ہے لیکن چونکہ دائیں میں انگشتری پہننا اہل بدعت (سنیہ) اور ظالمین کا شعار ہے۔ اسی لیے اب اس سنت کو ترک کر کے انگشتری

---

[1] انبیاء علیہم السلام کی شریعت کے امور ہماری شریعت میں روا ہیں جب تک ان کی ممانعت میں تصریح نہ ہو۔ (کذا فی اصول الفقہ والدین)

بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی (خنصر) میں پہننی چاہیے (کذا فی القہستانی، (یہ ان کے دور کی بات ہے) اسی طرح سرمہ والا پروگرام بھی۔ ورنہ عاشورا کے دن سُرمہ لگانے میں حرج نہیں۔

مسئلہ: ٹیڈی (تنگ، لباس اور حد سے زیادہ کپڑے کا لباس نہ ہونا چاہیے۔

مسئلہ: عاشورا کے دن نہانا، دوستوں، عزیزوں اور قرابت داروں کی ملاقات کے لیے جانا، طعام وغیرہ میں توسیع جائز ہے جبکہ بدمذاہب شیعہ و خوارج سے تشبیہ مدنظر نہ ہو۔ جیسے نصاریٰ اور مجوسیوں کے عیدوں کے ایام میں اتفاقیہ طور پر یا کسی مصلحت کے تحت اچھا لباس پہننے میں کوئی حرج نہیں جبکہ ان سے تشابہ مطلوب نہ ہو۔

تنبیہ: عاشورا یا محرم کی پہلی تاریخوں میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے واقعات بالخصوص ایسے واقعات سنانا جو رونے رلانے والے ہوں اور ان سے شہدائے کربلا کی تعظیم کے منافی بیانات ہوں، بیان نہ کیے جائیں تاکہ روافض سے تشبیہ نہ ہو۔ (اس مرض میں اہل السنت بالخصوص مبتلا ہیں[1]) البتہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ بیان کرنے کا ایک طریقہ جو قہستانی نے باب الکراہتہ میں بیان فرمایا کہ اگر ان دنوں میں حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر خیر اور ان کی شہادت کے واقعات بیان کرنا ہیں تو ان کے ذکر شریف سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و کمالات اور ان کی شہادت کے واقعات بھی بیان کیے جائیں۔ (جیسے حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے سوانح کربلا (کتاب) میں طریقہ لکھا ہے) تاکہ روافض سے تشابہ نہ ہو[2]۔

تنبیہ: حجۃ الاسلام میں امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ مواعظ و مقرر پر بالخصوص اور عوام پر بالعموم حرام ہے شہادت حسین رضی اللہ عنہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آپس کے جھگڑوں اور نزاعی باتوں کا ذکر کریں کیونکہ اس طرح سے ان سے سوءظنی اور ان پر طعن و تشنیع کا دروازہ کھلتا ہے جبکہ وہ دین کے بہت بڑے ستون تھے۔ اگر کسی وقت ان کے باہمی منازعات و مخاصمات کا ذکر چل نکلے تو ایسا پہلو اختیار کیا جائے کہ ان کے علو شان پر دلالت کرے یا کم از کم اسے خطائے اجتہادی (جیسے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے) پر محمول کیا جائے کیونکہ ان کے اختلافات مبنی بر دین و دیانت تھے نہ کہ برائے طلب دنیا اور ریاست و حکومت۔ جیسا کہ دین سے عشق رکھنے والے کو معلوم ہے۔

مسئلہ: حضرت عزالدین بن سلام رحمہ اللہ تعالیٰ نے آفات اللسان کے باب میں "الخوض فی الباطل" کی ایک مستقل فصل باندھی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ انسان پر لازم ہے کہ باطل کلام سے احتراز کرے۔ مثلاً جماع کے حالات بیان کرنا، شراب کی محفلوں کا ذکر چھیڑنا اور ظالموں کے تشدد اور ظلم کی داستانیں سنانا، اہلِ ہوا جیسے وہابی، دیوبندی، مرزائی، شیعہ، نیچری، چکڑالوی اور دہریوں کے عقاید و مسائل بیان کرنا۔ اسی طرح صحابہ کرام کے باہمی منازعات و مخاصمات کو اچھالنا وغیرہ۔

---

[1] جیسے شیعہ اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی بیبیوں کے نام لے کر ان کی بے پردگی کا تذکرہ کرتے ہیں ہمارے بعض واعظین بھی۔

[2] دیوبندیوں کے قطب العالم رشید احمد گنگوہی نے فتاویٰ رشیدیہ میں علی الاطلاق ان دنوں ذکرِ حسین کو ناجائز لکھا ہے۔

حسین کے قاتل کا انجام

قاتلِ حسین کا انجام بہت بُرا ہوا اور وہ مرتے ہی اپنے ہم جنسوں سمیت جہنم میں چلا گیا۔ کسی شاعر نے کہا: ؎

لا بد ان ترد القیامة فاطم
و قمیصها بدم الحسین ملطخ
ویل لمن شفعاؤہ خصماؤہ
والصور فی یوم القیٰمة ینفخ

ترجمہ: بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خون آلود قمیص قیامت میں لائیں گی۔ پھر اس وقت بُرا حال ہوگا ان کا جو حسین رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہوئے اس دن جبکہ قیامت میں صور پھونکا جائے گا۔

حدیث شریف

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل جہنم میں ایک صندوق میں بند ہوگا اور اسے تمام دنیا کا نصف عذاب ہوگا۔

ابتداء واقعہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ

انسان العیون میں ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفیوں نے خط لکھے کہ آپ تشریف لائیے ہم آپ کی بیعت کرلیں گے۔ حضرت حسینؓ نے کوفہ جانے کا قصد کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روکا اور فرمایا، وہ لوگ بڑے غدار ہیں۔ انہوں نے آپ کے والد گرامی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور آپ کے بھائی حسن رضی اللہ عنہ سے دھوکہ کرکے بہت رسوا کیا۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ایک نہ مانی اور کوفے کو روانہ ہوئے۔ آپ کی روانگی پر حضرت ابن عباس اور دوسرے مسلمان بہت روئے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی روانگی سے پہلے حضرت امام مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا۔ حضرت امام مسلم کے پہنچتے ہی امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی، بعض کہتے ہیں کہ اس سے بھی زیادہ لوگوں نے۔ جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کوفہ میں پہنچے تو عبداللہ بن زیاد نے یزید کی طرف سے بیس ہزار جنگجو تیار کرلیے۔ ان میں اکثر وہ تھے جنہیں بڑے بڑے انعامات کا وعدہ دیا گیا۔ ان بدبختوں کے دل سے آخرت کا خوف جاتا رہا۔ جب یزیدی لشکر نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو گھیرا تو آپ نے ان کی کثرت کو دیکھ کر فرمایا کہ تین شرطوں میں سے کسی ایک پر عمل کرو:

۱۔ مجھے واپس حرمین شریفین جانے دو۔
۲۔ تمہارے ساتھ میرا جھگڑا نہیں مجھے کسی دوسرے علاقے میں جانے دو۔
۳۔ یزید کی ملاقات کا موقع دو تاکہ میں اس سے بات کروں۔

لیکن ان بدبختوں نے ایک نہ مانی اور آپ کو جنگ کرنے پر مجبور کردیا اور کہا کہ ہم ابن زیاد کے حکم کے پابند ہیں۔ یا پھر آپ یزید کی بیعت کا اقرار کریں۔ لیکن آپ نے یزید کی بیعت سے انکار کردیا۔ اس پر جنگ ہوئی یہاں تک کہ آپ شہید ہوگئے۔ آپ کا سر تن سے جدا کرکے ابن زیاد کے ہاں لے گئے۔ یہ سانحہ عاشورا کے دن ۶۱ھ میں ہوا۔

ف : روضۃ الاخیار میں لکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کربلا (عراق) میں ہے - اور آپ کا سر مبارک دمشق کی ایک مسجد میں ہے -

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی

کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھ کر عرض کی : یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ کی اُمت میں خُوب خُونریزی ہو رہی ہے - آپ نے فرمایا : ہونے دو - انہوں نے میرے نواسے کو شہید کر ڈالا - انہیں میری نسبت کی بھی شرم وحیا نہ آئی -

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور کربلا

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم ایک روز جنگِ صفین کے موقع پر کربلا سے گزرے تو ایک لمحہ کے لیے یہاں ٹھہر کر پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے ؟ عرض کی گئی : اسے کربلا کہتے ہیں - کربلا کا نام سن کر آپ خُوب روئے یہاں تک کہ آپ کے آنسوؤں سے زمین تر ہو گئی - آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا تو وہ رو رہے تھے - اور فرمایا : ابھی میرے ہاں جبریل علیہ السلام حاضر ہُوئے اور بتایا کہ میرالختِ جگر حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) فرات کے کنارے کربلا نامی دھرتی پر شہید ہوگا چنانچہ وہاں کی مٹی مجھے دی گئی - میں نے اسے سُونگھا - اس لیے میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے -

کربلا کی مٹی اور علم غیب نبوی

مروی ہے کہ مذکورہ بالا مٹی حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شیشی میں رکھوا دی اور بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ یہ مٹی اس دھرتی کی ہے جہاں میرالختِ جگر حسین (رضی اللہ عنہ) شہید ہوگا - جب یہ مٹی اسی شیشی میں سُرخ ہو جائے گی تو یقین کر لینا کہ میرا حسین (رضی اللہ عنہ) شہید ہو گیا - بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے وُہ مٹی سُرخ ہو گئی اور کسی سے غائبانہ آواز میں یہ اشعار سنے : ؎

ایھا القاتلون جھلا حسینا
ابشروا بالعذاب والتذلیل
قد لعنتم علیٰ لسان ابن داؤد
وموسیٰ وحامل الانجیل

ترجمہ : اے جہالت سے حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والو ! سُن لو تمہیں بہت بڑا عذاب اور ذلت وخواری ہو گی -
اس سے قبل تم پر ابن داؤد ، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام نے لعنت کی -

بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ، یہ اشعار سن کر میں زار زار رونے لگی -

اعجوبہ مروی ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو آسمان پر سُرخی پھیل گئی - حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آسمان پر شفق کے ساتھ سُرخی پہلے ادوار میں نہیں ہوتی تھی - یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شروع ہوئی -

نکتہ : ابن الجوزی یہاں پر ایک بہترین نکتہ لکھتے ہیں وُہ یہ کہ جب کسی کو سخت غصہ آتا ہے تو سُرخی اس کے چہرے سے ٹپکتی ہے - حضرت

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوا۔ لیکن چونکہ وہ جسمانیت سے پاک اور منزہ ہے اسی لیے اپنے غضب کی علامت آسمان سے ظاہر فرمائی تاکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظمت دُنیا والوں کو معلوم ہو۔

اعجوبہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے دن جس پتھر کو اٹھایا جاتا وہی خُون سے لبریز ہوتا۔

قاتلانِ حسین کے بد انجام کی تفصیل ابوالشیخ سے مروی ہے وُہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے میں شریک تھے یا معین و مددگار تھے ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً گندی موت مرا۔ ایک بُوڑھے نے یہ روایت سُنی تو کہا کہ میں بھی تو حسین (رضی اللہ عنہ) کے قتل میں شریک تھا مجھے تو تا حال کچھ نہیں ہُوا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا تاکہ چراغ بجھائے۔ اچانک آگ نے بوڑھے پر حملہ کر دیا۔ ہائے آگ ہائے آگ کہتا ہُوا بھاگا لیکن آگ تو اس کے رگ و ریشے کو جلا رہی تھی۔ اس نے آگ سے بچنے کے لیے دریائے فرات میں چھلانگ لگا دی لیکن آگ نے اسے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ آخر ہائے آگ ہائے آگ کہتا ہُوا مرا۔ ان میں سے بعض بدبختوں کے چہرے سیاہ ہو گئے۔ بعض مارے گئے۔ بعض اندھے ہو گئے۔ بعض کی نوکریاں چھِن گئیں وغیرہ

سبق اہل بیت نبوی کے دشمنوں سے دور رہنا لازمی ہے کیونکہ ان سے دوستی کرنا اہل بیت سے دشمنی کرنے کا دُوسرا نام ہے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اہل بیت کی عزت و عظمت کو جگہ دے اللہ تعالیٰ انہیں عزت و عظمت بخشے گا۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص تین باتوں کا خیال رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دین کی حفاظت فرمائے گا اور جو ان کی حفاظت نہیں کرتا اللہ تعالیٰ نہ اس کے دین کی حفاظت کرے گا نہ اس کی دُنیا کی۔

۱۔ حرمت الاسلام

۲۔ حرمت نبی آخر الزماں

۳۔ حرمت اہل بیت (قرابت دار حضور علیہ السلام)

جو شخص میری عزت اور انصار و عرب کا احترام نہیں کرتا وہ ان باتوں میں سے ایک کے ساتھ ضرور متعلق ہے:

۱۔ منافق ہے۔

۲۔ ولد الزنا ہے۔

۳۔ حیض و نفاس یا ناپاکی کے دوران اس کا نطفہ ٹھہرا ہے۔

ہ

در کار دیں ز مردم بے دین مدد مخواہ

از ماہ منخسف مطلب نور صبحگاہ

ترجمہ: دینی امور کی مدد بے دین سے نہ چاہو۔ خسف کی راتوں میں چاند سے صبح کی روشنی مت چاہو۔

اے اللہ! ہمیں وسائل حقہ کے انقطاع سے محفوظ فرما اور دنیا و آخرت میں ہمیں حق والے گروہ میں رکھ۔ (آمین)

تفسیر عالمانہ تِلْكَ یہ اشارہ حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کی طرف ہے اور تلک محلاً مرفوع، مبتدا اور اس کی خبر مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ ہے۔ یعنی وہ غیب کی بعض خبریں ہیں۔ انھیں غیبی خبریں اس لیے کہا گیا کہ عرصہ دراز گزر جانے کی وجہ سے انھیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا نُوْحِیْهَآ حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ ہم اس کی خبر دیتے ہیں یہ تلک کی دُوسری خبر ہے اِلَیْكَ آپ کو، تاکہ آپ کو اس سے ہدایت ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی طرح دُوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی تبلیغ احکام میں تکالیف برداشت کیں۔ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ یہ تلک کی تیسری خبر ہے یعنی آپ اور آپ کی قوم اسے پہلے نہیں جانتی تھی۔ یہ واقعہ تم سے (بظاہر) مخفی تھا مِنْ قَبْلِ هٰذَآ وحی اور آپ کو خبر دینے سے پہلے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ آپ کو نوح علیہ السلام کے بارے میں دُوسروں سے معلومات حاصل نہیں ہوئیں جبکہ دُوسرے خود بھی اس سے بے خبر تھے تاکہ متعین ہو جائے کہ آپ کا علم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔

ف: سعدی مفتی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام سے فرمایا کہ یہ واقعہ ہم نے اس لیے بتایا تاکہ آپ کی قوم کو معلوم ہو جائے کہ اگر وہ اپنے نبی علیہ السلام کی تکذیب کریں گے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو نوح علیہ السلام کے مکذبین کا ہوا۔

فَاصْبِرْ یہ نُوْحِیْهِ پر متفرع ہے یعنی جب ہم نے آپ پر وحی کی تو آپ صبر کیجئے اور تفسیر ابی اللیث میں ہے کہ اے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم! اگر کفار آپ کی تصدیق نہیں کرتے تو آپ تبلیغ رسالت میں صبر کیجیے اور اپنی قوم کی اذیتیں برداشت کیجیے۔ اگر وہ تکذیب کرتے ہیں تو انھیں کرنے دیں۔ آپ نوح علیہ السلام کی طرح صبر کیجئے کہ وہ ایک عرصہ دراز تک اپنی قوم کے شدائد برداشت کرتے رہے اِنَّ الْعَاقِبَةَ بے شک اچھا انجام یعنی دنیا کی کامیابی اور کامرانی لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ متقین یعنی مومنین موحدین صابرین کے لیے ہے جیسا کہ تم نے نوح علیہ السلام کا حال مشاہدہ فرمایا اور ان کی قوم کے حالات بھی۔ اس سے تمہیں عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

ف: اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم اور اہل ایمان کو تسلی دی ہے۔

حضرت حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ؎

سروش عالم غیبم بشارتے خوش داد
کہ کس ہمیشہ گرفتار غم نخواہد ماند

ترجمہ: مجھے غیبی فرشتے نے خوش خبری سنائی ہے کہ کوئی بھی ہمیشہ غم میں مبتلا نہیں رہتا۔

ف: کاشفی نے کہا کہ ہمیں مرشد کامل نے سبق پڑھایا ہے کہ صبر بہت سے غم بستہ کی چابی ہے اور صبر تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ بالآخر صبر سے ہر کامیابی نصیب ہوتی ہے بے صبر کو ہمیشہ نقصان پہنچتا ہے۔ ؎

صبر است کلید گنج مقصود
بے صبر در مراد نکشود

گر صبر کنی مراد یابی
وز پائے در رفتی از شتابی

ترجمہ : صبر مخفی خزانوں کی چابی ہے ۔ بے صبر ہمیشہ بے مراد رہتا ہے ۔ اگر صبر کرو گے تو مراد کو پہنچو گے اور جلد بازی سے نقصان اٹھاؤ گے ۔

حدیث شریف
حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ آپ کعبہ کی دیوار کے سائے میں بیٹھے تھے ۔ ہم نے شکایت کے طور عرض کی : یارسول اللہ ! آپ ہمارے لیے دعا کیوں نہیں فرماتے ۔ دیکھیے ہم کتنے پریشان حال ہیں ۔ دشمن ہمیں کتنی سخت اذیتیں دے رہے ہیں ۔ آپ جوش میں آ گئے ۔ آپ کا چہرۂ مبارک سُرخ ہو گیا اور فرمایا : تمہارے سے پہلے لوگوں کا یہ حال تھا کہ دشمن انھیں گھسیٹ کر گڑھے میں لے جاتے اور اُوپر سے آرہ چلا دیتے جس سے ان کا جسم دو ٹکڑے ہو جاتا لیکن وہ اپنے دین پر ڈٹے رہے ۔

حدیث شریف
حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : دنیا میں سب سے بڑے خوشحال انسان کو لایا جائے گا اور اسے جہنم میں غوطہ دیا جائے گا جس سے وہ کالا سیاہ ہو جائے گا اس سے سوال ہوگا کہ کبھی تم نے آرام بھی پایا ۔ عرض کرے گا : میں ہمیشہ دُکھ درد میں رہا ۔ مجھے ایک لمحہ بھی آرام و چین نصیب نہ ہوا ۔ اس کے بعد دنیا میں دکھ اور درد کے ستائے ہوئے شخص کو لایا جائے گا ۔ حکم ہوگا کہ اسے بہشت کے اندر تھوڑی سی سیر کرائی جائے ۔ پھر اس سے سوال ہوگا ، کیا حال ہے ؟ عرض کرے گا : زندگی بڑے چین سے گزری ۔

ف : صاحبِ روح البیان نے فرمایا کہ اس سے وہ شخص مراد ہے جو دنیا میں کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا ورنہ موت بھی اس کی ایک کامیابی ہے ۔ چنانچہ "الا ان نصر اللّٰہ قریب" میں بعض مفسرین نے نصر اللّٰہ سے موت مراد لی ہے ۔ اس موت سے میت خود راحت پاتی ہے یا دوسروں کو راحت پہنچاتی ہے ۔

ف : اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ ہے کہ دکھ دیتا ہے تو اکثر لوگوں کو عجز پر صبر بھی عطا فرماتا ہے ۔ چنانچہ ہم نے اپنے زمانے میں بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ مصائب میں مبتلا ہوئے لیکن صبر کرنے پر انھیں امداد بھی نصیب ہوئی ۔

حکایت
صاحبِ روح البیان رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ملک روم کے شہر اسکوب میں وعظ و تبلیغ کے لیے گیا لیکن لوگوں نے ناقابلِ بیان حد تک اذیتیں پہنچائیں ۔ انہوں نے چھ سال تک مجھے بہت ستایا ۔ یہاں تک کہ میں وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گیا ۔ اور اپنے بال بچوں سمیت وہاں سے ہجرت کر کے شہر بروسہ میں پہنچا ۔ اور یہی میرے شیخ کا فرمان تھا ۔ یہاں کے لوگوں نے بھی مجھے اپنے شہر سے نکالنے کی ناکام کوشش کی ۔ بروسہ میں مَیں نے سکون پایا ۔ شہر اسکوب سے میرے نکل جانے کے بعد ملک روم پر کفار نے حملہ کر دیا اور شہر اسکوب کی مٹی ہی پلید کر دی ۔ اسے آگ لگا دی اور وہاں کے سرغنوں (جو میرے سخت مخالف تھے) کو ایسے ملیامیٹ کیا گویا وہ اس عالم دنیا میں تھے ہی نہیں ۔

(باقی برصفحہ ۳۲)

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا
مُفْتَرُونَ ○ يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا
تَعْقِلُونَ ○ وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً
إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ○ قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن
قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ○ إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ
اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ○ مِن دُونِهِ ۖ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ○ إِنِّي
تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○
فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ
شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ○ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ○ وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا
رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ○ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ
أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ○

ترجمہ: اور عاد کی طرف ان کے ہم قوم ہود (علیہ السلام) کو (بھیجا)، کہا اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں تم نہیں ہو مگر مُفتری۔ اے میری قوم میں تم سے اس پر اجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے کیا تم عقل پر زور نہیں دیتے۔ اور اے میری قوم اپنے رب سے بخشش مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تمہارے اوپر زوردار برستا ہوا بادل بھیجے گا اور سابقہ قوت میں اضافہ فرمائے گا اور مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔ کافروں نے کہا کہ اے ہود (علیہ السلام)، تو ہمارے پاس کوئی روشن دلیل لے کر نہیں آیا اور ہم صرف نیرے کہنے پر اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑتے اور نہ ہی ہم تمہیں مانتے ہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تمہیں ہمارے کسی معبود کی بددعا ہے۔ فرمایا میرا اللہ تعالیٰ گواہ ہے اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اللہ کے سوا ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم اس کا شریک کرتے ہو تم سب مل کر میرے لیے برائی کا سوچ لو پھر مجھے مہلت بھی نہ دو میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جو میرا اور تمہارا رب ہے زمین پر کوئی چلنے والا نہیں مگر وہی اس کی چوٹی کو پکڑنے والا ہے بے شک میرا رب سیدھے راہ پر (ملتا) ہے۔ پھر اگر تم منہ پھیر دو تو میں نے تمہیں پہنچا دیا وہ جو میں تمہاری طرف سے کر بھیجا گیا اور میرا رب تمہارے بجائے اوروں کو لے آئے گا اور تم اسے نقصان نہیں دے سکو گے بے شک میرا رب تمام چیزوں کا نگہبان ہے اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے ہود (علیہ السلام) اور اس کے اہل ایمان کو اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات بخشی اور یہی عاد ہیں کہ جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور بڑے

سرکش ہٹ دھرم (ضدی) کی تابعداری کی۔ اور اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگی اور قیامت کے دن میں بھی۔ خبردار! بے شک عاد نے اپنے رب کا انکار کیا سن لو کہ ہود کی قوم یعنی عاد پر پھٹکار ہو۔

(بقیہ تفسیر صفحہ ۱۳۰)

حکایت ابراہیم وزیر نے سلطان محمد رابع کے دور میں میرے شیخ کامل قدس سرہٗ کو شہر بدر کر دیا اور آپ شہر ثمنی میں چلے گئے اور اس سے قبل آپ قسطنطنیہ میں مقیم تھے۔ اس وزیر بے تدبیر کو چند روز کے بعد بادشاہ نے شہر بدر کر دیا۔ اس کے بعد وہی وزیر بے تدبیر قتل کر دیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد وزارتِ عظمٰی مصطفٰی المعروف بابن کو پریلی سلطان سلیمان کے دور کو منتقل ہوگئی۔ اس بے تدبیر وزیر نے بھی کسی غرض فاسد کے تحت میرے شیخ کامل قدس سرہٗ کو جزیرہ قبرص کی طرف شہر بدر کر دیا۔ اس وزیر کو بھی ایک سال کے اندر ہلاک کر دیا گیا۔ اس سے تمام لوگوں کو عبرت ہوئی کہ اللہ والوں کی مخالفت ومخاصمت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ حضرت صاحب روح البیان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے شیخ کی بہت فکر رہتی تھی جب وہ جزیرہ کی طرف شہر بدر کر دیے گئے تو اسی اثناء میں مجھے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا:

ولا تستعجل لهم كانهم يوم يرون ما يوعدون لم يلبثوا الا ساعة من نهار بلاغ فهل يهلك الا القوم الفاسقون۔

ترجمہ: ان کے لیے عجلت نہ کیجیے جب انہیں ان کے وعدہ کے مطابق سزا ملے گی تو وہ خود کہیں گے کہ ہم گھڑی بھر ٹھہرے ہیں۔ یہ پیغام ربانی پہنچ گیا اور صرف قوم فاسق ہی ہلاک ہوگی۔

اس کے بعد وہی ہوا کہ وزیر بے تدبیر مارا گیا۔ یہ بھی میرے شیخ کامل قدس سرہٗ کی ایک کرامت تھی۔

(تفسیر آیات صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ وَاِلٰی عَادٍ عاد یمن کے ایک عربی قبیلہ کا نام ہے اور اِلٰی عَادٍ فعل محذوف کے متعلق ہے اس کا ارسلنا (جو نوح علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہے) پر عطف ہے اور وہی اَخَاھُمْ کا ناصب ہے۔ تقدیم مجرور علی المنصوب اضمار قبل الذکر سے بچنے کی وجہ سے ہے۔ اب معنٰی یہ ہوا کہ ہم نے عاد کے قبیلے کے ایک فرد کو رسول بنا کر بھیجا۔

سوال: تم نے اخاھم سے قبیلے کے ایک فرد کا معنٰی کہاں سے سمجھا۔

جواب: اہل عرب کہتے ہیں؛

هُوَ اَخُو الْعَرَبِ یا هُوَ اخو بنی تمیم۔

ان کا یہ محاورہ قبیلے کے ایک فرد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

هُوْدًا ط ہود علیہ السلام کو، جو کہ ان کے قبیلے کے ایک فرد تھے۔

ہُود علیہ السلام کا نسب نامہ

ہود علیہ السلام بن رباح بن الخلود بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔ بعض روایتوں میں یوں ہے: ہود علیہ السلام بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام وابن عم ابی عاد۔

کاشفی نے کہا کہ عاد ہود علیہ السلام کا چوتھا دادا ہے اور عاد کا نسب یوں ہے: عاد بن عوص بن سام بن نوح علیہ السلام۔ اس معنیٰ پر بھی ہود علیہ السلام عاد کے ابنائے عم سے ہیں۔

ف: بعض کہتے ہیں کہ عاد ایک قبیلہ ہے جو ایک اصل کی کئی شاخیں ہیں۔ اسی معنے پر دراصل یہ ان کے مورث اعلیٰ کا نام ہے۔ پھر چونکہ اخوت اخص الاوصاف ہے اسی لیے اس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے دو شخصوں کو ایک پشت یا ایک سسرال رشتہ سے منسوب کیا جائے یا ان کا ددھیالی اور ننھیالی رشتہ ایک ہو۔ اسی وجہ سے اسی طرف دونوں کو منسوب کیا جائے۔ یعنی ان کے مورث اعلیٰ کے ایک ہونے کی وجہ سے اخوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ف: بعض کہتے ہیں کہ عاد ان کے بادشاہ کا نام ہے۔ اسی بادشاہ کی وجہ سے اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور حضرت ہود علیہ السلام کو ان سے منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی باتوں اور ان کے حالات سے زیادہ واقف تھے اور وہ لوگ حضرت ہود علیہ السلام کی باتوں، ان کے حالات، ان کی صداقت و امانت اور دیانت سے زیادہ واقف تھے۔ ان کی نیک خصائل کی وجہ سے وہ ان سے زیادہ مانوس ہو سکتے تھے۔

ف: بعض کہتے ہیں ہود علیہ السلام اپنی قوم میں چالیس سال رہ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے اور بتوں سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کی اس بزرگی کے پیش نظر جبریل علیہ السلام ان کے پاس عہدۂ رسالت لے کر حاضر ہوئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا کہ آپ عاد کی قوم کے نبی ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد کے ہاں تشریف لے گئے اور وہ احقاف کے مقام پر جمع تھے۔

ف: احقاف چند ٹیلوں اور پہاڑوں کی ایک جگہ کا نام ہے۔ ہود علیہ السلام نے انھیں جا کر فرمایا کہ بتوں کی پرستش ترک کر کے ایک اللہ کی عبادت کرو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان سے متعلق فرمایا قَالَ یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہود علیہ السلام نے عاد کی قوم کو رسول بننے کے بعد کیا فرمایا۔ اس کا جواب ملا کہ قَالَ کہے يٰقَوْمِ اے میری قوم! اعْبُدُوا اللّٰهَ ایک اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ کیونکہ تمہارا اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اسی لیے صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک مت ٹھہراؤ۔ غیرہٗ اللہ کی صفت ہے کیوں اللہ کا محل رفع ہے۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝ نہیں ہو تم بتوں کو معبود بنانے میں مگر اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے والے۔

تفسیر صُوفیانہ ھُود سے قلب اور عاد سے نفس اور اس کے صفات مراد ہیں کیونکہ ہُود قلب نفس عاد کا بھائی ہے ۔ جیسے ہم نے نوح علیہ السلام کے واقعہ میں تفصیل سے عرض کیا ہے ۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ جیسے ہم نے نوح روح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا ایسے ہم نے ہود قلب کو عاد نفس کی طرف بھیجا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قلب انسانی فیض رحمانی قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے جیسے نُوح کو فیض رحمانی کی استعداد ہے ۔ اس ہود قلب نے نفس اور اس کے صفات سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور اسکی طلب میں منہمک ہو جاؤ کیونکہ اس کے سوا کوئی تمہارا محبوب و مطلوب و معبود نہیں ۔ دنیا اور خواہشاتِ نفسانیہ کو تم نے اللہ پر افتراء کر کے اپنا محبوب و مطلوب بنا رکھا ہے انہیں ترک کر دو ۔

تفسیر عالمانہ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اے میری قوم ! میں تم سے تبلیغ رسالت کا اجر و مزدوری اور انعام نہیں لینا چاہتا اَجْرًا انعام ، رشوت ۔ یعنی مجھے تمہارے اموال و اسباب میں کسی قسم کا طمع و لالچ نہیں ۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ط میرا اجر اور انعام اس کے ہاں ہے جس نے مجھے پیدا کیا ۔ اس نے مجھے اس کا صلہ پہلے ہی عنایت فرما دیا ہے اور اس سے بڑی اور کوئی نعمت نہیں کیونکہ یہی سب سے پہلی نعمت ہر انسان کو عطا ہے اور اس کے شکر کی ادائیگی لازم اور ضروری ہے ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو ۔

تفسیر صُوفیانہ مال و جاہ اور مخلوق کی خوشامد اور چاپلوسی وغیرہ اہل اللہ کے نزدیک نفس کے صفات و عادات سے ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی علیہ السلام نے اپنی اُمت کو جب بھی کوئی نصیحت فرمائی ہے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ یہ وعظ و نصیحت کسی دنیوی طمع و لالچ کے تحت نہیں وُہ اپنے سے اس گندی تہمت سے بچنے کے لیے فرماتے تھے تاکہ اُمت ان کی خالص لوجہ اللہ تبلیغ سمجھ کر ان کی نصیحت قبول کریں کیونکہ نصیحت وہی موثر ہوتی ہے جو طمع و لالچ کی گندگیوں سے پاک اور صاف ہو ۔ ؎

طمع بند و دفتر ز حکمت بشوئے

طمع بگسل و ہر چہ خواہی بگوئے

ترجمہ : طمع کا دروازہ بند کر دو اور حکمت کا دفتر خالی کر دو اور لالچ ختم کر کے جو مرضی آئے کہو ۔

حکایت کسی بزرگ کی ایک بلی تھی اپنے قصاب ہمسایہ سے اس کے لیے چند چھیچھڑے مفت لیا کرتے ۔ ایک دفعہ اس قصاب سے کوئی شرعی کمی دیکھی تو پہلے اپنے گھر داخل ہو کر بلی کو نکالا پھر قصاب کو جا کر نصیحت کی ۔ قصاب نے کہا ، آپ نے میری بے عزتی کی ہے اس لیے آیندہ میں آپ کو بلی کا گوشت نہیں دُوں گا ۔ اس بزرگ نے فرمایا ؛ میں نے تمہیں نصیحت بھی اسی وقت کی ہے جب میں نے بلی کو مار بھگایا ہے تاکہ آیندہ مجھے تجھ سے کسی قسم کا لالچ اور طمع نہ ہو ۔

سبق ؛ وہ طمع سکون قلب کو خراب کر دیتا ہے جس سے مشکوک منفعت کی امید ہو ۔ شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

مکن سعدیا دیدہ بر دست کس

کہ بخشندہ پروردگار است و بس

طمع آبروئے موقر بریخت
برائے دو جو دامن در بریخت

ترجمہ: اے سعدی کسی کا دست نگر نہ ہو کیونکہ پروردگار صرف اللہ ہے۔ طمع نے بہت سے معزز لوگوں کی عزت لوٹ لی ہے جو صرف مٹھی بھر طمع سے اپنی عزت کا دامن داغدار کر بیٹھے۔

نبوت و ولایت کے متعلق ادب یاد رہے کہ انبیاء اور اولیاء علیہم السلام کے قلوب مقدسہ ہر قسم کے طمع و لالچ کی آلائش سے پاک ہوتے ہیں وہ جسے بھی نصیحت فرماتے ہیں خالص اللہ کی رضا کے لیے اور یہی ان کا منشور ہے۔

نکتہ: اولیاء کرام و علماء عظام عوام کو صرف اس لیے شریعت مطہرہ پر چلنے کی تلقین کرتے تاکہ عزت و عظمت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار ہو اور عوام کے ذہن نشین ہو کہ وہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اس قدر ارفع و اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے کہ باوجود عرصۂ دراز گزر جانے کے ان کے بتائے ہوئے طریقے زندہ ہیں۔ اس تلقین سے اولیاء و علماء کو کسی قسم کا دنیوی لالچ اور طمع نہیں ہوتا۔ (اور نہ ہونا چاہیے) اس لئے انھیں جو انعامات نصیب ہوں گے وہ دنیاوی مناصب سے بلند قدر اور ہمیشہ رہنے والے اور غیر فانی ہوں گے۔

اعجوبہ اور حکایت عرب میں کہاوت مشہور ہے کہ:
اجهل من داعی ثمانین من الضان۔
(فلاں اسی بھیڑیں مانگنے والے سے بھی زیادہ جاہل ہے)

دراصل واقعہ یوں ہوا۔ ابن خالویہ فرماتے ہیں کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شخص نے کوئی حاجت پوری کی وہ حضور علیہ السلام کے ہاں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا، آپ سے عرض کی: مجھے کچھ عنایت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: اسی بھیڑیں چاہتا ہے یا میں تیرے لیے دعا مانگوں تاکہ تو بہشت میں میرے ساتھ اٹھے۔ اس نے عرض کی: مجھے تو اسی بھیڑیں چاہییں۔ آپ نے فرمایا: اسے اسی بھیڑیں دے دو۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی صاحبہ اس سے بہت سمجھدار نکلی کہ اس نے جب موسیٰ علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کے مزار کی رہبری کی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا تو کیا چاہتی ہے۔ اگر چاہو تو میں دعا کروں کہ تو بہشت میں میرے ساتھ ہو، اگر چاہو تو تجھے سو بکریاں دے دی جائیں۔ اس نے کہا: مجھے بہشت چاہیے۔

مسئلہ: اسی دین کی محافظت کی نیت پر متقدمین نے وعظ و نصیحت، تعلیم، امامت و خطابت اور اذان کہنے پر کسی مزدوری اور انعام کو قبول نہ فرمایا ؎

زیاں میکند مرد تفسیر دان
کہ علم و ادب می فروشد بنان

ترجمہ: وہ عالم اپنے دین کا نقصان کرتا ہے جو اپنے علم کو روٹی کی خاطر بیچتا ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اور اے میری قوم! اپنے رب سے استغفار کرو۔ یعنی اس پر ایمان لاؤ۔ ثُمَّ تُوْبُوْآ اِلَيْهِ پھر غیر کی عبادت سے توبہ کرو۔

سوال: تم نے ایمان کی شرط کہاں سے نکالی؟

جواب: ایمان کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی۔ (کذا فی بحر العلوم)

زیادہ واضح یہ ہے کہ یہاں پر معنی یوں ہے کہ پہلے اپنے سابقہ گناہوں (جن میں کفر اور شرک بھی ہے) سے معافی مانگو۔ بایں طور کہ ایمان لاؤ کیونکہ ایمان شرط ہے توبہ کی قبولیت کے لیے۔ پھر طاعت کی طرف رجوع کرو کیونکہ صفائی پہلے ہوتی ہے زیب زینت بعد میں۔ اس تقریر پر ثمّ اپنے حقیقی معنیٰ میں ہوگا۔

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ پھر تمہارے اوپر برسائے گا بارش مِّدْرَارًا موسلا دھار۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، بمعنے اسم فاعل۔ اس میں مذکر و مؤنث دونوں برابر مستعمل ہیں۔ یہ دار اللبن درورًا سے ہے دودھ دوہنے والے کے لیے بہت زیادہ دودھ دوہنا اسی معنے پر کہتے ہیں۔ سحاب مدرار و مطر مدرار یہ اس وقت بولتے ہیں جب بارش پے در پے ہو۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ جب تمہیں ضرورت ہوگی تو اللہ تعالیٰ تم پر بارش برسائے گا درانحالیکہ وہ مسلسل اور موسلا دھار ہوگی۔ وَيَزِدْكُمْ اور بڑھائے گی تمہاری قُوَّةً قوت جو ملی ہوگی اِلٰى قُوَّتِكُمْ تمہاری قوت کی طرف۔ اور تمہاری قوت میں اضافہ فرمائے گا۔

سوال: انھیں ایمان کی ترغیب پر قوت اور بارش کی خوشخبری کیوں؟

جواب: وہ لوگ کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے ان کے بہت بڑے باغات اور بڑی بڑی عمارات تھیں اور ان امور میں حریص بھی تھے اور چاہتے تھے کہ کھیتیاں سرسبز ہوں، باغات بڑے بڑے ہوں۔ ان کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی بناء پر انہیں بارش کی خوشخبری سنائی گئی پھر وہ اپنی اس قوت و طاقت پر نازاں بھی تھے۔ اسی وجہ سے ان کی طرف دشمن آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ انھیں مزید قوت اور طاقت کا مژدۂ بہار سنایا گیا تاکہ وہ قوت سے مزید مطمئن ہوں کہ دنیا بھر کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

بارش کا وعدہ کیوں کاشفی صاحب لکھتے ہیں کہ جب قوم عاد نے ہود علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شامتِ اعمال پر تین سال بارش بند کر دی۔ ان کی عورتیں بانجھ ہوگئیں۔ چونکہ یہ لوگ کھیتی باڑی کرنے والے تھے بارش کی بندش سے سخت پریشان ہوئے ادھر دشمن کے مقابلہ پر اولاد (مردم شماری) میں کمی واقع ہوئی۔ اس سے انھیں دشمنوں کے حملوں کا خطرہ لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام کے ذریعہ سے انھیں فرمایا: استغفروا الخ اب و یزدکم قوۃ الیٰ قوتکم کا یہی مطلب ہوا کہ تمہیں اولاد عنایت فرمائے گا جس سے تم دشمن کا مقابلہ کر سکو گے۔ اور انھیں اپنی کثرتِ تعداد کی وجہ سے بھگا سکو گے۔

وظیفہ برائے وسعتِ مال و اولاد مروی ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں تشریف لائے۔ وہاں سے فراغت پا کر واپس مدینہ طیبہ جانے لگے تو امیر معاویہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربان نے عرض کی کہ حضرت جی میں بہت بڑا مالدار ہوں لیکن ہوں بے اولاد۔ مجھے کوئی وظیفہ بتائیے جس کے پڑھنے سے میں صاحبِ اولاد ہو جاؤں۔ آپ نے اسے کثرتِ استغفار کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ دربان کبھی کبھار دن میں سات سو بار بھی استغفار پڑھ لیتا تھا۔ اس استغفار کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس دربان کو بیس لڑکے عطا فرمائے۔

یہی واقعہ حضرت امیر معاویہ کو معلوم ہوا تو آپ نے دربان سے فرمایا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ یہ وظیفہ انھیں کہاں سے دستیاب ہوا جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ حسبِ معمول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے تو وہی دربان حاضر ہوا اور عرض کی کہ آپ کے بتائے ہوئے وظیفہ کی برکت سے میں صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں۔ لیکن براہِ کرم آگاہی بخشئے کہ آپ کو یہ وظیفہ کہاں سے دستیاب ہوا۔ آپ نے فرمایا: قرآن کی اس آیت سے جو ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم الٰہی سنایا:

واستغفروا ربکم الیٰ ان قال ویزدکم قوۃ الیٰ قوتکم۔ اور نوح علیہ السلام کے ذریعہ سے۔ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا:

فقلت استغفروا ربکم الیٰ ان قال ویمددکم باموال و بنین۔

وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ جس امر کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں اس سے روگردانی نہ کرو بلکہ اس میں سخت رغبت کرو۔ مجرمین درانحالیکہ تم جرائم و آثام اور معاصی پر اصرار کرنے والے ہو۔ مجرمین اجرام سے مشتق ہے بمعنے ارتکاب جرم۔ جیسے اذناب بکسر الہمزہ بمعنے ارتکاب ذنب۔ قَالُوْا یہ جملہ مستانفہ اور سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہود علیہ السلام کی تبلیغ پر قوم نے کیا کہا اس کا جواب دیا کہ قالوا انھوں نے کہا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ اے ہود علیہ السلام! تم ہمارے ہاں اپنے دعوے پر کون سی دلیل لائے ہو تاکہ ہم یقین کر سکیں کہ واقعی آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

ف: یہ کمال عناد اور ہود علیہ السلام کے معجزات کو غیر معتبر سمجھ کر کہا ورنہ انھوں نے تو اپنی نبوت و رسالت کے دعوٰی پر بہت بڑے معجزات دکھائے۔ یہ ایسے ہے جیسے قریش مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بڑے معجزات دیکھنے کے باوجود بطور عناد کہا لولا انزل علیہ اٰیات من ربہ۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزات کیوں نہیں آتے۔ وہ بھی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے کہتے اور یہ بھی۔

وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا اور ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے یعنی ہم ان کی پوجا پاٹھ ترک نہیں کر سکتے۔ دراصل تارکین تھا۔ اس کا نون اضافت کی وجہ سے گر گیا ہے۔ عَنْ قَوْلِكَ تمہارے کہنے پر۔ یہ تارکین کی ضمیر سے حال ہے۔ دراصل عبارت یوں ہوگی:

وما نترک اٰلھتنا صادرین عن قولک ای صادرا ترکنا عن قولک۔

یعنی تیرے کہنے پر ہم سے بتوں کی پرستش نہیں چھوڑی جا سکتی۔ وصف کے حال کا اسناد موصوف کی طرف ہے اور اس میں بلیغ تر وجہ سے علت بتائی گئی ہے اور یہ خود واضح تر دلیل ہے۔ یہ علت فاعلیہ ہے۔ اس عبارت میں باء اور لام اس کے معنے کے لیے غیر مفید ہے۔

ف : سعدی مفتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عن سببیہ بھی مستعمل ہے۔ جیسے :

الا عن موعدۃ وعدہا ایاہ۔

یہ تاماکی کے متعلق ہے۔ یعنی ہم صرف تمہارے کہنے سے بُت پرستی ترک نہیں کر سکتے جب تک تم اس پر مضبوط دلیل قائم نہ کرو۔
وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ اور ہم تمہیں نہیں مانتے۔ یعنی جس توحید پر ایمان لانے اور بت پرستی کے ترک کرنے کی ہمیں دعوت دیتے ہو، ہم ہرگز ایسا نہیں کرتے۔ گویا انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو صاف جواب دے دیا کہ ہم سے اپنی دعوت کی اجابت اور اپنی تصدیق کی اُمید نہ رکھو۔ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ اعتراك جملہ ہے اور مصدر محذوف کی تفسیر کرتا ہے۔ اصل عبارت یوں ہے :

ما نقول فی شانك الا قولنا اعتراك۔

ہم تمہارے حق میں کچھ نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں ہمارا قول عارض ہوا ہے۔ اعتراك بمعنے اصابك۔ عراه یعسریه سے مشتق ہے۔ بمعنے اصابہ وغیرہ۔ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ۔ بسوء کی با، تعدیہ کی ہے یعنی ہمارے بعض معبود تمہیں دُکھ اور تکلیف پہنچائیں۔ مثلاً تمہارا مجنون ہونا۔ یہ تمہاری سزا ہے اس غلطی کی کہ تم ہمیں ہمارے معبودوں کی پرستش سے روکتے ہو اور ان سے دشمنی رکھتے ہو۔ اس کی سزا تمہیں مل رہی ہے کہ تم مجنونانہ باتیں کرتے ہو اور پاگلوں کی طرح لایعنی باتیں بولتے ہو (معاذ اللہ) قَالَ ہود علیہ السلام نے فرمایا اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا بے شک میں اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے کی گواہی دیتا ہوں اور اسی کی تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ کہو اشھدوا اس معنے پر عطف الانشاء علی الخبر کی خرابی سے بچاؤ ہو گیا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ یہ جملہ مؤول بمفرد ہو کر اشھد اللہ اور اشھدوا کا متنازع اسم ہے یعنی گواہ ہو جاؤ کہ میں بیزار ہوں مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ تمہارے شرکیہ عقاید سے مِنْ دُوْنِهٖ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم غیروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔ دونه کی ضمیر یا اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یا ماتشرکون کی طرف۔ آیت میں ما موصولہ ہے۔

ف : ہود علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانا تو مبنی برحقیقت ہے اور کفار کو اپنے مطلب پر گواہ بنانا ان سے استہزاء اور ان کی اہانت مطلب ہے کیونکہ اپنے مخالف کو صاف لفظوں میں کوئی بھی نہیں کہتا کہ میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں تم سے بیزار ہوں۔ اس سے حضرت ہود علیہ السلام ان کو بتانا چاہتے ہیں کہ مجھے تمہاری کوئی پرواہ نہیں اور نہ ہی تمہاری اور تمہارے بُتوں کی عداوت مجھے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہے۔

ف : کافروں نے ہود علیہ السلام سے دو باتیں کہیں :

۱۔ اپنے معبودوں کے اسماء کا اظہار۔

۲۔ ان کا ہود علیہ السلام کو ضرر پہنچانا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے انی اشھد اللہ الخ کہہ کر ان کے بتوں کی معبودیت کی نفی فرمائی۔ اب فَكِيْدُوْنِيْ فرما کر چیلنج کرتے ہیں

کہ تم اور تمہارے بُت مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی جملہ تدابیر عمل میں لاؤ۔ الکید بمعنے کسی کو چھپ کر چھپکے سے نقصان پہنچانے کی تدبیر کرنا مخلوق کی طرف ہو تو اس سے بہت بُرا حیلہ کرنا مراد ہوتا ہے کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے تو بندوں کے اعمال کی جزاء کی لطیف تدبیر مراد ہوتی ہے۔ یعنی ہود علیہ السلام نے چیلنج کرتے ہوئے فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ جو بھی تمہارے معبودوں کی مذمت کرے اور ان کی پرستش سے روکے تو تمہارے بُت اسے ضرر پہنچاتے ہیں۔ تمہارے اس قول سے برأت کا اظہار کر کے تمہیں یہ چیلنج کرتا ہوں کہ تم خود اور تمہارے تمام معبود مل کر مجھے نقصان پہنچانے کے لیے اپنی تمام تدبیریں بروئے کار لاؤ جَمِيعًا یہ کیدونی کی ضمیر جمع مخاطب سے حال ہے یعنی مجھے نقصان پہنچانے کے لیے تم سب مل کر اپنے تمام حربے استعمال کرو ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ○ نہ مجھے مہلت دو اور نہ ہی مجھ سے چشم پوشی کرو۔ فکیدونی کی فاء امر کو متفرع کرنا ہے ان کے اس ظن فاسد پر کہ ان کا عقیدہ تھا کہ ان کے معبود جسے چاہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ہود علیہ السلام نے ان کے اس عقیدہ کا رد بھی فرمایا اور اپنی دونوں برأتوں کو بھی چیلنج کر کے مضبوط اور پختہ بنایا۔ (کذا فی الارشاد)

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ نفس اور اس کے جملہ صفات اور شیطان اور جملہ شہوات اور تمام دنیا قلب کو نیچا دکھانے کی تدبیریں لگے رہتے ہیں لیکن بفضلہ تعالیٰ قلب کو تائید ربانی حاصل ہے۔ اسی لیے وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ؎

جملہ عالم اگر دریا شود
چوں تو با حق تر نگردد پائے تو

ترجمہ: اگر جملہ جہان دریا ہو جائے جب حق کی مدد شامل حال ہو تو پاؤں بھی تر نہ ہوں گے۔

تفسیر عالمانہ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ اے کافرو! تم اور تمہارے معبود میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے کیونکہ میں نے اپنے اور تمہارے حقیقی رب پر بھروسہ کیا ہوا ہے اور وہ بڑی قدرت و قوت کا مالک ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں میری اور تمہاری جان ہے۔ مَا مِن دَابَّةٍ کوئی ذی روح زمین پر چلنے والا ایسا نہیں إِلَّا هُوَ مگر وہ رب کریم آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اس کی پیشانی سے پکڑے ہوئے ہے۔

ف: اہل عرب سر کے اگلے حصے بالوں کے اگنے والی جگہ کو ناصیہ کہتے ہیں اور اس جگہ اگنے والے بالوں کو بھی ناصیہ سے تعبیر کرتے ہیں تسمية الشئ باسم مكانه۔ یعنی شے کو اپنے مکان کے نام سے موسوم کرنے کے قبیل سے ہے۔ یہاں پر اخذ ناصیہ سے اللہ تعالیٰ کا قہر و غلبہ اور قبضہ مراد ہے کیونکہ جیسے پیشانی کو پکڑنے والا پکڑے ہوئے انسان کو جس طرح چاہے نچائے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر قبضہ ہے جس طرح چاہے وہ ان میں تصرف کرتا ہے۔

ف: اہلِ عرب جب کسی کی ذلت و خواری اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں:

ما ناصية! لابيد فلان۔ فلاں کی پیشانی کے بال فلاں کے ہاتھ میں ہیں۔

یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کا حد سے زیادہ مطیع اور فرماں بردار ہو۔ کیونکہ جب کسی کی پیشانی کے بال کسی کے ہاتھ میں آگئے تو وہ اس کے قابو میں آگیا۔ وہ اس کے ساتھ جس طرح چاہے کرے۔

ف : اس جملہ میں استعارہ تمثیلیہ ہے۔ اس معنیٰ سے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق پر پورا قبضہ اور غلبہ ہے۔ اب معنیٰ یوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا مالک ہے وہ اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہے۔

مسئلہ : اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کا بیان ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ بہت بڑی سلطنت اور کبریائی رکھتا ہے اور ہر قوت اور قدرت اسی کی ہے۔ اس کے غیر کتنی ہی بڑی قدرت اور عظمت کا دم ماریں اس کے سامنے لاشئی ہیں اور اس کی قدرت و عظمت کے سامنے حبہ بھر حیثیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ تمام کائنات وموجودات اسی کے پیدا کردہ اور اسی کے قبضہ میں ہیں وہ ان میں جیسے چاہے تصرف کرتا ہے۔ اسے کسی قسم کی رکاوٹ اور ممانعت نہیں۔

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ بے شک میرا رب سیدھے راہ پر ہے یعنی اس کا ہر فیصلہ حق اور مبنی بر عدل ہے اس سے نہ کوئی ظالم بچ سکتا ہے اور نہ ہی اس (اللہ) کی پناہ میں آنے والے کوئی رسوا کر سکتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ ما من دابۃ کوئی بھی خیر یا شر کو طلب نہیں کرتا الا ھو اٰخذ بناصیتھا مگر وہی اللہ تعالیٰ اسے پیشانی سے پکڑ کر خیر یا شر کی طرف کھینچ کرلے جاتا ہے کیونکہ ہر ایک اسی کے قبضے میں ہے اور ہر کوئی اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے۔ ان ربی علی صراط مستقیم بے شک وہی اہل خیر کے حال کی اصلاح کرتا اور اہل شر کے حالات بگاڑتا ہے۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اے طالبانِ حق! اگر حق کو طلب کرتے ہو تو شریعت کی سیدھی سڑک پر چلو اسی سے تمہیں طریقت کا راستہ ملے گا۔ وہی تمہیں حقیقت تک پہنچا دے گا کیونکہ شریعت ایسا سیدھا رستہ ہے کہ درگاہِ حق کے سوا اور کہیں جاتا ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : وان الی ربک المنتھٰی صرف تمہارے رب تک ہی اس کی انتہا ہے۔

وحدت الوجود کی ایک جھلک نقد النصوص میں احدیت افعال کے باب میں تاثیرات ومؤثرات کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا کہ ذات باری تعالیٰ درحقیقت وہی تمام افعال کا مصدر اور تمام منفعلات کا مؤثر ہے بحکم تربیت بموافق قابلیات ہر ایک کو وہی اپنی طرف کھینچتا ہے۔" یہی راز ہے اٰخذ بناصیتھا ان ربی علی صراط مستقیم میں۔

مے

کش کشاند می کند کانا الیہ راجعون
چوں روی جائے ذکر فکر غلط باشد جنون

ترجمہ : وہی ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ چنانچہ انا الیہ راجعون میں تصریح فرمائی جب ذکر و فکر میں پورا

مشغلہ رکھو گے تو باقی تمام ارادے غلط ہو جائیں گے۔

کسی بزرگ نے خوب فرمایا ہے: ؎

چوں ہمہ راہ اوست از چپ و راست

تو بہر رہ کہ می روی او راست

چوں از و بود ابتدائے ہمہ

ہم بدو باشد انتہائے ہمہ

ترجمہ: دائیں بائیں ہر راہ اسی کے ہاں پہنچتا ہے جس راہ پر چلو گے اسی کے ہاں لے جائے گا اس لیے کہ اسی سے ہر شے کی ابتدا ہوتی ہے اور اسی کے ہاں سب کی انتہا ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا یہ دراصل تتولوا تھا۔ ایک تا حذف کر دی گئی ہے۔ یعنی اگر تم اعراض اور روگردانی کرتے رہو گے تو مجھے تم کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ط اور میں تمہارے پاس جن احکام کے لیے مامور ہوا ہوں وہ پہنچا چکا ہوں اس لیے کہ جو کچھ میرے اُوپر ضروری تھا وہ میں نے پُورا کر دیا۔ اب تمہارے اوپر حجت اور الزام قائم ہو گیا اس سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ اگر میری تکذیب اور انکار کرتے ہو تو اس کا خمیازہ بھگتو گے۔ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ تمہاری جگہ دوسری قوم کو اللہ تعالیٰ لائے گا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی تمہیں تباہ و برباد کر کے دوسروں کو لائے جو وہ تمہارے گھروں اور تمہارے اموال و اسباب کے مالک بن بیٹھیں۔ وَلَا تَضُرُّونَهُ روگردانی اور انکار سے اسے تم کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے شَيْئًا ط کیونکہ اس کے لیے نقصان و نفع کا کیا معنیٰ۔ بلکہ اس کا نقصان تمہیں ہو گا۔ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ○ بے شک میرا رب تعالیٰ ہر شئے کی حفاظت کرنے والا ہے کیونکہ تمہارے اعمال اس سے پوشیدہ نہیں وہ تمہاری جزا و سزا سے غافل نہیں۔

ف: اللہ تعالیٰ پر توکل واجب اور اسے ہر امر کا محافظ اور نگہبان ماننا ضروری ہے اس کے چند وجوہ ہیں،

١- اس کی ربوبیت ہر ایک کے لیے عام ہے جو کسی کی تربیت اور اس کے جملہ امور کی تدبیر اپنے ذمے لگاتا ہے تو وہ اسکی خود حفاظت فرماتا ہے اسے کسی دُوسرے کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہتی۔

٢- ہر نفس اسی کے قہر و سلطنت اور قبضہ میں ہے۔ ہر بندہ اسی کا اسیر اور ذاتی طور پر اپنے فعل سے عاجز ہے اور وہ کسی دُوسرے کے فعل میں اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اسے ایسی ذات پر بھروسہ ضروری ہے اور اس سے دُوری کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں۔

٣- یہ عالم کثرت اللہ تعالیٰ کی وحدت کا ظل ہے اسی لیے اس پر وہ عدل کا طریقہ جاری کرتا ہے کسی کو کسی پر مسلط نہیں کرتا سوائے اس کے اسی استحقاق کے کہ جس کا وہ مستحق ہے۔ ایسا نہیں کہ کسی کو کسی دُوسرے کے گناہ اور جرم سے سزا دے

اور نہ ہی کسی کو گناہ اور جرم کے بغیر سزا دیتا ہے۔ ہاں جس سے کوئی گناہ اور جرم صادر ہو اور اسے سزا ملے تو وہ اس کا عدل ہے، خواہ اس کا وہ جرم گناہ صغیرہ کے قبیل سے ہی ہو۔ البتہ تزکیہ اور رفع درجات کے طور کبھی کسی کو تکلیف وغیرہ میں بتلا کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ بتوں کو کسی قسم کی قدرت اور تصرف کی قوت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کوئی طاقت اور قوت نہیں اور وہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کسی صورت میں ظلم کا شائبہ پایا جاتا ہے تو وہ ہماری نظر کا قصور ہے ورنہ اس میں ہزار ہا حکمتیں اور بے شمار اسرار و رموز مضمر ہوتے ہیں۔ عارف باللہ ہر وقت اسرارِ الٰہیہ پر نظر رکھتا ہے اور دنیا و آخرت کے ہر واقعہ کو حکمتِ الٰہی پر محمول کرتا ہے۔

حکایت

ایک سقہ کسی شہر کے سنار کے گھر پانی بھرتا تھا۔ اس سنار کی عورت نہایت حسین و جمیل تھی اور نیک بخت اور صالحہ بھی۔ ایک دن سقہ حسبِ معمول وقت پر پانی لایا تو سنار کی عورت کے ہاتھ کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور چلا گیا۔ جب اس کا شوہر بازار سے واپس آیا تو شوہر سے پوچھا: آج تم سے رضائے الٰہی کے خلاف کوئی کام ہوا ہے؟ اس نے کہا: ایک غلطی ہو گئی ہے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ وہ یہ کہ میرے ہاں ایک حسینہ و جمیلہ دکان پر آئی اس نے ہاتھ میں کنگن پہنانے کو کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ سے پیار آ گیا تو میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے دیا۔ اس کی عورت نے کہا: آج سقہ سے میرے ساتھ یہی کیفیت ہوئی ہے۔ میں اس کی خیانت پر حیران رہ گئی اور دل میں سوچا اس میں کوئی حکمت ضرور ہے۔ سنار نے کہا: میں توبہ کرتا ہوں آیندہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کروں گا۔ جب دوسرے روز وہی سقہ آیا تو سنار کی عورت سے کہا: اے مائی! آگاہ ہو جا، جو غلطی کل مجھ سے سرزد ہوئی تھی اس سے توبہ کرتا ہوں آیندہ ان شاء اللہ ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے شیطان نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا۔ سنار کی عورت نے کہا: تیرا کوئی قصور نہیں میرے شوہر سے غلطی ہوئی جس کی سزا اسے دنیا میں مل گئی۔ اللہ تعالیٰ کے عدل کے کرشمے اس طرح سے ہوا کرتے ہیں۔ سچ ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

سبق

بندوں پر لازم ہے کہ وہ ہر معاملہ میں عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھیں۔ بالخصوص حکام و سلاطین کو بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے کیونکہ عدل و انصاف دنیا و آخرت میں نفع پہنچاتا ہے۔

حکایت

حضرت ذوالقرنین نے ارسطو سے پوچھا کہ بادشاہوں کے لیے عدل ضروری ہے یا شجاعت؟ ارسطو نے کہا: بادشاہ عدل کرے تو اُسے شجاعت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سبق

جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہے اس پر لازم ہے کہ عدل و انصاف کرے اور ظلم سے بچے ان شاء اللہ تعالیٰ بہت بڑے درجات اور کمالات پائے گا ورنہ آخرت کے سخت عذاب میں مبتلا ہو گا بلکہ اسے دنیا میں بھی سزا ملے گی۔ چنانچہ ویستخلف قوماً غیرکم میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں لعنت کا بھی مستحق ہے حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ؎

نماند ستمگار بد روزگار
بماند برو لعنت پائدار

خنک روز محشر داد گر

کہ در سایۂ عرش دارد مقر

ترجمہ: ظالم کمینہ دنیا سے رخصت ہو جائے گا لیکن اس پر ہمیشہ لعنت برستی رہے گی مبارک ہو اس عادل کو جو قیامت میں عرشِ الٰہی میں جگہ پائے گا۔

تفسیر عالمانہ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا اور جب آیا عذاب ہمارا۔ امر؛ امور کا واحد ہے تو اس سے عذاب مراد ہے اگر مصدر ہو تو معنیٰ ہوگا کہ ہمارے عذاب کا امر نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ تو ہم ہود علیہ السلام اور ان کے ایمان دار ساتھیوں کو نجات دیں گے۔

ف: حضرت ہود علیہ السلام کے چار ہزار ساتھی تھے۔

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ اپنی بہت بڑی رحمت سے۔ یعنی انھیں نجات حاصل ہوگی تو وہ ہمارا فضل اور کرم ہوگا نہ ان کے اعمال کی وجہ سے۔

مسئلہ: اہل سنت کا مذہب ہے کہ نجات کا دارو مدار اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ہے اعمال صالح صرف سبب بنتے ہیں۔

وَ نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ○ اور ہم انھیں سخت عذاب سے نجات دیں گے۔

ف: اے ما نجیناھم کے بیان کی وجہ سے مکرر لایا گیا ہے یعنی انھیں شدید عذاب سے نجات نصیب ہوئی۔ یعنی ما نجیناھم میں اجمال تھا اب اس کی تفصیل کر دی گئی ہے اجمال کے بعد تفصیل میں تکرار نہیں ہوتا۔

ف: عذاب غلیظ سے وہ ہوا مراد ہے جو کافروں کی ناک سے داخل ہو کر ان کے اندرونی حصے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دُبر سے باہر نکلتی تھی۔ سورۂ اعراف میں ان کے قصے کی تفصیل عرض کر دی گئی ہے۔

تفسیر صوفیانہ عذاب کی دو اقسام ہیں:

۱۔ خفیف

۲۔ غلیظ

خفیف سے وہ شقاوت مراد ہے جو ازل سے کسی کے مقدر میں لکھی گئی۔

غلیظ سے شقی کا عذاب مراد ہے جو معاملات کی شقاوت کی وجہ سے اسی شقاوت مقدرہ کے مطابق حاصل ہوگا۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

ف: مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عاد کو برباد کیا اور ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو نجات بخشی تو ہود علیہ السلام اپنے ساتھیوں سمیت مکہ معظمہ میں تشریف لائے۔ وہیں پر بقایا زندگی عبادتِ الٰہی میں گزار کر فوت ہوئے۔

قاعدہ عجیبہ انسان العیون میں ہے کہ جس نبی علیہ السلام کو اُمت جھٹلاتی تو وہ مکہ معظمہ میں تشریف لاتے اور وہیں پر فوت

ہو جاتے۔ چنانچہ مروی ہے کہ رکن یمانی اور رکن اسود کے درمیان بہشت کے باغیچوں سے ایک باغیچہ ہے۔ حضرت ہُود، حضرت شعیب، حضرت صالح اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مزارات اسی جگہ ہیں۔ فتوح الحرمین میں ہے۔ ؎

ہیچ نبی ہیچ ولی ہم نبود
کو نہ بریں در رخ امید سود
کعبہ بود نو گل مشکین من
تازہ ازو باغ دل و دین من

ترجمہ: ہر نبی اور ولی نے اسی جگہ پر ماتھا ٹیکا۔ کعبہ خوشبو کا مرکز ہے۔ اسی سے ہی ہمارے دل اور دین کا دماغ خوشبو پاتا ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَتِلْكَ اے پیارے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت۔ وہی قوم عَادٌ عاد تھی۔

ف: علامہ طیبی نے فرمایا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے عام ذہنوں میں اس قبیلے کا تصور پیدا فرمایا۔ پھر ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ تلك مبتدا اور عاد اس کی خبر ہے۔ اس معنے پر جحدوا بایٰت ربھم اس کی تفسیر اور احسن تفسیر ہے۔ یعنی عاد وہ قوم تھی جس نے اپنے رب تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا گویا تلك عاد اجمال تھا۔

جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ اس کی تفصیل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تلك سے ان کی قبروں اور ان کی پرانی منزلوں کی طرف اشارہ ہو گویا اس میں حکم ہے کہ اے لوگو! زمین کی سیر کر کے عاد کی قوم کی قبروں اور ان کی پرانی منزلوں کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو۔ اس معنے پر تلك میں مجاز ہے یا تو اس سے پہلے اصحاب محذوف ہے ای اصحاب تلك جحدوا الخ یا عاد سے پہلے قبور محذوف ہے۔ یعنی آیات ربانی پر یقین ہونے کے باوجود عمداً انکار کر دیا۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ واقعی یہ آیات ربانیہ ہیں لیکن پھر بھی منکر ہو بیٹھے۔ یہ ایسے ہے جیسے کسی کے ہاں کوئی شے امانت رکھی جائے جب اس سے طلب کی جائے تو وہ انکار کر دے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ فلاں شے اس کے پاس بطور امانت ہے لیکن جان بوجھ کر انکار کرتا ہے اور اسی پر ڈٹ جاتا ہے۔ یہ بھی ایسے تھے وَعَصَوْا رُسُلَهٗ اور اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں کی نافرمانی کی۔

سوال: انہوں نے تو صرف ہود علیہ السلام کی نافرمانی کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کی نافرمانی کا فرمایا ہے۔

جواب: ایک رسول کا انکار گویا سب رسولوں سے انکار ہے کیونکہ ان سب کا توحید و شرائع پر اتفاق تھا۔

ف: بعض کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ہر ہر فرد انکار و تکذیب میں یکتا تھا اور وہ اپنے لیڈروں اور سرداروں کی وجہ سے انکار و تکذیب کرتے تھے۔

وَاتَّبَعُوْٓا اور ان کے نچلے طبقے کے لوگوں نے فرماں برداری کی اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ امر ہر سرکش عَنِيْدٍ۝ جھگڑالو کی۔

ف : تبیان میں ہے کہ جبار وہ ہے جو کسی کو اپنا ہمسر نہ مانے بلکہ ہر ایک کو اپنے سے ہیچ جانے اور عنید وہ ہے جو حق بولے نہ اسے قبول کرے۔

ف : قاضی نے فرمایا کہ ان کے لیڈروں میں بعض حد سے زیادہ سرکش تھے۔

ف : سعدی مفتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جبار بمعنے وُہ متکبر جو اپنے اوپر کسی کا کوئی حق نہ مانے اور عنید مطلقاً سرکش کو کہا جاتا ہے۔

اب معنیٰ یہ ہُوا کہ وہ ایسے بدبخت تھے کہ ایمان اور نجات کے داعی کی نافرمانی کرتے اور جو کفر و عصیان اور تباہی میں ڈالے اس کے فرمانبردار تھے۔ وَاُتْبِعُوْا اور ان کے پیچھے کی گئی۔ اس میں لیڈر اور سردار بھی ہیں اور ان کے عوام بھی فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً اسی دنیا میں لعنت یعنی انھیں رحمت اور ہر کار خیر سے دُور رکھا گیا۔ یعنی لعنت ان کے پیچھے لگائی گئی اور ایسی لازم کی گئی کہ وہ انھیں جہنم تک پہنچائے۔ جیسے کوئی کسی کے پیچھے ہو کر دھکے دے کر منہ کے بل گرا دے۔ اس میں مبالغہ ہے کہ گویا لعنت نے ہی انھیں دھکے دیتے ہوئے جہنم میں اوندھے منہ گرا دیا اور اس کے پیچھے ایسے لگی رہی کہ پل بھر بھی اسے مہلت نہ دی۔ جہاں بھی جاتے لعنت ان کا تعاقب کرتی۔ اور تابعداروں اور سرداروں میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ دونوں اس بدقسمتی میں برابر ہیں اور دونوں کو برابر سزا ملی وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اور قیامت میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگائی جائے گی۔ اس سے جہنم کا دائمی عذاب مراد ہے۔ اور لعنت کو حذف اس لیے کر دیا گیا ہے کہ فی ھذہ الدنیا لعنۃ میں جو مذکور ہوا ہے وہ اس محذوف پر دلالت کرے گا۔ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ط خبردار! بے شک عاد کی قوم اپنے رب کی منکر ہوئی گویا وہ دہریہ (کمیونسٹ) تھے۔ ان کی گویا عادت تھی کہ وہ محسوسات کا اقرار اور غیر محسوسات کا انکار کرتے۔ پھر ہر امر کی نسبت دہر کی طرف کرتے جیسے دہریوں کی عادت ہے۔

ف : کواشی نے فرمایا کہ فعل کفر لازم بھی ہے متعدی بھی، جیسے فعل شکر کہ وہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

شکرتہ و شکرت لہ۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ۔ خبردار دُوری ہے عاد کو۔ یعنی قوم عاد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُور ہے۔

تبیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی رحمت سے دُور کر دیا۔ فلہذا وہ دُور ہو گئے۔ قَوْمِ هُوْدٍ ؕ ہُود علیہ السلام کی قوم۔ یہ عاد سے عطف بیان ہے کیونکہ عاد کی قومیں دو تھیں:

۱۔ عاد قدیمہ

۲۔ عاد روم (جدیدہ)

لفظ الا اور بددعا کلمات کا تکرار اس لیے ہے تاکہ معلوم ہو کہ ان کا معاملہ نہایت خطرناک اور ہیبت ناک تھا اور بندوں کو برانگیختہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ان کے حالات پڑھ سن کر عبرت حاصل کر کے ان جیسی غلط کاریوں سے بچیں۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

پس سپاس او را کہ ما را دو جہان

کرد پیدا از پس پیشینیان

تا شنیدیم آن سیاستہائے حق

بر قرون ماضیہ اندر سبق

استخوان و پشم آن گرگان عیان

بنگرید و پند گیرید اے جہان

عاقل از سر بنہد این ہستی و باد

چون شنید انجام فرعونان و عاد

ورنہ بنہد دیگراں از حال او

عبرتے گیرند از ضلال او

ترجمہ : اسی کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے لیے دو جہان پیدا فرمائے اور تمام امم کے بعد ہمیں پیدا کیا تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی کارروائیوں کو دیکھ لیں کہ اس نے پہلی اُمتوں سے کیا کیا۔ ہمیں فرمایا کہ ان بھیڑیوں کی ہڈیاں اور اُون دیکھ کر عبرت حاصل کرو۔ دانا اس ہستیِ دنیا کو کچھ نہیں سمجھتا جب وہ عاد اور فرعونیوں کے حشر کے بارے میں سُنتا ہے۔ اگر کوئی دوسروں سے عبرت حاصل نہیں کرتا اور غافل ہو کر زندگی بسر کرتا ہے تو دُوسرے اس سے عبرت حاصل کریں گے۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ اس میں قومِ عاد کو تباہی و بربادی اور ہلاکت کی بد دعا کی گئی ہے یعنی خدا کرے عاد کو دُوری اور ہلاکت ہی ہلاکت ہو۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ اس تباہی اور ہلاکت کے مستحق اپنے گندے کردار اور بد اعمال مذکورہ کی وجہ سے ہوئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وُہ اس قدر بُرے لوگ تھے کہ ان کے لیے بار بار بد دعا کی جارہی ہے۔ جیسا کہ بار بار عرض کیا گیا ہے لعاد میں لام استحقاق کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ بیان کے لیے ہو۔ گویا کسی نے پُوچھا کہ بُعد (دُوری) کس لیے۔ اس اجمال کو لعاد سے بیان کیا گیا۔

ف : سعدی مفتی نے فرمایا کہ یہ بھی جائز ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی بد دُعا کی ہے کیونکہ قاموس میں ہے کہ بعد بعاد بمعنے لعن استعمال ہوتا ہے۔

تحقیق در مسئلہ لعنت

کفایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ لعنت کرنے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی کو دھتکارنا۔ یہ صرف کفار کے لیے مخصوص ہے۔

۲۔ ابرار و صالحین کے مراتب سے دُور کرنا۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المحتکر ملعون ۔ ذخیرہ کرنے والا لعنتی ہے۔

مسئلہ : اہل سنت فرماتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ اسی معنے پر احادیث شریفہ میں لعنت عام (ہر گناہ کبیرہ کے لیے) آتی ہے۔

حدیث شریف ۱ : لعن اللہ من لعن والدیہ ولعن من ذبح لغیر اللہ ولعن اللہ من آوی محدثا ولعن اللہ من غیر منار الارض۔

جو اپنے والدین کو لعنتی کہتا ہے یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتا ہے اور جو مجرم کو پناہ دیتا ہے اور جو زمین کے نشانات مٹاتا ہے یہ سب ملعون ہیں۔

حل لغات : محدث حدیث مذکور میں واقع ہے (وہ بکسر دال ہے) بمعنے وہ بندہ جسے برائیوں اور حرام اشیاء سے روکا جائے گروہ ان کا مرتکب ہو۔ اور آوی بمعنے حماہ وذب عنہ ولم یکن ینکو عنہ و یردعہ یعنی وہ شخص جو مجرم کی حمایت کرتا اور اسکی طرفداری کرتا ہے اور اسے اس برائی سے نہیں روکتا۔ منار الارض بمعنے وہ علامات جو راستوں اور وہ بند جو ایک دوسرے کی ملکیت کے لیے چھوڑے جاتے ہیں۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حدیث شریف ۲ : لعن اللہ اکل الربوا و موکلہ و کاتبہ وشاھدہ و الواشمۃ والموشومۃ ومانع الصدقۃ والمحلل والمحلل لہ۔

اللہ تعالیٰ سُود خوار اور سُود کھلانے والے اور اس کے لکھنے والے اور اس کے گواہ اور واشمہ وموشمہ اور مانع زکوٰۃ اور محلل (حلالہ کرنے والا) اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے سب پر لعنت بھیجے۔

حل لغات : الوشم وہ نیلا پن جو بدن میں سُوئی کے چبھونے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی بدن میں سُوئی چبھونے کے بعد سوراخ پر نیل یا سُرمہ ڈال دیا جائے اس سے اسی بدن کی جگہ نیلی یا سرمئی رہتی ہے و الواشمۃ وہی فعل کرنے والی عورت ہو یا مرد اور موشومہ وہ جس کے بدن پر فعل مذکور ہو وہ مرد ہو یا عورت۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حدیث شریف ۳ : لعن اللہ الراشی والمرتشی والرائش۔

اللہ تعالیٰ رشوت لینے اور دینے اور رشوت دینے دلانے والے پر لعنت کرے۔

ف : الرائش ہر وہ جو رشوت دینے دلانے میں وکالت کا کردار ادا کرے۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حدیث شریف ۴ : لعن اللہ الخمر وشاربہا وساقیہا و بائعہا ومبتاعہا وعاصرہا و معتصرہا وحاملہا والمحمولۃ الیہ و اکل ثمنہا۔

اللہ تعالیٰ شراب اور شراب خور اور اس کے پلانے بیچنے اور خریدنے اور اس کے اٹھانے اور جس کے لیے اٹھا کر لے جائے اور اس کے منافع کے ثمن کھانے والے پر لعنت بھیجے۔

مسئلہ: مسلمان اس کافر وغیرہ کی مزدوری نہ کرے جو شراب کی ساخت کے لیے اجرت پر کام کرائے۔ (کذا فی الاشباہ)

مسئلہ: انگور کا نچوڑ ہر اس شخص کو بیچنا جائز ہے جو اس سے شراب تیار کرے گا اس لیے شراب کا نچوڑ گناہ نہیں بلکہ بعد کو اس کی ہیئت تبدیل کی جائے گی اور وہ جرم مشتری کا ہے نہ بائع کا۔

مسئلہ: ایام جنگ میں کافروں کے ہاتھ جنگی ہتھیار بیچنا ناجائز ہیں اس لیے کہ وہ ہتھیار بنے بنائے ہیں ان میں بعد کو تغیر کا عمل نہیں جو شخص ایام جنگ میں اس کے ہاتھ ہتھیار بیچے جس کے متعلق معلوم ہو کہ ہتھیار لینے والا اہل فتنہ (مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والا) ہے کیونکہ ایسے شخص کو جنگی ہتھیار بیچنے میں اس کی مدد کرنی ہے جو ایک معصیت پر دوسرے کو تعاون کے معنے میں ہے اور وہ گناہ ہے۔

مسئلہ: کسی مسلمان نے شراب بیچ کر اس کا ثمن لے کر اس پر قبضہ کر لیا اور اس پر اس نے کسی کا قرضہ دینا ہے تو قرضخواہ کو شراب کے ثمن والی رقم لینا مکروہ ہے اس لیے کہ ذمی کے لیے بھی شراب مال متقوم نہیں (یہ تو مسلمان ہے) اسی طرح اس کا ثمن بھی۔ فلہذا مسلمان کو ثمن لینا حلال نہیں۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف ۵: لعن المسلم کقتلہ۔ مسلمان پر لعنت کرنا اس کے قتل کے مترادف ہے۔

مسئلہ: اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ حضرت حسین کا قاتل کافر نہیں البتہ اسے گناہ کبیرہ کا مرتکب کہیں گے۔ ہاں نبی کا قاتل کافر ہو جاتا ہے۔ (کذا فی الفتاویٰ ابن الصلاح)

لعنت یزید کی تحقیق

یزید کی لعنت کے متعلق تین مذہب ہیں:

۱۔ یزید کو محبوب اور بہترین حاکم و خلیفہ مانتے ہیں۔

۲۔ یزید کو لعنتی کہہ کر اسے غلیظ گالیاں دیتے ہیں۔

۳۔ نہ لعنت کرتے ہیں اور نہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اور خلفاء راشدین کے بغیر دوسرے خلفاء کی امیین اور حکام کی طرح جانتے ہیں۔ یہی تیسرا مذہب صحیح ہے۔ کیونکہ یہ قواعد شرعیہ کے مطابق ہے اور جنہیں تاریخ کا گہرا مطالعہ ہے وہ جانتے ہیں کہ مذہب ہذا صحیح تاریخ کے مطابق ہے۔ حضرت سعد الدین تفتازانی قدس سرہ نے فرمایا: ؎

اللعن علی یزید فی الشرع یجوز

واللاعن یجزی حسنات و یفوز

قد صح لدی انہ صح

واللعن مضاعف و ذالک مھموز

ترجمہ : شریعت میں یزید پر لعنت جائز ہے لعنت کرنے والے کو بہت ثواب ملے گا اور وُہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔
میرے نزدیک یہی صحیح ہے اور لعنت یزید پر دوہرا ثواب ملے گا اور یہی قوی اور مضبوط ہے۔
باقی ابحاث سورۂ بقرہ الا لعنۃ اللہ علی الظالمین کے تحت دیکھیے۔

مذمت دنیا حیوۃ الحیوان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو مقصود بالذات نہیں بنایا بلکہ یہ ایک طریق موصل ہے۔ اسی کے ذریعہ مقصود بالذات حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ تو دار الاقامہ ہے اور نہ ہی اس میں کوئی کمائی کرنی ہے بلکہ یہ دار الفناء والبلاء ہے اور اس سے لامحالہ کوچ کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں عیش وعشرت کا سامان اکثر جہال و کفار کو بخشا ہے۔ انبیاء علیہم السلام ، اولیاء کرام اور ابدال کو اس سے بہت دُور رکھا ہے۔ اس کی ذلت اور خواری کی اتنی دلیل کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ہر جگہ مذمت فرمائی ہے اور اس کی حقارت تفصیل سے بیان فرمائی ہے اور اپنے بندوں کو اس سے کنارہ کشی کا حکم فرمایا ہے بلکہ اسے اپنی مبغوض بنایا ہے اور فرمایا ہے کہ نہ صرف وہی مبغوض ہے بلکہ اس کے متعلقین بھی مبغوض ہیں۔ سمجھدار انسان اس سے دل نہیں لگاتا بلکہ اس سے کُوچ کرنے کی تیاری میں لگا رہتا ہے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
الدنیا ملعونۃ وملعون ما فیھا الا ذکر اللہ ومن والاہ وعالما او متعلما۔

ترجمہ : دنیا اور اہلِ دنیا ملعون ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا اور جو اس سے محبت کرنے والا ہے اور عالم دین (باعمل) اور طالب علم۔

ازالۂ وہم اس سے یہ نہ سمجھنا کہ دُنیا اور اہلِ دُنیا مطلقاً ملعون ہیں بلکہ دُوسری حدیث شریف میں ہے جو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تسبوا الدنیا فنعمت مطیۃ المؤمن علیھا یبلغ الخیر وبھا ینجو من الشر ان العبد اذا قال لعن اللہ الدنیا قالت الدنیا لعن اللہ من عصاہ۔

ترجمہ : دنیا کو گالی نہ دو یہ مومن کی سواری ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے وہ بھلائی کو پہنچتا ہے اور اسی کے ذریعہ شر سے نجات پاتا ہے۔ جب کوئی کہتا ہے کہ دنیا پر لعنت ہو تو دنیا کہتی ہے اس پر لعنت ہو جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔

اس حدیث شریف سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا پر نہ لعنت جائز ہے نہ اس کی مذمت۔
سوال : دو حدیثیں آپس میں متضاد کیوں ؟
جواب : اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو دنیا اللہ تعالیٰ سے دُوری اور اس کی ناراضگی اور غیظ و غضب کا سبب بنے ایسی دنیا لعنت کی مستحق ہے۔ چنانچہ مشایخ کرام فرماتے ہیں :

(باقی برصفحہ ۱۵۱)

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ
مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝
قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ
شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ مِنْهُ
رَحْمَةً فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَیْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ ۝ وَیٰقَوْمِ هٰذِهٖ
نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ
قَرِیْبٌ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ فَلَمَّا
جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْیِ یَوْمِىِٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ۝ وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا
فِیْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝

ترجمہ: اور ثمود کی طرف ان کا ہم قوم صالح (علیہ السلام) کو (بھیجا) فرمایا اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں اسی نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا اور اسی میں تمہیں آباد فرمایا تو اس سے معافی مانگو پھر اسی کی طرف رجوع کرو بیشک میرا رب قریب دعا قبول کرنے والا ہے کافروں نے کہا اے صالح (علیہ السلام) اس سے قبل تو ہم میں اُمیدوں کا سہارا تھا۔ کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان کی پوجا کرتے ہیں جن کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے اور بیشک جس کی تو ہمیں دعوت دیتا ہے اس کے متعلق ہم اس سے بڑے دھوکہ ڈالنے والے شک میں ہیں۔ فرمایا میری قوم بھلا بتاؤ اگر میں رب کی طرف سے کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ تو پھر کون بچائے گا اللہ کے عذاب سے اگر میں اس کی نافرمانی کروں سو تم مجھے سوا گھاٹے کے کچھ نہ بڑھاؤ گے اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے تو اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھائے اور اسے کوئی دُکھ نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں نزدیک کا عذاب پکڑے گا۔ پھر انہوں نے اس کی کوچیں کاٹیں تو صالح (علیہ السلام) نے فرمایا اپنے گھروں میں تین دن اور فائدے اٹھا لو یہ ایسا وعدہ ہے کہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ پس جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے صالح (علیہ السلام) کو اور ان کے ساتھ ایمان والوں کو اپنی رحمت سے نجات دی اور اس دن کی رسوائی سے (بھی بچا لیا) بیشک آپ کا رب طاقت و عزت والا ہے اور ظالموں کو ہولناک آواز نے آپکڑا تو صبح کے وقت اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے رہ گئے گویا وہ ان میں بسے ہی نہ تھے۔ خبردار! بیشک انہوں نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سن لو ثمود پر لعنت ہو۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۹)
كل ما شغلك عن الله سبحانه من مالٍ و ولدٍ فهو مشئومٌ عليك۔

جو مال واولاد اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب بنے وہ وبال اور سراسر نقصان ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ دنیا مستحقِ لعنت ہے جو اللہ تعالیٰ سے دُور رکھے ورنہ وُہ دنیا جو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے اور راہِ حق پر چلنے کے لیے مدد کرے وُہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نیک بندے کے نزدیک محبوب ہے اور ایسی دنیا کی اللہ تعالیٰ بھی تعریف کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بھی ایسی دنیا پر دشنام طرازی نہیں کرتے بلکہ اس کے حصول کے لیے ترغیب دیتے ہیں۔ دوسری حدیث شریف الا ذکر اللہ وما والاہ وعالما او متعلما میں اسی کی تصریح موجود ہے اور اس کے اول میں فرمایا، نعمت مطیۃ المومن سے اس کا بھی یہی مقصد ہے ہماری اس تقریر سے دونوں حدیثوں کا تعارض اُٹھ گیا۔

تفسیر صوفیانہ حقیقی لعنت تو یہ ہے کہ شہواتِ دنیا میں مبتلا ہو کر بارگاہِ الٰہیہ سے دُور ہو جانا یعنی دنیا کے ہونے پر خوشی اور نہ ہونے پر غم کا نام صوفیہ کرام کے نزدیک لعنتِ حق کا مستحق ہونا ہے۔ اور یہ لعنتِ دنیویہ ہے اور لعنتِ اُخرویہ یہ ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کے قرب سے دُور اور مہجور کر دینا اور عذابِ جہنم میں مبتلا کرنا۔

اب آیت کا معنیٰ یوں ہُوا کہ نفس نے جب قلب ہود کی نصیحت قبول نہ کی اور اس نے قلب کے مشاربِ غیبیہ باقیہ کو ترک کر دیا حالانکہ وہی لوامع نورانیہ اور طوالع روحانیہ اور شواہد ربانیہ تھیں اس بدبخت نفس نے مشاربِ دنیویہ فانیہ کو قبول کر لیا حالانکہ یہی سراسر شہوات اور لذاتِ حیوانیہ اور خلقِ خدا کی خوشامد اور چاپلوسی اور ان کے جاہ وجلال کے سامنے سربسجود ہونا وغیرہ وغیرہ ایسے بدبخت کو سراسر حق سے دُوری ہی دُوری اور دیدارِ الٰہی سے فرقت ومہجوری اور دائمی حسرت وناامیدی نصیب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفس امارہ کی مکاریوں سے محفوظ فرمائے اور زندگی کو اچھے اعمال سے سنوارنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

(تفسیر آیاتِ صفحہ گزشتہ)

تفسیر عالمانہ وَ اِلٰی ثَمُوْدَ ہم نے ثمود کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ ثمود عرب کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ یہ بھی اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام سے موسوم ہوئے۔ اس کا نسب نامہ یُوں ہے، ثمود بن عاد بن ارم بن سام۔

بعض نے کہا انہیں ثمود اس لیے کہا جاتا ہے کہ جس محلِ وقوع پر یہ رہتے تھے وہاں پانی کی سخت کمی تھی اور یہ ثَمَدٌ سے مشتق ہے بمعنے الماء القلیل۔

ف: تفسیر ابو اللیث میں ہے کہ ثمود غیر منصرف ہے اور اس میں منع صرف کے دو سبب ہیں:

۱۔ علمیت اس لیے کہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔

۲۔ عجمیت اس لیے کہ یہ عجمی ہے۔

اگر منصرف ہو تو چونکہ ایک قوم کا صرف اسم جنس ہے اسی لیے دوسرا سبب نہ رہا۔ اور ایک سبب سے اسم غیر منصرف نہیں ہو سکتا۔

اَخَاھُمْ ان کا بھائی یعنی ان کے نسب اور قبیلے کا ایک فرد صٰلِحًا یہ اخاھم سے عطف بیان ہے صالح بن عبید بن آسف بن ماسخ بن عبید بن خاور ابن ثمود قَالَ یہ جملہ مستانفہ بیانیہ اور سوال کے مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام جب رسول بن کر تشریف لائے تو اپنی قوم سے کیا فرمایا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا یٰقَوْمِ اے میری قوم! اعْبُدُوا اللّٰهَ اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو اس لیے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ھُوَ صرف وہی ہے نہ کوئی اور، کیونکہ ہر فعل کا فاعل حقیقی وہی ہے۔ ھُوَ کی تقدیم قصر پر دلالت کرتی ہے۔ اَنْشَاَكُمْ تمہاری تخلیق اور تمہارے وجود کی ابتدا اسی نے فرمائی ہے مِّنَ الْاَرْضِ زمین سے۔ یہ من ابتدا انشاکم کی غایت کے لیے ہے۔ یعنی زمین سے تمہاری تخلیق کا آغاز فرمایا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ وہی قیامت تک پیدا ہونیوالی تمام اولاد کا نمونہ تھے۔ وہ ہم سب کی تخلیق کا اجمال تھے اور ہم ان کی تفصیل ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کہا ہے کہ تمام انسانوں کو ظاہری طور پر مٹی سے نہیں بلکہ منی کے قطرہ اور پھر ماں کے پیٹ کے اندر حیض کے خون سے تیار کیا گیا لیکن حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب انسان مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔ مثلاً وہی منی یا حیض غذاؤں سے تیار ہوتے ہیں اور غذا نباتات وحیوانیات سے تیار ہوتی ہے اور نباتات کے مٹی ہونے میں تو کسی کو شک نہیں لیکن حیوانیات بھی غذا کھاتے ہیں جو نباتات سے ہی تیار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ نباتات مٹی ہیں۔ فلہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو مٹی سے پیدا فرمایا وَاسْتَعْمَرَكُمْ یہ عمر سے مشتق ہے۔ مثلاً عمر الرجل یعمر عمرا (بفتح العین وسکون المیم) بمعنے عاش زمانا طویلا۔ یعنی فلاں نے لمبا وقت گزارا۔ اور کہا جاتا ہے استعمرہ اللہ بمعنے اطال اللہ بقاءہ یعنی اللہ تعالیٰ فلاں کی بقاء لمبی کرے۔ اس کی نظیر بقی الرجل واستبقاہ اللہ ہے۔ یہ البقاء سے مشتق ہے بمعنے ابقاء اللہ استفعل کے باب پر آئے تو متعدی ہوتا ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ عمرکم واستبقاکم فی الارض یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں زمین پر بقاء بخشے۔

ف: مدارک میں ہے کہ ثمود کی قوم عمریں تین سو سال سے ایک ہزار سال تک ہوتی تھیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ استعمرکم' العمارۃ سے مشتق ہے بمعنے آباد کرنا۔

مسئلہ: حضرت کعب فرماتے ہیں: استعمرکم' عمارۃ سے مشتق ہو تو آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کو آباد کرنا واجب ہے کیونکہ استعمار بمعنے طلب العمارۃ اور اللہ تعالیٰ سے طلب عمارت مطلقاً امر اور ایجاب پر دلالت کرتی ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں زمین آباد کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ اور تمہیں قوت اور قدرت بھی بخشی ہے کہ تم اس پر مکانات اور منازل وغیرہ تعمیر کرو۔

ف: کاشفی نے لکھا کہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ زمین پر مکانات ومنازل تیار کرنے، نہریں کھودنے، درخت اور باغات لگانے پر قدرت بخشی ہے۔ فلہٰذا ان امور میں مشغول ہو جاؤ۔

فَاسْتَغْفِرُوْهُ پس ایمان لاکر اسی سے گناہوں کی بخشش مانگو کیونکہ نیکی کرنے والے کو استغفار ضروری ہے ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ پھر غیر اللہ کی پرستش سے توبہ کرو۔ استغفار اور توبہ سے پہلے ہم نے ایمان کی قید اس لیے لگائی ہے کہ جب تک ایمان نہ ہو

اعمال صالح بیکار ہیں۔ لفظ ثم کی تحقیق ہم نے پہلے کئی بار عرض کی ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ بے شک میرے رب تعالیٰ کی رحمت بہت قریب ہے۔ چنانچہ فرمایا:

ان رحمة الله قريب من المحسنين۔

بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت محسنین کے قریب ہے۔

مُّجِيْبٌ ○ جو اُسے پکارے وہ اسے جواب دیتا ہے۔ اور جو اس سے دُعا مانگتا ہے اس کی دُعا قبول کرتا ہے۔

ف: سعدی مفتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قریب بمعنے ناظر ہے یعنے تم توبہ کرو تو وہ دیکھتا ہے۔ اور مجیب وہ تمہاری ہر نیکی قبول فرماتا ہے فلہذا استغفر وہ اس سے استغفار کرو کیونکہ وہ اپنے سائل کو خالی نہیں پھیرتا۔ یہ مفتی صاحب مذکور کی اپنی رائے ہے (اور بہترین رائے ہے) ؎

محالست اگر سر برین در نہی
کہ باز آیدت دست حاجت تہی

ترجمہ: اگر سر اسی درگاہ پر رکھو تو محال کہ تمہاری ضرورت پوری نہ ہو۔

ف: بندے کا اصلی مطلب اور مطمحِ نظریہ ہونا چاہیے کہ مجیب یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر عمل کرے اور اس کے روکے ہوئے امور سے رک جائے اور اس کریم کی عادت کریمہ ہے کہ وہ بندوں کو کریمانہ جواب سے نوازتا ہے بلکہ اس کی ہر تمنا پوری فرماتا ہے اور حقیقی عبد بھی وہی ہے کہ جب بھی اپنے مالک کو پکارے اور جو اس سے مانگے وہ اسے فی الفور عطا فرمائے۔ چنانچہ ابو طالب نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

ما اطوع ربك۔ تیرا رب تیری ہر بات مانتا ہے؟

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

وانت يا عم لو اطعته لا طاعك۔ اے چچا! اگر تم بھی خدا کی عبادت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارا کہا مانے گا۔

تفسیر صوفیانہ حضرت الشیخ الاکبر قدس سرہ الاطہر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو پکارنے سے تو یہ ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعید ہے حالانکہ وہ تو قریب ہے۔ جب وہ قریب ہے تو اسے پکارنا کیسا۔ اگر اسے پکارا نہ جائے اور اس سے دُعا نہ مانگی جائے تو ناراض ہوتا ہے بلکہ فرماتا ہے کہ تم مجھ سے تکبر کرتے ہو اس سے تو بہرا بھلا کہ نہ اسے دُعا مانگنے کا شعور اور نہ اس پر ناراضگی کا اظہار ہوگا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ گونگے سے یہی عرفی گونگا نہیں بلکہ وہ عارف باللہ کہ جس کے متعلق کہا گیا من عرف الله كل لسانه جو اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ؎

چو بیت المقدس درون پر قباب
رہا کردہ دیوار بیرون خراب

بخود سر فرو بردہ ہچوں صدف
نہ ماند ز دریا برآوردہ کف

ترجمہ: بیت المقدس کا ظاہر دیکھو تو خستہ حال ہے لیکن باطن تجلیات ربانی سے معمور ہے۔ صدف کی طرح پردہ میں ہے کہ وہ دریا کی جھاگ کی طرح اوپر کو ظاہر نہیں۔

مسئلہ تصوف: ظاہر کو شرعی امور سے معمور کرنا لازمی ہے باطن کو اخلاق ربانیہ سے۔

تعمیر کی اقسام

علماء کرام نے فرمایا کہ عمارت کی کئی اقسام ہیں:

۱۔ واجب

۲۔ مندوب

۳۔ مباح

۴۔ حرام

واجب: جیسے سرحدوں کی دیوار، ضرر رساں نہروں پر پُل باندھنا، بڑے شہروں میں جامع مسجد بنوانا۔

مندوب: چھوٹی نہروں پر پُل بنوانا، مساجد، مدارس، لوگوں کی سہولت کے لیے سرائیں بنوانا۔

مباح: جیسے عام چھوٹی نہریں کھدوانا اور خانقاہیں (عبادت خانے) بنوانا اور ایسے مکانات تعمیر کرنا جو عوام کو گرمیوں و سردیوں میں کام دیں۔ کبھی ایسے مکانات بنوانا واجب بھی ہوتا ہے۔

حرام: ہر ایسی عمارت یا مکان جس سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو حرام ہے۔

ف: اسرارِ محمدیہ میں ہے کہ مکان کی تعمیر سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ بارش، سردی اور گرمی وغیرہ سے بچاؤ ہو جائے اور اس کا کم درجہ سب کو اپنی ضرورت کے مطابق معلوم ہے۔ ضرورت سے زاید مکان تعمیر کرانا فضول خرچی (اسراف) میں داخل ہے۔ بہتر ہے کہ تھوڑے مکان بنوائے جائیں اور گرم علاقوں میں معمولی مکان کافی ہے اور سرد علاقوں میں چونکہ سردی کا حملہ ہوتا ہے بلکہ سردی مکان کے اندر اور اس کی دیواروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے یا پھر سردی موت کا سبب بنتی ہے یا کم از کم بیمار کر ڈالتی ہے۔ اگر ایسے علاقوں میں مضبوط اور پختہ مکان تعمیر کیے جائیں تو خلافِ زُہد نہیں۔ اسی طرح گرم علاقوں میں بھی اگر ضرورت درپیش ہو تو مضبوط اور پختہ مکان بنوانا جائز ہے۔ اسی طرح اولاد کو ضرر سے بچانے کے لیے یا مچھروں اور پسوؤں وغیرہ سے بچانے کے لیے مناسب مکان بنوائے جائیں تو بھی جائز بلکہ موجبِ اجر ہے۔

حدیث شریف ۱: جس نے ظلم سے بچ کر اور زیادتی سے محفوظ ہو کر مکان بنوائے، باغ بوئے، تو جب تک اس مکان یا باغ سے لوگ مستفید ہوتے رہیں گے اسے ثواب ملتا رہے گا۔

ف: مکان بنوانا اس وقت حرام ہے جب فخر و مباہات سے بنوائے جائیں ایسے ہی ظالموں وغیرہ کے حالات ہیں

کر بلا ضرورت مکان بنواتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف ۲: جو شخص بلا ضرورت مکان بنواتا ہے قیامت میں وُہ مکان سر پر رکھ کر آئے گا

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف ۳: دنیا اور اس کے اندر والی تمام اشیا ملعون ہیں ہاں اس میں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں وہ لعنت سے مستثنیٰ ہیں۔

فارس کے علاقوں کے لوگوں نے بہت اونچے اونچے مکانات بنوائے، نہریں کھدوائیں، باغات لگائے۔ اس زمانہ کے

اعجوبہ نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا: اے الٰہ العٰلمین! یہ لوگ خواہ مخواہ اسراف کیوں کر رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خرچ کر رہے ہیں اس سے میرے بندے مستفید ہوں گے۔

حکایت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وصال (موت) سے پہلے ویران زمینیں بہت آباد کرنے لگے۔ آپ سے سبب پوچھا گیا آپ نے فرمایا کہ مجھے کسی شاعر کے شعر ذیل نے اس پر آمادہ کیا ہے ؎

لیس الفتی بفتی لیستضاء بہ

ولا یکون لہ فی الارض آثار

ترجمہ: بھلا وُہ بھی کوئی انسان ہے جس سے بعد مرگ کوئی یادگار نہ ہو۔

مسئلہ: اس سے وہ تعمیریں اور یادگاریں مراد ہیں جو واجب اور مندوب ہیں۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

نمرد آنکہ ماند پس از وے بجائے

پل و مسجد و خان ومہمان سرائے

ہر آنکو نماند از پسش یادگار

درخت وجودش نیاورد بار

اگر رفت آثار خیرش نماند

نشاید پس از مرگ الحمد خواند

ترجمہ: جس کی کوئی یادگار باقی ہو وہ مرتا نہیں۔ پل، مسجد، سرائے اور مہمان خانے جو اپنی یادگار نہ چھوڑ جائے اسے کسی قسم کا فائدہ نصیب نہ ہوگا۔ اگر مرنے کے بعد کوئی نیکی نہ چھوڑ جائے اس کے لیے فاتحہ پڑھنے والا نہ ہوگا۔

قَالُوْا صالح علیہ السلام کی قوم نے کہا جب انہیں صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی دعوت دی یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا اے صالح علیہ السلام ! تم ہمارے درمیان تھے مَرْجُوًّا ہمارا مقصد قَبْلَ ھٰذَآ اس سے قبل یعنی اس دعوت سے پہلے ہمارے ہاں نہایت نیک انسان اور ہر بھلائی کا مرکز اور تیرے اندر ہر ہدایت کی علامات نظر آتی تھیں اور ہم سمجھتے تھے کہ یہی ہمارے سردار ہوں گے اس سے ہم بہت فوائد حاصل کریں گے اور اپنے کاروبار میں اس سے مشورہ لیں گے۔ اور اسے اپنے جملہ امور کا رہبر بنائیں گے۔ لیکن جب سے ہم نے تم سے یہ باتیں سُنی ہیں تو ہماری تمام اُمیدیں منقطع ہوگئیں۔ اب ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ تم (معاذ اللہ) بالکل ناکارہ ہو۔

ردّ وہابیہ دیوبندیہ جیسے صالح علیہ السلام کی قوم نے صالح علیہ السلام کو کہا ایسے ہی بعض بدبخت اولیاء کرام کو کہتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل بے کار ہیں۔ ایسے بدبختوں کو صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ان نالائقوں کا عقیدہ خراب ہے یا وہ پاگل ہیں کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام جیسے عاقل و صالح بزرگ و نبی علیہ السلام کو بھی ناکارہ کہنے والے ایسے ہی بدبخت تھے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

عقل جزوی عشق را منکر بود
گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود

ترجمہ: جزوی عقل والا عشق کا منکر ہوتا ہے اگرچہ وہ صاحبِ سر ہوتا ہے۔

حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ؎

مبین حقیر گدایان عشق کین بود
شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ اند
غلام ہمت دردے کشان یک رنگیم
نہ زیں گروہ کہ ازرق ردا و دل سیاہ اند

ترجمہ: عشق کے گداؤں کو حقارت سے نہ دیکھ اس لیے یہ بے تاج بادشاہ ہیں ہم درد کشان حضرات کے غلام ہیں لیکن ان مکّار رنگین کپڑوں سے ہمارا دُور سے سلام اس لیے کہ ان کے دل سیاہ ہیں۔

اَتَنْھٰنَآ یہ ہمزہ انکاری ہے، کیا تم ہمیں روکتے ہو اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ان کی عبادت سے جن کی ہمارے آبا نے پرستش کی۔ یعنی بتوں کی پرستش سے روکتے ہو۔ مضارع بمعنے ماضی ہے۔ وَاِنَّنَا بعض قراتوں میں اِنَّا ہے ایک نُون گرایا گیا ہے یعنی اِنَّ کا ایک نون اس لیے کہ نا متکلم کے نون حذف ہونے کے لائق نہیں کیونکہ وہ تو ایک عمدہ یعنی فاعل کا جز ہے۔ یہی مختار مذہب ہے لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ یعنی ہم شک میں ہیں جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو۔

یعنی توحید کی دعوت دے کر ہمیں بتوں کی پرستش سے روکتے ہو تمہاری اس کارروائی سے ہمیں شک ہے۔ مُرِیۡبٍ ۝ تمہارا یہ معاملہ شک میں ڈالنے والا ہے۔ ریبۃ سے ماخوذ ہے بمعنے قلق النفس و انتفاء الطمانیۃ یعنی نفس کی قلق اور اطمینان کے نہ ہونے کو ریبۃ کہتے ہیں۔ یعنی ہر وہ امر جو نفس کو مضطرب اور دل کو بے آرام کرے اور عقل کو شوریدہ بنا دے۔ اہلِ عرب کہتے ہیں ارابہ یعنی اوقعہ فی الریبۃ یعنی فلاں نے فلاں کو شک میں ڈالا۔

نکتہ : ارابۃ کا شک کی طرف اسناد دلالت کرتا ہے کہ انسان نفی و اثبات کے درمیان لٹکا رہتا ہے اور اس اسناد میں مجازی معنیٰ ہے ورنہ درحقیقت ہر فعل کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، اور یہی موحدین یعنی عارفین کا مذہب ہے۔

قَالَ صالح علیہ السلام نے فرمایا یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اے میری قوم! مجھے بتاؤ اِنۡ کُنۡتُ اگرچہ میں ہوں در حقیقت عَلٰی بَیِّنَۃٍ حجت ظاہرہ اور برہان اور بصیرت پر مِّنۡ رَّبِّیۡ اپنے رب تعالیٰ سے۔ یعنی میرا مالک اور میرے جملہ امور کا متولی وہی ہے وَ اٰتٰىنِیۡ مِنۡہُ رَحۡمَۃً اور مجھے اپنی طرف سے رحمت عنایت فرمائی۔ یہاں پر رحمت سے نبوت مراد ہے۔

سوال : اگر نبوت مراد ہے تو لفظ ان شک کیوں، حالانکہ آپ کو اپنی نبوت پر یقین تھا۔

جواب : اگرچہ آپ کو اپنی نبوت پر یقین تھا لیکن چونکہ مخالفین سے گفت گو تھی اور وہ آپ کی نبوت پر شک رکھتے تھے انھیں فرمایا کہ اے کافرو! اگر بفرضِ محال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل واضحہ پر نہیں ہوں تو کچھ دن کے بعد دیکھنا کہ اگر میں تمہارا کہا مان لوں اور اپنے رب تعالیٰ کی نافرمانی پر ہوں تو فَمَنۡ یَّنۡصُرُنِیۡ پھر میری مدد کون کرے گا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب میں مبتلا کرے تو پھر مجھ سے اس کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ینصر، یمنع کے معنے کو متضمن ہے۔ یہاں پر لفظ مِنَ اللّٰہِ سے پہلے عذاب محذوف ہے۔

ف : الارشاد میں ہے کہ عبارت یوں تھی،

فمن ینصرنی منجیا من عذابہ تعالیٰ۔

یعنی میری مدد کون کرے گا درانحالیکہ میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات پاؤں۔

اِنۡ عَصَیۡتُہٗ اگر میں تبلیغ رسالت نہ کروں اور اشراک باللہ سے نہ روکوں فَمَا تَزِیۡدُوۡنَنِیۡ پس مجھے نہیں بڑھاؤ گے یعنی مجھے کوئی فائدہ نہیں دو گے کیونکہ تمہاری اتباع میں سوائے خسارہ کے اور کچھ نہیں اگرچہ تم مجھے کہتے ہو قد کنت فینا مرجوًا قبل ھذا لیکن میں اسے خسارہ ہی خسارہ کہتا ہوں جبکہ میں تمہاری اتباع کو گمراہی سمجھتا ہوں غَیۡرَ تَخۡسِیۡرٍ ۝ سوائے خسارہ میں ڈالنے کے کیونکہ تمہاری اتباع سے میرے تمام اعمال باطل ہو جائیں گے بلکہ اُلٹا اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشان بن جاؤں گا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے جو کہتے ہو وہ تمہاری خالی باتیں ہیں حقیقت یہ ہے کہ تمہاری باتیں گمراہ کن ہیں انھیں میں گمراہی کی طرف منسوب کرتا ہوں۔ اس لحاظ سے فما تزیدوننی اپنے معنے پر ہے۔ تخسیر میں نسبت کا معنیٰ ہوگا یعنی انھیں خسارہ کی طرف منسوب کرنا، مثلاً فسقہ و فجرہ، یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کو فسق و فجور کی طرف منسوب کرے۔ اسی طرح

خسرہ یعنی فلاں کو فلاں نے خسارہ کی طرف منسوب کیا۔

تفسیر صوفیانہ

آیت میں اشارہ ہے کہ جب کسی کو حق منکشف ہوتا ہے تو وہ حق سے کبھی نہیں مُنہ موڑ سکتا اس لیے کہ حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں بلکہ اس میں رسوائی اور خسارہ ہے۔

زیارت مصطفوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

اپنے وقت کے بہت بڑے شیخ کامل ابو عبداللہ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا آپ نے فرمایا کہ جو راہِ حق پر چل کر پھر اس سے ہٹ جائے اسے ایسے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا کہ اس جیسا کسی کو عذاب نہ ہوگا

ملفوظ جنید رضی اللہ عنہ

حضرت جنید قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جو کامل ایک ہزار سال اللہ تعالیٰ کی راہ میں جد وجہد کرتا رہے اور اگر لحظہ بھر اس سے رُوگردانی کرے تو حاصل کردہ مراتب میں سے بہت سے مراتب اس سے ضائع ہو جائیں گے اگر بعد میں بہت بڑے مراتب حاصل کرے مگر ضائع شدہ کمالات کو نہیں پا سکے گا۔

تصوف میں بیعت کا مقام

تجلیات کی شرح میں لکھا ہے کہ سالک کو بیعت لازم ہے اور مرتے دم تک اسی پر مستقیم رہے جو اس سے ہٹ جائے گا اسے جہنم میں داخل ہونا پڑے گا اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہوگا نہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے گا نہ اس پر نظرِ کرم فرمائے گا اور اس کے لیے سخت عذاب ہوگا۔ حضرت ابو سلیمان الدارانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یہ اس کی آخرت کی سزا ہے۔ اور دنیا کی سزا کے متعلق منقول ہے کہ حضرت ابو یزید بسطامی قدس سرہٗ نے اپنے شاگرد (مرید) سے فرمایا جب اس مرید نے آپ کے ساتھ بغاوت کی تو آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دو جو اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد دیکھا گیا کہ وہی بدبخت ہیجڑوں کے ساتھ مل گیا اور اس نے چوری کی تو پکڑا گیا اور سزا کے طور اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ یہ تو بایزید بسطامی قدس سرہٗ کے باغی کی سزا ہے نہ معلوم ابو سلیمان دارانی قدس سرہٗ کے باغی کی سزا کیا ہو گی۔

کرامت

حضرت ابو سلیمان دارانی قدس سرہٗ کے ایک مرید صادق کی کرامت مشہور ہے کہ انہیں شیخ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو آگ کے تنور میں ڈال دے۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو تنور میں ڈال دیا۔ چنانچہ آگ اس کے لیے باغیچہ بن گئی۔ یہ سچی بیعت کا نتیجہ ہے۔

ضرورتِ مرشد

بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونی چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے وسائل اور ذرائع بنائے ہیں تاکہ فیض کا حصول آسانی سے ہو اور وہ انبیاء و اولیاء اور مشائخ ہیں، اور وہ سلاطین ہیں جو ان مشائخ سے نسبت رکھتے ہیں اور ان سے بیعت کرتے ہیں ایسے حضرات معصوم و محفوظ ہوتے ہیں یہ برائی سے بچاتے ہیں اور ان کے متعلقین سے عہد توڑنے کا امکان نہیں۔ اسی لیے مشائخ سے بیعت اور اتباع ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ان حضرات کے دامن کو جو شخص مضبوطی سے پکڑتا ہے وہ بہت بڑا خوش قسمت ہو جاتا ہے اور انجام نیک پاتا ہے اور جو ان سے

روگردانی کرتا ہے مارا جاتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ دائمی طور پر ذلیل و خوار کرتا ہے۔

مثنوی شریف میں ہے ؎

مرسگاں را چوں وفا آمد شعار
رو سگاں را ننگ بد نامی میار
بے وفائی چوں سگانرا عار بود
بے وفائی چوں روا داری نمود

ترجمہ: جب کُتوں کو شعار وفا نصیب ہے تو تمہیں بھی وفا کا شعار حاصل کرنا چاہیے ورنہ تم تو کتوں سے بھی پیچھے رہ گئے جب کتوں کو بے وفائی عار محسوس ہوتی ہے تو تمہارے نزدیک وفاداری اچھی نہیں افسوس ہے۔

سبق: عاقل پر لازم ہے کہ جن امور کی انبیاء و اولیاءٗ دعوت دیں یعنی توحید و حقایق کے اسباق بتائیں تو ان میں شک اور تردد نہ کرے بلکہ ان کی اتباع کرے۔ اس اتباع کی برکت سے مخفی اسرار و رموز نصیب ہوں گے۔ تردد اور شک کافروں کا کام ہے اور انبیاءٗ و اولیاءٗ کے امور میں قلق و اضطراب فاجروں کا طریقہ ہے۔ ؎

ایں تردد عقبۂ راہ حقست
اے خنک آنرا کہ پایش مطلقست
بے تردد می رود بر راہ راست
رہ نمی دانی بجو گامش کجاست
گام آہو را بگیر و رو معاف
تا رسی از گام آہو تا بناف
گر گراں و گر شتا بندہ بود
عاقبت جویندہ یابندہ بود

ترجمہ: یہ تردد راہِ حق کا عقبہ ہے۔ خوش وہ ہے جس کا پاؤں مطلق ہے وہ راہِ راست پر بے تردد ہو کر جاتا ہے تو اس راہ پر نہیں چل سکے گا جب تک راہرو کو تلاش نہیں کرے گا تجھے راہ نہیں ملے گا۔ آہو تیز رفتار کے قدم پکڑ کر راہ پر چل دو آہو کے قدموں پر چلنے سے ناف (مُشک) نصیب ہو گی۔ آہستہ چلو یا تیز، لامحالہ تلاش کرنے والا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔

ف: ہم نے اپنے زمانے میں بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ مشایخ کے طالب ہیں ان کے ہاں حاضری بھی دیتے ہیں باوجودیکہ وہ مشایخ کامل ہوتے ہیں اور صحیح معنے پر اللہ تعالیٰ کی دلیل پر ہوتے ہیں لیکن بدقسمتوں کی نظروں میں وہ بیکار محسوس ہوتے ہیں۔

کیونکہ خود وہی طالبین اپنے اعتقاد اور طلب میں کمزور ہوتے ہیں ان کے افکار پریشان اور ان کے ارادے ناقص ہوتے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ جب اعتقادی کمزوری موجود ہے تو اسے ولی کامل کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے اگرچہ اللہ والے اس کے سامنے ہوں بلکہ ایسے لوگ الٹا خسارہ اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب فرمایا:

الشمس شمس وان لم یرھا الضریر۔

سورج سورج ہے اگر اندھا نہ دیکھے تو اس کا اپنا قصور ہے۔

سبق سابقہ اُمتوں کو دیکھیے کہ وہ کس طرح انبیاء علیہم السلام کے فیوضات و برکات سے محروم رہیں حالانکہ انھوں نے بہت بڑے معجزات، براہین اور مضبوط و قوی دلائل پیش کیے۔ (اللھم انا نسئلك العصمة والتوفیق)

وَيَقُوْهِمِ مروی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوتِ دین پیش کی تو قوم نے آپ کی تکذیب کی۔ اس سے آپ نے رنجیدہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ الٰہ العالمین! مجھے اجازت بخشئے تاکہ میں اپنی قوم سے کہیں دور چلا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل پڑے۔ چلتے چلتے جب طلب دریا پہنچے ایک ایسے مرد کو دیکھا جو دریا میں چلتا جا رہا ہے مگر اس کے پاؤں خشک ہیں۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا: اے بندۂ خدا! تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں وہ بندہ ہوں میری قوم خدا کی نافرمان تھی اللہ تعالیٰ نے اسے غرق کر دیا۔ میرے سوا کوئی بھی اللہ کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ میں رزق کی طلب میں کبھی کبھار دریا کے پار جاتا ہوں، جیسے جاتا ہوں ویسے ہی بآسانی آجاتا ہوں، میرا بسیرا ایک جزیرے میں ہے وہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا ہوں۔

دریا عبور کر کے حضرت صالح علیہ السلام ریت کے ایک بہت بڑے ٹیلے کے قریب پہنچے تو آپ کے پاس ایک شخص آیا جس نے کہا السلامُ علیکم۔ آپ نے اسے وعلیکم السلام کہا۔ آپ نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: یہاں ایک بستی ہوا کرتی تھی یہاں کے باشی ماسوائے میرے سب کے سب کفار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو غرق کر دیا اور مجھے اپنے فضل و کرم سے نجات بخشی۔ میں نے اس دن سے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ سوائے خدا کی عبادت کے اور کوئی کام نہیں کروں گا اور تادم زیست عبادتِ الٰہی ہی میں گزاروں گا۔ اس کریم نے بھی میرے لیے کرم فرمایا کہ یہاں کھانے کے لیے ایک انار پیدا فرما دیا اور پینے کے لیے ایک چشمہ۔ کھانے کی خواہش انار سے، پینے کی خواہش چشمہ سے پوری کرتا ہوں۔ وضو، غسل اور دیگر پانی کی ضروریات بھی اسی چشمہ سے پوری کرتا ہوں۔

اس کے بعد صالح علیہ السلام ایک ایسے گاؤں میں پہنچے جہاں کے باشندے سوائے دو بھائیوں کے باقی سب کافر تھے اور وہ دونوں بھائی محنت مزدوری کرتے تھے۔ آپ نے وہاں بطور مثال بیان فرمایا کہ کسی جگہ تمام کفار ہوں اور صرف ایک مومن ہو تو مومن مسافر کا دل اسی مومن سے متعلق ہو گا۔ اسی طرح اگر کسی جگہ پہ تمام مومنین ہوں اور وہاں صرف ایک منافق ہو تو مسافر منافق کا جی صرف اسی منافق سے وابستہ ہو گا۔ حضرت صالح علیہ السلام اسی گاؤں میں انہی دو مومن بھائیوں کے مہمان ہوئے اور عرصۂ دراز تک ان کے ہاں ٹھہرے رہے۔ آپ نے ان کے حالات دریافت کیے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین انھیں بہت ستاتے ہیں اور یہ دونوں ان کی ایذا رسانی پر صبر کرتے ہیں اور

مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔ کمائی سے جو بچ جاتا ہے وہ راہِ خدا میں خرچ کر دیتے ہیں ۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا : خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے زندگی میں اپنے خاص بندوں کی زیارت نصیب فرمائی اور وہ مردِ مجاہد ہیں جو کفار و مشرکین کی ایذا پر صبر کرتے ہیں ۔ اب میں بھی اپنی قوم میں واپس جا کر ان کی ایذا برداشت کروں گا ۔ چنانچہ صالح علیہ السلام گھر واپس آ گئے اور وہ لوگ عید کی تقریب کے لیے گئے ہوئے تھے ۔ آپ بھی وہیں پہنچ گئے اور انھیں توحید و رسالت کی دعوت دی ۔ انھوں نے کہا اگر آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو ہمیں کوئی معجزہ دکھائیے ۔ آپ نے فرمایا : بتاؤ کیسا معجزہ دکھاؤں ۔ ان کے سردار جُندع بن عمرو نے اکیلے پڑے ہوئے کاتبہ نامی ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ اس پتھر (کاتبہ) سے ایک موٹے پیٹ والی ، زیادہ بالوں والی اور گابھن اُونٹنی نکالیے جو پتھر سے نکلتے ہی بچہ جنے ۔ آپ نے فرمایا : اگر ایسی اونٹنی اس پتھر سے نکل آئے تو پھر تم ایمان لے آؤ گے ؟ انہوں نے کہا ہم ضرور ایمان لے آئیں گے ۔ آپ ان سے عہد و پیمان لے کر دوگانہ نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی ۔ آپ کی دُعا مستجاب ہُوئی ۔ چنانچہ اس پتھر (کاتبہ) سے بچہ جننے والی اونٹنی کی طرح آواز آنے لگی ۔ جیسے قوم نے چاہا ویسے ہی اس پتھر سے اونٹنی نکلی جو بڑے پیٹ والی ، بڑے بالوں والی اور دس ماہ کی گابھن تھی جسے بچہ جننے میں تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا ۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی تھی ۔ یہ اضافت تشریفی ہے یعنی ناقہ کو اللہ تعالیٰ کی مضاف کرنے میں اونٹنی کی شرافت مطلوب ہے[1] ۔ اور اس میں تنبیہ ہے کہ خلقت اور عادات کے لحاظ سے اپنی دوسری ہم جنسوں سے جُدا تھی کیونکہ دُوسری اونٹنیاں ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہیں یہ اس کے برعکس پتھر سے پیدا ہُوئی اور تھی بھی بہت بڑے جُثّے والی ۔ لَكُمْ اٰيَةً وہ تمہارے لیے معجزہ ہے جو میری (صالح کی) نبوت کی صداقت پر دلالت کرتا ہے ۔ جندع سردار چند آدمیوں کی معیت میں حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لے آیا باقی سارے کے سارے محروم رہ گئے ۔ اٰيَةً کا منصوب ہونا علی الحالیۃ ہے اور وہ ناقۃ اللہ سے حال ہے اور اس کا عامل وہ فعل ہے جو هٰذا میں پایا جاتا ہے ۔ یعنی اشیر ۔ اب عبارت یُوں ہوگی :

اشیر الیها اٰیة ۔

اور لکم بھی اٰیۃ سے حال ہے اور اپنے ذو الحال سے مقدم ہے اس لیے کہ ذو الحال نکرہ ہے اور جب ذو الحال نکرہ ہو تو اس وقت حال مقدم ہوتا ہے ۔ اگر اٰیۃ لکم سے مؤخر ہو تو اسے لکم کی صفت بنایا جاتا جو اس وقت مقصود نہیں اور مقصود ہے حال بنانا اسی لیے مقدم کرنا پڑا ۔ فَذَرُوْهَا پس اسے اپنے حال پر چھوڑ دو تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ چرتی پھرتی رہے اللہ کی زمین میں ۔ یعنی جہاں چاہے کھاتی پیتی اور دوڑتی پھرے ۔

اعجوبہ

وہ اُونٹنی دُودھ اتنا دیتی تھی کہ وہ لوگ اپنے تمام برتن دُودھ سے بھر لیتے ۔ مزے سے پیتے اور بچا ہوا دودھ رکھ لیتے ۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کا نو سو گھرانہ تھا ۔ دوسری روایت میں ہے کہ ڈیڑھ ہزار گھرانہ تھا ۔

---

[1] اسی قبیل سے ہے نور اللہ ۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نور ہیں ۔ یا کہا جاتا ہے کعبۃ اللہ ، روح اللہ ، ارض اللہ وغیرہ

ربط : حضرت صالح علیہ السلام نے محسوس کیا کہ وہ (کفار) بجائے معجزہ ماننے کے اپنے کفر کی وجہ سے اونٹنی کے درپے آزار ہونے کے منصوبے بنانے لگے تو آپ نے احتیاطاً فرمایا :

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ اور اے کافرو! تم اسے کسی قسم کا ضرر نہ پہنچانا۔ اس معنے پر یہ باد تعدیہ کی ہے اس کے ایذا پہنچانے کی نہی میں مبالغہ کے ارادے سے اسے ہاتھ نہ لگانے سے تعبیر فرمایا جو کہ وہ ضرر پہنچانے کے مبادی سے ہے۔

ف : سوء کو نکرہ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسے ہر قسم کی ایذا سے محفوظ رکھا جائے۔ مثلاً مارنا، عضو کاٹنا، قتل کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یعنی نہ اسے مارنا نہ اپنی کھیتیوں سے بھگانا۔ الغرض اسے (اونٹنی کو) معمولی سے معمولی تکلیف بھی نہ دینا چہ جائیکہ اس کا کوئی عضو کاٹ دیا اسے قتل کرو۔

فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ○ پس پکڑے گا تمہیں وہ عذاب جو جلد تر نازل ہونے والا ہے۔ وہ اونٹنی گرمیوں میں جب وادی کے کنارے بیٹھتی تو ڈر کے مارے کافروں کے جانور وادی کے اندر چھپ جاتے اور سردیوں میں وادی کے اندرونی حصے میں جا بیٹھتی تو ان کے جانور وادی کے کنارے باہر سردی میں ٹھٹھرتے رہتے۔ کافروں پر یہ بات ناگوار گزری کہ ان کے جانور اونٹنی کی وجہ سے تکلیف میں ہیں۔ فَعَقَرُوْهَا تو اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ برخلاف قدار نامی کافر نے کیا جسے کفار نے حکم دیا یا کم از کم اس کی اس غلطی سے سب خوش ہوئے بلکہ وہ کٹا ہوا گوشت اپنی تمام بستی میں بانٹ دیا۔

ف : عقر جسم کا وہ حصہ کاٹنا جس سے شے کی موت واقع ہو جائے۔

ف : قدار (بالدال المہملہ) بروزن ہمام، اسی شخص کا نام ہے جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ یعنی قدار بن سالف۔ (اس کے واقعہ کی تفصیل ہم نے سورۂ اعراف میں کر دی ہے)۔

ف : کاشفی میں ہے کہ جس وقت اونٹنی کی کونچیں کاٹی گئیں صالح علیہ السلام وہاں موجود نہ تھے۔ جب واپس آئے تو آپ سے عرض کیا گیا کہ اونٹنی کی کونچیں کاٹ لی گئی ہیں۔

فَقَالَ تو آپ نے کافروں سے فرمایا : تَمَتَّعُوْا گزار لو فِيْ دَارِكُمْ اپنے شہر یا اپنے گھروں میں۔

ف : شہر کو دیار سے اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس کی طرف انسان گھوم پھر کر واپس آتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے :

دیار بکر۔ یعنی بکر قبیلے کے رہنے سہنے کے مکانات۔ اسی لیے وہ عرب جو کہ مکہ معظمہ کے گرد مکانات بنائے بیٹھے تھے وہ اپنے تعارف میں کہتے :

نحن من عرب الدار۔

اس سے ان کی مراد عرب البلد ہوتی۔ (کذا فی بحر العلوم)

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ تین دن یعنی بدھ، جمعرات، جمعہ۔ وہ اس لیے کہ انھوں نے اونٹنی کو بدھ کے دن دکھ پہنچایا تو ہفتہ کے دن صبح سویرے عذاب میں مبتلا ہوئے۔ (کذا فی التبیان)

ف، مروی ہے کہ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ پہلے دن تمہارے چہرے زرد، دوسرے دن سُرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے۔ پھر تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

ذٰلِكَ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ تم ان تینوں دنوں کو اپنے گھروں میں گزار لو۔ پھر تمہیں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ ○ یہ وہ وعدہ ہے کہ جس میں جھوٹ ہرگز نہیں۔ یہاں پر مکذوب بمعنے کذب ہے۔ جیسے مجلود بمعنے مجلد یعنی جلادۃ وجلادۃ آتا ہے۔ یا یہ دراصل غیر مکذوب فیہ تھا۔ حرف جر حذف کرکے ضمیر فاعل متصل کی مکذوب میں ہے اور ظرف میں توسع ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے مفعول بہ کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔ جیسے کہتے ہیں: شہد ناہ کہ دراصل شہدنا فیہ تھا۔ اس میں بھی حرف جر محذوف ہے اور ظرف مفعول بہ کے قائم مقام ہے۔

سوال: اتنی طویل تقریر کی کیا ضرورت ہے۔

جواب: جب کہا گیا کہ یہ وہ وعدہ ہے جس میں جھوٹ نہیں۔ اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض وعدے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں جھوٹ ہوتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں صدق کے سوا کذب کا امکان تک نہیں۔[1]

ردّ وہابیہ دیوبندیہ

اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب کا احتمال اس لیے نہیں کہ صدق وکذب کا احتمال اس کلام میں ہوتا ہے جس میں واقعہ کے مطابق یا غیر مطابق کی بحث ہو اور یہ انسانی کلام میں ہوتا ہے نہ کہ خالق کے کلام میں کہ جہاں کلام کے واقعہ کے مطابق ہونے کے علاوہ غیر مطابق کا مفہوم پیدا کرنا جہالت وضلالت کے سوا اور کچھ نہیں (جیسے دیوبندیوں وہابیوں کے بیانات فاسدہ سے واضح ہوتا ہے)

تفسیر صوفیانہ

آیت ہذا میں اشارہ ہے کہ قوم نے جو کچھ کیا یہ حقیقت امر سے جہالت کی وجہ سے کیا اس لیے کہ جہالت سے بہت بڑی اور کوئی بیماری نہیں اور دنیا نفس کا مسکن اور قرار گاہ ہے اور اس میں اس کا نفع پانا صرف تین یوم ہے۔ پہلا دن جہالت کا ہے جس میں ان کے چہرے زرد ہوئے۔ دوسرا دن غفلت کا ہے جس میں ان کے چہرے سُرخ ہوئے، اور تیسرا دن قلوب پر مُہر لگنے کا ہے جس میں ان کے چہرے سیاہ ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے لیے سوائے عذاب کے اور کوئی شے باقی نہ رہی۔

سبق

عاقل پر لازم ہے کہ معرفتِ الٰہی سے جہالت اور بیداری سے غفلت کے پردے دل سے ہٹائے اس وقت سے پہلے جبکہ اس پر مہر لگ جائے اس لیے کہ جب کسی کے دل پر مُہر لگ جاتی ہے تو اس کے بعد اس کا علاج مشکل ہو جاتا ہے اس لیے کہ مہر لگنے کے بعد دل علاج کے قابل نہیں رہتی۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

مسئلہ تصوف: جیسے چہرے نارِ جلال سے مختلف رنگ اختیار کر لیتے ہیں ایسے ہی بعض چہرے نورِ جمال سے بھی مختلف رنگ

---

[1] جیسے دیوبندیوں وہابیوں نے سمجھ رکھا ہے کہ کذب تحت امکان باری تعالیٰ ہے۔ (معاذ اللہ)

بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حکایت ملاحظہ ہو۔

حکایت ذوالنون مصریؒ

سیدنا ذوالنون مصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں بصرے کی سڑک پر جا رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز آئی :

یاشفیق یارفیق ارافق بنا۔

اے شفیق رفیق ہمارے ساتھ نرمی کیجئے۔

میں اسی آواز کا تعاقب کرنے لگا۔ آگے جاکر دیکھا کہ ایک نوجوان حسینہ وجمیلہ لڑکی بلا حجاب چہرہ محل کے دریچے سے باہر نکالے بیٹھی ہے میں نے پوچھا : اے خدا کی بندی ! یہ حسین چہرہ بے پردہ کیوں ؟ اس نے جواب دیا : اس چہرے کو پردے کی کیا ضرورت ہے جس پر زردی چڑھ جائے۔ میں نے پوچھا : زردی کس سے ؟ اس نے جواب دیا : حجاب سے۔ میں نے پوچھا : تُو نے شراب تو نہیں پی؟ اس نے جواب دیا : ہاں گزشتہ رات محبت کی شراب کا ایک پیالہ خوشی سے پی لیا تھا، اسی لیے تم مجھے مخمور دیکھ رہے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ تم دانا عورت معلوم ہوتی ہو اس لیے مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ اس نے کہا :

علیك بالسکوت ولزومخد متہ فی ظلم البیوت حتی یتوھم الناس انك مبھوت و ارض من اللہ بالقوت و استعد لیوم موت لکی یبنی لك بیت فی الملکوت اساسا من الزبرجد والیاقوت۔

ترجمہ : خاموشی اختیار کیجئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت نہایت تاریک مکانوں میں کیجئے یہاں تک کہ لوگ کہیں کہ یہ دیوانہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے جو کچھ تھوڑا بہت مل جائے اس پر راضی رہو اور موت کے لیے ہر وقت تیار رہو تاکہ تمہارے لیے ملکوت میں ایسا محل تیار ہو جس کی بنیادیں زبرجد اور یاقوت کی ہیں۔ ؎

روح ہجرں و صالح و تن ناقہ است
روح اندر وصل و تن در فاقہ است
روح صالح قابل آفات نیست
زخم بر ناقہ بود بر ذات نیست
روح صالح قابل آزاد نیست
نور یزداں سبقۂ کفار نیست
جسم خاکی را بدو پیوستہ جان
تا بیازار زناد بیند امتحان

ترجمہ : جسم اونٹنی اور روح صالح (علیہ السلام) ہے۔ روح کو وصال اور جسم کو فاقہ ہے۔ روح صالح

قابل آفات نہیں زخم بھی اونٹنی کے ظاہر پر آئے ذات مستثنیٰ ہے۔ روح صالح قابل آزار نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا نور کفار کے لائق نہیں۔ جسم خاکی کو روح ضروری ہے تاکہ ہر درد و رنج دیکھ آزمائش کیے جا۔ مسکین لوگ آزار سے بیخبر ہیں کیونکہ یہ آزار درحقیقت اسی کا عنایت کردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مٹکے کا پانی اپنا نہیں دریا کا ہے۔ جسم ناقہ کے متولی کا تا بعدار ہو تاکہ تجھے روح صالح کی رفاقت نصیب ہو۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا پس جب ان پر عذاب کے لیے ہمارا حکم آیا نَجَّيْنَا تنجية سے ہے بمعنے نجات دینا۔ یعنی ہم نے نجات دی صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ صالح علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے۔ معهٗ، نجینا یا اٰمنوا کے متعلق ہے۔ یہی دُوسرا زیادہ موزوں ہے کیونکہ یہاں مراد یہی ہے کہ وہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف ایمان لائے اور ان کی اتباع کی۔ اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ ان کے اور صالح علیہ السلام کے ایمان کا ایک زمانہ ہے اس لیے کہ ہمیشہ نبی علیہ السلام کا ایمان اپنی اُمت سے پہلے ہوتا ہے۔ بِرَحْمَةٍ درانحالیکہ تم متلبس ہو عظیم رحمت کے ساتھ مِّنَّا ہماری طرف سے اور ہمارے فضل و کرم سے۔

ف : تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہیں یہ رحمت نصیب نہیں ہوئی۔ یہی اہلسنت کا مذہب ہے۔

تفسیر صُوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ برحمة منا سے اعمال نجات کی توفیق مراد ہے۔ اور الارشاد میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صالح علیہ السلام کی نبوت کی اور امت کو ایمان کی توفیق نصیب ہُوئی۔

تفسیر عالمانہ وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اس کا عطف نجّینا پر ہے۔ یعنی اس دن کی ذلت وخواری اور رسوائی سے بچایا اور جسے اللہ تعالیٰ تباہ و برباد کرے اور اس سے انتقامی کارروائی کرے اس سے بڑھ کر رسوائی اور ذلت و خواری اور کیا ہو سکتی ہے۔

ف : ابن الشیخ نے فرمایا کہ اس سے چونکہ نجات دینے کا اظہار مطلوب تھا اس لیے نجّینا کو مکرر لایا گیا ہے۔ یعنی اس دن کی ذلت وخواری سے۔

ف : یومئذٍ در اصل یوم اذ جاء امرنا تھا۔ اذ جملہ محذوفہ کی طرف مضاف ہے۔ اس کے بالعوض تنوین آئی ہے اس سے وہ ذلت وخواری مراد ہے جو اسی دن ان پر نازل ہوئی اور ان پر ایسی لازم ہُوئی کہ جو کچھ انھیں نصیب ہوا وہ قیامت تک انھیں کی طرف منسوب ہو کر بیان ہوتا رہے گا۔

ف : الخزی ہر وہ عیب کہ جس کی رسوائی ظاہر اور اس کی طرف منسوب ہونے میں عار محسوس ہو۔

قاعدہ : ظرف زمان جب مبنی کی طرف مضاف ہو تو اسے مبنی و معرب دونوں طرح پڑھنا جائز ہے جس نے یومئذٍ کو بفتح المیم پڑھا ہے تو اس کے نزدیک مبنی ہے کیونکہ مبنی یعنی اذ کی طرف مضاف ہے اور وہ اسم غیر متمکن ہے۔ اور جو اسے مکسور پڑھتا ہے اس کے نزدیک معرب ہے اور میم کا مکسور ہونا خزی کے مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

ف : پہلی قرأۃ (یعنی مفتوح المیم ہونا) نافع اور کسائی کی ہے اور دوسری قرأت اوروں کی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ بے شک اے حبیب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا رب تعالیٰ هُوَ الْقَوِیُّ ہر شے پہ قادر ہے الْعَزِیْزُ۝ صرف وہی غالب ہے ہر شے پر نہ کوئی اور۔

ف : کاشفی نے فرمایا کہ وہی اہلِ ایمان کو نجات دینے پر بڑی قدرت رکھتا ہے۔ العزیز وہ دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے پر غالب ہے۔

ربط : چونکہ قبل از وقت اپنے محبوبوں کو خبر دینا بالخصوص انھیں دشمنوں پر نزولِ عذاب سے مطلع کرنا اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے انھیں پہلے کفار کے ہلاک ہونے سے مطلع کر کے اب ان کی تباہی و بربادی کی خبر دی اور فرمایا :

وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا اور پکڑا نفس پر ظلم کرنے والوں کو الصَّیْحَةُ چیخنے و پکارنے سے۔ حضرت جبریل علیہ السلام زور سے چیخے جس سے کفار تباہ و برباد ہو گئے۔ الصیحة ' اخذ کا فاعل ہے اور الذین ' اخذ کا مفعول بہ ہے۔ الصیحة مصدر ہے جو یکبار کرن کا معنیٰ دیتا ہے اور صیحة بمعنے سخت چیخنا۔ صاح یصیح صیاحًا اس کی گردان ہوتی ہے۔ یعنی زور لگا کر آواز دینا۔

ف : سورۂ اعراف میں فاخذ تهم الرجفة ہے بمعنے وہ زلزلہ جو کہ صیحہ کے بعد متصلاً واقع ہوتا ہے۔

ف : کاشفی نے کہا کہ جونہی صالح علیہ السلام نے انھیں عذاب کی خبر دی انھوں نے اپنی قبریں اپنے گھروں میں کھود لیں۔ اور عذاب کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ جب چوتھے روز سورج طلوع ہونے لگا اس وقت عذاب نازل نہ ہوا تو وہ گھروں سے باہر نکل آتے اور ایک دوسرے کو بُلا کر ہنسی مذاق اور صالح علیہ السلام سے استہزاء کرنے لگے۔ دریں اثنا حضرت جبریل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے۔ آپ کے پاؤں زمین پر اور سر آسمان پر تھے۔ پھر اپنے پَر پھیلائے جنھوں نے مشرق و مغرب تک تمام روئے زمین کو ڈھانپ لیا۔ آپ کے پاؤں زرد، بال سبز، دندان مبارک سفید اور چمکیلے، پیشانی نورانی اور روشن چہرہ، سر کے بال سُرخ مرجان کی طرح نمودار ہوئے۔ جسے صالح علیہ السلام کی باغی قوم نے دیکھا تو سخت گھبرائی اور ڈر کے مارے اپنی کھودی ہوئی قبروں میں داخل ہو گئی۔ چونکہ جبریل علیہ السلام روئے زمین پر چھا گئے تھے وہیں کھڑے کھڑے زور سے کہا :

مُوتوا علیکم لعنة الله۔

تم پر اللہ کی لعنت ہو مر جاؤ۔

آپ کے ایک بار کہنے سے سب کافر مر گئے اور ان کے مرنے سے ان کے گھروں کو جھٹکا (زلزلہ) لگا جس سے ان کی چھتیں ان کے اوپر آ گریں۔

فَاَصْبَحُوا پس ہو گئے فِیْ دِیَارِهِمْ اپنے گھروں یا اپنے شہروں میں جٰثِمِیْنَ۝ گھٹنوں کے بل مردہ پڑے ہوئے۔ یعنی مر گئے اور ان میں حس و حرکت بھی نہ تھی۔ جیسے عموماً موت کے وقت ہوتا ہے کہ جونہی کسی پر موت کا حملہ

ہوتا ہے تو اس کے بعد اس میں حس وحرکت نہیں ہوتی۔

ف : اس میں بتانا یہ ہے کہ ان کی بہت جلد گرفت کی گئی۔ (اللھم انا نعوذ بك من حلول غضبك)۔

ف : جٰثمین، جثوم سے مشتق ہے بمعنے منہ کے بل گرنا یا جثوم بمعنے ساکن ہونا اس پرندے (کے لیے اپنے گھونسلے میں گزارتا ہے) کہتے ہیں جثمت اس کے بعد اہل عرب اس شخص کے لیے بولتے ہیں جو مرنے کے بعد ہاتھ پاؤں کو متحرک نہ کرے۔

ف : بحر العلوم میں ہے : رجل جثم اے قعود یعنی چلنے پھرنے سے عاجز یعنی وہ نہایت بے حس وحرکت تھے اور مجثمہ شریعت کا حرام کردہ جانور اسی سے مشتق ہے۔ یعنی ہر وہ جانور جسے باندھ کر ہاتھ پاؤں مضبوطی سے جکڑ دیے جائیں تاکہ اسے کھڑے کھڑے کسی ہتھیار سے مارا جاسکے۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

شحنۂ قہر خدا ایشاں بجست
خونبہائے اشترے شہرے درست
چوں ہمہ در نا امیدی سر زدند
ہمچو اشتر در دو زانو آمدند
در نبی آورد جبریل امین
شرح ایں زانو زدن را جاثمین
زانو آندم زن کہ تعلیمت کنند
وز چنیں زانو زدن بیمت کنند

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کے کوتوال نے اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کے بدلے تمام شہر کو ویران و برباد کر ڈالا۔ جب سب نا امید ہوئے تو تمام کافر اونٹ کی طرح دونوں زانو کے بل گرے۔ نبی علیہ السلام کے ہاں جبریل علیہ السلام نے ان کے گھٹنوں کے بل پڑنے کی خبر دے دی۔ تعلیم وتلقین کے وقت تسلیم مفید ہے عذاب کے نزول کے وقت تسلیم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا گویا وہ اپنے مکانوں میں ٹھہرے بھی نہ تھے یعنی تباہی کے بعد وہ جگہ ایسی ویران معلوم ہوتی تھی کہ گویا وہ لوگ یہاں بسیرا کرتے ہی نہ تھے۔ زندگی کے آثار معدوم ہو چکے تھے۔ گویا وہ جگہ ایسی تباہ ہوئی کہ وہاں کبھی آبادی تھی ہی نہیں۔

ف : المغنی بمعنے المنزل یعنی وہ جگہ جو زندہ لوگوں کے رہنے سہنے کے لیے ہو۔ مثلاً اہل عرب کہتے ہیں :

غنی الرجل بمکان کذا۔ یعنی وہ مرد یہاں مقیم ہوا۔

یا غنی بمعنے عاش یعنی اس نے زندگی بسر کی۔

اَلَاۤ خبردار اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ط بیشک ثمود نے اپنے رب تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا۔ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار کیا۔ یہ آنے والی نسلوں کے لیے تنبیہ و تخویف کے لیے ہے۔ اَلَا بُعْدًا خبردار دوری اور ہلاکت و تباہی ہے لِّثَمُوْدَ ۞ ثمود کی قوم کے لیے۔ بعدًا مصدر ہے فعل کے قائم مقام لایا گیا ہے دراصل بمعنے بعدوا ای هلکوا یعنی ہلاک و برباد ہوئے۔ یہ لام بیانیہ ہے اس میں ان کا بیان ہے جن پر یہ بددعا کی گئی۔

ف: ان کے برباد ہونے کے بعد بددعا کہنے میں اشارہ ہے کہ وہ اس عذاب کے انہی اعمال کی وجہ سے مستحق ہوئے یعنی نبی علیہ السلام کی نافرمانی اور تکذیب کرکے کافر ہوئے۔ بدیں وجہ اسی اجاڑنے والے عذاب کے مستحق ٹھہرے بالخصوص ان کی وہ سنگین غلطی کہ انہوں نے اونٹنی کی کوچیں کاٹیں۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حجر مقام پر اُترے تو آپ نے کھڑے ہوتے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوتے کہا کہ اے لوگو! اپنے نبی علیہ السلام سے معجزات کا سوال نہ کیا کرو کیونکہ یہاں پر صالح علیہ السلام کی قوم نے آپ سے معجزہ طلب کیا کہ ان کے لیے پتھر سے اُونٹنی نکالیں۔ آپ نے اونٹنی پتھر سے نکال دکھائی۔ وہ اونٹنی یہاں سے آتی اور اپنی باری میں تمام پانی پی جاتی اور وہ اس سے اتنا دُودھ حاصل کر لیتے جتنا ان کے ناغہ کے دن پانی پی لیتی تھی۔ اس پر انہوں نے اپنے رب تعالیٰ کے حکم پر بغاوت کی تو صالح علیہ السلام نے انھیں فرمایا:

تمتعوا فی دارکم ثلاثة ایام۔

اپنے گھروں میں تین دن گزار لو۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ان پر سخت آواز آئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مشرق و مغرب تک ان کی برادری کے سب لوگوں کو نیست و نابود کر دیا۔ ان کا صرف ایک آدمی بچ گیا جو حرم شریف میں تھا وہ حرم شریف کی برکت سے بچ گیا۔ اس کا نام ابو رغال تھا۔ عرض کی گئی: یا حضرت! ابو رغال کون تھا۔ آپ نے فرمایا: ابو ثقیف۔

تفسیر صوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس اور اس کے تمام صفات مٹا ڈالے جبکہ وہ ایمان نہ لائے۔ ہاں اگر وہ حرم شریعت سے پناہ لے تو وہ ہجر و فراق کے عذاب سے نجات پا جاتا ہے۔ پھر جس قدر وہ حرم شرع سے پناہ مانگتا ہے اسی قدر اسے قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔ قربِ الٰہی سے جنت مراد ہے اسی لیے نفس مطمئنہ سے فرمایا:

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

میرے بندوں میں داخل ہو کر میری بہشت میں داخل ہو جا۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

ف: قرب و بُعد اور راہِ حق پہ چلنے اور نہ چلنے والے کئی قسم ہیں:

۱۔ ازل سے ہی انھیں اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہُوا۔ اُنھیں جدوجہد کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت سے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی پر نگاہ نہیں رکھتا۔

۲۔ ان کو اغیار اللہ تعالیٰ سے دُور ہٹا لیتے ہیں، لیکن جد وجہد سے علاج کر کے دل سے غیر کا تصور ختم کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سوائے حق کے کچھ باقی نہیں رہتا۔

۳۔ بعض وہ ہوتے ہیں جو راہِ حق پر چلتے تو ہیں لیکن منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ ان کی تخلیق مراد تک پہنچنے کی برداشت نہیں رکھتی۔

۴۔ ان میں وہ بھی ہیں جنھیں معلوم نہیں کہ طریق کیا ہے، اس کے حصول کا کیا معنیٰ ہے۔ وہ اپنے مقام طبعی میں رہتا ہے۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا:

ے

قومے بجد و جہد خریدند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بتقدیر می کنند

ترجمہ: بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو وصل دوست کے لیے جد وجہد کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنے امور تقدیر کے حوالے کرتے ہیں۔

اس شعر میں پہلے لوگوں کا استدلال والذین فینا جاھدوا لنھدینھم سبلنا یعنی جو لوگ ہمارے وصال کے لیے مجاہدہ کرتے ہیں انھیں ہم اپنی راہ دکھائیں گے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ حصول وصال میں جدوجہد کو دخل ہے جیسے وزارت جدوجہد اور اسباب کے استعمال سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ایسے ہی دُوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے وصال سے نوازے۔ اس میں علم و عمل کو کوئی تعلق نہیں۔ یہ سلطنت کی طرح ہے اور سلطنت اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔

کما قال تعالیٰ:

قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء۔

اور فرمایا:

یؤتی الحکمۃ من یشاء۔

مزید فرمایا:

وما یمسک فلا مرسل لہ۔

یہی ہمارے دل پر راز کھلا ہے۔ واللہ اعلم

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ط قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ
حَنِيْذٍ ○ فَلَمَّا رَاٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ط قَالُوْا لَا تَخَفْ
إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ○ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِإِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ إِسْحٰقَ
يَعْقُوْبَ ○ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰىٓ ءَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ط إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ○
قَالُوْٓا أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ ط إِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○
فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ○ إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ
أَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ يٰٓإِبْرٰهِيْمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ج إِنَّهٗ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ ج وَإِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ
غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ○ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ○
وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ إِلَيْهِ ط وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ط قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ
أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ط أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ○ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ
مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ج وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ○ قَالَ لَوْ أَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً أَوْ اٰوِيْٓ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ
قَالُوْا يٰلُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ
إِلَّا امْرَاَتَكَ ط إِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ أَصَابَهُمْ ط إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ط أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ○
فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ لا مَّنْضُوْدٍ لا مُّسَوَّمَةً
عِنْدَ رَبِّكَ ط وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ○

ترجمہ: بیشک ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے ہاں خوشخبری لے کر آئے کہا سلامتی ہو اس نے فرمایا
سلامتی ہو پھر کچھ دیر نہ ٹھہرے کہ ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں پہنچتے تو انھیں
اجنبی سمجھا اور ان سے دل میں خوف محسوس کیا انہوں نے کہا مت گھبرایئے ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں اور اس کی
بی بی کھڑی تھی وہ ہنسی تو ہم نے اسے اسحاق (علیہ السلام) اور اس کے پیچھے یعقوب (علیہ السلام) کی خوشخبری دی کہا
واہ! کیا میں بھی بچہ جنوں گی حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ ہیں میرے شوہر بوڑھے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے
فرمایا کیا اللہ کے حکم پر تعجب کرتے ہو۔ اے اہل بیت تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں بیشک وہی ہے تمام خوبیوں اور بزرگیوں
والا۔ جب ابراہیم علیہ السلام سے خوف ہٹ گیا اور اسے خوشخبری ملی تو قوم لوط (علیہ السلام) کے متعلق جھگڑنے لگا بے شک
ابراہیم علیہ السلام بُردبار بہت آہیں بھرنے والا رجوع کرنے والا تھا۔ اے ابراہیم (علیہ السلام) اس ارادہ کو ترک کر دو
یقیناً تیرے رب کا حکم آ گیا ہے اور ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آنے والا ہے۔ اور جب لوط (علیہ السلام) کے ہاں ہمارے

فرشتے آئے تو وہ ان کی وجہ سے مغموم اور دلتنگ ہوا اور فرمایا یہ دن بڑا سخت ہے اس کے پاس اس کی قوم دوڑتی ہوئی آئی اور وہ پہلے سے ہی بُرا کام کرتے تھے فرمایا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے سب سے بڑھ کر پاکیزہ ہیں سو اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی بھی نیک چلن آدمی نہیں ہے کافروں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں اور تو خوب جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ فرمایا کاش مجھے تمہارے ساتھ مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارا کی پناہ لیتا فرشتوں نے کہا اے لوط (علیہ السلام) ہم آپ کے رب کے رسول ہیں وہ (کافر) آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے تو آپ اپنے گھر والوں کو رات کے ایک حصے میں باہر لے جائیے اور تم میں کوئی ایک پیچھے مڑ کر نہ دیکھے سوائے آپ کی عورت کے یقیناً اسے وہی مصیبت پہنچنی ہے جو انہیں پہنچے گی بیشک ان کا مقررہ وعدہ صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں۔ جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس بستی کو تہہ و بالا کر دیا اور اس پر کنکر کے پتھر لگاتار برسائے جو نشان لگاتے ہوئے تیرے رب کے ہاں ہیں اور وہ پتھر ظالموں سے کچھ دُور نہیں۔

تفسیر عالمانہ وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِيْمَ بخدا ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے یہ آنے والے جبریل علیہ السلام اور چند دیگر فرشتے تھے جو بے ریش حسین و جمیل لڑکوں کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے بِالْبُشْرٰى خوشخبری لے کر۔ یعنی بی بی سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے صاحبزادے کی پیدائش کی خبر لائے۔

سوال: بچے کی پیدائش کی خوشخبری کا اضافہ تم نے کیوں کیا ہے۔

جواب: اسے دوسرے مقام پر اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

فبشرنا باسحٰق۔

یہاں مطلق ہے وہاں مقید۔ اور قاعدہ ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔

قَالُوْا یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔ یعنی انہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے عرض کیا سَلٰمًا السلام علیکم۔ یعنی ہم نے آپ کے لیے سلامتی کی دعا کی یا ہم آپ کو شرعی سلام عرض کرتے ہیں۔ قَالَ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: سَلٰمٌ تم پر سلام ہو۔ یعنی ان کے سلام کا جواب احسن طریق سے دیا۔ قاعدہ ہے کہ جملہ فعلیہ حدوث و تجدد پر اور جملہ اسمیہ ثبات و استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

ف: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ کوئی مہمان ہیں آپ نے فرمایا انہیں مہمان خانے میں بٹھا دو۔

فَمَا لَبِثَ پس نہ ٹھہرے ابراہیم علیہ السلام اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ○ یہ کہ بھنا ہوا گائے کے بچھڑے کا گوشت لے آئے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے جلدی سے بچھڑا ذبح کر کے فوراً پتھر پر گرم کر لیا۔

ف : حنیذ تنور کے بغیر زمین میں پڑے ہوئے پتھر پر آگ کے بغیر بُھنا ہوا گوشت۔ جیسے بادیہ نشین لوگوں کا طریقہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں گرم پتھر پر گوشت پکاتے ہیں۔

ف : کواشی میں ہے کہ حنیذ ، گڑھے میں ایسے طور پر گوشت پکانا کہ اس سے چربی گرنے لگے۔ حنذت الفرس یعنی گھوڑے پر پردہ ڈالا گیا تو وہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ قالوا سلٰما یعنی ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی سلام قولا من رب رحیم پہنچاتے ہیں۔ قال سلٰم آپ نے فرمایا ہمارے اوپر رب جلیل کی جانب سے سلام ہو۔ یہ وہی طریقہ ہے جو حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب اسریٰ اختیار فرمایا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

السلام علیك ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

اس پر حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی :

السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین۔

حبیب وخلیل علیہما السلام کے دونوں سلاموں میں فرق یہ ہے کہ حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بلاواسطہ ہے اور خلیل علیہ السلام کا سلام بواسطۂ ملائکہ کرام علیہم السلام ہے اور حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے سلام میں منجانب اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کا اضافہ ہے اور خلیل علیہ السلام کے سلام میں یہ الفاظ ہیں :

فما لبث ان جاء بعجل حنیذ۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلام اور ملائکہ کرام کے اعزاز میں فرمایا ہے۔

س

قاصد دلبر کہ آرد یک پیام

از حبیب من کہ آمد یک سلام

مژدگانہ مال و جانم مے دہم

ہر چہ میدارم بر اہش می نہم

ترجمہ : دلبر کا قاصد اگر صرف دلبر کا ایک پیغام لائے یا محبوب سے صرف ایک بار سلام پہنچے تو اس کی خوشی میں جان و مال بلکہ جو کچھ میرے ہاتھ میں ہوگا سب کچھ اس کی راہ میں نچھاور کر دوں گا۔

لہ اس تقریر سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم تھا کہ یہ آنے والے مہمان ملائکہ کرام ہیں لیکن وہابی دیوبندی کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو علم نہ تھا کہ یہ کون ہیں۔ تفصیل فقیر کی تفسیر اویسی میں دیکھیے۔ ۱۲

ف : حضرت ابراہیم علیہ السلام اس لیے گائے کا بچھڑا لائے کہ آپ کے ہاں یہی جانور زیادہ تھے ۔
ربط : ابراہیم علیہ السلام گوشت پکا کر کھانا لاکر ان مہمانوں کے آگے رکھا تو مہمانوں نے کھانے سے اپنے ہاتھ کھینچ لیے ۔

تفسیر عالمانہ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْہِ پس جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان مہمانوں کے ہاتھ طعام کی طرف نہیں جارہے ۔ یعنی وہ کھانے کے لیے گوشت اور طعام کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے نَکِرَھُمْ آپ نے انھیں اجنبی سمجھا یعنی محسوس کیا گیا کہ یہ اجنبی ہیں ۔ لیکن طعام نہ کھانے اور اس سے رُک جانے کا سبب معلوم نہیں ہو رہا تھا وَاَوْجَسَ ایجاس سے ہے بمعنے الادراک ۔ تہذیب اللغات میں ہے کہ اوجس بمعنے دل میں خوف محسوس کرنا ۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دل میں محسوس فرمایا مِنْھُمْ اُن کی طرف سے خِیْفَۃً خوف ، جبکہ سمجھ لیا کہ یہ تو فرشتے ہیں اور ان کا نزول یا تو میرے اُوپر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے لیے ہوا ہے یا کسی قوم پر عذاب کے لیے ۔

ردّ وہابیہ و دیوبندیہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ :

ماکان خوف ابراھیم علیہ السلام خوف البشریہ ما خاف علیٰ نفسہ فانہ حین رمی بالمنجنیق الی النار ما خاف علیٰ نفسہ وقال اسلمت لرب العٰلمین و انما کان خوفہ خوف الرحمۃ و الشفقۃ علیٰ قومہ یدل علیہ قالوا لا تخف[1] الخ

ترجمہ : حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خوف بشریت کا اور اپنے لیے نہیں تھا اس لیے کہ وہ نار میں فلاخن کے ذریعے ڈالے گئے تو بھی نہ ڈرے ۔ یہاں انھیں خوف اگر ہُوا تو صرف اپنی اُمت کے لیے ، اور وہ بھی بہ بنائے رحمت و شفقت ۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ ملائکہ کرام نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا آپ خوف نہ کیجئے ہم عذاب دے کر بھیجے گئے ہیں اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ؕ لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف ۔ یعنی ہم صرف لوط علیہ السلام کی قوم کو عذاب دینے آئے ہیں ، ہمیں آپ کی قوم سے کوئی سروکار نہیں فلہٰذا آپ مطمئن رہیے ۔
ف : حضرت لوط علیہ السلام بی بی سارہ کے بھائی یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے ۔
وَامْرَاَتُہٗ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ مکرمہ بی بی سارہ بنت ہاران بن ناخور یہ آپ کے چچا کی لڑکی تھیں قَآئِمَۃٌ کھڑی تھیں ۔

---

[1] اس سے ثابت ہُوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خوف اُمت کے لیے تھا لیکن وہابی دیوبندی جو کہتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے ۔ تفصیل تفسیر اویسی میں دیکھیے ۔

سوال : بی بی صاحبہ یہاں کیسے کھڑی تھیں انھیں تو پردہ میں رہنا چاہیے تھا۔
جواب : مہمان خانہ گھر کے بالکل قریب تھا اسی لیے بی بی صاحبہ نے ملائکہ اور ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو بلا تکلف سن لی ہوگی۔
۲۔ بی بی صاحبہ کا پردہ تھا ہی نہیں۔ جیسا کہ عام دیہاتوں میں بادیہ نشین عورتیں بلا حجاب رہتی ہیں اور مہمان نوازی میں شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ بی بی صاحبہ بھی اسی دستور کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھیں۔
۳۔ بی بی صاحبہ بوڑھی تھیں اور ان کی شریعت میں پردہ کا حکم بھی نہیں تھا اور چونکہ مہمان نوازی دین کا بہترین عمل ہے اس کے پیشِ نظر بی بی صاحبہ مہمان خانے میں موجود تھیں۔ اور ملائکہ کرام و ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو سن رہی تھیں۔
یہ جملہ قالوا کی ضمیر هم سے حال ہے۔ عبارت یوں ہوگی : قالوا لا تخف فی حال قیام امرأته۔
فَضَحِكَتْ خوف کے زوال سے خوش ہو کر بی بی صاحبہ ہنسیں فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ پس ہم نے انھیں اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری سنائی۔ یعنی انھیں پہلی خوشی سے اور بہت زیادہ خوشی ملائکہ کرام کی زبان سے سنائی۔
ف : اسحٰق عبرانی لغت میں ضحاک (بہت زیادہ ہنسنے والے) کو کہتے ہیں۔
وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ وراء بروزن فعال لام کے مقابلہ ہمزہ ہے یعنی یہ مہموز اللام ہے اور ابوعلی فارسی بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن عام صرفی کہتے ہیں کہ یہ ناقص یائی ہے لام کے مقابلہ میں یاء ہے اور اسے ہمزہ سے تبدیل کیا گیا ہے یہ ظروف مکان سے ہے بمعنے خلف و قدام از قبیل اضداد ہے یعنی ہر دو نقیضوں کا معنیٰ پایا جاتا ہے یعنے پیچھے اور آگے۔ کبھی یہ ظرف زمان کے معنے میں استعارۃً بھی آتا ہے۔ جیسے یہاں پر ظرف زمان استعمال ہوا ہے۔ یعنی بی بی سارہ کو اسحاق کے بعد عطا فرمایا یَعْقُوْبَ ○ یعقوب (علیہ السلام) یہ عطف الجملۃ علی الجملۃ کے قبیل سے ہے۔ اس معنے پر یعقوب علیہ السلام مبشر بہ ہیں۔
ف : تبیان میں لکھا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کرام نے بی بی سارہ سے کہا کہ تم سے اسحاق علیہ السلام پیدا ہوں گے اور وہ جوان ہو کر شادی کریں گے ان سے یعقوب علیہ السلام پیدا ہوں گے۔ آپ کو نہ صرف صاحبزادے کی خوشخبری دی جا رہی ہے بلکہ آپ اپنی زندگی میں پوتے یعقوب علیہ السلام کو بھی دیکھو گی۔ اس کے بعد آپ کی موت واقع ہوگی۔
ف : ممکن ہے کہ بشارت میں دونوں باپ بیٹے کا نام (اسحاق و یعقوب علیہما السلام) رکھ کر خوشخبری دی گئی ہو جیسے یحییٰ علیہ السلام کے لیے ہوا کہ پیدائش کی خوشخبری کے ساتھ ان کا نام بھی رکھا گیا۔ کما قال تعالیٰ :
انا نبشرك بغلام اسمهٗ یحییٰ۔
اور یہ بھی ممکن ہے کہ حکائی طور انھیں اس وقت انہی ناموں سے یاد کیا گیا۔ پھر جب پیدا ہوئے تو انہی اسماء سے موسوم ہوئے۔
سوال : بی بی سارہ کو بچے کی خوشخبری دینے کا کیا معنیٰ جبکہ اس کے مستحق تو حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے انھیں خوشخبری سنانا زیادہ مناسب تھی کیونکہ شوہر اصل ہوتا ہے اور عورت اس کی تابع۔
جواب : ۱۔ جس بچے کی خوشخبری دی جا رہی ہے وہ اسی بی بی سارہ سے پیدا ہوگا نہ کسی دوسری بی بی سے۔

۲۔ بی بی صاحبہ بوڑھی ہو چکی تھیں۔ سنِ یاس کو پہنچ چکی تھیں کہ ان سے بچے کی پیدائش کے ظاہری اسباب منقطع ہو چکے تھے۔ جسے بانجھ کہا جاتا ہے اسی کیفیت کی حامل تھیں لیکن تاحال نرینہ اولاد کی متمنی تھیں اسی لیے انھیں زیادہ خوش کرنا مطلوب تھا ورنہ ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے دُوسری بی بی ہاجرہ سے تو پہلے موجود تھے انھیں چنداں اولاد کی خواہش نہ تھی۔

۳۔ بچے کی پیدائش سے عورتوں کو زیادہ فرحت اور خوشی ہوتی ہے۔ بنابریں بشارت کی نسبت بی بی سارہ کی طرف کی گئی۔ اگرچہ ابراہیم علیہ السلام اصل تھے لیکن اہمیت بی بی صاحبہ کے لیے تھی۔

ف: حضرت ابن عباس اور وہب فرماتے ہیں کہ بی بی کا ہنسنا بہ بنائے تعجب تھا کہ بڑھاپے میں اسے بچے کی بشارت کیسی اور نہ صرف خود کبیر السن تھیں بلکہ ان کے شوہر نامدار حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بوڑھے تھے۔ اس معنے پر آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: وامرأته قائمة فبشرنٰها باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب فضحکت۔ (کذافی البحر العلوم وتفسیر ابی اللیث)

تفسیر صُوفیانہ اور بیانِ شانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس بشارت کا تعلق نہ تو بی بی سارہ کی بشریت سے ہے نہ آپ کی حیوانیت سے اور نہ ہی آپ کو بیٹے کی پیدائش سے کسی قسم کی خوشی تھی کیونکہ اولاد دنیوی زیب وزینت سے تعلق رکھتی ہے البتہ آپ کی خوشی اپنی قوم کے عذاب سے نجات پا جانے کی وجہ سے ہے اور انھیں ان کے بیٹے اسحاق اور ان کے بعد یعقوب علیہما السلام کی نبوت کی بشارت دی گئی اور نبوت نہ صرف یعقوب علیہ السلام تک محدود رہے گی بلکہ خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک نبوت ان کے خاندان میں ہوگی۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بی بی سارہ سے نہیں حضرت اسماعیل بن ہاجرہ کی اولاد سے ہیں۔

ف: کاشفی نے بالبشرٰی کے تحت اپنی تفسیر میں لکھا کہ حقائق میں مروی ہے کہ یہ بشرٰی (خوشخبری) حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہورِ مبارک کے متعلق تھی کہ اے ابراہیم (علیہ السلام)! تمھیں بشارت ہو کہ وہ سید الانبیاء شہِ ہر دوسرا حبیبِ کبریا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری پشتِ مبارک سے ظہور پذیر ہوں گے وہی خاتم الانبیاء اور صاحبِ لواء الحمد ہوں گے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

نکتہ: بشارت کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر پدر خلیل ہیں تو پسر بھی حبیبِ ربِ جلیل ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

ے

خوش وقت آں پدر کہ چنیں باشدش پسر
شاباش ازاں صدف کہ چنیں پرورد گہر
آباء ازو مکرم و ابنا ازو عزیز
صلوا علیہ ما طلع الشمس والقمر

ترجمہ : اس باپ کو اس سے زاید اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ اسے گوہر پیدا کرنے والے صدف جیسا بچہ نصیب ہو۔ اور جس سے آباء کو عزت اور ابنا کو شفقت میسر ہو۔ اس پر ہمیشہ ہمیشہ درود وسلام جب تک سورج اور چاند چمکتے رہیں۔

قَالَتْ یہ سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ:

جب بی بی کو خوشخبری سُنائی گئی تو اس نے کیا کہا؟

اس کے جواب میں فرمایا:

بی بی نے کہا یٰوَیْلَتٰی۔ یہ دراصل یا ویلتی تھا۔ یاء کو الف سے اور تاء کی کسرہ فتحہ سے تبدیل کی گئی ہے کیونکہ الف بہ نسبت کسرہ کے فتحہ کے ساتھ زیادہ خفیف ہے۔ دراصل یہ کلمہ شر کے وقت بولا جاتا ہے کیونکہ جب کوئی بولتا ہے: ویلتہ۔ تو اس سے وہ ہلاکت مراد لیتا ہے۔ گویا وہ اسے کہتا ہے: آجا اب تیری حاضری کا وقت ہے۔ پھر ہر عجیب امر پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ جیسے کہتے ہیں:

یا سبحان اللّٰہ۔

یہ بھی عجیب امر پر بولا جاتا ہے۔ یہاں بھی عجیب بات سُن کر بی بی نے کہا:

یا ویلتی۔ ہائے خرابی۔

ف: سعدی مفتی نے فرمایا کہ یہ کلمہ دراصل خرابی کی دعا کے لیے آتا ہے۔ درد وغیرہ کے اظہار کے لیے جبکہ کسی مکروہ شے کی شدت سے نفس کو اکساہٹ پیدا ہو۔ لیکن یہ اس وقت تعجب کے وقت بولا جاتا ہے جو نفس کو اکسائے۔

ءَ اَلِدُ کیا میں بچہ جنوں گی وَ اَنَا عَجُوْزٌ اور میں بوڑھی ہوں نوے یا ننانوے سال کی۔ کیونکہ پہلے بچہ پیدا نہیں ہوا۔

وَ هٰذَا اور یہ جسے تم دیکھ رہے ہو بَعْلِیْ میرا شوہر نامدار۔ دراصل بعل اس شخص کو کہتے ہیں جو جملہ امور کا انتظام سنبھالے شَیْخًا بوڑھا ایک سو یا ایک سو بیس سال کا ہے۔ یہ حال ہے اور اس کا عامل ھذا کا معنیٰ یعنی اشیر ہے۔

ف: کواشی میں ہے کہ یہ اشارہ معہود فی الذہن کی طرف ہے۔ یعنی میرا وُہ شوہر جو تمہیں معلوم ہے وہی معلوم شخص بوڑھا میرا شوہر ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا کہ وہ بوڑھا ہے۔

سوال: معہود فی الذھن کی طرف اشارہ کرنے کا کیا فائدہ؟

جواب: چونکہ ملائکہ کرام کے ہاں معروف تھا کہ ابراہیم علیہ السلام بی بی سارہ کے شوہر ہیں اسی لیے ان کی طرف اشارہ کرنے میں وہی معروف حیثیت مراد ہے۔ اگر صرف شخصیت مراد ہے تو معنیٰ یہ ہوگا کہ یہ میرے (بحالت شیخوخت) شوہر ہیں حالانکہ یہ غلط ہے اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام بی بی سارہ کے بحالت شیخوخت شوہر نہیں تھے بلکہ وُہ جوانی میں بھی اس کے شوہر تھے۔ اس کی مثال ھذا زید قائما اگر اس میں زید معروف کی طرف اشارہ ہے تو معنیٰ یہ ہو جائے گا کہ وہ صرف بحالتِ قیام زید ہے۔ اگر قیام سے قعود

یا کوئی دوسری حالت اختیار کرے تو وہ زید نہ رہے۔ یہ بالکل نادرست ہے۔ جیسے یہ نادرست ہے وہ بھی ایسے ہی کہ بی بی کا مشارٌ الیہ معہود فی الذہن ہے یعنی معروف شخصیت عند الملائکہ۔

سوال: بی بی نے اپنے بڑھاپے کا ذکر پہلے اور شوہر کے بڑھاپے کا ذکر بعد میں کیوں کیا؟

جواب: تاکہ معلوم ہو کہ عورت اور مرد کے بڑھاپے میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ یہ کہ بوڑھے شوہر کی نوجوان عورت سے تو بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن بوڑھی عورت کے نوجوان شوہر سے بچے پیدا نہیں ہوتے۔

اِنَّ هٰذَا بے شک ہمارے جیسے بوڑھوں سے بچوں کا پیدا ہونا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ○ ایک عجیب شے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ وہ بندوں کے لیے بڑھاپے میں اولاد پیدا نہیں کرتا۔

سوال: بی بی صاحبہ کا عقیدہ ہم سے تو زیادہ پختہ تھا وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیوں متعجب ہوئیں؟

جواب: اپنے اُوپر ایک عظیم نعمت سے متعجب ہُوئیں کہ وہ بوجہ ضُعف بچہ جننے کے قابل نہ تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ان پر اس قدر فضل ہو رہا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تعجب کیا۔ یہ تو کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جہالت کا اظہار تو ایک عام مومن بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ایک ولیہ کاملہ۔

قَالُوْٓا بی بی کی بات کاٹ کر فرشتوں نے کہا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ کیا اللہ تعالیٰ کے امر ایجاد سے تعجب کرتی ہو وہ تو بہت بڑی قدرت کا مالک ہے وہ تم جیسی بوڑھی کو بچہ عنایت فرما سکتا ہے۔

ف: کاشفی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کیا تعجب، وہ تو اپنی قدرت سے سبب کے بغیر اور اپنے فضل سے علت کے سوا دو بوڑھوں سے بچہ پیدا فرما سکتا ہے۔ ؎

قدرتے را کہ بر کمال بود
کہ چنینہا ازو محال بود

ترجمہ: کمال قدرت والے سے ایسے امور محال نہیں۔

حکایت جبریل علیہ السلام

سعدی مفتی نے فرمایا کہ بی بی سارہ کے سامنے جبریل علیہ السلام نے ایک خشک لکڑی اٹھائی اور اسے اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان گھسایا تو ہرا بھرا درخت پیدا ہو گیا۔ بی بی صاحبہ نے سمجھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔

ف: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ جیسے عوام کے لیے اللہ تعالیٰ کا طریقہ جاری ہے کہ ان کے امور اسی طریقہ کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایسے ہی خواص کے لیے بھی اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس سے اپنی خاص نشانی کا اظہار اور اپنی قدرت کا اعجاز دکھاتا ہے۔ اسی لیے اسے سارہ! تم خواص سے ہو، اسی لیے تمہارے سے اولاد کی پیدائش اس کی قدرت کا اعجاز ہوگا جیسے بی بی حنہ یعنی عمران کی گھر والی کہ وہ بھی بالکل بوڑھی تھیں، بچہ جننے کے لائق نہیں تھیں لیکن بی بی مریم ان سے پیدا ہوئیں۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گزرا۔

ف : جب بچے کا جننا ایسے بوڑھوں کے لیے اعجاز ہے، ایسے ہی انھیں اگرچہ حیض نہیں آتا، لیکن ایسے سن بڑھاپے میں حیض آ بھی جاتا ہے یہ بھی اعجاز پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے ضحکت بمعنے حاضت کیا ہے۔

اعجوبہ جب حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو سُولی پر لٹکایا تو آپ کی والدہ ماجدہ بی بی اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما تشریف لائیں۔ جب انہوں نے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھا تو باوجود بڑھاپے کے ان کو حیض جاری ہوگیا حالانکہ اس وقت بی بی کی عمر سو سال تھی اور آپ کے پستانوں سے دُودھ جاری ہوگیا اور فرمایا کہ اس کی جراگاہ اس پر شفقت کر رہی ہے اور اس کی دُودھ پینے کی جگہ دُودھ بہا رہی ہے۔

رَحْمَتُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی رحمت جو ہر شئے کو محیط ہے بلکہ ہر خیر پر وہ سبقت رکھتی ہے وَبَرَكٰتُهٗ اور اس کی برکتیں، یعنی ہر طرح کی بے شمار خیراتیں منجملہ ان کی اولاد کا عطیہ عَلَيْكُمْ رحمتیں اور برکتیں تمہارے لیے لازم ہیں کہ تم سے جدا نہیں ہوں گی۔ اَهْلَ الْبَيْتِ ط اے اہلِ بیت! اللہ تعالیٰ تمہارے لیے خاص فرماتا ہے ایسی برکتیں اور رحمتیں۔ پھر اس سے تعجب کیسا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ بعض نے کہا یہ خبر ہے اور یہی اظہر ہے۔ بعض نے کہا یہ دعا ہے۔ بعض نے کہا کہ رحمت سے نبوت اور برکات سے بنی اسرائیل کی اسباط مراد ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے تمام انبیاء علیہم السلام ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے قصہ میں گزرا تحت آیت قیل ینوح اھبط بسلٰم منا وبرکات علیك۔ اِنَّهٗ بے شک اللہ تعالیٰ حَمِيْدٌ حمید ہے یعنی تمام محامد کا مستحق۔ ہے مَّجِيْدٌ ○ اپنے بندوں پر بہت زیادہ خیر اور احسان فرماتا ہے بالخصوص نبوت کے گھرانے کو اپنی برکات کا مرکز بناتا ہے۔

ف : تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بطریقۂ عام اور قدرت عامہ سے جو کام کرتا ہے اسی وجہ سے حمد کیا ہوا ہے۔ مجید وہ ہے جو عوام و خواص پر انعام کی وجہ سے حمد کا مستحق ہے اہلِ عرب میں مجد سقہ کلام کو چاہتا ہے۔

ف : ابن الشیخ نے فرمایا المجد بمعنے الکرم اور مجید اسی کا صیغۂ مبالغہ ہے۔

ف : امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : المجید بمعنے شریف الذات وجمیل الافعال کہ جس کا انعام و عطا جزیل ہے۔ جس شریف الذات کے افعال جمیل ہوں اسے مجید کہا جاتا ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ جب ابراہیم علیہ السلام کا خوف زائل ہوا اور وہ گھبراہٹ دُور ہوگئی جو فرشتوں کے طعام نہ کھانے سے ہوئی تھی اور آپ کو ان کی حقیقت ملکیہ کے عرفان سے پورا اطمینان ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ وہ کس لیے آئے ہیں۔
وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى اور اپنی قوم کی نجات کے متعلق بشارت ملی۔ چنانچہ فرشتوں نے کہا قالوا لا تخف انا ارسلنا الی قوم لوط ملائکہ نے کہا کہ آپ نہ گھبرایئے ہم کو لوط علیہ السلام کی قوم کے لیے بھیجا گیا ہے اور آپ کو اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دینے کے لیے۔ چنانچہ فرشتوں نے کہا فبشرنھا باسحٰق یعنی ہم نے سارہ بی بی اور ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی۔

سوال : آیت میں صرف بی بی کا نام ہے تم نے ابراہیم علیہ السلام کا کیوں اضافہ کیا :
جواب : چونکہ بشارت دراصل ابراہیم علیہ السلام کو تھی ۔ چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا :

فبشرنٰہ بغلام حلیم اور ہم نے اسے حوصلہ والے صاحبزادے کی خوشخبری دی ۔

بی بی بشارت میں تابع تھیں لیکن چند وجوہ سے اس کا نام لیا گیا اور وہ وجوہ ہم نے پہلے عرض کر دیے ہیں ۔

یُجَادِلُنَا ہمارے ملائکہ کے ساتھ جھگڑتے تھے ۔

سوال : آیت میں ملائکہ کا نام نہیں تم نے کہاں سے نکال لیا ۔
جواب : سورۂ عنکبوت میں ملائکہ کے نام کی تصریح کی گئی ہے ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے ۔
سوال : لما کا جواب ماضی میں ہونا چاہیے تھا یہاں مضارع یجادلنا کیوں ۔
جواب : جس واقعہ کا وقوع یقینی ہو اس کے لیے مضارع علی سبیل الحکایت الماضیہ لایا جاتا ہے

فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ؕ لوط علیہ السلام کی قوم سے عذاب اٹھ جانے کے متعلق ۔

سوال ؛ جھگڑا کرنا بری بات ہے اور پھر ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے ۔
جواب : یہ وہ جھگڑا نہیں جو ایک قوی ضعیف سے یا ضعیف قوی سے کرتا ہے بلکہ محتاج فقیر کا کریم غنی کے ساتھ ہے ۔ اور جھگڑا بھی حرفی نہیں بلکہ رحمت اور لطف و کرم کا ہے اور وہ بھی دوسرے غریبوں ، محتاجوں اور مسکینوں کے لیے ، کیونکہ لوط علیہ السلام آپ کے بھتیجے تھے اس لیے کہ وہ آذر بن آزر اور ابراہیم بن آزر تھے ۔ بعض روایتوں میں ہے کہ لوط علیہ السلام آپ کے چچیرے بھائی تھے اور بی بی سارہ لوط علیہ السلام کی بہن تھیں ۔ اسی روایت میں لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے سالے بنتے ہیں ۔

جب ابراہیم علیہ السلام اور بی بی سارہ نے فرشتوں سے سنا کہ :

جھگڑے کا موجب

انا مھلکوا اھل ھذہ القریۃ ۔ ہم اس بستی کو تباہ و برباد کرنے آئے ہیں ۔

تو وہ دونوں مغموم ہوئے کیونکہ اس بستی میں حضرت لوط علیہ السلام رہتے تھے ۔ پھر وہ دونوں فرشتوں سے سوالات کرنے لگے ۔ مثلاً فرشتوں سے فرمایا کہ جس بستی میں پچاس مومن دیندار رہتے ہوں اسے تباہ و برباد کر دو گے ؟ انھوں نے کہا : نہیں ۔ پھر آپ نے پوچھا : اگر چالیس ہوں ۔ تو انہوں نے کہا : نہیں ۔ پھر سوال کیا اگر تیس ہوں ۔ تو انہوں نے کہا : نہیں ۔ پھر سوال کیا : اگر پانچ ہوں ۔ تو انھوں نے کہا : نہیں ۔ پھر کہا : اگر ایک ہو ۔ تو انہوں نے کہا : نہیں ۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہے ہم لوط علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کو نجات دیں گے ۔

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَحَلِیْمٌ بے شک ابراہیم علیہ السلام باحوصلہ اور برائی کرنے والے سے جلدی سے انتقام لینے والے نہیں تھے اَوَّاہٌ گناہوں اور غلطیوں سے بہت زیادہ آہ کرنے والے اور لوگوں کی وجہ سے بہت زیادہ آہ کرنے والے اور لوگوں کی وجہ سے بہت زیادہ افسوس کرنے والے تھے ۔

ف : ربیع الابرار میں ہے کہ : التاوہ بمعنے نبطیہ لغت سے ملتا جلتا ہے۔

مُّنِيبٌ ○ محبت اور رضا جوئی کی خاطر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کا جھگڑا حوصلہ اور لوگوں پر رحم کرنے کی وجہ سے تھا ورنہ انہیں جو ایذا دیتا تھا اس سے بدلہ لینے میں جلدی نہیں کرتے بلکہ کسی دوسرے کو رنج اور تکلیف میں مبتلا دیکھ کر آوہ آوہ کرتے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رکھتے تھے وہ کسی وقت بھی اپنے نفس کی خاطر کوئی کام نہ کرتے بلکہ ان کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا تھا۔ چونکہ بہت زیادہ رقیق القلب تھے اسی لیے اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کر بیٹھے کہ کس طرح ان بیچاروں کو عذاب نہ ہو بلکہ ان کو کچھ مہلت مل جائے ممکن ہے توبہ کر کے اپنی غلطی سے باز آجائیں۔ جیسے انہوں نے اپنے اب (چچا) آزر کے لیے کیا تھا

سوال : ایک آیت میں ہے کہ حضرت ابراہیم لوط علیہ السلام کی اُمت کے لیے جھگڑے تھے۔ دوسری میں ہے کہ لوط علیہ السلام کے لیے۔ اس کی کیا وجہ؟

جواب : مقصد طلب نجات تھا اور انبیاء علیہم السلام اپنی رقت قلبی سے طالب دعا ہوتے ہیں۔ انھیں شخصیت پر نگاہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ انبیاء انبیاء علیہم السلام کو امت سے ایسے محبت ہوتی ہے جیسے باپ کو اولاد سے۔ اولاد اگرچہ کیسی ہی ہو باپ کی محبت بدستور رہتی ہے اس میں فرق نہیں آتا۔ جیسے نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کنعان کے لیے دعائیں مانگتے رہے حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ کافر ہے یہ محض ان کی شفقتِ پدری ہی نہ تھی بلکہ جبلی فطرت بھی تھی۔

ف : اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کو ان کی امت کے متعلق خوشخبری سنائی گئی لیکن لوط علیہ السلام کی اُمت کا درد بدستور ان کے دل میں رہا۔

ف : چونکہ ابراہیم اور لوط علیہما السلام آپس میں قریبی رشتہ دار تھے اسی لیے ان کی اُمت کو اپنی اُمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے رفع عذاب کا جھگڑا کیا۔

يَا إِبْرَاهِيمُ ملائکہ کرام نے عرض کی : اے ابراہیم علیہ السلام أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۖ اس جھگڑے سے اعراض کیجئے کیونکہ جن کے لیے آپ عذاب کے رفع کرنے اور ان پر رحمت کرنے کا فرماتے ہیں وہ اس کے اہل نہیں۔ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ بیشک شان یہ ہے کہ عذاب ان کا مقدر ہو چکا ہے اب اس قضا و قدر کے مطابق تیرے رب تعالیٰ کا عذاب ان پر ضرور واقع ہوگا کیونکہ وہ ان کے حالات کو بہت زیادہ جانتا ہے۔ قضاء اس فیصلے کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے ارادۂ ازلیہ اور عنایت الٰہیہ سے موجودات کے انتظامات کے لیے ترتیبِ خاص سے مرتب فرمائے۔ اور قدر بمعنے تعلق الارادۃ بالاشیاء فی اوقاتہا۔ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ○ ان کے ہاں عذاب ضرور آئے گا وہ کسی حالت میں بھی رُکنے کا نہیں، جھگڑا کرو خواہ دُعائیں کرو یا کوئی اور اسباب و حیلے بناؤ۔

ردِ وہابیہ و دیوبندیہ وہابی دیوبندی کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی دُعا رد ہو گئی۔ ہم (اہلسنت) کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کا عقیدہ ہم سے مضبوط تر تھا انھیں یہ بھی علم تھا کہ یہ عذاب روکا نہیں جا سکتا

لیکن دُعا مانگی یا جھگڑا کیا تو صرف اپنے مراتب و کمالات اور اجر و ثواب کے ارادہ پر۔

چنانچہ صاحب روح البیان لکھتے ہیں :

وانك ماجور مثاب فیما جادلتنا لنجاتھم۔

بیشک تم کفار کی نجات میں جھگڑنے سے ماجور و مثاب ہو۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

حدیث شریف اشفعوا توجروا ولیقض اللہ علیٰ نبیہ ما شاء۔

نیک سفارش کر کے ثواب پاؤ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کا قصہ جس طرح چاہا اُن کی زبان سے بیان کر دیا۔

مسئلہ : مطلق شفاعت (سفارش) پر ثواب نہیں بلکہ اس سفارش پر ہے جس میں شرع مطہرہ کی اجازت ہے۔ مثلاً کسی کو ظلم سے بچانا یا جس گناہ میں حد نہ ہو اس گناہ سے معافی مانگنا۔

مسائلِ لواطت ۱۔ صاحبین کا فتویٰ ہے کہ لواطت کے مرتکب پر زنا کی حد جاری کی جائے اس لیے کہ لواطت اور زنا ایک شے ہے حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس پر تعزیر ہے۔ یہ ظاہر الروایۃ میں ہے اور جامع الصغیر میں لکھا ہے کہ اسے قید کیا جائے جب تک کہ اس گناہ سے وہ صدقِ دل سے تائب نہ ہو جائے۔

۲۔ اجنبیہ عورت سے لواطت کرے تو اس پر حد ہے۔

۳۔ اپنے غلام، اپنی لونڈی اور زوجہ منکوحہ سے لواطت کرے تو بلاخلاف اس پر حد نہیں۔

۴۔ شرح الاکملی میں ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ لواطت پر حد مقرر نہیں فرماتے۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ اتنا سنگین جرم ہے کہ اس کی حد مقرر نہ کرو۔ جیسے زنا اور قتل کی حد مقرر ہے بلکہ اسے اتنی سخت سزا دی جانے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ فتنہ مٹ جائے[۱] اس کی نظیر یمین غموس ہے کہ اس میں بھی قرآن نے فرمایا کہ یمین غموس (جھوٹی قسم) پر کفارہ نہیں۔ تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ یمین غموس اتنا سنگین جرم ہے کہ اس کے لیے کفارہ نہیں بلکہ سخت ترین سزا ہے۔

بقایا تفسیر آیت مذکورہ صاحب روح البیان رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان پر عذاب نہ رُکنے کا موجب اُن کا اپنا غلط کردار (لواطت) اور لوط علیہ السلام کے ساتھ کفر و تکذیب پر اصرار تھا۔ جب نوبت بایں جا رسید والا معاملہ ہو تو پھر عذاب نہیں رُکتا جیسے صالح علیہ السلام کی قوم نے اونٹنی کی توہین کی تو فوراً عذاب کی لپیٹ میں آ گئی۔ ایسے ہی یہ بھی۔

آغازِ عذاب کی کہانی مروی ہے کہ ملائکہ کرام ابراہیم علیہ السلام سے فراغت پا کر لوط علیہ السلام کے گاؤں سدوم کی طرف روانہ ہوئے وہ وہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ حضرات ان کے ہاں بوقتِ دوپہر پہنچے۔

---

[۱] یہی جواب غیر مقلدوں اور شیعوں کو دیا جائے جبکہ مذکورہ مسئلہ لے کر امام اعظم اور احناف پر اعتراض کیا جاتا ہے۔

انہیں پہلے وہ لڑکیاں ملیں جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہی تھیں۔ سب سے پہلے ان کی ملاقات حضرت لوط علیہ السلام کی صاحبزادی سے ہوئی جو پانی پلانے والیوں میں شامل تھی۔ اس نے ان سے پوچھا: آپ کون حضرات ہیں اور کہاں جا رہے ہو؟ انھوں نے اپنا حال سنایا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے آ رہے ہیں اور مسافر ہیں آگے جا رہے ہیں۔ بی بی نے قوم لوط علیہ السلام کی غلط کاریوں کی داستان سنائی تو ملائکہ کرام نے بی بی سے غم کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس بستی میں کوئی ایسا نیک انسان ہے جو ہماری مہمان نوازی کرے۔ مائی صاحبہ نے اپنے باپ لوط علیہ السلام کے متعلق کہا وہ اس وقت اپنے گھر پر موجود تھے۔ یہ حضرات ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ کاشفی صاحب لکھتے ہیں کہ جب ملائکہ کرام بستی سدوم میں پہنچے تو لوط علیہ السلام کو کھیتی باڑی میں مصروف پایا۔ اور کہا: السلام علیکم۔ لوط علیہ السلام نے وعلیکم السلام کہتے ہوئے ان کی طرف دیکھا ان بے ریش لڑکوں کو دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ یہ کہاں سے آ نکلے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيٓءَ بِهِمْ جب ہمارے ملائکہ کرام لوط علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے۔ تو لوط علیہ السلام ان کی وجہ سے گھبرائے اور پریشان ہوتے۔

حلِ لغات: سیٓ فعل مجہول اور اس کا نائب فاعل ھو ضمیر ہے جو لوط علیہ السلام کی طرف راجع ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے:

ساء فی کذا ای حصل لی منه سوء وحزن وغم۔

یعنی مجھے اس سے حزن و غم وغیرہ لاحق ہوا۔

اور بھم کی باء سیٓ کے متعلق اور سببیہ ہے۔

ازالہ: اس سے یہ نہ سمجھنا کہ لوط علیہ السلام اس لیے غمگین ہوئے کہ یہ مسافر لوگ میرے ہاں کیوں آئے اور آپ مہمان نوازی سے گھبرا گئے (معاذ اللہ)۔ ایسی غلط خیالی اور بدگمانی نبوت پر حرام ہے بلکہ آپ اس لیے گھبر لیتے کہ وہ بے ریش اور نہایت حسین و جمیل لڑکوں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ آپ نے خیال فرمایا کہ قوم غلط کار ہے اگر اس نے ان سے بدفعلی کا منصوبہ بنا لیا تو میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا جس سے بعد میں رسوائی اور شرمساری ہوگی

ف: اس سے ثابت ہوا کہ لوط علیہ السلام کو بھی حزن و غم امت کے لیے ہوا۔

فرق مابین ابراہیم و لوط علیہما السلام حضرت ابراہیم و حضرت لوط علیہما السلام اور ان کی امت کے مابین فرق واضح ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں ملائکہ خوشی اور لوط علیہ السلام کے ہاں حزن و غم کی خبر لائے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

نبوت کی شان اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کرام سے فرمایا کہ لوط علیہ السلام کو پہلے ہرگز تباہ نہ کرنا جب تک وہ چار بار اپنی قوم کی برائی کی گواہی نہ دیں۔ جب فرشتے لوط علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے کہا: کیا آپ کو ہمارے

لوگوں کے متعلق معلوم ہے کہ ان کے کرتوت کیا ہیں۔ انہوں نے عرض کی: وہ کیسے ہیں؛ لوط علیہ السلام نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں اس بستی والے بہت ہی بُرے ہیں۔ اسی طرح چار بار فرمایا۔ وہ فرشتے لُوط علیہ السلام کے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ ان کا کسی کو علم نہ تھا۔ لیکن لُوط علیہ السلام کی کافرہ منافقہ عورت نے سب کو اطلاع دے دی۔ چنانچہ اس کی تفصیل یُوں آتی ہے:

وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا اور لُوط علیہ السلام ان کی وجہ سے تنگ دل ہُوئے۔

حل لغات وترکیب: ذرعًا بوجہ تمیز منصوب ہے یعنی ان کے ہونے سے لوط علیہ السلام کا سینہ یا قلب یا وسعت، وطاقت تنگ ہوگئی۔ اس میں اشارہ ہے کہ لوط علیہ السلام کو بظاہر اتنے اسباب حاصل نہ تھے جس سے وُہ اپنی قوم کا مقابلہ یا مدافعہ کر سکتے۔ اسی عجز کو مدِنظر رکھ کر ملول ومغموم تھے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

ضاق ذرع فلان بکذا۔

یہ اس شخص کے لیے بولتے ہیں جو کسی مصیبت میں ایسا گرفتار ہو کہ اس کا وہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے۔

اور الاختری میں لکھا ہے کہ:

ضاق به ذرعا" ای طاقة وضاق بالامر ای لم یطقه و لم یقو علیه وکان مد الیه یده ولم تنله۔

یعنی اس کی طاقت نہ رہی اور وہ اس پر کوئی قوت نہیں رکھتا اور اس طرف ہاتھ پھیلایا لیکن اسے پا نہ سکا۔

ف: الازہری میں ہے کہ ذرع طاقت کے قایم مقام استعمال ہوتا ہے۔ یہ دراصل اس اُونٹ کے لیے کہا جاتا ہے جو چلتے ہوئے اپنے پاؤں کے پھیلاؤ کے مطابق اپنے ہاتھوں کو بڑھائے پھر جب اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادا جائے تو اس کے وہی دونوں ہاتھ پہلے کی نسبت پیچھے اور ڈھیلے پڑتے ہیں اور گردن بھی اٹھا کے چلتا ہے۔ اس معنے پر اب جہاں وسعت وطاقت کی کمی واقع ہو وہاں یہی لفظ ذرع بولتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

مالی به ذرع ولا ذراع۔

یعنی مجھے کوئی وسعت وطاقت نہیں۔

وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝ اور فرمایا آج کا دن مجھ پر بڑا سخت ہے۔ یہ قبیلۂ جرہم کی زبان ہے کہ وہ شدید کو عصیب بولتے ہیں۔ (کذا فی ربیع الابرار)

ف: جب ملائکہ کرام بصورت مہمان لوط علیہ السلام کے گھر میں حاضر ہوئے تو آپ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ ان کے لیے طعام تیار کیجئے اور اپنی قوم کو ان کی خبر نہ دینا۔ چونکہ وہ کافرہ ومنافقہ تھی اس لیے بظاہر تو اقرار کر لیا لیکن کسی کام کے بہانے بستی میں جا کر سب کو فرداً فرداً مطلع کر دیا کہ ہمارے گھر ایسے حسین وجمیل لڑکے آئے ہیں جو دیکھے نہ سُنے گئے ہوں۔ ان کا لباس اور طرز طریق بھی نرالا ہے اور بہترین خوشبوؤں سے مہکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سنتے ہی سب بھاگے اور لُوط علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَآءَہٗ قَوْمُہٗ اور آئے لوط علیہ السلام کے ہاں جبکہ آپ اپنے مہمانوں کے ساتھ اپنے گھر کے اندر تھے قَوْمُہٗ آپ کی قوم درانحالیکہ وہ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ دوڑتے ہوئے اس کی طرف گویا وہ برائی کی طرف بلا جھجک بھاگے جا رہے تھے لیکن انہیں ان مہمانوں کی حقیقت معلوم نہ تھی ان کے حالات سے غافل اور اپنے انجام سے بھی بے خبر تھے۔

حل لغات: الھراع بمعنے الاسراع یعنی تیز دوڑنا۔ تہذیب میں ہے الھراع بمعنے براندن سخت وشتابانیدن۔ یعنی سختی سے ہٹانا اور کسی شے کو دوڑانا۔ مثلاً کہا جاتا ہے: اھرع القوم وھرعوا۔

وَمِنْ قَبْلُ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ یہ جملہ قومہ سے حال ہے یعنی وہ لوط علیہ السلام کے ہاں دوڑتے ہوئے آئے درانحالیکہ لوط علیہ السلام کی اس وقت کی حاضری سے پہلے گندی اور سخت بری عادتوں میں منہمک تھے۔

قوم لوط (علیہ السلام) کی گندی عادات کی تفصیل

لوط علیہ السلام کی قوم کی گندی عادات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ لواطت (لونڈے بازی)

۲۔ کبوتر بازی

۳۔ مجلسوں میں سیٹی بجانا

۴۔ چوراہوں اور چوکوں میں بیٹھ کر لوگوں سے ٹھٹھا کول اور ہنسی مذاق کرنا۔

یہ گندے افعال ان کی طبیعتوں میں گھل مل گئے تھے۔ کوئی گندا فعل ان کے نزدیک عیب نہ تھا۔ اسی لیے بے ریش لڑکوں کا نام سنتے ہی کھلم کھلا برائی کرنے کے لیے دوڑتے بھاگتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں حاضر ہو گئے۔

ف: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ وہ ایسی برائیوں کے مرتکب ہوتے تھے جو ہلاکت و تباہی اور عذاب کی موجب ہیں۔ اسی لیے عذاب کے منہ میں خود بھاگ کر چلے گئے۔ اہل نبوت جو پاکیزگی اور طہارت کا مرکز ہیں ان سے برائی طلب کرنے لگے اس لیے کہ ان کے نفس کی خباثت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ برائی طلب کریں۔ اسی وجہ سے وہ کمال شقاوت اور سرعت عذاب کے مستحق ہوئے۔

مسئلہ: فاسق مجاہر (کھلم کھلا گناہ کرنے والا) پوشیدہ گناہ کرنے والے سے بدتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاسق مجاہر کی گواہی ناقابل قبول ہے۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے ہر امتی مجرم گنہگار کو معافی دی جا سکتی ہے سوائے مجاہرین (کھلم کھلا گناہ کرنے والوں) کے کہ انہیں ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا بلکہ ان سے دنیا میں بھی مواخذہ ہو گا۔ یعنی ان پر حد ہے (یہ ان جرائم کے لیے ہے جن کی شرعی حد مقرر ہے) اور آخرت میں سخت سزا ہے خواہ ان جرائم پر حد شرعی دنیا میں ہو یا نہ۔

شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

نہ ہرگز شنیدم دریں عمر خویش
کہ بد مرد را نیکی آمد بہ پیش
نہ ابلیس بد کرد و نیکی ندید
بر پاک ناید ز تخم پلید

ترجمہ : ہم نے عمر بھر دیکھا نہ سنا کہ بُرے مرد کو نیکی نصیب ہو ۔ دیکھیے ابلیس نے بُرائی کی تو اس کی سزا پائی ۔ ظاہر ہے کہ گندے بیج سے اچھا پھل حاصل نہیں ہوتا ۔

قَالَ یٰقَوْمِ لُوط علیہ السلام نے فرمایا : اے میری قوم ! هٰٓؤُلَآءِ یہ بتدا ہے بَنَاتِیْ یہ اس بتدا کی خبر ہے ۔ یعنی میری حقیقی لڑکیاں موجود ہیں ان سے نکاح کر لو لیکن میرے ان مہمانوں کو کچھ نہ کہو ۔

نکتہ : آپ نے اپنی لڑکیوں کی پیش کش اس لیے کی کہ اس سے قبل وُہ لوگ آپ سے لڑکیوں کا نکاح چاہتے تھے تو آپ نے ان کی خباثت کی وجہ سے انکار کر دیا تھا لیکن اب کی بار آپ نے خود پیش کش کی ۔

سوال : لوط علیہ السلام نے انھیں اپنی حقیقی لڑکیوں کے نکاح کا کیوں کہا حالانکہ وہ لوگ کافر تھے اور لوط علیہ السلام کی لڑکیاں مومنہ موحدہ تھیں ۔

جواب : ان کی شریعت میں نکاح میں ایمان و کفر کی کوئی شرط نہیں تھی لیکن ہمارے اسلام میں بھی ابتداءً یہ شرط نہیں تھی ۔ چنانچہ آغازِ اسلام میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیاں ابو العاص بن وائل اور عتبہ بن ابی لہب کے نکاح میں دی تھیں حالانکہ وہ دونوں کافر تھے اور آپ کی دونوں صاحبزادیاں مومنہ موحدہ تھیں ۔ بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا ۔ اس کی ناسخ یہ آیت ہے ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا [1] اور نہ ہی مشرکین کو اپنی لڑکیاں وغیرہ نکاح میں دو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں ۔

ف : ایک روایت میں آیا ہے کہ لوط علیہ السلام کی باغی قوم کے دو سردار تھے جن کی تمام برادری پہ بات چلتی تھی ۔ لُوط علیہ السلام نے صاحبزادیوں کا رشتہ انھیں دینے کا وعدہ کیا تاکہ مہمانوں کی عزت رہ جائے ۔ یہ ان کا کرم تھا حالانکہ لڑکیوں کا رشتہ دینا ایک بہت نازک اور اہم امر ہے مگر آپ مہمانوں کی عزت پر لڑکیاں قربان کرنے پر تیار ہو گئے ۔

هُنَّ یہ بتدا ہے اس کی خبر اَطْهَرُ لَكُمْ ہے ۔ یعنی یہ میری لڑکیاں تمہارے لیے بہتر رہیں گی ۔

سوال : اطہر افعل کے صیغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لواطت اطہر نہ سہی تو طاہر ضرور ہے حالانکہ وہ طاہر تو کجا اخبث سے خبیث ترین فعل ہے ۔ پھر لوط علیہ السلام نے اس طرح کیوں فرمایا ۔

جواب : اس سے علی الاطلاق نکاح کی طہارت مطلوب ہے بطور مبالغہ کے افعل کا صیغہ استعمال فرمایا ۔ جیسے کہا جاتا ہے :

---

[1] ناسخ و منسوخ کی تفصیل فقیر کی کتاب " احسن البیان " میں دیکھیے ۔

النكاح اطهر من الزنیٰ۔ (نکاح زنا سے اطہر ہے)

اس میں زنا کی طہارت مطلوب نہیں نکاح کی طرف ترغیب بطور مبالغہ بیان کی جاتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ زنا خبیث فعل ہے۔

جواب ۲: وہ لوگ لواطت کو اچھا فعل سمجھتے تھے۔ ان کی زبان میں فرمایا کہ مانا کہ تمہارے نزدیک لواطت اچھا فعل ہے لیکن نکاح اس سے بہتر اور اطہر ہے۔ اس کی نظیر حدیث شریف میں ہے کہ جب ابوسفیان نے بحالتِ کفر ہُبل بُت کے بارے میں کہا: اعل ھبل۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم کہو:

اللہ اجل و اعلیٰ۔

اس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصد یہ نہیں تھا کہ بت جلیل یا عالی ہے بلکہ ان کے اعتقادِ فاسد اور ظن و باطن کے مطابق کہ اگر بقول شما تمہارا بت ایسا ہے تو ہمارا اللہ تعالیٰ اعلیٰ و اجل ہے۔ اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے ان کے خیال کے مطابق فرمایا: اطہر لکم۔

صاحبِ روح البیان کا بیان

صاحب روح البیان فرماتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی صاحبزادیوں کی پیشکش اس لیے فرمائی تاکہ ان سے لواطت کا مرض دفع ہو جائے اور اس خباثت سے بچ کر انسانی طریقۂ نکاح کو اپنائیں۔ آپ نے برائی بند کرنے کا بہترین طریقہ اختیار فرمایا۔

سوال: آپ کی صاحبزادیاں صرف دو تھیں تو ساری قوم کو آپ نے عام دعوت کیوں دی۔

جواب ۱: پہلے عرض کیا گیا ہے کہ اس قوم کے دو لیڈر تھے ان دونوں کی شرارت سے ساری برادری بگڑی ہوئی تھی آپ نے دونوں کے لیے اپنی صاحبزادیوں کی پیشکش اس ارادہ پر فرمائی کہ یہ دونوں اس برائی سے باز آ جائیں، اور تمام قوم سدھر جائے گی۔

جواب ۲: فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ ھُنّ جمع کی ضمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو سے زاید تھیں اور لوط علیہ السلام نے ان سب کو ان کے بعض کے نکاح میں دینے سے نکاح کی ترغیب دی تاکہ وہ لواطت جیسے گندے فعل سے بچ جائیں۔ اور انہیں معلوم ہو جائے کہ ایامِ حیض میں اپنی عورت سے جماع نہ کرنے میں طبعی کراہت ہے وہ باوجودیکہ مباح المحل ہے لیکن طبیعت کو نفرت ہے تو باوجودیکہ دُبر حرام المحل ہے اور ایامِ حیض مباح المحل میں جب جماع سے طبیعت کو نفرت ہے تو لواطت سے بطریق اولیٰ نفرت ہونی چاہیے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ پس اللہ تعالیٰ سے ڈر کر لواطت جیسے گندے فعل کو ترک کر کے مباح المحل یعنی عورتوں سے نکاح کو اختیار کرو۔ وَلَا تُخْزُوْنِ اور مجھے رسوا نہ کرو۔ فِیْ ضَیْفِیْ میرے مہمانوں کے بارے میں کہ ان سے لواطت جیسا گندا فعل کرو اس لیے کہ مہمانوں کی رسوائی دراصل میزبان کی رسوائی ہے جیسے مہمان کا اعزاز دراصل میزبان کی عزت ہے۔

ف: ضیف دراصل مصدر ہے اس لیے قلیل و کثیر دونوں کے لیے مستعمل ہے۔

اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ○ کیا تم میں کوئی ایک بھی راہِ راست پر نہیں جو راہِ حق اختیار کر کے لواطت جیسے گندے فعل سے ہٹ جائے۔

ف: کاشفی نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ کیا تم میں کوئی ایسا نہیں کہ تمہیں حق کی بات سمجھائے اور لواطت جیسے گندے فعل سے بچنے کی تلقین کرے۔

ف: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ تم میں کوئی ایسا نہیں جو میری نصیحت قبول کر کے سچے دل سے تائب ہو کر عذابِ خداوندی سے نجات پا جائے۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِکَ مِنْ حَقٍّ ج انہوں نے کہا کہ ہمیں تمہاری لڑکیوں کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہمیں ان سے کوئی رغبت ہے۔ وہ بدبخت ایسے تھے کہ عورتوں سے کسی قسم کی دلچسپی تھی ہی نہیں اور نہ ہی وہ نکاح کرا اچھا سمجھتے تھے بلکہ وہ لواطت کو اپنا مذہب سمجھتے تھے اسی لیے لوط علیہ السلام سے کہا: علمت الخ۔ لوط علیہ السلام کو ان کا مذہب تو معلوم تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ انہیں عورتوں بالخصوص ان کی صاحبزادیوں سے رغبت ہے یا نہیں چنانچہ وَاِنَّکَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ○ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی اے لوط (علیہ السلام)! ہماری مراد کا تمہیں علم ہے یعنی ہم لواطت کے خواہشمند ہیں اس سے وہ از لی مقدر یعنی عذاب سے تباہی و ہلاکت کو دعوت دے رہے تھے۔

ربط: جب لوط علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ کسی طرح بھی اپنی گمراہی سے باز آنے والے نہیں تو کہا:

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً لو تمنائیہ ہے اسی لیے اسے جواب کی ضرورت نہیں بکم قوۃ سے حال ہے اور قوۃ بمعنے گرفت ہے۔ یعنی لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ کاش مجھے تمہارے دفعیے کے لیے کوئی قوت ہوتی اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ○ اس کا عطف ان لی بکم پر ہے کیونکہ اس میں فعل کا معنیٰ موجود ہے رکن بسکون الکاف پہاڑ وغیرہ کا کنارہ یعنی کاش مجھے تمہارے دفعیہ اور مقابلہ کی ذاتی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط اور طاقت ور معاون کی پناہ لیتا جس کے سہارے میں تمہارا مقابلہ کرتا اور وہ میرا دفاع کرتا اور ہر معاملہ میں میری اعانت کرتا۔ معاون و مددگار کو رکن الجبل سے شدۃ اور قوۃ کی وجہ سے تشبیہ دی ہے۔

ف: کاشفی نے کہا کہ لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ میں پناہ لیتا یا میں جاتا کسی سخت رکن کے ہاں۔ یعنی کسی قبیلہ کی پناہ لے کر تمہیں اس برائی سے بچاتا۔

ف: چونکہ لوط علیہ السلام اس قوم میں ایک مسافر کی حیثیت سے تھے یعنی ان کی برادری کے نہیں تھے بلکہ باہر سے کوچ کر کے یہاں ان میں قیام پذیر تھے۔ آپ کا کوئی قوی سہارا نہ تھا کہ جس کی مدد سے وہ اپنی مشکلات پر قابو پاتے۔ عام عادت یہ ہے کہ اکثر شہروں میں غریب مسافر کی کوئی مدد نہیں کرتا بالخصوص ہمارے دور میں تو یہ معاملہ عام ہے۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

تیمار غریباں سبب ذکر جمیلست
جانا مگر ایں قاعدہ در شہر شما نیست

ترجمہ: مسافروں کی غمخواری کا سبب ذکر جمیل ہے اے محبوب! شاید تمہارے شہر میں یہ طریقہ نہیں ہے۔

نکتہ: حضرت لوط علیہ السلام نے مددگاری کی تمنا اس لیے کی کہ انسان خلقۃً کمزور ہے۔ کما قال تعالیٰ:

خلقکم من ضعف۔ تمہیں کمزوری سے پیدا فرمایا۔

ازالۂ وہم اس سے کوئی بدگمانی نہ کرے کہ لوط علیہ السلام نے کمزوری سے تمنا کی۔ یہ نبوت پر الزام ہے۔ بلکہ آپ کی یہ تمنا آپ کے عرفان پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ صاحبِ روح البیان رقمطراز ہیں کہ:

والعارف ینظر الی ھذا الضعف ذوقا وحالا ولذا قیل ان العارف التام المعرفۃ فی غایۃ العجز والضعف عن التاثیر والتصرف لانقہارہ تحت الوحدۃ الجمعیۃ وقد قال تعالیٰ "فاتخذہ وکیلا" والوکیل ھو المتصرف فان الھم التصرف بجزم تصرف وان منع امتنع وان خیر اختار ترک التصرف الا ان یکون ناقص المعرفۃ۔

عارف کامل ایسے ضعف میں ذوق پاتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عارف کامل کی تکمیل عجز و ضعف سے ہوتی ہے کیونکہ عجز و ضعف وحدۃ جمعیہ کے تحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فاتخذہ وکیلا۔ صوفیہ کی اصطلاح میں الوکیل وہ ہے جو متصرف ہو۔ اگر اسے تصرف کا الہام ہو تو تصرف کرے اگر روکا جائے تو رک جائے اور جس کی معرفت ناقص ہوتی ہے وہ اظہار عجز و ضعف نہیں کرتا۔

حضرت رومی قدس سرہٗ نے بھی مثنوی شریف میں فرمایا: ؎

تاکہ باشیم اے تو ما را جانِ جاں
تاکہ ما باشیم با تو درمیاں
دست نے تا دست جنباند بدفع
نطق نے تا دم زند از ضر و نفع
پیش قدرت خلق جملہ بارگہ
عاجزاں چوں پیش سوزن کارگہ

ترجمہ: اے جانِ جاں! ہم تیرے سامنے ہیں کچھ بھی ہیں نہ ہمارے ہاتھ ہیں کہ کسی شئے کو رد کیں اور نہ ہی زبان کہ دم ماریں۔ اور قدرت کے آگے تمام مخلوق ایسے ہے جیسے سوئی کے سامنے تاگہ۔

حدیث شریف: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بھائی لوط علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے کہ انھوں نے رکن شدید سے سہارا لینے کی تمنا کی۔

ف : رکن شدید سے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد مراد ہے۔

شرح الحدیث اس حدیث کے معنیٰ میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ کاشفی نے لکھا کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی اور اسی سے پناہ مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی[1] اس لیے کہ عاجزوں کو سوائے اس کی درگاہ کے اور کہاں پناہ ملے۔

آستانش کہ قبلہ ہمہ است

در پناہش ز ماہے تا بہ است

ہر کہ دل در حمایتش بستست

از ہم ہر دو کون وارستست

ترجمہ : اس کا آستان ہر ایک کا قبلہ ہے از ماہی تا ماہ اسی کی پناہ میں ہیں۔ جس نے بھی اس کی حمایت میں دل باندھا وہ دونوں جہان میں نجات پا گیا۔

ف : ابن الشیخ نے فرمایا کہ لوط علیہ السلام چاہتے اور تمنا کرتے تھے کہ انھیں مضبوط اور قوی جائے پناہ مل جائے۔ اسی لئے رحم اللہ الخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے او آوی الی رکن شدید غیر مناسب بات کہی اس لیے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بالکل ناامید ہو کر ایسا کہنا چاہیے تھا اور نہ ہی اس سے ناامید ہونا تھا بلکہ انھیں تو یقین کرنا چاہیے تھا کہ میرا حامی و ناصر اللہ تعالیٰ ہے وہ ان کی مدد کرتا کیونکہ اس سے اور کون بڑا اور قوی ہو سکتا ہے! جو ان کو پناہ دیتا وہی اپنے بندوں کی مدد کے لیے کافی ہے۔ (ابن الشیخ کا یہ قول مرجوح بلکہ مردود ہے) بلکہ صحیح قول وہی ہے جو کاشفی نے کہا اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ہوتی ہے کہ لوط علیہ السلام کے بعد ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم سے بہت بڑی قوت والے آدمی عطا فرمائے۔ یعنی لوط علیہ السلام کی دعا مستجاب ہوئی[2] کہ وہ چاہتے تھے کہ قوت و طاقت کے ساتھ ہی کفار کا مقابلہ ہو۔ چنانچہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قبیلے سے ہی حمایت حاصل رہی جیسا کہ ابتدائے اسلام میں آپ کو ابو طالب نے اپنی پناہ میں لیا تھا اور ہر طرح کی امداد کی تھی۔ اس کی وفات کے بعد ہی ہجرت الی المدینہ پر مجبور ہوئے۔

---

[1] یہی قول صحیح ہے۔ ۱۲

[2] ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ لوط علیہ السلام نے اپنی کمزوری سے شکایت نہیں کی بلکہ اظہار ضعف بھی ان کی شان عالی کی دلیل ہے۔

لُوط علیہ السّلام کا قصّہ

لُوط علیہ السلامؑ نے شرارتیوں کے خطرے سے اپنے مہمانوں کو گھر کے اندر آنے سے روک دیا اور دروازے بند کر دیے۔ وہ دروازے سے باہر ہی حضرت لوط علیہ السلام سے گفتگو کرتے رہے لیکن لوط علیہ السلام نے دروازہ نہ کھولا اور بالآخر وہ دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ لوط علیہ السلام بہت پریشان ہیں تو عرض کی:

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْكَ فرشتوں نے کہا: اے لوط علیہ السلام! ہم تیرے رب تعالیٰ کے رسول ہیں یہ لوگ تمہارے ہاں نہیں پہنچ سکیں گے۔ یعنی ہم تمہیں کسی قسم کا نقصان اور تکلیف نہیں پہنچائیں گے اور نہ ہی ہمارے متعلق آپ کو کوئی شکایت ہوگی یعنی ہماری وجہ سے آپ کی تذلیل نہیں ہوگی۔ اور تمہارا سہارا بڑا مضبوط ہے۔ فلہٰذا دروازہ کھولیے اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑیے۔ ہم جانیں اور وہ۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ یہ سن کر حضرت لُوط علیہ السلام نے دروازہ کھول دیا اور وہ حضرات ملائکہ لوط علیہ السلام کے گھر کے اندر آ گئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: اے الٰہ العالمین! اب انہیں (قومِ لوط کو) عذاب دیا جائے یا نہ۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اجازت بخشی تو جبرئیل علیہ السلام نے اپنی اصل شکل وصورت میں کھڑے ہو کر اپنے تمام پر پھیلا دیے۔ ان کے دو پر ایسے ہیں جن پر جڑے ہوئے موتیوں کے زیورات ہیں۔ انھوں نے اپنے چمکیلے دانت کھول کر اپنے پر کافروں کے چہروں پر مارے جس سے وہ اندھے ہو گئے۔ کما قال:

فطمسنا اعینھم۔ پس ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔

وہاں سے اپنے گھروں کو لوٹے تو انھیں راستہ دکھائی نہ دیتا تھا اور چلتے چلتے کہتے جاتے تھے کہ لُوط علیہ السلام کے گھر سے بچ کر رہو وہاں دو جادوگر آئے ہوئے ہیں۔ جاتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام نے ڈرایا دھمکایا کہ آج کی شب تو تم خیر سے گزارو، کل تمہاری خبر لیں گے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ الاسراء بمعنے رات کو جانا۔ یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ اسی طرح اس کے مجرد کا مصدر بروزن فعل آتا ہے یہ حرف معتل سے مخصوص ہے یعنی اپنے لوگوں کو رات کو لے جاؤ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ القطع بمعنے رات کا آخری حصہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رات کا کوئی حصہ یعنی رات کے کچھ حصہ گزر جانے کے بعد۔ اس معنے پر باھلك کی باء تعدیہ کی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ حال کا معنیٰ ہو۔ اب معنیٰ یہ ہو گا کہ ان کو رات کو لے جاؤ درانحالیکہ تم ان کی مصاحبت کرنے والے ہو رات کے کسی حصے میں بہرحال اس سے اندھیری رات مراد ہے۔ بعض نے کہا کہ یہاں پر باء بمعنے فی ہے۔ یعنی اے لوط علیہ السلام! تم سب رات کو یہاں سے نکل جاؤ تاکہ صبح کے وقت کے عذاب میں ان کے ساتھ تم بھی نہ مارے جاؤ۔ فلہٰذا صبح سے پہلے ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اور تم میں کوئی ایک بھی التفات نہ کرے۔ یعنی نہ تم اور نہ تمہارا ماننے والا کوئی اس کے خلاف کرے اور نہ پیچھے مڑے۔ جیسے انھیں حکم ہوا ہے ویسے ہی عمل کریں یا یہ کہ پیچھے مڑ کر کوئی نہ دیکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا اس شہر میں مال ومتاع اور دوست احباب کافی تھے اس لیے انھیں فرشتوں نے فرمایا کہ یہاں سے نکل جاؤ اور یہاں کے تمام یار دوستوں سے انقطاع کر لو۔

ف : تاویلات نجمیہ میں ہے کہ تم میں سے کوئی بھی دنیا و مافیہا کی طرف توجہ نہ کرے اور نہ ہی اس کی زیب و زینت اور نقش و نگار اور مال و متاع کو دل میں لائے۔ خلاصہ یہ کہ سالک کو دنیا و مافیہا سے بالکل کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔

حدیث شریف اسی لیے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقعہ پر اپنے صحابہ کرام کے لیے دعا فرمائی کہ یا الٰہی ! میرے صحابہ کرام کی ہجرت مکمل فرما اور انھیں ان کے گٹوں پر واپس نہ کر۔ یعنی ان کی ہجرت ایسی مکمل ہو جائے کہ انھیں متروکہ شہر سے کسی قسم کا لگاؤ نہ رہے تاکہ پچھلے وطن کے میلان سے ان کا ثواب نہ جاتا رہے۔

ف : مروی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی دو صاحبزادیوں (۱) ریثا (۲) زعورا و دیگر ماننے والوں کو جمع فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے انھیں اپنے پروں کو اٹھا کر شہر زغر میں پہنچا دیا۔

ف : یہ شہر قومِ لوط کے پانچوں شہروں سے ایک تھا۔ یہ بستی سدوم سے بارہ میل دور تھا اور یہاں کے باشی لواطت کے عمل سے پاک تھے۔ لیکن یہ روایت فاسر باهلك کے تقاضا کے خلاف ہے۔ یعنی اس میں پیدل چلنے کا حکم ہے اور یہاں جبرئیل علیہ السلام کا ذکر ہے۔ لیکن یہ صرف صاحبِ رُوح البیان کا خیال ہے ورنہ فاسر باهلك جبریل علیہ السلام کے لے جانے کے منافی نہیں جیسے سبحٰن الذی اسرٰی بعبدہٖ میں فرمایا لیکن وہاں بھی براق پر لے جانیوالے حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔

نکتہ : ۱۔ انھیں پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے سے اس لیے روکا گیا کہ معذب قوم پر عذاب کے نزول سے ان کے دلوں پر اثر نہ پڑے۔
۲۔ مسلسل چلتے رہیں ٹھہرنے کا نام نہ لیں کیونکہ مڑ کر دیکھنے سے تسلسل قایم نہیں رہتا۔
۳۔ دراصل یہ بھی ایک آزمائش تھی۔

اِلَّا امْرَاَتَكَؕ فاسر باهلك سے استثنا ہے۔ مگر آپ کی زوجہ اِنَّهٗ بیشک شان یہ ہے کہ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْؕ جو عذاب کفار پر واقع ہوگا۔ یہ بھی اس کی لپیٹ میں آئے گی۔

ف

با بدان یار گشت همسر لوط
خاندان نبوتش گم شد

ترجمہ : لوط علیہ السلام کی زوجہ بُروں کے ساتھ مل گئی اس لیے اس کا نبوت سے رشتہ منقطع ہو گیا۔ یعنی نبوت کے خاندان سے ہونے کے باوجود صحبت بد نے گمراہ کر دیا جس سے وہ بھی ان کے ساتھ تباہ و برباد ہو گئی کیونکہ نبوت سے بہت بڑے قوی تعلق کے باوجود جب اہلِ ضلالت سے تعلقِ باطنی جوڑا تو وہ انہی کی طرح گمراہ ہو کر بہت بڑے عذاب سے تباہ و برباد ہوئی۔

سبق اس سے معلوم ہوا کہ اغیار کی صحبت سے بہت ضرر اور نقصان عظیم ہوتا ہے۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُؕ ان کے عذاب اور تباہی و بربادی کا وقت صبح کا ہے۔ اس میں فاسر باهلك الخ کی

علت بتائی گئی ہے۔ اور مسلسل چلنے کی اصلی غرض سمجھائی گئی ہے۔ (کذا فی الارشاد)

ف : مروی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے ملائکہ سے پوچھا کہ ان کافروں کو کس وقت عذاب آئے گا؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ صبح کو۔ آپ نے فرمایا: تو میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے چلا جاؤں۔ فرشتوں نے کہا:

اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ۝ کیا صبح قریب نہیں ہے۔

نکتہ : ۱۔ ان کے عذاب کا تعین صبح کے وقت کا اس لیے ہوا کہ وہ آرام اور راحت کا وقت ہوتا ہے اس وقت کا عذاب زیادہ گھبراہٹ پیدا کرتا ہے۔

۲۔ ناظرین کو عبرت دلانے کے لیے یہی گھڑی زیادہ موزوں ہوتی ہے۔

لطیفہ : اس میں اشارہ ہے کہ موت کی گھڑی ہر ایک کے قریب تر ہے۔ جب وہ کسی کو گھیر لے گی تو بندہ سمجھے گا کہ گویا اس دنیا میں وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں ٹھہرا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا:

چرا دل بریں کارواں می نہم
که یاراں برفتند و ما بردیم
پس اے خاکسار گنہ عن قریب
سفر کرد خواہی بشہر غریب
بریں خاک چنداں صبا بگزرد
کہ ہر ذرہ از ما بجائے برد

ترجمہ : اس دنیا کے قافلے سے مجھے دل لگانا اچھا نہیں کیونکہ بہت سے دوست یہاں سے چلے گئے اور ہم چندروز کے لیے رہ گئے۔ پس اے گنہ میں مبتلا ہونے والے! عنقریب تم بھی شہر غریب کی طرف رخت سفر باندھو گے۔ اسی خاک سے کئی بار باد گزرے گی کہ ہماری مٹی کو تھوڑا تھوڑا کر کے لے جائے گی۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جب ہمارے عذاب کا وقت آیا یعنی صبح ہوئی جَعَلْنَا ہم نے اپنی قدرت کاملہ سے کیا عَالِیَهَا قوم لوط کی اوپر والی بستیوں کو۔ انہیں مؤتفکات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ چار شہر تھے جن کی چار ہزار، چار سو یا صرف چار ہزار بستیاں تھیں۔

ف : کاشفی نے لکھا کہ ہر شہر میں ایک لاکھ شمشیر زن جوان بہادر تھے۔ وہ چار شہر یہ ہیں:

- ۝ سدوم
- ۝ عامورا

○ کادوما

○ نذدایم

بیت المقدس سے تین دن کے سفر کے فاصلے پر تھے سَافِلَهَا نیچے کی طرف یعنی ان کو اسی ہیئت پر اُلٹ دیا گیا۔ یعنی ہم نے تمام شہروں کو اُلٹ دیا۔

جبریل علیہ السلام کی طاقت

مروی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے انھیں پانی والے حصّے سے اٹھایا اور آسمان تک لے گئے جن کے برتن بھی نہ اُلٹے اور بدستور کُتے بھونکتے رہے، مرغ بولتے رہے اور سونے والے سوتے رہے کسی کو معمولی دھکا بھی نہ لگا۔ حتّٰی کہ آسمان تک لے گئے، آسمان سے الٹا پھینکا تو زمین پر آگرے۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا اور ہم نے ان تمام شہروں کے اوپر سے برسایا یعنی آسمان سے زمین کی طرف اُلٹنے کے بعد ان پر پتھر برسائے گئے۔

سوال: یہ تمام کام فرشتوں نے کیا لیکن ان جملہ امور کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا؟

جواب: تاکہ معلوم ہو وہ جملہ امور ایسے مہتم بالشان تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔

حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ گارے والے پتھر۔ جیسے دُوسرے مقام پر فرمایا: حجارۃ من طین در اصل ان پتھروں کو کہا جاتا ہے جن پر گیلی مٹی کی لپیٹ ہو۔ یعنی یہ در اصل سنگِ گِل تھا۔ اس کی عربی سجیل بنائی گئی۔ مَّنْضُوْدٍ ۝ یہ سجیل کی صفت ہے۔ مُّسَوَّمَةً یہ سجّیل کی صفت ہے یعنی نشانی والے۔ یعنی وہ ان پتھروں سے نرالی طرز کے تھے یا وہ ہر ایک کے لیے نامزد تھے کہ جس کو جو پتھر لگنا تھا اسی کے لیے اس کی کوئی علامت ڈالی گئی تھی۔ منضود، اہلِ عرب کہتے ہیں النضد فی الارسال۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی شے کو پے در پے پیچھے بھیجا جائے۔ جیسے بارش کے قطرات، دراصل نضد بمعنے وضع الشئ بعضہ علیٰ بعض کسی شے کے بعض کو بعض پر رکھنا۔ یہ سجیل کی صفت ہے۔ مسومۃ نشان لگائے ہوئے۔ اسے دنیا کے کسی پتھر سے مشابہت نہ تھی۔ یا مسومۃ کا معنیٰ یہ ہے کہ اس پتھر پر اس شخص کا نام کندہ تھا جسے اس پتھر نے تباہ کرنا تھا۔ عِنْدَ رَبِّكَ ط تیرے رب تعالیٰ کی طرف سے۔ کاشفی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خزائن میں ان کے عذاب کے لیے پہلے تیار کر کے رکھے تھے۔

اعجوبہ

مروی ہے کہ وہ پتھر ہر ایک کو پہنچے جہاں بھی تھا یہاں تک کہ ان میں سے ایک حرم شریف میں تھا اس کا پتھر چالیس دن آسمان پر لٹکا رہا یہاں تک کہ وہ حرم شریف سے باہر نکلا تو اسے اس وقت لگ کر اسے تباہ و برباد کیا۔

ف: تفسیر زاہدی میں ہے کہ ان کا بڑا پتھر بڑے مٹکے کے برابر اور چھوٹا پانی کے گھڑے کے برابر تھا۔

نکتہ: صاحب رُوح البیان لکھتے ہیں کہ قومِ لوط کو الٹنے کے بعد پھر پتھروں سے مارنا عذاب کی تکمیل کے لیے تھا۔ جیسے

صالح علیہ السلام کی قوم کو صیحہ کے بعد رجفہ (زلزلہ) میں مبتلا کیا گیا۔ وُہ برایہ گزجوان ہیں تھے ان کا عذاب اسی طریق سے تھا کہ وُہ اپنے شہروں سے باہر تھے۔ شہروں کے اُلٹنے سے بچے تو پتھروں کے عذاب میں مبتلا ہوئے۔

وَمَا هِيَ اور نہیں ہے مذکورہ پتھروں میں مبتلا ہونا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ظالموں سے۔ یعنی وُہ اپنے ظلم کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق تھے اور وہ عذاب انھیں لازماً پہنچا بِبَعِيْدٍ ۝ کوئی بعید۔

سوال: اسے بعیدۃ لانا چاہیے کہ ما کا اسم مونث ہی ہے۔

جواب: حجارۃ 'حجر' کی تاویل کی وجہ سے اسے مذکر لایا گیا ہے۔

مسئلہ: اس میں ہر ظالم کو وعید ہے کہ وہ ظلم کے وقت خیال رکھے کہ اسے بھی اس عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

حدیث شریف ۱ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پُوچھا کہ اس آیت میں ظالمین سے کون مراد ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے عرض کی، آپ کی امت کے ظالمین مراد ہیں۔ وہ عذاب کے پتھر کا نشان ضرور بنیں گے۔ اور وہ پتھر ہر لحظہ گرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ظالمین کو یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ اس عذاب کے پتھر سے بچ جائیں گے۔ بلکہ بوقتِ وفات اس پر بھی اسی قسم کا پتھر گرے گا۔

حدیث شریف ۲ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مسجد شریف میں تشریف فرما تھے کہ اچانک دیوار کے گرنے کی آواز آئی۔ اس سے تمام صحابہ کرام گھبرائے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ یہ دیوار کے گرنے کی آواز کیسی تھی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اللہ و رسولہٗ اعلم۔ (اللہ جانے یا اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے فرمایا کہ ستر سال پہلے اس پتھر کو جہنم کی اوپر کی جانب سے نیچے گرایا گیا تھا۔ اب یہ جہنم کے گڑھے کی آخری جانب کو گرا ہے یہ اسی کی آواز تھی۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی اپنے ارشاد گرامی سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کسی منافق کے گھر سے کسی کے مرنے پر نوحہ (بین) کی آواز سُنی گئی۔ اس وقت وہ منافق مرا تھا۔ اس کی عمر خوتیدگی کے وقت ستر برس تھی۔ گویا اس کے مرنے کے بعد یہ پتھر اسی کے ٹھکانے پر پہنچا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔ بے شک منافقین جہنم کے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

ف: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بطورِ عبرت کے وہ آواز سُنائی گئی۔

حدیث شریف ۳ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب میں شبِ معراج تیسرے آسمان پر پہنچا تو میں نے ایک پتھر دیکھا۔ جبریل علیہ السلام سے پُوچھا: یہ کیا ہے؟ انھوں نے عرض کی: آپ اس کے متعلق مت پُوچھیے۔ جب ہم واپس ہوئے تو میں نے پھر اُسی پتھر کے بارے پُوچھا۔ تو اُنھوں نے عرض کی کہ یہ قومِ لوط کے پتھروں سے ہے۔ اسے آپ کی اُمت کے ظالمین کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد یہی آیت پڑھی: وما ھی من الظالمین ببعید۔ (کذا فی زہرۃ الریاض)

چوں عالم از ستمگر تنگ دارد
عجب نبود کہ بر وے سنگ بارد

ترجمہ: جب سارا عالم کسی سے تنگ ہو تو اس پر اگر پتھر برسیں تو تعجب نہ کرو۔

ف: تبیان میں ہے بعید وُہ ہے جو نہ ہونے والا امر ہو، اور جس کا تصور بھی نہ ہو سکے اور جس کے وقوع کا امکان ہو وہ قریب ہے۔

حکایت محمد بن مروان کہتا ہے کہ جزیرۂ نوبہ سے ہمارا گزر ہوا اور وہی ہماری آخری گزرگاہ تھا۔ مجھے حکم ہوا کہ اس جزیرہ پر چند کوڑے ماروں۔ میرے کوڑے مارنے سے نوبہ کے متعدد باشندے باہر آ گئے۔ ان کے آگے آگے ایک لمبے قد کا گنجا مرد نہایت کمزور آدمی تھا جو اُون کا کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ میرے قریب آ کر السلامُ علیکم کہہ کر مٹی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا آیئے صف پر بیٹھئے۔ اس نے کہا: میں ان کا بادشاہ ہوں اور جسے اللہ تعالیٰ رفعت بخشے اس پر تواضع لازم ہے۔

تواضع ز گرداں فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

ترجمہ: بڑے آدمیوں کو تواضع ضروری ہے گداگر کو تو تواضع کی عادت ہے۔

اس نے مجھ سے کہا کہ تم کھیتوں کو جانوروں سے کیوں برباد کراتے ہو حالانکہ یہ تمہارے اُوپر حرام ہے۔ میں نے کہا یہ ہمارے نوکروں کی غلطی ہے۔ پھر کہا کہ تم ریشم اور سونا و چاندی کیوں پہنتے ہو حالانکہ یہ بھی تمہارے دین میں حرام ہیں۔ میں نے کہا ہمارے عجمی غلاموں کی غلط عادت ہے ہم انھیں روکتے ہیں لیکن وُہ نہیں رُکتے۔ اس نے مجھے شوخ نگاہ سے دیکھ کر استہزا کرتے ہوئے کہا کہ اے ابن مروان! تم غلط کہہ رہے ہو دراصل بات یہ ہے کہ تم خدا کی زمین پر بادشاہ بنائے گئے ہو لیکن ظلم کر رہے ہو تمہارے اوپر جتنے احکامِ خداوندی لازم ہیں تم نے سب کی خلاف ورزی کی ہے اس کا وبال تم چکھو گے بخدا تمہارے ہاں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں مجھے ڈر ہے کہ تم اس کی خلاف ورزی کا خمیازہ بھگتو گے۔ اور اے ابن مروان! تم خدا کی زمین پر ایک بہت بڑی مصیبت ہو مجھے ڈر ہے کہ تیری شامت سے ہم نہ مارے جائیں۔ یہ کہہ کر چلا گیا۔

ظلم کی صوفیانہ تقریر ظلم اس قساوت قلبی کا نتیجہ ہے جو انسان کے قلب پر بارش کی طرح برستی ہے اور قلب کی قساوۃ میں اس قدر اضافہ ہو گا جس قدر اس کا ظلم ہو گا۔ جب وُہ قساوۃ قلب کے شیشے کو سیاہ کر دیتی ہے تو اس کی نجات کی امید بھی نہیں رہتی۔ پھر وہ ان ظالموں کی طرح ہلاک اور تباہ ہو جاتا ہے جنھیں قہرِ خداوندی کے آسمانِ جلال سے قساوۃ کے پتھروں سے تباہ و برباد کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بغاوت و فساد اور قساوۃِ قلبی سے بچا کر عدل و صلاح کی ہدایت بخشے وہی ولی الارشاد ہے۔ (آمین)

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥ ۖ وَلَا تَنقُصُوا۟
ٱلْمِكْيَالَ وَٱلْمِيزَانَ ۚ إِنِّىٓ أَرَىٰكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ۝ وَيَٰقَوْمِ أَوْفُوا۟
ٱلْمِكْيَالَ وَٱلْمِيزَانَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا۟ ٱلنَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا۟ فِى ٱلْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝
بَقِيَّتُ ٱللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ۝ قَالُوا۟ يَٰشُعَيْبُ أَصَلَوٰتُكَ
تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ ءَابَآؤُنَآ أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِىٓ أَمْوَٰلِنَا مَا نَشَٰٓؤُا۟ ۖ إِنَّكَ لَأَنتَ ٱلْحَلِيمُ
ٱلرَّشِيدُ ۝ قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّى وَرَزَقَنِى مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَآ
أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَآ أَنْهَىٰكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا ٱلْإِصْلَٰحَ مَا ٱسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا
تَوْفِيقِىٓ إِلَّا بِٱللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ وَيَٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِىٓ أَن
يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَآ أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَٰلِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ۝
وَٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوٓا۟ إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّى رَحِيمٌ وَدُودٌ ۝ قَالُوا۟ يَٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا
مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَىٰكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَٰكَ ۖ وَمَآ أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ۝
قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَهْطِىٓ أَعَزُّ عَلَيْكُم مِّنَ ٱللَّهِ وَٱتَّخَذْتُمُوهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّى بِمَا
تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝ وَيَٰقَوْمِ ٱعْمَلُوا۟ عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّى عَٰمِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ
يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَٰذِبٌ ۖ وَٱرْتَقِبُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُمْ رَقِيبٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَ
ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ ٱلصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا۟ فِى دِيَٰرِهِمْ
جَٰثِمِينَ ۝ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا۟ فِيهَآ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ۝

ترجمہ: اور مدین کی طرف ان کے ہم قوم شعیب (علیہ السلام) کو (بھیجا) کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو بیشک میں تمہیں خوشحالی میں دیکھتا ہوں اور مجھے تم پر گھیر لینے والے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔ اور اے میری قوم! ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ اور فساد پھیلاتے ہوئے زمین میں نہ پھرو۔ اللہ کے ہاں جو بچ رہے وہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تمہیں یقین ہو اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں۔ کافروں نے کہا: اے شعیب (علیہ السلام) کیا یہ تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں ان خداؤں کو جن کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے اور ہم نہ کریں اپنے مالوں میں وہ جو ہم چاہیں۔ بے شک تو بڑا عقلمند اور نیک انسان ہے۔ فرمایا: اے میری قوم! بھلا بتاؤ تو اگر میں اپنے رب سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے سے اچھی روزی بخشی اور

بس نہیں چاہتا کہ میں تمہاری مخالفت کر کے وہ کام کروں جس سے تمہیں روکتا ہوں۔ میں حتی الامکان اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا اور میری توفیق اللہ ہی سے ہے اور میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اے قوم! میرے ساتھ اختلاف تمہارے سے یہ کرا دے کہ تمہیں وہی مصیبت پہنچے جیسی قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو پہنچی اور تم سے قوم لوط بھی تو کچھ دُور نہیں اور اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ یقیناً میرا رب رحیم محبت کرنے والا ہے۔ کافروں نے کہا اے شعیب (علیہ السلام) ہم تو تمہاری بہت سی باتیں سمجھ نہیں رہے اور بیشک تمہیں ہم اپنے میں کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم نے تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا اور تو ہمارے ہاں کوئی معزز انسان نہیں۔ فرمایا اے قوم! کیا میری برادری کا دباؤ تم پر اللہ سے زیادہ ہے اور اسے تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے اور جو تم کرتے ہو میرا رب اس پر محیط ہے اور اے قوم تم اپنی جگہ اپنے کام کیے جاؤ میں اپنا کام کرتا ہوں تم جان لو گے کس پر عذاب آتا ہے کہ وہ اسے رُسوا کرے گا اور کون جھوٹا ہے اور انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے شعیب (علیہ السلام) اور ان کے ساتھ اہلِ ایمان کو اپنی رحمت سے نجات دی اور ظالموں کو سخت آواز نے آپکڑا تو وہ صبح کے وقت اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے رہ گئے گویا وہ اس میں بسے ہی نہیں تھے سُن لو پھٹکار مدین پر جیسے ثمود پر پھٹکار ہوئی۔

تفسیر عالمانہ

وَاِلٰی مَدْیَنَ مدین ابراہیم علیہ السلام کے ایک لڑکے کا نام ہے۔ پھر ایک قبیلے یا شہر کا نام پڑگیا جسے مدین نے بنایا۔ جیسے اصول ہے کہ جو کوئی شہر کو آباد کرے تو وہ شہر اسی کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ یعنی ہم نے قبیلہ مدین یا شہر مدین کے مکینوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا اَخَاهُمْ ان کے بھائی یعنی ان کے نسب کا ایک فرد شُعَيْبًا شعیب علیہ السلام کو۔ یہ اخاھم سے عطف بیان ہے۔

ف: شعیب علیہ السلام بن میکیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیم علیہ السلام۔

قَالَ یہ جملہ استینافیہ بیانیہ ہے یعنی شعیب علیہ السلام نے فرمایا: يٰقَوْمِ اے میری قوم! اعْبُدُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو اس کے ساتھ بتوں کو شریک نہ بناؤ اس لیے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط تمہارا اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں یعنی تمہارا کوئی الٰہ نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ کلمۂ توحید کا دعوٰے ہر نبی علیہ السلام کا تھا۔ سب نے اپنی اُمت کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی کیونکہ شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنی اُمت کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی کیونکہ تمام امور کا دارومدار اسی توحید پر ہے اس کے بعد انھیں ان کے مراسم و اعمال سے روکا۔ اناج کی بھر تول میں کمی بیشی خصوصیت سے ان کی بُری عادت تھی انھیں ماپ تول میں کمی سے روکا کیونکہ یہ عادت ہلاکت و تباہی لاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ ماپنے اور تولنے کے پیمانے میں کمی نہ کرو۔ ان کے دو پیمانے تھے

ایک بڑا دوسرا چھوٹا۔ جب لوگوں سے کچھ لینا ہوتا تو بڑے پیمانے کو استعمال کرتے اگر دینا ہوتا تو چھوٹے کو۔ یعنی معہود ومقررشدہ پیمانے کا حجم نہ گھٹاؤ اور نہ تولنے کے باٹ کم وزن بناؤ۔ اس طرح سے حقوق العباد میں کمی کا ارتکاب ہوتا ہے اور وہ موجب تباہی وبربادی ہے۔ ممکن ہے کہ اسم آلہ کہ کر وہی شے مراد لی جائے جو اس پیمانے سے لی اور دی جاتی ہے۔ یعنی نہ گھٹاؤ اور نہ کم کرو مکیلات کے بھر دینے اور موزونات کو تول دینے ہیں۔

تنبیہ: یہی گندی عادتیں تاحال کفار کی وراثت میں موجود ہیں[1]

اِنِّیْٓ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ بے شک میں تمہیں بھلائی یعنی مال ودولت والا دیکھتا ہوں۔ یہ ولا تنقصوا الخ کی علت ہے یعنی بھوکے اور تنگ دست نہیں ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ثروت و وسعت والے ہو اسی لیے تمہیں کم بھرنے اور کم تولنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ہاں اگر تم بھوکے اور تنگ دست ہوتے تو پھر تمہاری مجبوری تھی اگرچہ جائز اس وقت بھی نہیں تھا لیکن ایک عذر تو پیش کر سکتے تھے مگر اب تو وہ عذر بھی نہیں ویسے ہی خواہ مخواہ غلطی کا ارتکاب کر رہے ہو۔ بلکہ تمہارے ہاں مال ودولت کی وسعت ہے تم تو الٹا غریبوں اور مسکینوں کی امداد کرو۔ وَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ اگر تم اس برائی سے باز نہ آئے تو مجھے تمہارا خطرہ ہے عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ۝ یوم محیط کے عذاب کا کہ اس دن کوئی غلط کار عذاب سے نہیں بچ سکے گا۔ اس سے قیامت کا عذاب یا اسی دن کا عذاب مراد ہے۔ جب اس قوم پر آیا تو ان کی بنیادیں ہلا دیں اور محیط سے اسے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس دن کی کیفیت یہی ہے کہ جب آئے گا تو کوئی بھی اس سے نہیں بچ سکے گا۔ دراصل اس سے عذاب کا حال ظاہر کرنا مطلوب ہے۔

حلِ لغات: العذاب کلامِ عرب میں ع ذ ب سے ہے بمعنے المنع۔ اور پانی کو عذب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پیاس کو روکتا ہے اور عذاب بھی اسی نام سے اس لیے موسوم ہے کہ وہ مجرم کو ایسے جرم کے ارتکاب سے اور دوسروں کو عبرت بن کر اسی طرح کے جرم کے عمل سے روکتا ہے۔

وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اور اے میری قوم! بھر تول کو پورا کرو یعنی حقدار کو اس کا حق پورا ادا کرو اور حق والے کے حقوق کی ادائیگی میں معمولی کمی بھی نہ کرو یہاں تک کہ تم خود دل میں مطمئن ہو کر واقعی ہم نے اس کے حقوق پورے طور پر ادا کر دیے بِالْقِسْطِ یہ اوفوا کے فاعل سے ہے یعنی درانحالیکہ تم عدل سے متلبس ہو کر اس میں نہ زیادتی ہو اور نہ نقصان، بلکہ پورا دو اور پورا لو۔

مسئلہ: کسی کو بطور احسان وفضل اپنے پیمانے کو زاید بنانا ناجائز ہے جیسا گھٹانا ناجائز ہے۔ لیکن پیمانے میں ایسا نہ چاہیے۔ ہاں ویسے جتنا زیادہ دیا جائے جائز ہے لیکن پیمانے میں ایسا نہ کرنا چاہیے۔

مسئلہ: الارشاد میں ہے کہ یہ بڑھانا گھٹانا بھرنے اور تولنے کے وقت انہیں استعمال کرنا مراد ہے۔

سوال: جب ولا تنقصوا المکیال الخ فرمایا تو اس سے اوفوا کا حکم خود بخود سمجھا گیا اس لیے کہ نہی سے امر خود بخود

---

[1] بلکہ ہمارے دور میں مسلمانوں میں بھی یہ گندی عادات گھس گئی ہیں۔

سمجھا جاتا ہے جیسے امر سے نہی۔ اس قاعدہ کے باوجود اسے دوبارہ ذکر کرنا تکرار محض ہے اور وہ فصاحت کے خلاف ہے۔
جواب: پہلے تنبیہ کی ہے کہ اناج کے بھرنے کے پیمانے اور تولنے کے ترازو کے باٹ صحیح رکھو۔ اس کے بعد ادفواکا حکم انہی معبود پیمانوں کو پورا دینے اور لینے کا ہے اور بس، اسے تکرار نہیں کہتے۔ (کذا فی حواشی سعدی المفتی)
وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو یہ حکم مطلق ہے کہ وہ مکیل اشیاء ہوں یا موزونی یا ان کے سوا کوئی اور، وہ بڑی اہم اشیاء ہوں یا معمولی، ان سے ہر خرید و فروخت کی شے پر محصول لیتے تھے۔ جیسے دلالوں کی عادت ہے۔ اور جو کچھ لوگوں سے خریدتے اس کے ثمن مقرر کردہ سے بھی کم دیتے یا ان کو مجبور کر کے ان سے سستا سودا کر لیتے۔ **وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ** ○ اور زمین پر فساد برپا نہ کرو۔
حلِ لغات: العثی بمعنے اشد الفساد (سخت ترین فساد) یعنی فساد میں سرکشی وغیرہ نہ کرو۔ یعنی ڈکیتی وغیرہ۔ ان کی عادت تھی کہ جگہ جگہ پر ڈاکہ ڈالتے تھے اس سے بھی انہیں روکا گیا۔
مسائل: ۱۔ حقوق اللہ و حقوق العباد میں کمی کرنا۔
۲۔ کھرے دراہم و دنانیر (روپے پیسے) چھپا کر کھوٹے دینا وغیرہ وغیرہ بھی زمین پر فساد ڈالنے کے معنے میں ہے۔
بَقِيَّتُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا جو بچ رہے۔ یعنی ترک حرام کے بعد حلال کا نزکہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمایا۔
حلِ لغات: بقیۃ بروزن فعیلۃ بمعنے مفعول ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف کرنے میں اس کی شرافت و بزرگی مطلوب ہے۔ جیسے بیت اللہ، ناقۃ اللہ وغیرہ میں اضافت تشریفی ہے اس لیے کہ کیل و وزن میں صحیح طریقہ اختیار کرنے سے جو رزق حلال طیب نصیب ہوگا وہ شرافت و بزرگی کا مستحق ہے اس لیے کہ اسی سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔
خَيْرٌ لَّكُمْ تمہارے لیے بہتر ہے اس سے جو تم کیل و وزن میں گھٹا بڑھا کر لوٹ مار کر کے جمع کرتے ہو۔ اس لیے کہ وہ تو ملیا میٹ ہو جائیں گے بلکہ وہ الٹا تمہارے لیے وبالِ جان ثابت ہوں گے اگرچہ تم سمجھتے ہو کہ تم اس سے بہت بڑے فائدے حاصل کر رہے ہو۔ کما قال تعالیٰ:

یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات۔

(اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور خیرات کو بڑھاتا ہے)

مسئلہ: شرح الشرعہ میں ہے کہ انسان کو چاہیے کہ خرید و فروخت میں مکر و حیلہ اور دھوکہ سازی وغیرہ نہ کرے کیونکہ اس طرح رزق بڑھنے کی بجائے بے برکتی ہوگی۔

اعجوبہ: بہت سے لوگ تھوڑا تھوڑا کر کے کئی مکروں اور حیلوں سے مال جمع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ڈھیروں کے ڈھیر ایک لمحہ میں کسی سبب سے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس طرح مال و دولت تو گئی سو گئی لیکن اس جمع کردہ مال کا گناہ سر پر۔

حکایت و اعجوبہ ایک شخص دُودھ میں پانی ملا کر بیچتا رہا۔ اس سے بہت کمائی کی۔ ایک رات شدید سیلاب آگیا تو اس کا بیل پانی میں ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔ اس کی چھوٹی سی بچی نے کہا، ابا! یہ سیلاب کا پانی نہیں بلکہ یہ وہی پانی ہے جو تم دُودھ میں ملایا کرتے تھے وہ سارے کا سارا جمع ہو کر بشکلِ سیلاب نمودار ہوا اور اس نے ہمارے بیل کو مار ڈالا۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ اگر تم ایمان لاؤ۔ یعنی اگر تم صحیح طور بھر تول کرو تو اس سے تمہیں بھلائی اس وقت نصیب ہوگی جب تم ایمان کی دولت سے نوازے جاؤ گے۔ اس سے پھر تمہارے اس نیکی کے کام سے ثواب بھی ہوگا اور عذاب سے نجات بھی۔ کیونکہ ان باتوں کے لیے ایمان ضروری ہے ورنہ کافر تو دائمی عذاب میں مبتلا ہوگا۔ نہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب اور نہ ہی ثواب کی امید، خواہ وہ بھر تول میں کسی قسم کی خیانت نہ کرے یا اور بہت بڑی نیکیوں کا سرمایہ جمع کرے اس لیے کہ کفر کسی قسم کی نیکی قبول نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی دائمی عذاب سے بچاؤ ہوسکتا ہے۔ یا مؤمنین بمعنے مصدقین ہے۔ یعنی اگر تم میری بات کی تصدیق کرو تو تمہارے لیے بھلائی ہوسکتی ہے۔ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ اور میں تمہارے لیے محافظ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ میں تمہیں ہر قسم کے گناہ اور معاصی وجرائم سے بچاؤں بلکہ میں تو مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہیں بھلائی پر آگاہ کروں اور میں مامور من اللہ ہوں کہ میں تمہیں خیر خواہانہ مشورے دوں۔ اور ان سب سے میں سبکدوش ہو چکا ہوں۔ ؎

من آنچہ شرط بلاغست با تو میگویم
تو خواہ سخنم پند گیر و خواہ ملال

ترجمہ: میں نے تو خیر خواہانہ طور پر وعظ کر دیا اب یہ تیری مرضی تُو اس سے نصیحت حاصل کر یا ملول ہو۔

سبق: عدل وانصاف زمین پر اللہ تعالیٰ کا ترازو ہے اور عدل جس طرح احکام میں ہوتا ہے ایسے ہی معاملات میں بھی ضروری ہے۔ جو اس سے روگردانی کرے گا اس کا سخت مواخذہ ہوگا۔ اسی لیے سالک پر ضروری ہے کہ وہ ظلم سے بچے۔ ظلم سے دوسرے کو ضرر دینا مراد ہے۔ اس معنے پر عدل کا معنیٰ یہ ہوا کہ کسی کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچاؤ۔

ف: حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر بھرنے تولنے والا جہنم میں ہوگا۔ آپ سے پُوچھا گیا: کیوں؟ آپ نے فرمایا، اس لیے کہ ہر تولنے والا صحیح نہیں تولتا۔ ہر بھرنے والا صحیح نہیں بھرتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ویل للمطففین۔ خرابی ہو کم وبیش بھرنے تولنے والوں کے لیے۔

ف: حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس علاقہ کے لوگ صحیح بھر تول کرتے ہوں وہاں زیادہ تر قیام رکھو اور جس علاقہ کے لوگ بھر تول میں کمی بیشی کرتے ہوں وہاں نہ ٹھہرنا اچھا ہے اگر ٹھہرنا ہے تو بہت کم ٹھہرو۔

حدیث شریف جس قوم کو خیانت کی عادت ہو اس پر غیروں کا رعب چھا جاتا ہے اور جہاں زنا کا مرض ہو وہاں موت بکثرت واقع ہوتی ہے اور جہاں بھر تول میں کمی بیشی ہو وہاں رزق میں بے برکتی ہو جاتی ہے اور جو حاکم ناحق فیصلہ کرتا ہے اس علاقہ میں خونریزی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور جو قوم عہد شکنی کرتی ہے اس پر دشمن کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔

ف : ختر بمعنے نقض العھد وغدر۔ یعنی عہد شکنی۔ (کذا فی الترغیب)

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ ولا تنقصوا المکیال والمیزان محبت کا پیمانہ ہے۔ طلب الٰہی کے ترازو میں کمی نہ کرو۔ صوفیا کرام نے محبت کو پیمانے سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ محبتِ الٰہی کا بھی ایک پیمانہ ہے جسے ماسوی اللہ کی عداوت کہا جاتا ہے۔ جیسے حضرت خلیل علیہ السلام نے اظہارِ خُلت فرماتے ہوئے کہا فانھم عدو لی الا رب العٰلمین۔

اسی طرح جو سالک اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ کسی دُوسرے کو شریک کرتا ہے تو سمجھو کہ وہ پیمانۂ محبت میں کمی کر رہا ہے۔ اسی طرح طلب الٰہی کا ترازو بھی ہے یعنی شریعت و طریقت کے نقشِ قدم پر چلنے کو صوفیاء کرام میزان کہتے ہیں۔ اسی لیے اہلِ تصوف کہتے ہیں کہ جو دو قدم مکمل طور پر چلتا ہے وہ واصل ہے۔ اور جو ان دونوں میں نقص کرتا ہے اسے ناقص المیزان کہا جاتا ہے۔

سبق : سالک پر لازم ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے طریقوں کو اپنائے اور ان کے نقشِ قدم پر چلے۔ اسی کا وہ مامور ہے۔ اور وصول الی اللہ کی شرط اول یہی ہے اور اس کے لیے امانت و استقامت بھی ضروری ہیں اور حق والے کا حق ادا کرنا بھی اس پر لازم ہے۔ عدل و انصاف کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے صحیح ترازو سے تولے اور کامل پیمانے سے بھرے۔ تب کہیں اپنے مالک و مولیٰ کی درگاہ میں قبولیت حاصل کرے گا۔ دنیا میں اہلِ حق کا ممدوح ہوگا اور آخرت میں اسے وہی زندگی نصیب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے سعادت مند بندوں کو حاصل ہوگی۔ اور اس کا خاتمہ بھی ایمان پر ہی ہوگا۔ اس کے برعکس جو ظلم، فریب، دھوکہ، خیانت، تکبر اور دیگر برائیوں میں لگا رہے گا اسے مالک و مولیٰ قبول نہیں کرے گا۔ دنیا میں مذموم کہا جائے گا۔ آخرت میں سخت عذاب و عقاب میں مبتلا ہوگا۔ اگر عفو و کرم ہو جائے تو وہ الگ بات ہے اور جو بدبخت ہو کر زندگی بسر کرے گا وہ مرے گا تو بدبخت ہو کر، محشر میں اُٹھے گا تو بدبخت ہو کر۔

مثنوی شریف میں ہے:

چوں ترازوے تو کژ بود و دغا
راست چوں جوئے ترازوے جزا
چونکہ پائے چپ بود در غدر و کاست
نامہ چوں آید ترا در دست راست

چوں جزا سایہ است ای قد تو خم
سایہ تو کژ فتد در پیش ہم

ترجمہ : جب تیرا اپنا ترازو ہی ٹیڑھا ، کھوٹ اور دھوکہ والا ہے تو جزا کے ترازو کے یہ سا ستی کی امید کیسی۔

جب تیرا قدم ہی غداری اور دھوکہ پر ہے تو پھر تیرا اعمال نامہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیسے آئے گا۔

جب جزا کا سایہ ٹیڑھے قد کی علامت ہے تو سایہ ٹیڑھا ہی پڑے گا جبکہ قدم ٹیڑھا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مروی ہے کہ انبیاء علیہم السلام دو قسم کے ہیں :

۱۔ بعض کو کفار سے جنگ کا حکم ہوا جیسے موسیٰ ، داؤد اور سلیمان علیہم السلام ۔

۲۔ بعض کو جنگ کا حکم نہیں ہوا صرف وعظ و نصیحت پر اکتفا کیا گیا۔ شعیب علیہ السلام اس دوسرے گروہ سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام دن کو اپنی امت کو وعظ و نصیحت فرماتے رات کو یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔

اسی لیے آپ کی قوم نے آپ سے کہا : اے شعیب ! اَصَلٰوتُكَ کیا تمہاری نماز تَاْمُرُكَ تمہیں حکم دیتی ہے۔ امر کا اسناد صلوٰۃ کی طرف استہزاءً کیا۔ اس سے ان کا ٹھٹھا مسخری کرنا مطلوب تھا۔ حقیقی طور پر استفہام کر کے سوال نہیں کر رہے تھے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ کیا تمہاری نماز تمہیں ہمارے وعظ و نصیحت پر اکساتی ہے۔ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا کیا ہم چھوڑ دیں بتوں کی پرستش جسے ہمارے آباؤ اجداد وراثۃً عرصۂ قدیم سے پوجتے چلے آرہے ہیں۔

سوال : حضرت شعیب علیہ السلام نے انھیں بتوں کی پرستش سے روکا تو نہیں تھا انھوں نے تو صرف اتنا فرمایا کہ اعبدوا اللّٰہ۔

جواب : پہلے قاعدہ عرض کیا گیا ہے کہ امر مذکور ہو تو وہ نہی کو متضمن ہوتا ہے۔ اگر نہی مذکور ہو تو وہ امر کو متضمن ہوتی ہے۔ جب شعیب علیہ السلام نے انھیں ایک معبود کی عبادت کا امر فرمایا تو گویا یوں بھی فرمادیا کہ بت پرستی ترک کردو۔

اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط اور جو کچھ اور جیسے ہم اپنا مال چاہیں کریں تمہیں اس سے کیا تعلق ہے یہ شعیب علیہ السلام کی اس نصیحت کا جواب ہے جبکہ آپ نے انھیں فرمایا کہ حقوق العباد میں کوتاہی نہ کرو اور نہ ہی کیل و وزن میں کمی بیشی۔

ف : اس کا ماقبل پر عطف ہے اور اَوْ بمعنے واؤ ہے اس لیے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کی مجموعہ خرابیوں کا ذکر صرف ایک لفظ میں ادا کر کے انھیں (امر) فرمایا تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم اپنے مال کے مالک ہیں اس میں جس طرح کا تصرف چاہیں کر سکتے ہیں۔ تم کون ہو روکنے والے۔

ف : بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ دراہم و دنانیر سے کچھ حصہ کاٹ کر دوسروں کو دیتے تھے اور کٹے ہوئے حصے سے بھی فائدہ حاصل کر لیتے اور دراہم و دنانیر کی بھی پوری رقم کھری کر لیتے۔ اس سے شعیب علیہ السلام نے انھیں روکا تو انہوں نے یہی

جواب دیا۔

۱۔ زمین سے سب سے پہلے لوہا، سونا، چاندی نکالنے والا شنک نامی تھا جو بہت بڑا نیکبخت اور داعی الی الاسلام

اعجوبے بادشاہ تھا۔ وہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے میں گزرا ہے۔

۲۔ سونے اور چاندی پر سب سے پہلے مُہر لگانے والا ضحاک بادشاہ ہے۔

مسئلہ: چاندی سونے کے مہر شدہ سکے میں خرابی پیدا کرنا در اصل زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔

حجاج بن یوسف ظالم سے کسی نے پوچھا کہ اتنے بڑے جرائم و معاصی کے باوجود تمہیں اپنی نجات کی امید بھی ہے۔

حکایت اس نے کہا: ہاں، بہت سے اعمال میں نے ایسے بھی کیے ہیں جن سے مجھے اپنی بخشش کی بہت بڑی امید ہے۔

منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ میں نے خلقِ خدا کو روپے پیسے کے معاملے میں دھوکہ و فریب سے کام نہیں لیا۔

اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ○ ہاں بیشک تم بڑے عقلمند اور نیک چلن ہو۔

ف: الرشید مدین کی لغت میں سفیہ احمق کو کہا جاتا ہے۔ (کذا فی ربیع الابرار)

ف: کواشی میں ہے کہ قوم نے کہا کہ تم اپنے آپ کو بڑا دانشور اور نیک خو سمجھتے ہو، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یعنی نہ تم دانشور ہو نہ نیک چلن۔ جن امور کے متعلق تم ہمیں نصیحت کرتے ہو اس میں تم حق بجانب نہیں ہو بلکہ ہمیں غلط راستے پر لگانا چاہتے ہو۔

ف: بعض اہل تفاسیر نے کہا کہ الرشید سے ان کی مراد یہ تھی کہ شعیب علیہ السلام گمراہ اور غلط راہ پر ہیں۔ اسی بناء پر اچھے القاب "الحلیم الرشید" کہہ کر ان سے تہکم، تمسخر اور استہزاء کیا ہے۔ جیسے ایک بخیل سے تہکم کر کے کہا جائے لو ابصرك حاتم لتعلم منك الجود۔ اگر تمہیں حاتم اپنے زمانے میں پاتا تو تمہیں سخاوت میں اپنا استاذ مانتا۔ یا جاہل سے کہا جائے آپ ہیں مولانا۔ یا کسی جلد باز سے کہا جائے حلیم الطبع وغیرہ وغیرہ۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ یہ استعارہ تبعیہ کے قبیل سے ہے کہ علیٰ سبیل الاستہزاء متضاد کو بمنزلہ متناسب قرار دے کر اس پر بھی لوازمات استعمال کیے گئے ہیں۔ گویا حلم اور رشد کو سفہ اور غوایۃ کے لیے استعارہ کر کے شعیب علیہ السلام کو حلیم و رشید سے موصوف کیا گیا۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اے میری قوم! مجھے بتاؤ اِنْ کُنْتُ اگر میں ہوں۔

ف: شک کا لفظ کفار مخاطبین کی وجہ سے ہے۔ اس کی تشریح ہم نے پہلے عرض کر دی ہے۔

عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ میں اپنے رب تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن دلیل پر۔ اس سے نبوت و رسالت مراد ہے۔ اور یہ جواب دے کر آپ اپنی قوم کے اس قول کا رد کرنا چاہتے ہیں جبکہ انھوں نے بکواس کی کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے بیکار ہے وَرَزَقَنِیْ مِنْہُ اور اس نے اپنی طرف سے مجھے عطا کیا ہے رِزْقًا حَسَنًا اچھا رزق یعنی نبوت و حکمت۔

ف : نبوت و حکمت کو رزق حسن سے تعبیر کرنے میں تنبیہ ہے کہ اے کافرو ! تم جانتے ہو کہ یہ دونوں مضبوط اور مستحکم دلیل کے ساتھ میرے لیے ثابت ہیں۔ تم بھی معترف ہو تو جو کچھ ان کے ذریعے سے تمہیں بتایا جائے گا وہ میرے اور تمہارے لیے بہتر و اعلیٰ ہوگا۔

ف : بعض مفسرین نے بتایا کہ اس سے حضرت شعیب علیہ السلام کی مراد اپنا حلال مال اور پاک رزق مراد ہے کہ اس میں ناپ و تول کی کمی بیشی کے بغیر ہی کتنی برکت ہے جس کے تم بھی معترف ہو تو پھر خواہ مخواہ تم کیوں حرام کے مرتکب ہو کر غضبِ خدا وندی کو دعوت دیتے ہو۔ حضرت شعیب علیہ السلام کثیر المال والاسباب تھے۔

ف : شرط کا جواب محذوف ہے۔ اس کے محذوف ہونے پر قصۂ نوح و لوط علیہما السلام اور محلِ کلام دلالت کرتے ہیں۔ اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ اے میری قوم ! مجھے بتاؤ کہ اگر میں ایک واضح اور روشن راہ پہ ہوں اور نبوت و حکمت سے بھی نوازا جاؤں تو کیا میرے لائق ہے کہ میں بھی تمہاری طرح حلال مال کے ساتھ حرام ملاؤں اور پھر تمہیں توحید کا اقرار کرنے ، بتوں کی پرستش سے باز رہنے ، برائیوں سے اجتناب کرنے اور عدل و انصاف کا حکم دوں۔ اور انبیاء علیہم السلام تو اسی لیے بھیجے جاتے ہیں جیسے میں تمہیں وعظ و تبلیغ کر رہا ہوں۔

وَمَا أُرِيدُ اور کمی و بیشی کی ناپ و تول سے روکنے کا میرا ارادہ یہ نہیں أَنْ أُخَالِفَكُمْ کہ میں تمہاری مخالفت کروں درانحالیکہ میں مائل ہوں إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ اس کی طرف جس سے میں تمہیں روکتا ہوں۔

ف : یہ اس محاورہ سے ہے :

خالفت زیداً۔

یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی کسی کام کا ارادہ کر رہا ہو۔ لیکن تم اسے روک کر پھر خود اس کا ارتکاب کرو۔ خلاصہ یہ کہ شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہیں ناپ تول کی کمی بیشی سے روک کر خود اس کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بس تمہارے لیے وہی پسند کر رہا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ بھلا وہ بھی کوئی واعظ ہے جو لوگوں کو نصیحت کے پل باندھ دے لیکن خود بدعمل ہو۔

حدیث شریف احیاء العلوم شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے بذریعہ وحی فرمایا کہ اے عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) ! پہلے خود عمل کرو پھر دوسروں کو کہو ورنہ میرے سے حیا کرو۔ حضرت حافظ شیرازی قدس سرہ نے فرمایا : ؎

؎

واعظان کیں جلوہ در محراب منبر می کنند

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند

ترجمہ: واعظین ومقررین حضرات جو محراب ومنبر کی زینت بنتے ہیں اور لچھے دار تقریریں کر کے لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے ہیں لیکن خود بیچارے بے عمل ہوتے ہیں۔ ان کی خلوت میں حالت کچھ اور ہوتی ہے۔ مجھے دانشور اور مجلس وعظ میں باز پرس کرنے والے سے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ دوسروں کو تو توبہ کرنے پر بڑا زور دیتے ہیں لیکن خود اپنے گناہوں سے تائب نہیں ہوتے۔

اِنْ اُرِیْدُ میں نہیں چاہتا اس سے کہ جن پر خود عمل کرتا ہوں اور برائیوں سے رکتا ہوں اِلَّا الْاِصْلَاحَ مگر اصلاح کا یعنی میرا وعظ ونصیحت سے مقصود محض یہ ہے کہ تم سنور جاؤ مَا اسْتَطَعْتُ جتنا میری طاقت میں ہے کہ تمہیں سنوار سکوں۔

ف: بحر العلوم میں ہے کہ ما مصدر ظرف کے قائم مقام ہے یعنی اپنی استطاعت کی حد تک میں تمہاری اصلاح کرتا رہوں گا۔ اور جہاں تک ممکن ہوا تمہیں تمہارے فائدے کی باتیں بتاتا رہوں گا۔ اور اسی میں تمہاری مصلحت ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

بگو آنچہ دانی سخن سود مند
وگر ہیچ کس نیابد پسند

ترجمہ: جو بات تمہیں مفید نظر آتی ہے کہہ ڈالو اگرچہ کسی کو پسند نہیں آتی۔

تفسیر عالمانہ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ یہ مصدر مبنی للمفعول ہے۔ یعنی تمہاری اصلاح کی تحقیق پر میں توفیق دیا ہوا نہیں۔ اِلَّا بِاللّٰہِ مگر اللہ تعالیٰ کی تائید وامداد سے۔ یعنی درحقیقت اصلاح اسی نے ہی کرنی ہے میں تو صرف ظاہری سبب ہوں۔

فائدہ: توفیق متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی لام اور باء کے واسطہ سے بھی۔ لغت میں بمعنے خیر کا راہ آسان کرنا اور عرف میں انسان کا اچھا فعل تقدیر کے موافق ہونا اور اتفاق تقدیر کے موافق ہونا، تقدیر بری ہو یا بھلی۔

ف: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ بندے کا عنایت ازلیہ ورعایت ابدیہ سے مخصوص ہونا۔

عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ میں نے اس کام میں صرف اللہ تعالیٰ پر سہارا کیا ہے اس کے ماسوا سے بالکل منہ پھیر لیا ہے اس لیے کہ صرف وہی ہر شے پر قادر ہے اس کے ماسوا کو ذاتی طور پر کوئی قدرت نہیں وہ عاجز محض ہیں بلکہ معدوم اور بالکل ساقط الاعتبار۔ اسی لیے اس کے غیر سے استمداد کا کیا معنیٰ۔ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ○ اور جس مقصد کے درپے میں ہوں اس کے جملہ امور میں صرف اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ف: میرا حق وصواب پر موفق ہونا اور ہر کام کا امر اور ہر فعل کی نہی پر میرا مصیب ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی تائید و امداد پر ہے۔ علیہ توکلت میں توحید کے مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جو مبدا کے علم کا آخری مرتبہ ہے۔ والیہ انیب

میں اشارہ ہے کہ اپنے نفس کی جملہ خرابیوں کے جملہ امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں تو کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

توکل کے مراتب

توکل کے تین مراتب ہیں:

۱۔ عوام کا توکل۔ معاش کے بارے میں اسباب کا ترک۔

۲۔ متوسط کا توکل۔ طلب عیش مع اللہ میں طلب معاش کا ترک۔

۳۔ منتہی کا توکل۔ اپنے وجود کو وجود الٰہی میں اور اپنے اختیار کو اختیارِ حق میں فنا کر دینا بلا ہُو ہُوِیّت میں باقی رہنا اسباب میں تصرف کرنا۔ لیکن اس تصرف اور اسباب کو مسبب الاسباب کا تصرف سمجھنا۔

فائدہ صوفیانہ

تاویلات قاشانیہ میں ہے کہ مراتب توحید کا پہلا مرتبہ توحید افعال ہے اس کے بعد مرتبہ توحید صفات، اس کے بعد مرتبہ توحید ذات ہے، یہ سب کے بعد اس لیے ہے کہ ذات صفات سے اور صفات افعال سے اور افعال آثار و اکوان سے محجوب ہیں۔ پس جس سے حُجب اکوان اُٹھ گئے اور اس پر افعال متجلّی ہوئے تو اس کو توکل کا درجہ نصیب ہوا، اور جس سے حجب افعال اُٹھ گئے اور صفات کے تجلیات نصیب ہوئے تو وہ رضاؔ و تسلیم سے نوازا گیا اور جس پر حجب صفات منکشف ہوئے اور تجلیات ذات سے متجلی ہوا تو وہ وحدت میں پہنچ گیا اور حقیقی موحد مطلق اسی کو کہا جاتا ہے۔

ف

تا نہ نخوانی لا و الا اللہ

در نیابی منہج ایں راہ را

عشق آں شعلہ است کو چون بر فروخت

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل حق براند

در نگر آخر کہ بعد از لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت

شاد باش اے عشق شرکت سوز و رفت

ترجمہ: جب تک لا و الا اللہ کو غور سے نہ پڑھا جائے اس طریق تک تمہیں راستہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ عشق وہ شعلہ ہے کہ جب چمکتا ہے تو معشوق کے سوا باقی ہر شے کو جلا کر راکھ بنا دیتا ہے۔ لا کی تلوار سے سب غیر حق کو قتل کر دو۔ پھر دیکھو کہ لا کے بعد کیا رہا۔ ہاں صرف الا اللہ باقی رہ گیا۔ باقی ہر شے رخصت ہو گئی۔ اے عشق خوش باش کہ تو شرکت سوز ہے کہ غیر کو تیرے سامنے گم ہونا پڑتا ہے۔

سبق: سالک پر لازم ہے کہ وہ طریقِ حق میں اذکار نافعہ اور اعمال صالحہ میں جد و جہد کرے تاکہ توحید حقیقی کے مقام تک

پہنچنا نصیب ہو۔ جب یہ مرتبہ نصیب ہوتا ہے تو سالک انبیاء و کاملین کی طرح وعظ و نصیحت کے طریقہ کو جاری کرتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ غلامانِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کثرت ہو اور ارکانِ عالم کو عدل سے مضبوطی نصیب ہو اور لوگوں کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے نظام میں شمولیت کا موقعہ حاصل ہو۔ وہی ہدایت کا مالک ہے وہی سب کا خالق ہے اور اسی کی طرف رجوع اور واپس لوٹنا ہے۔

وَيٰقَوْمِ اور اے میری قوم! لَا يَجْرِمَنَّكُمْ جرم سے مشتق ہے بمعنے کسب۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

جرم زید ذنبا۔

(زید نے گناہ کا کام کیا)

اور کہا جاتا ہے:

جَرَمْتُهٗ ذَنباً ای اکتسبت ایاہ۔

یہ متعدی بیک مفعول و بدو مفعول دونوں طرح مستعمل ہے۔ آیت میں مفعول اوّل کاف ضمیر خطاب سے ہے اور دوسرا آگے آرہا ہے۔ لا یجرمنکم بمعنے یکسبنکم۔ شقاقی یہ لا یجرمنکم کا فاعل ہے۔ یعنی میرے ساتھ اختلاف و عداوت تمہیں نہ اکسائے اَنْ يُّصِيْبَكُمْ بمعنے بنالکم۔ یہ یجرمنکم کا دوسرا مفعول ہے۔ یہ اس محاورہ سے ہے جو اہل عرب کہتے ہیں:

جرمنی فلان علیٰ ان صنعت کذا۔

یہاں پر جرمنی بمعنے حملنی ہے۔ اس معنے پر لفظ علیٰ ان سے پہلے محذوف ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ تمہیں برانگیختہ نہ کرے میری دشمنی سے تمہیں پہنچے مِّثْلَ یہ ان یصیب کا فاعل اور مضاف مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ مضاف الیہ ہے۔ یعنی مثل اس کے جو پہنچا تھا قومِ نوح کو، کہ جیسے وہ طوفان میں غرق ہوئے تم بھی ایسے ہی غرق ہو جاؤ۔ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ یا جیسے ہود کی قوم ہوا میں برباد ہوئی تم بھی برباد ہو جاؤ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ یا جیسے قومِ صالح، کہ جیسے وہ صَیْحَۃ سے مارے گئے تم بھی مارے جاؤ۔ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ اور نہیں لوط کی قوم مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ۝ تم سے دور۔

ف: جوہری نے کہا کہ قوم کا لفظ مذکر و مونث دونوں طرح مستعمل ہے۔

یعنی وہ کفر و معاصی کی وجہ سے ابھی تھوڑے دن ہوئے تباہ و برباد ہوئے اور وہ تو ہلاک ہونے میں بہت زیادہ قریب ہیں۔ اگر پہلی اُمتوں سے تم عبرت نہیں پکڑتے تو ان قریبی زمانہ کے ہلاک شدگان سے ہی عبرت حاصل کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ کفر و معصیت کے مرتکب ہو کر ان کی طرح برباد ہو جاؤ۔

تفسیر صوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ انسان طبعاً حریص ہے۔ جس امر سے اسے روکا جائے اس پر عمل کرنے کی حرص کرتا ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام کو اکل شجر سے روکا گیا مگر انھوں نے کھا لیا۔ انہی دو وجوہ یعنی امر سے اباء اور نہی پر حرص کی وجہ سے جب اسے حکم دیا جاتا ہے تو انکار بلکہ بسا اوقات تکبر کا ارتکاب کر جاتا ہے۔ اور

جب اسے کسی فعل سے روکا جاتا ہے تو اس کے ارتکاب کے لیے حرص کرتا ہے۔ بالخصوص اپنے جیسے انسان سے امر و نہی ہو تو مزید نفرت ورزی کرتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا نفس پر اتنا گراں نہیں جتنا مخلوق کا حکم ماننا اس پر دشوار ہوتا ہے۔ کیونکہ فطری طور پر کسی کے زیر فرمان ہونا ذلت و خواری اور نفس پر بارِ گراں محسوس ہوتا ہے۔ پھر خالق کا حکم سے تو نفس برداشت کر لیتا ہے لیکن اپنی ہم مخلوق کا حکم برداشت کرنا اس کے لیے دوبھر ہو جاتا ہے۔

نکتہ: انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ بندوں کو حکم ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ جسے توفیق ایزدی حاصل ہوتی ہے اور عنایت ازلیہ تائید کرتی ہے تو امر و نواہی کی پابندی کرتا ہے اور رسل کرام علیہم السلام کے لائے ہوئے احکام کو مانتا ہے تو اس کی برکت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ مخلوق کی ظلمانی صفات سے نکل کر روحانی صفات کے نور میں داخل ہو جاتا ہے اور جسے شقاوتِ ازلی نصیب ہوتی ہے تو وہ رسوائی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہمیشہ نفس و طبع کے زیر فرمان چلتا ہے اسے نہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نصیب ہوتی ہے نہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کا پاس ہوتا ہے بلکہ رسل کرام علیہم السلام کی دعوت سے روگردانی کرتا ہے اور ان کے ساتھ سرکشی سے پیش آتا ہے۔ ان سے نہ صرف مخالفت بلکہ مخاصمت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ○ یعنی تمہارا اور قوم لوط کا معاملہ اور ان کے کردار اور تمہارے کردار میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ الکفر ملة واحدة کے مطابق تم سب ایک جنس ہو اور کفر کی صفات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

مثنوی شریف میں ہے: ؎

پس وصیت کرد و تخم وعظ کاشت

چوں زمین شاں شورہ بد سودی نداشت

گرچہ ناصح را بود صد داعیہ

پند را اذنی بباید واعیہ

تو بصد تلطیف و پندش میدہی

او ز پندت میکند پہلو تہی

یک کس نا مستمع را ستیز و رد

صد کس گوینده را عاجز کند

ز انبیا ناصح تر و خوش لہجہ تر

کے بود کہ رفت دمشاں در حجر

زانچہ کوہ و سنگ در کار آمدند
می نشد بدبخت را بکشادہ بند
آنچناں دلہا کہ بدشان ما و من
نقشاں شد بل اشد قسوۃ

ترجمہ : بہت وعظ فرمایا اور بہت نصیحتیں کیں لیکن چونکہ ان کی زمین شور تھی اس لیے وعظ و نصیحت بے اثر ثابت ہُوئی۔ اگرچہ ناصح کتنا ہی موثر واعظ کیوں نہ ہو جب تک سامعین سننے کی اہلیت اور اثر پذیری کی قوت نہ رکھتے ہوں تو اس کی نصیحت بیکار۔ اگر کوئی مُصِر ہو کر کسی مسئلہ سے انکار کرے تو سینکڑوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ بھلا انبیاء علیہم السلام سے کوئی بڑا واعظ اور خوش لہجہ ہو سکتا ہے! لیکن ان کی باتوں کو بھی کافروں نے نہ سُنا بلکہ برسر پیکار ہو کر ان پر خشت باری کی۔ اُنھیں کی بدبختی کی داستانیں تا حال بل اشد قسوۃ (یعنی سنگدل لوگ) سے مشہور ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اور اپنے رب تعالیٰ سے بخشش مانگو۔ یعنی ایمان قبول کر کے اس سے بخشش کی طلب کرو ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ پھر اپنی موجودہ حالت کو بدلو۔ گناہ ترک کر دو۔ بُت پرستی چھوڑ دو اور پہلے ایمان اس لیے ضروری ہے کہ ایمان کے بغیر توبہ و استغفار بیکار ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لا کر استغفار کرو، اس کے بعد طاعت میں ترقی کرو۔

صُوفیانہ تقریر تاویلات نجمیہ میں ہے کہ صفات کفر سے استغفار کرو اور کفر کے تمام معاملات ختم کر ڈالو ان کے بجائے اسلام کے صفات اختیار کرو اور اسی کے معاملات اپناؤ اس لیے کہ اسلام ہی تمہارے اندر پاکیزہ اوصاف پیدا کرے گا۔ اور تمہارے اندر جتنے گندے صفات ہیں سب کے سب اسلام کی برکت سے مٹ جائیں گے۔ پھر شریعت و طریقت کے نقشِ قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف چلو وُہ تمہیں حقیقت کے زیورات سے سنگار رے گا یعنی فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہو جاؤ گے۔

اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ بیشک میرا رب تعالیٰ اہلِ ایمان اور تائبین کے لیے عظیم الرحمۃ ہے۔ ودودٌ ان سے بہت بڑا لطف و احسان کرتا ہے۔ جیسے ایک پیارا دوست کسی پیارے دوست سے لطف و کرم کرتا ہے اس سے بھی بڑھ کر اس کریم کی کریمی ہے ان بندوں پر جو اس پر ایمان لاتے اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔

ف : المفاتیح میں ہے الودود الواد کا مبالغہ ہے۔ وادّ بمعنے تمام مخلوق کے لیے بھلائی چاہنے اور ان پر احسان کرنیوالا۔ بعض کے نزدیک الودود بمعنے المحب لاولیائہ یعنی اپنے پیاروں سے محبت کرنے والا۔ محبت عام ہوتی ہے اور وداد خاص ارادہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور بندے کا ودود ہونا بایں معنیٰ ہے کہ جو کچھ اپنے لیے چاہے وہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق

کے لیے چاہیے اور ان کے ساتھ حسبِ طاقت احسان کرے اور اللہ والوں سے محبت کرے۔ بلکہ افضل یہ ہے کہ انھیں اوپر ترجیح دے، یہاں تک کہ اس کی طبیعت چاہے کہ کاش اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے وہ جہنم کا پُل بن جائے جس پر سے وہ گزر کر وہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ (کذا فی المقصد الاسنیٰ للغزالی قدس سرہٗ)

ف : کاشفی نے لکھا ہے کہ قطب الابرار مولانا یعقوب چرخی قدس سرہٗ اسماء اللہ تعالیٰ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ودود اس لیے ہے کہ وُہ اپنی مخلوق سے بوجہ نیکی کے محبت کرتا ہے اور نیک لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ہے۔ یعنی وُہ نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے اور نیک لوگ اس سے۔

نکتہ : بندوں کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کی فرع ہے اس لیے کہ غور سے دیکھا جائے تو یقین ہو جائے گا کہ محبت احسان وکرم سے پیدا ہوتی ہے اور احسان وکرم صرف وہی کرتا ہے۔ اگر کسی سے یہ افعال سرزد ہوتے ہیں تو وہ بھی اسی کا فضل وکرم ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی پوتے سے پیار کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ اس کے بیٹے کا بیٹا ہے اس سے ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ پوتے کی محبت بیٹے کی محبت کی فرع ہے۔ اس سے یحبھم و یحبونہ کا نکتہ بھی اسی طریق سے بیان کیا جا سکتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا۔ ؎

اے حسن تو دادہ یوسفاں را خوبی
وز عشق تو کردہ عاشقاں یعقوبی
گر نیک نظر کند کسے غیر تو نیست
در مرتبہ محبی و محبوبی

ترجمہ : تیرے حُسن نے محبوبوں کو محبوبی بخشی اور تیرے عشق سے عاشقوں کو عشق نصیب ہُوا۔ اگر کوئی غور سے دیکھے تو غیر کوئی نہیں۔ محب بھی وہی ہے اور محبوب بھی وہی۔

نکتہ : اگر اللہ تعالیٰ میں محبت نہ ہوتی تو کسی کو ہدایت نصیب نہ ہوتی۔ یہی محبت تو ہے کہ وہ اپنے بندے کی توبہ سے خوشی کا اظہار فرماتا ہے۔

حکایت و روایت

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس بندے سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو کسی ویران علاقے میں اُترے اور اس کے ساتھ اُونٹنی ہو جس پر کھانے پینے کا سامان لدا ہُوا ہو۔ تھکان کی وجہ سے وہ شخص اسی ویرانہ میں سو جائے، نیند سے جاگے تو دیکھے کہ اس کی اُونٹنی کا سامان گم ہو گیا ہو۔ تلاشِ بسیار کے باوجود نہ ملے، ادھر اسے بھوک پیاس ستائے ادھر موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ اور تپش۔ جان بلب ہو جائے۔ زندگی سے ہاتھ دھو کر سر بازو پر رکھ کر موت کا انتظار کرنے لگے لیکن اسے اونگھ آ جائے۔ بیدار ہو تو دیکھے کہ ناقہ مع سامانِ اکل و شرب اس کے سامنے موجود ہے۔ تو بتائیے اس کی خوشی کا کیا عالم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔

نکتہ صوفیانہ غفلت کے غلبہ سے جس کی سواری خواہشِ نفسانی کے جنگل میں گم ہو جائے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اصلی مکان یعنی فطرت اولیٰ کی طرف تسلیم اور اختیاری موت سے رجوع کرے۔ اس طرح اسے گمشدہ حقیقت حاصل ہو جائے گی۔

حدیث شریف کی صوفیانہ شرح حدیث شریف میں بدایۃ سے نہایۃ کی طرف اشارہ ہے۔ فاستیقظ میں سالک کی ابتداء کا اشارہ ہے اسی لیے کہ بیداری سالک کا ابتدائی حال ہے لیموت میں اس کی انتہا کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ فنا سالک کی سیر الی اللہ کی انتہا ہے فاستیقظ فاذا راحلۃ الخ میں بقاء بعد الفنا اور رجوع الی البشریۃ کی طرف اشارہ ہے۔

توبہ کے مراتب صوفیانہ توبہ کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ جمیع ماسوی اللہ سے فارغ ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کا بن جانا اس مقام پر نہ معصیت کی خبر ہوتی ہے نہ توبہ کی بلکہ توبہ سے توبہ کر لیتا ہے اس لیے کہ تصفیہ بہ یاد جفاء کا خیال دل سے آنا زدیتا ہے۔ علاوہ ازیں جب سالک کو حق تعالیٰ تجلیات سے نوازتا ہے تو اس کی نظروں میں ہر شئے لاشئی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بھی فانی پاتا ہے۔ جب وُہ اپنی ہستی سے بے خبر ہوتا ہے تو پھر اعمال سے اسے تعلق کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

مسئلہ: اللہ تعالیٰ ہر بندے کی توبہ قبول کرتا ہے بشرطیکہ حقیقی طور تائب ہو۔ اگر کوئی صرف لفظوں سے ہی توبہ کا اظہار کرے مگر دل میں اس کے خلاف ارادہ رکھتا ہو تو ایسے کاذب کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

حکایت و کرامت حضرت مالک بن دینار دو نوجوانوں سے گزرے جو لہو و لعب میں مصروف تھے۔ آپ نے دونوں کو نصیحت فرمائی۔ ان میں سے ایک نے کہا میں شیر ہوں مجھے کسی کا خطرہ نہیں۔ حضرت مالک بن دینار نے فرمایا: تیرے پاس ایک دن ایسا شیر آئے گا کہ جس کے سامنے تُو لومڑی ہو جائے گا۔ چند روز کے بعد وہ شخص بیمار ہو گیا حضرت مالک بن دینار اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس سے پُوچھا: کیا حال ہے؛ عرض کی: بخدا! آپ کے فرمان کے مطابق میرے ہاں شیر آیا ہے جس کے سامنے میں لومڑی ہو گیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تو پھر تُو توبہ کیوں نہیں کرتا اللہ تعالیٰ توّاب ہے وہ ہر ایک کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اس کے گھر کے ایک گوشے سے آواز آئی کہ اس کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس نے متعدد بار توبہ کر کے اسے توڑا ہے یہ سچے دل سے توبہ نہیں کرتا اسی لیے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی اور نہ ہوگی۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

توبہ آرند و خدا توبہ پذیر
امر او گیرند او نعم الامیر

ترجمہ : بندوں پر لازم ہے کہ وہ توبہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی توبہ قبول کرتا ہے اور اس کا حکم ماننا سب پر لازم ہے اس لیے کہ وہ بہتر امر فرمانے والا ہے۔

قَالُوْا یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔ یعنی کفار نے کہا یٰشُعَیْبُ اے شعیب علیہ السلام مَا نَفْقَهُ فقہ بمعنے معرفۃ غرض المتکلم متکلم کا مقصد سمجھنا یعنی ہم جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں کَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ بہت سی باتیں۔ مثلاً توحید اور ایفاء الکیل و الوزن وغیرہ، جو تم کہہ رہے ہو۔

سوال : مطلق باتوں کو تم نے توحید و ایفاء الکیل والوزن سے کیوں مقید کیا؟

جواب : وما یتبع اکثرھم الاظنا۔ اور وہ شعیب علیہ السلام اپنی اکثر باتوں میں گمان سے کام لیتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد وہی مذکورہ باتیں ہیں۔ بہرحال انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کی نصیحت پر طنز کرتے ہوئے ان کے کلام کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اے شعیب علیہ السلام! تم خیالی باتیں کرتے ہو یا ہماری سمجھ سے بالاتر بولتے ہو۔ یہ دونوں باتیں انھوں نے شعیب علیہ السلام کو غیر معتبر آدمی سمجھ کر کہیں، جیسے کسی کی بات کو کسی کھاتے ہیں نہ لکھا جائے تو اس کے بولنے پر اسے کہا جائے،

لا ندری ما تقول۔

ہم نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو۔

ورنہ شعیب علیہ السلام ان کے ہمزبان تھے وہ جو کچھ فرماتے تھے وہ لوگ بخوبی سمجھتے تھے اور اس کا معنیٰ و مطلب پورے طور پر جانتے تھے لیکن چونکہ شعیب علیہ السلام کا وعظ ان کے اور ان کے آباؤ اجداد کے عقاید اور مذہب کے خلاف تھا اسی لیے مذکورہ بالا بکواس کی۔

وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا اور ہم تمہیں اپنے مابین دیکھتے ہیں ضَعِیْفًا کمزور یعنی تو ہمارے مقابلے میں جسمانی قوت کے لحاظ سے کمزور ہے۔ اگر ہم تم پر حملہ کر دیں تو تمہیں ہمارے ساتھ مقابلہ کی ہمت و طاقت نہیں یا ہمارے ہاں تم کوئی باعزت انسان نہیں ہو کہ تمہاری عزت سے ہم تمہیں کچھ نہ کہہ سکتے ہوں۔ اس دوسرے معنے پر قوتِ جسمانیہ کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ بہت سے کمزور جسمانیت والے حضرات مالی، علمی یا کسی اور وجہ سے عزت کی بنا پر لوگوں میں معزز سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہی معنیٰ یہاں پر زیادہ موزوں ہے اس لیے کہ کفار کی نظروں میں نہ انبیاء علیہم السلام معزز ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے متبعین[1]۔

صوفیانہ تقریر تاویلات نجمیہ میں ہے ضعیف بمعنے ناقص الرای والعقل۔ کیونکہ عادت ہے کہ جیسے دانا بیوقوف کو بے عقل سمجھتا ہے تو بیوقوف بھی عاقل کو احمق سمجھتا ہے۔ (چنانچہ تجربہ کر کے دیکھ لو)

---

[1] یہی بیماری دیارِ ہند میں اسماعیل دہلوی کو لگی اس نے وراثت میں وہابیوں دیوبندیوں کو عنایت فرمائی۔ ۱۲

وَلَوْلَا رَهْطُكَ اور اگر رشتہ داروں کی عزت اور ان کی طرفداری ملحوظِ خاطر نہ ہوتی ۔

ف : شعیب علیہ السلام کی برادری کا اعزاز اس لیے ملحوظِ خاطر تھا کہ وہ ان کے دین پر تھے ورنہ وہ کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ سات ، نو یا دس ہوں گے ۔ کیونکہ رہط کا اطلاق تین سے دس تک ہوتا ہے ۔ تو ان معمولی آدمیوں سے خوف کیسا ۔ جبکہ وہ خود ہزاروں کی تعداد میں تھے ۔

لَرَجَمْنٰكَ تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر جان سے ختم کر دیتے ۔

ف : پتھر سے مارنے کی قید اتفاقی ہے کیونکہ کبھی مطلق قتل کو رجم سے تعبیر کرتے ہیں ۔ یا اس لیے کہ عالمِ دنیا کے سب سے پہلے انسان (ہابیل) کا قتل پتھر سے ہوا جبکہ اسے اس کے بھائی (قابیل) نے قتل کیا تھا ۔ اس کے بعد ہر قتل کو رجم سے تعبیر کیا جاتا ہے خواہ وہ پتھر سے قتل کیا جائے یا کسی اور چیز سے ۔

ف : حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا :

علم الانساب سیکھو اس سے تم اپنے اصول کو سمجھ سکو گے اور رشتہ داری کی حفاظت بھی آسان ہو گی ۔

ف : اہلِ عرب کہتے ہیں کہ صرف علم الانساب سے دشمنوں کے حملوں سے بچنا ممکن ہوتا تو اس کا سیکھنا بہترین امور میں شمار ہوتا جیسا کہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ ولولا رھطك الخ یعنی ہم نے تمہاری برادری کی وجہ سے تمہیں کچھ نہیں کہا برادری کی رعایت سے شعیب علیہ السلام پر انہوں نے رحم کیا ۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ۝ اور تم ہمارے معزز و مکرم نہیں ہو جو تمہاری عزت و احترام دیکھ کر ہم تمہارے قتل سے رُک گئے ہیں بلکہ تمہارے رشتہ داروں کی عزت سے ہم تمہیں کچھ نہیں کہہ رہے کیونکہ وہ ہمارے دین پر ہیں اور ہمیں ان کا احترام ضروری ہے ۔

ف : جہال کی یہ عام عادت ہے کہ جب دلائل و براہین سے عاجز آتے ہیں تو گالی پر اتر آتے ہیں یا پھر ڈرانے دھمکانے سے کام لیتے ہیں ۔

ف : فاعل معنوی کا مقدم ہونا بوجہ حصر کے ہے ۔ اگرچہ ما نافیہ کی خبر فعل نہیں بلکہ صیغۂ صفت ہے اور علینا بعزیز کے متعلق ہے اور یہ جائز ہے کیونکہ معمول ظرف ہے اور ظرف میں وسعت ہوتی ہے اور بعزیز کی باء زاید ہے ۔

تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معزز و محبوب بندہ جہال کی نظروں میں غیر معزز و غیر محترم ہوتا ہے ۔

فائدہ صوفیانہ صاحبِ روح البیان فرماتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جہال کی نگاہ ظاہری جاہ و مال پر ہوتی ہے ۔ انہیں دین اور کمال باطنی سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا ۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اموال اور صورتوں کو نہیں دیکھتا وہ تمہارے قلوب و اعمال کو دیکھتا ہے ۔ یعنی جب تمہارے قلوب اور اعمال صالحہ ہوں تو تم اللہ تعالیٰ کے مقبول ہو گے ۔ تمہاری صورتیں اچھی اور اموال بہتر ہوں یا نہ ۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

وقت بازی کودکاں را از اختلال

می نماید ایں خزفہا زر و مال

عارفانش کیمیا گر گشتہ اند

تاکہ شد کانہا پریشان و نژند

باغہا و قصرہا و آب رود

پیش چشم از عشق گلخن می نمود

ترجمہ : کھیل کے وقت بچوں کو ٹھیکریاں مال وزر نظر آتی ہیں۔ عرفاء سرے سے کیمیاگر کا تصور ہی ختم کر ڈالتے ہیں تاکہ دنیا و دولت کی کان کا خیال ہی نہ رہے۔ باغات و محلات اور نہریں سب کی سب عشق کے سامنے راکھ کے برابر ہیں۔

قَالَ کفار کے جواب میں شعیب علیہ السلام نے فرمایا یٰقَوْمِ اَرَهْطِیٓ اے میری قوم ! کیا میری برادری - یہ ہمزہ استفہام انکار و توبیخ کے لیے ہے۔ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ زیادہ معزز اور مکرم تر ہے مِّنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ سے۔

سوال : شعیب علیہ السلام من اللہ کے بجائے منی کہتے کیونکہ کفار سے گفتگو اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہیں ہو رہی تھی بلکہ خود ان کی ذات کے متعلق تھی۔

جواب : تاکہ قوم کو معلوم ہو کہ ان کی تحقیر و توہین درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تحقیر و توہین ہے[1]۔

سوال : قوم نے صرف شعیب علیہ السلام کی برادری کی عزت کا کہا۔ شعیب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا نام کیوں لیا۔ قوم نے اللہ تعالیٰ کی عزت کا انکار تو نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی انھوں نے یہ کہا کہ تیری برادری خدا تعالیٰ سے عزیز تر ہے۔

جواب : قوم کفار کی توبیخ میں تکرار ثابت ہو کہ پہلے انھیں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کو ہر حیثیت سے بلند و بالا اور افضل و اعلیٰ مانو۔ پھر سمجھایا کہ تم اتنے نالائق ہو کہ سرے سے خدا تعالیٰ کی عزت و حرمت کے قائل ہی نہیں ہو۔ اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا کہ تم میری برادری کو اللہ تعالیٰ سے معزز تر ین نہیں بلکہ تم اتنے بیوقوف ہو کہ سرے سے اللہ تعالیٰ کے لیے عزت ثابت نہیں کرتے ہو۔

وَاتَّخَذْتُمُوْهُ اور تم نے اللہ تعالیٰ کو بنایا ہے وَرَآءَكُمْ اپنی پیٹھ کے پیچھے ظِهْرِيًّا ایسے شخص کی طرح جو بھولا بھلایا ہو ایسی شئے کی طرح جسے ایسے ہی بیکار پھینک دیا جائے۔ یعنی بالکل غیر معتبر۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک، اس کے نبی علیہ السلام کی اہانت و تحقیر، اور بجائے اس کے اعزاز و اکرام کے میری برادری کا اعزاز د

---

[1] جیسے اب ہم اہلسنت کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعظیم و تکریم درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تکریم ہے۔

اکرام کرکے اللہ تعالیٰ کو غیر معتبر قرار دے رہے ہو۔ اسی لیے تو تم کہتے ہو کہ اے شعیب! ہم تمہیں اللہ تعالیٰ کی وجہ سے نہیں بلکہ تیری برادری کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے حالانکہ تمہارا فرض تھا کہ تم کہتے کہ اے شعیب علیہ السلام! ہم تیری حفاظت یا تیرا احترام یا تیرے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے نہ برادری وغیرہ کی وجہ سے تمہیں نہ نبوت کا لحاظ رہا اور نہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کی طرف توجہ رہی صرف دیکھی تو ایک معمولی شے۔ یعنی برادری کی نسبت کو جو ایک نہایت غلط رویّہ ہے کہ مخلوق کو خالق پر ترجیح دے کر کہو کہ ہم نے تجھے اے شعیب علیہ السلام! اسی لیے قتل نہیں کر رہے کہ تم فلاں برادری کے ایک فرد ہو حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو ہر حیثیت سے ترجیح ہے۔ فلہذا تمہارے لیے واجب تھا کہ کہتے کہ اے شعیب! ہم تمہیں اس لیے نہیں قتل کرتے کہ تم خدا تعالیٰ کے نبی ہو۔

ف: اہلِ عرب جس شے کو نہایت غیر معتبر سمجھتے ہیں تو کہتے ہیں:

قد جعل فلان ھٰذا الامر بظھرہ۔

اس معنے سے ظہری منسوب بہ ظہر ہے۔ ظاء کی فتح کو کسرہ سے پڑھا جائے نسبت کی وجہ سے جیسے نسبت کے وقت امسی (امس) کو بکسر الھمزہ اور دھری کو دھر بضم الدال پڑھتے ہیں۔ یعنی ایسے اسماء میں جب یائے نسبت داخل ہو تو اس کے اوّل کے حرف کی حرکت کو متغیر کرتے ہیں، جیسے اوپر ہوا۔

اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بے شک میرے رب تعالیٰ کو تمہارے اعمال معلوم ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ تم اس کے نبی علیہ السلام کی عزت و تکریم نہیں کر رہے مُحِیْطٌ محیط ہے کہ اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ اگر تم اسے کوئی شے نہیں سمجھتے تو وہ تمہیں اس کی سزا دے گا۔

ف: الاحاطہ بمعنے ادراک الشئ بکمالہ کسی شے کا مکمل طور پر ادراک کرنا اور اعمال پر اللہ تعالیٰ کے احاطہ سے اس کی جزا دینا مراد ہے۔

وَیٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ اپنا کام کیے جاؤ۔

ف: مکانۃ مصدر ہے مَکُنَ۔ مکانۃ فھو مکین سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی شے پر پوری قدرت حاصل کرے۔ اور اس کا جار مجرور محلاً منصوب حال ہے۔ اب عبارت یوں ہوئی:

اعملوا حال کونکم موصوفین بغایۃ المکنۃ الخ

یعنی تم جتنی شرارتیں کرنا جانتے یا کر سکتے ہو کرو۔ یا مکان از کون ہے بمعنے مقام و مقامۃ۔ استعارہ کے طور پر عین کو معنے میں لیا گیا ہے جیسے لفظ حیث کو ظرف زمان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ وہ ظرف مکان ہے یعنی تم جس کام میں لگے ہو کر میری دشمنی کرتے ہو کرتے رہو اور شرک میں پھنسے ہو پھنسے رہو۔

اِنِّیْ بے شک میں بھی عَامِلٌ اپنا کام کرتا ہوں۔ یعنی میں اپنی طاقت لگاتا ہوں۔ یہاں اختصار کے پیش نظر عبارت

محذوف ہے ۔ دراصل عبارت یوں ہونی چاہیے :

انی عامل بقدر ما اٰتنی اللہ من القدرۃ الخ

یعنی میں بھی اپنی قدرت صرف کرتا ہوں جو مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید جو مجھے حاصل ہے میں بھی تمہارے مقابلے میں صرف کروں گا ۔ گویا انہوں نے کہا کہ اگر ہم تمہارے خلاف اپنی قوت استعمال کریں تو پھر کیا ہوگا تو ان کے جواب میں کہا گیا :

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ " عنقریب تم جان لوگے مَنْ یہ استفہامیہ ہے ہمارے میں سے کسی کو ، یا موصولہ ہے ۔ یعنی پہچان لوگے اسے یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ جس کے پاس عذاب آکر اسے رُسوا کرے گا ۔ یعنی اسے ذلیل و خوار کرے گا وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ط اس کا عطف من یاتیہ پر ہے ۔ اور اس کے پاس عذاب آئے گا جو جھوٹا ہے ۔

ربط : جب کفار نے شعیب علیہ السلام کو ڈرایا دھمکایا تو شعیب علیہ السلام نے ارادہ فرمایا کہ کفار کے ساتھ جوابی کارروائی کریں تو نرم پالیسی اختیار کرتے ہوئے اپنے مخالفین سے کہا کہ وقت بتائے گا کہ معذب اور کاذب تم ہو یا میں ۔

وَارْتَقِبُوْٓا اور انجام کار اور عاقبت امر کا انتظار کرو ۔ یعنی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا انجام اور میرے قول کی صداقت ظاہر ہو جائے گی اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ ۝ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں ۔ رقیب بمعنے منتظر ۔ فعیل بمعنے فاعل یعنی راقب ۔

ف : حضرت شعیب علیہ السلام شہبازِ خطابت تھے ان کا لقب خطیب الانبیاء تھا کیونکہ آپ کا کلام نہایت عمدہ تھا اور قوم کے ہر سوال کا جواب ایسی سنجیدگی سے عنایت فرماتے کہ قوم کو پھر اعتراض کا موقعہ نہ ملتا ۔

حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام خوفِ الٰہی سے بہت رویا کرتے تھے ۔ اسی لیے آپ کی بینائی پر بھی اثر پڑا ۔ اگرچہ بعد کو اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھ کی روشنی میں قوت بخشی ۔ لیکن پھر بھی گریہ و زاری سے آپ کی آنکھیں متاثر ضرور ہوئیں ۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی شعیب علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ بہشت کے شوق سے روتے ہیں یا جہنم کے خوف سے ، حضرت شعیب علیہ السلام نے عرض کی ، یا الٰہ العٰلمین ! نہ مجھے جنت کی لالچ ہے نہ جہنم کا خطرہ ، مجھے تو تیرے شوق دیدار نے بیقرار کر رکھا ہے لیکن تیری بے نیازی کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ میرے جیسے سے کیا معاملہ ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغام بھیجا کہ اے شعیب علیہ السلام ! اگر تم واقعی میرے شوقِ دیدار سے رو رہے ہو تو تمہیں مبارک ہو ، اس کے صلے میں فی الحال میں تمہیں اپنا پیارا بندہ حضرت موسیٰ (کلیم اللہ) بن عمران علیہ السلام خدمت کے لیے پیش کرتا ہوں ۔ حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

زاہد خلد خواہد و اوباش عیش نقد
ما خود بدولت غمت از ہر دو رستہ ایم

ترجمہ : زاہد بہشت مانگتا ہے اور اوباش زندگی کے عیش وعشرت کا طالب ہے اور ہم ہر دو کے برعکس (اے جاناں!) تیرا درد اور غم مانگتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ عاشقانِ الٰہی کا طریقہ یہی ہے کہ وہ ذاتِ حق کو اپنا مطمعِ نظر سمجھ کر خلقِ خدا کے تصورات پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں بخلاف اہلِ غفلت کے کہ ان کا مطمعِ نظر صرف اور صرف دُنیا ہوتی ہے اور انھیں خالقِ کائنات سے کسی قسم کا سروکار نہیں ہوتا لیکن عاشقانِ حق دونوں (دُنیا و آخرت) کے گورکھ دھندوں سے فارغ ہوتے ہیں۔ وہ صرف ایک دھن میں رہتے ہیں۔ یعنی عشقِ خداوندی اور صرف یہی اُن کا مدّعا ہوتا ہے اور بس۔ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے آزاد بندے یہی ہیں باقی لوگ ان کے حق میں مختلف طور طریقے رکھتے ہیں۔ بہت سے بدبخت وُہ ہیں جو ان کی حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں بلکہ ان کو لاشئی اور غیر معتبر سمجھتے ہیں وہ بھی بیچارے معذور ہیں اس لیے کہ وہ چشمِ بصیرت کھوچکے ہوتے ہیں اسی وجہ سے وُہ ایسے انکشافات سے بالکل محروم ہوتے ہیں۔ مثلاً شعیب علیہ السلام کی قوم کو دیکھیے کہ انھوں نے شعیب علیہ السلام کی ظاہری صورت میں بینائی کے ضُعف کو تو بھانپا لیکن ان کے نورِ نبوت کے شعلوں سے خود اندھے رہے۔ اُلٹا کہتے کہ شعیب (علیہ السلام) نبی کیسے ہوسکتا ہے جبکہ وہ خود آنکھوں سے معذور ہے اور ہم چشمِ بینا رکھتے ہیں۔ اسی لیے اُنھوں نے شعیب علیہ السلام کو کہا:

وانا لنرٰلك فينا ضعيفا۔

ان کورچشموں کی حقیقت پر نگاہ نہ پڑی اسی لیے اپنے اندھے پن سے ان کی نبوت کی روشنی کو نہ دیکھ سکے اور نہ ہی ان کی ظاہری بینائی انوارِ نبوت سے اقتباس کرسکی۔ حق ہمیشہ اہلِ حق کے پاس ہوتا ہے خواہ ظاہری اسباب ان کے ہاں ہوں یا نہ ہوں۔

ف : دنیا میں لوگوں کے کوائف مختلف ہوتے ہیں بعض کو ظاہری طور پر بہت مصائب ومشکلات میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن باطنی واردات سے وہ دوسروں سے ممتاز اور بے شمار نعمتوں سے مالامال ہوتے ہیں۔

نکتہ : حضرات انبیاء ورسل کرام علیہم السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لیے عالمِ دنیا میں بھیجا تاکہ غافلوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرکے ان کی باطنی آنکھیں کھولیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچا کر انہیں وصالِ حق سے اور جمالِ الٰہی سے بہرہ ور فرمائیں۔ جس بندے میں استعداد ہوتی ہے وہ ان کی تربیت وارشاد سے استفادہ واستفاضہ کرتا ہے بلکہ اس میں جان کی بازی لگا دیتا ہے اور جو محروم القسمت ہوتا ہے وہ منکر ہوکر اُلٹا ان سے عداوت وبُغض کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے دائمی طور تاریکیوں وظلمتوں میں اندھا بن کر رہتا ہے اسے اپنی منزلِ مقصود کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔

سبق : برادرانِ ملت! اپنے رب تعالیٰ کے ہاں پہنچنا چاہتے ہو تو ان روحانی قافلوں کے ساتھ مل جاؤ ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ اس طرف جانے والی تمام سڑکیں ویران ہوجائیں گی اور اس منزل کا راہرو کوئی نظر نہیں آئے گا۔

کسی نے کیا خوب فرمایا: ؎

خیز دلا مست شو از مئے قدمی ازانک
مانہ دریں تیرہ جام بہر نشست آمدیم

ترجمہ: اے دل! قدسی مے سے مست ہو جا اس لیے کہ ہم اس ظلمانی میکدے میں محض بیٹھنے کے لیے ہی نہیں آئے۔

تفسیر عالمانہ

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا اور جب ہمارا حکم آگیا یعنی شعیب علیہ السلام کی قوم کے لیے وہ قضا و قدر کا حکم جو ہم نے ان کی ہلاکت و عذاب کے لیے ازل میں مقدر فرمایا۔ یہاں پر امر عرفی معنے میں استعمال ہوا جس کی جمع امور آتی ہے۔ نَجَّیْنَا شُعَیْبًا ہم نے شعیب علیہ السلام کو نجات دی۔

نکتہ: نجات کا ذکر اس لیے پہلے کیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے اور مقتضائے ربوبیت بھی یہی ہے کہ رحمت کو غضب پر سبقت ہو اس لیے کہ غضب کا صدور جرائم و معاصی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ اور ان لوگوں کو جو ایمان لانے میں شعیب علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ یعنی جیسے وہ توحید کے قائل تھے وہ بھی۔ بِرَحْمَةٍ ازلی رحمت سے مِّنَّا جو ان کے حق میں ہماری طرف سے صادر ہوئی وہ بھی محض ہمارا فضل تھا۔ رحمت ان کے اعمال کی وجہ سے نہیں ہوتی جیسا کہ اہل سنت وجماعت کا مذہب ہے۔

ف: بعض کے نزدیک یہاں پر رحمت سے ایمان مراد ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق بخشی۔

نکتہ: کفار کو ہلاک و تباہ کرنا اور ان کو عذاب میں مبتلا کرنا یہ عدل و انصاف پر مبنی ہیں اس لیے ان کی نسبت کفر کی طرف ہوتی ہے اسی تقاضے پر نجات و خلاص کو ایمان و عمل صالح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی خود توفیق پر منحصر ہیں اور توفیق اللہ تعالے کا فضل اور رحمت ہے وہ جسے چاہے عطا فرمائے۔

وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اور پکڑا ظالموں کو، یعنی جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کی اور انکار کر کے تکبر کیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تو پکڑا انہیں الصَّیْحَةُ یہ اخذت کا فاعل ہے اس سے جبرئیل علیہ السلام کی وہ سخت آواز مراد ہے جب آپ نے شعیب علیہ السلام کے مخالفین سے فرمایا:

موتوا جمیعا۔ سارے مر جاؤ۔

اور سورۂ اعراف میں ہے:

فاخذتہم الرجفة۔ پس انہیں رجفہ (زلزلہ) نے گھیر لیا۔

رجفة، صیحة کے مترادفات سے ہے۔ بایں معنیٰ کہ جب ان کی تباہی پر ان کے مکانات وغیرہ منہدم ہونے لگے تو اس وقت سخت ہوائی موجوں سے جو صورت پیدا ہوئی اسے رجفہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ف: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہر معذب قوم کو نئے نئے طریق سے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ صرف شعیب و صالح علیہما السلام کی دو ایسی امتیں ہیں جنہیں ایک قسم کے عذاب میں تباہ و برباد کیا گیا۔ ان کے عذاب کی صورت یہ تھی کہ ان پر سخت گرمی پڑی۔ اپنے قریب کے باغ کے درختوں کے سایہ میں چلے گئے آسمان پر دیکھا کہ ایک قسم کا بادل چھا گیا جو

لیے اتر کر ان کے مذکورہ باغ کو گھیر کر آگ کی صورت اختیار کر گیا۔ اس پر جبریل علیہ السلام زور سے بولے تو وہ زلزلہ بن گیا جس سے وہ سب وہیں جل کر مر گئے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ○ پس وہ ہو گئے اپنے گھروں اور مکانوں میں گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے یعنی ان جگہوں پر ایسے چمٹ گئے کہ جن کا وہاں سے اٹھنا گویا محال ہو گیا۔ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ط گویا کہ وہ یہاں پر زندہ رہ کر کسی کاروبار میں نہیں لگے اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ خبردار! مدین کے لیے ہلاکت اور تباہی ہو۔

ف: بعدا و سحقا وغیرہ ان مصادر سے ہیں جو اپنے افعال کے قائم مقام استعمال ہوتے ہیں۔ اور خود افعال ظاہر نہیں ہوتے۔ دراصل بعدا، بعدوا نھا بمعنے ھلکوا۔ اور لمدین یہ ان لوگوں کا بیان ہے جن پر تباہی اور ہلاکت واقع ہوئی۔ جیسے کہا جاتا ہے:

ھیت لك۔

یعنی جان لو کہ مدین کی قوم کو تباہی اور رحمت حق سے دوری ہو۔

کَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ○ جیسے ثمود کو تباہی و بربادی ہوئی۔

ف: شعیب علیہ السلام کو ثمود کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ عذاب کی ایک قسم ہے۔ یعنی صیحۃ و رجفۃ سے تباہ ہوئے۔ اسے ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔

حل لغات: بعدت کے متعلق جمہور نے فرمایا کہ اسے مکسور العین پڑھا جائے از باب بعد یبعد یعنی بفتح العین فی المضارع وبکسرہا فی الماضی یعنی علم یعلم بمعنے ھلك یھلك۔

قاعدہ لغویہ: اہلِ عرب کے ہاں بُعد دو معنوں میں مستعمل ہے:

۱۔ ہلاکت

۲۔ ضد القرب

ان کا فرق ظاہر کرنے کے لیے دونوں کی گردان مختلف کر دی ہے۔ وہ ایسے کہ جب بضم العین پڑھا جائے تو بمعنے ضد القرب کے ہوگا اور اگر بکسر العین ہو تو بمعنے ضد السلامۃ کے ہوگا۔

ف: البعد بضم الاول وسکون الثانی ہر دو کا مصدر ہے اور اگر اسے بفتحتین پڑھا جائے تو صرف مکسور العین یعنی علم یعلم کے باب کا مصدر ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ اہلِ دنیا اور خواہشات نفسانی کے پجاریوں نے طلبِ دنیا اور خواہشاتِ نفسانی پورا کرنے اور حق د ہدایت کو قبول نہ کرنے سے استعداد روحانی فطری کو ضائع کر دیا۔ ان کی خرابی نے حق سے کوسوں دور اور باطل کے بالکل قریب کر دیا۔ اسی وجہ سے ظاہراً بھی تباہ و برباد ہوئے اور باطناً بھی۔

ظاہراً کی تفصیل تفسیر عالمانہ میں گزری ہے ۔ اور باطناً اس طرح کہ قربِ الٰہی اور دائمی عیش سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر طبقہ اسفل سافلین سے جا ملے اور ہجران و فرقت کی نار میں ہمیشہ رہے جس سے نہ وہ زندہ نہ مُردہ اور نہ ہی زندگی سے نفع پا سکے اگر وہ زندہ رہے تو بھی مُردوں کی طرح ۔ جیسے جبرائیل علیہ السلام کی آواز نے کفار کو مار مٹایا ایسے ہی اہلِ ایمان کو شعیب علیہ السلام کی رُوحانیت نے زندہ فرمایا اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے فیوض و برکات کے حصول کی استعداد ہو تو ان میں وہی تاثیر ہوتی ہے جیسے تانبے میں اکسیر اثر انداز ہوتی ہے ۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

سازد اسرافیل روزی نالہ را
جان دہد پوشیدۂ صد سالہ را
ہین کہ اسرافیل وقتند اولیا
مردہ را زیشاں حیاتست و نما
جان ہر یک مردۂ از گور تن
بر جہد آواز شاں اندر کفن
سرکشی از بندگان ذوالجلال
دانکہ دارند از وجود تو ملال
کہربا دارند چوں پیدا کنند
گاہ ہستی ترا شیدا کنند
کہربای خویش چوں پنہاں کنند
زود تسلیم ترا طغیاں کنند

ترجمہ : اسرافیل ایک دن آواز دے گا تو وہ صدیوں پوسیدہ ہڈیوں کو جان ڈال دے گا ۔ یاد رکھیے کہ یہ اولیاء اپنے وقت کے اسرافیل ہیں ۔ انہی سے مُردوں کو جان ملتی ہے ۔ ہر ایک مُردے کو قبر میں جان مل جاتی ہے اور ان کی آواز سے کفن پہنے ہوئے مُردے اُٹھ بیٹھتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ذوالجلال کے سرکش بندے تجھ سے ملال کرتے ہیں ۔ اولیاء تو کہربا رکھتے ہیں کہ جب ظاہر کرتے ہیں تو سب کو شیدا کر دیتے ہیں جب کہربا کو چھپاتے ہیں تو پھر کسی کی سرکشی ہو تو اسے برداشت کر جاتے ہیں ۔

پہلے گزرا ہے کہ کفار نے شعیب علیہ السلام کو ضعیف کہا ۔ ان اندھوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ان کا رب ہے جو قوی ہے ۔ ؎

گر تو پیلی خصم تو از تو رمید
نک جزا طیراً ابابیلت رسید

گر ضعیفی در زمین خواہد امان
غلغل افتد در سپاہ آسمان

گر بدندانش گزی پر خون کنی
درد دندانت بگیرد چوں کنی

ہر پیمبر فرد آمد در جہان
فرد بود و صد جہانش در نہاں

ابلہاں گفتند مردی بیش نیست
وائی آں کو عاقبت اندیش نیست

ترجمہ: اگر دشمن کا ہاتھی تجھ کو نقصان پہنچائے گا تو تیری مدد کو خدا کی فوج پہنچے گی۔ اگر کوئی ضعیف تجھ سے امان چاہے گا تو آسمان پر شور برپا ہوگا۔ اگر کسی دشمن کو نقصان پہنچا کر تُو اسے زخمی کرے گا تو جیسے دانتوں کو اکھاڑنے سے درد اٹھتا ہے ہر پیغمبر بے نظیر ہے جہان میں ایسے بے نظیر حضرات کے دامن میں ہزاروں راز مضمر ہوتے ہیں۔ بیوقوفوں نے کہا کہ یہ لوگ کچھ نہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ انجام کی فکر نہیں کرتے۔

سبق: صلحا پر لازم ہے کہ وہ بدبختوں سے سبق حاصل کریں کہ ان بیچاروں نے دنیا میں گرفتار ہو کر آخرت کو بھلایا، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے مال بھی چھین لیے اور ملک بھی۔ گویا وہ اس میں تھے ہی نہیں اور نہ وہ ان سے نفع پا سکے۔

حدیث شریف حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مجلس میں موجود تھا کہ اچانک ایک مرد حاضر ہوا نہایت سفید چہرہ، خوب صورت بال، حسین وجمیل صورت اور سفید کپڑوں والا۔ اس نے عرض کی: السلام علیک یا رسول اللہ! آپ نے جواباً فرمایا وعلیک السلام۔ پھر عرض کیا دنیا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی مثال خواب کا خیال ہے لیکن خواب کے خیال کی کوئی سزا نہیں مگر دنیا کے تمام اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ پھر عرض کی کہ آخرت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہاں دائمی زندگی ہے۔ ایک گروہ بہشت میں جائے گا، ایک جہنم میں۔ پھر عرض کی: بہشت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بہشت کا بدلہ دنیا کو خرچ کرنے پر ہے۔ لیکن اس کے طالب کو اس میں دائمی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ پھر عرض کی: جہنم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: آخرت کو اس کے بدلہ میں دینا اور جو اس میں داخل ہُوا وہ اس میں ہمیشہ پڑا رہے گا۔ پھر عرض کی کہ اس اُمت میں بہترین انسان کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کا اطاعت گزار ہے۔ اس نے عرض کی کہ اس کی علامت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ اس شخص کی طرح

ہوتا ہے جو قافلہ کے پیچھے بھاگتا جارہا ہو۔ پھر عرض کی کہ دنیا کی رہائش کی مثال کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا: جیسے کوئی قافلہ سے بچھڑ کر تھوڑا سا ستانے کے لیے بیٹھ جائے۔ پھر عرض کی، دنیا و آخرت کے مابین کتنی دیر ہے؟ آپ نے فرمایا: جتنی دیر آنکھ جھپکنے میں لگتی ہے۔ یہ سوالات کر کے وُہ جوان چلا گیا۔ اہلِ مجلس سے اوجھل ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ جبرئیل علیہ السلام تھے وہ تمہیں دنیا کا زہد سکھانے کے لیے تشریف لائے تھے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

یکے بر سر گور گل میسرشت
که حاصل کند زاں گل گورخشت

باندیشہ لختے فرد رفت پیر
که اے نفس کوتہ نظر پند گیر

چہ بندے دریں خشت زریں دلت
که یک روز خشتے کند از گلت

تو غافل در اندیشۂ سود مال
که سرمایہ عمر شد پائمال

دل اندر دلا رام دنیا مبند
که بنشست باکس که دل برنکند

بر مرد ہشیار دنیا خسیست
که ہر مدتے جائے دیگر کسست

ترجمہ: کوئی آدمی قبر سے اینٹ تیار کر رہا تھا۔ خود کو اپنے دل میں کہنے لگا کہ کچھ تو خوفِ خدا کیجیے۔ یہاں سے اینٹ کیا تیار کرے گا کہ ایک دن تیری مٹی سے بھی ایسے ہی اینٹ تیار ہوگی۔ تجھے مال کا فکر ہے تجھے اپنی عمر کے سرمائے کا خیال کرنا چاہیے کہ وہ ضائع ہو رہا ہے۔ دنیا سے محبت نہ کر کیونکہ یہ جس کو لگی ہے وہ برباد ہوا ہے۔ ہشیار مرد کے لیے دنیا کچھ نہیں کیونکہ ہر مدت میں اس کے لیے نیا دوست ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَۚ وَ
مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ
الْمَوْرُوْدُ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ذٰلِكَ مِنْ
اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ
فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَؕ
وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌؕ اِنَّ
اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ
مَّجْمُوْعٌۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝ يَوْمَ
يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي
النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ
رَبُّكَؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝
فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُؕ
وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝

ترجمہ : اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی آیات اور کھلے غلبے کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے فرعون کے حکم کی اتباع کی اور فرعون کا معاملہ صحیح نہ تھا وہ قیامت میں اپنی قوم کے آگے ہوگا تو انھیں جہنم میں لا اتارے گا اور وہ کیا ہی اترنے کا برا گھاٹ ہے اور دنیا میں انھیں لعنت پیچھے لگی اور قیامت کے دن میں انھیں کیا ہی بُرا انعام ہے جو انھیں عطا ہوگا۔ یہ بستیوں کی خبریں ہیں جو ہم آپ کو بیان کرتے ہیں ان میں بعض موجود ہیں اور بعض مٹ گئی ہیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا پھر وہ اللہ کے سوا جن معبودوں کو پُوجتے تھے انھیں نہ بچایا جبکہ ان پر آپ کے رب کا حکم آیا اور انھوں نے انھیں ہلاکت کے سوا اور کچھ نہ بڑھایا اور آپ کے رب کی گرفت ایسی ہی ہوتی ہے جب بستی والوں کو ان کے ظلم پر گرفت کرتا ہے بیشک اس کی گرفت سخت دردناک ہوتی ہے۔ یقیناً اس میں اس کے لیے نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے وہ دن ہے جس میں تمام لوگ اکٹھے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہے اور ہم اسے موخر نہیں کر رہے مگر ایک مقرر وقت کے لیے۔ جب وہ دن آئے گا تو اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی

نہیں بول سکے گا بعض ان میں بدبخت ہوں گے اور بعض خوش بخت۔ پھر وہ جو بدبخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے اس میں ان کا چیخنا چلانا ہوگا وہ اسی میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین ہیں مگر وہ جو آپ کا رب چاہے۔ اور وہ جو خوش بخت ہیں وہ بہشت میں ہوں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین ہیں مگر وہ جو آپ کا رب چاہے یہ بخشش ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی سو اس میں ذرہ برابر بھی شک نہ کیجیے اس سے کہ جن کی یہ عبادت کرتے ہیں یہ اسی طرح پوجتے ہیں جیسے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے تھے اور بیشک ہم انھیں ان کا حصہ پورا دیں گے جس میں کسی قسم کی کمی نہ ہوگی۔

تفسیر عالمانہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا بحذا ہم نے مُوْسٰی موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا درانحالیکہ وہ ملتبس تھے بِاٰیٰتِنَا ہمارے معجزات کے ساتھ۔ وہ مندرجہ ذیل نو معجزات ہیں:

1. عصا
2. ید بیضا
3. طوفان
4. کڑی
5. جوئیں
6. مینڈک
7. خون
8. نقص الاموال
9. نقص الانفس

وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ○ اور برہان واضح کے ساتھ۔ یہ عطف الصفۃ مع اتحاد الموصوف کے قبیل سے ہے اور بیشک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا درانحالیکہ وہ آیات معجزات اور دلائل قویہ کے جامع تھے اور یہ معجزات و دلائل واضح کرنے والے تھے۔

ف: مبین، اَبان سے ہے اور ابان لازم و متعدی ہر دو طرح مستعمل ہے۔ اس آیت کا مضمون اس آیت کی طرح ہے کما قال:

ولقد اٰتینا موسی الکتاب والفرقان۔

یعنی انھیں تورات عطا ہوئی وہ جامع تھی بایں معنی کہ وہ کتاب تھی اور حجت بھی جو کہ حق و باطل کا فرق بتاتی تھی اور یہ بھی ہے کہ سلطٰن مبین سے غلبہ و استیلاء مراد ہو۔ کما قال: ونجعل لکما سلطانا۔

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِ فرعون اور اس کی قوم کے برگزیدہ اور رُؤسا کی طرف ۔
سوال : حضرت موسیٰ علیہ السلام تو قبطیوں اور بنی اسرائیل کے ہر چھوٹے بڑے کی طرف بھیجے گئے لیکن یہاں پر صرف اشراف قوم کی تخصیص کیوں ؟
جواب : چونکہ اشراف ورؤسائے قوم اصحاب رائے تھے اور قوم کے جملہ امور کی تدابیر انہی کے ہاتھ تھیں اسی لیے ان کا نام لیا گیا اور عوام کے احکام ان کی اتباع میں مذکور ہوتے ۔
فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ پس انھوں نے فرعون کے امر کی اتباع کی یہاں پر امر فرعون سے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار مراد ہے ۔ یعنی فرعون کے اتباع میں موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے احکام کا انکار کیا ۔ اس کے قول ما علمت لکم من الٰہ غیری ۔
سوال : آیات کے انکار میں فرعون کا نام کیوں نہیں ۔
جواب : چونکہ وہ ان سب کا سرغنہ تھا اور اس کا کفر اتنا واضح تھا کہ اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے ذکر کی ضرورت ہوئی جو متردد تھے کہ ادھر موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھیے تو خیال کرتے ان کا کہنا ماننا چاہیے ادھر فرعون کا جاہ وجلال مجبور کرتا کہ فرعون کی تابعداری کریں ۔ لفظ فاء دلالت کرتا ہے کہ وہ فرعون کی اتباع میں گمراہی کی طرف فوراً مائل ہو جاتے گویا جونہی موسیٰ علیہ السلام نے دعوت دین حق کی تو فوراً گمراہی کا اظہار کر دیا ۔
وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ○ کاشفی نے لکھا کہ فوراً کا کام رشد وصواب پر نہیں تھا ۔ دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ ماشد ہر پسندیدہ ومحمود کام پر استعمال ہوتا ہے ۔ جیسے غیّ ہر گمراہی اور مذموم امر پر استعمال ہوتا ہے ۔ اس معنے پر ماشید بمعنے مرشد ہے ۔ اس معنے پر یہ اسناد مجازی ہے اب معنیٰ یہ ہوا کہ فرعون کا کام خیر کی رہبری کرنے والا نہیں تھا اس لیے کہ وہ سراسر گمراہی اور غیّ محض تھا اور عقلاً صرف صواب وحق کی اتباع کرتے ہیں وہ گمراہی وغیّ کے پیچھے نہیں لگتے ۔ اس میں فرعون کے تبعین کی جہالت کا اظہار ہے ۔ يَقْدُمُ صحاح میں ہے قدم بالفتح يقدم قد مًا یعنی آگے ہوگا ۔ یہ جملہ متانفہ ہے ۔ اس میں فرعون کی آخرت کا حال بتایا گیا ہے قَوْمَهٗ اپنی تمام قوم کے اشراف، رؤسا اور دیگر تمام يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت میں یعنی آخرت میں فرعون جہنم کی طرف سب سے آگے ہوگا اور اس کے تبعین اس کے پیچھے ۔ یعنی جیسے دنیا میں گمراہی کے لحاظ سے وہ ان کا مقتدا تھا ایسے ہی آخرت میں جہنم میں داخل ہوتے ہوئے وہ سب سے آگے ہوگا اور اسکی قوم اس کے پیچھے فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ پس وہ انھیں جہنم میں لے جائے گا ۔ یعنی ان سب کو جہنم میں داخل کرے گا ۔ ماضی بمعنے مضارع ہے کیونکہ جو امر مستقبل میں محقق الوقوع ہو اسے ماضی سے تعبیر کرتے ہیں ۔
ف : الورود بمعنے پانی کی طرف آنا اور ایراد بمعنے دوسرے کو پانی کی طرف لے جانا ۔ الورد پانی کی جگہ ۔ فرعون کو اس شخص سے تشبیہ دی ہے جو پانی کے متلاشیوں کے آگے ہوتا ہے اور اس کی قوم کو پانی کے متلاشیوں سے اور جہنم کو

پانی سے۔ اس کے بعد فرمایا:

وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ یعنی وہ جگہ بہت بری ہے جہاں فرعون اور اس کی قوم وارد ہوگی کیونکہ وہ آگ ہے اور پانی جگہ تر وہ ہوتی ہے جہاں لوگ پیاس کی آگ بجھا کر تسکین پاتے ہیں لیکن یہاں معاملہ الٹ ہوگا۔ وَاُتْبِعُوْا اور جن لوگوں نے فرعون کے امر کی اتباع کی ان کے پیچھے لگائی گئی فِیْ هٰذِهٖ اسی دن میں لَعْنَةً عظیم لعنت، کہ اس پر آنے والی تمام امتیں لعنت کریں وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ اور قیامت میں انہیں تمام اہل محشر لعنت کریں۔ یعنی ان کو لعنت ایسی لازم ہو کر وہاں جہاں ہوں لعنت ان کے پیچھے ہو جیسے انہوں نے فرعون کے امر کی اتباع کی ایسے ہی ان کو لعنت لازم ہوئی تاکہ انہیں ان کے اپنے کردار کی پوری جزا حاصل ہو۔ یا اس کا معنٰے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مطرود و مطروح ہوئے بایں طور کہ دنیا میں انہیں دریا میں غرق کر دیا گیا اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ جس کا اس طرح کا حال ہو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مطرود و مطروح ہوتا ہے۔

سوال: اس سے فرعون کے متعلق کچھ مذکور نہ ہوا۔ اس کی قوم کو ملعون بھی کہا گیا اور معذب بھی۔

جواب: عقلمند خود سمجھ سکتا ہے کہ جب متبعین کا یہ حال ہے تو ان کے آقا کا کیا حال ہوگا جس نے ان سب کو گمراہ کیا۔

سوال: تابع و متبوع کو بھرپور لعنت کی خبر دے کر اسے رفد مرفود سے تعبیر کرنے کا کیا معنیٰ، کیونکہ رفد کا اطلاق تو انعام پر ہوتا ہے۔

جواب: ان کی رسوائی و ذلت کو انعام (رفد) سے تعبیر کرنے میں تہکم ہے۔ یعنی انہیں مزید رسوا اور ذلیل کرنا مطلوب ہے۔

بئس الرفد المرفود، رفد کے کئی معانی ہیں:

۱۔ عون

۲۔ عطیہ

۳۔ ملاتم

یہاں پر پہلا معنیٰ مراد ہے۔ زجاج نے فرمایا: کسی شے کو دوسری شے کی مدد کر کے پہلی شے کو دوسری شے کی طرف اسناد کا نام رفد ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ وہ مدد جو انہیں انعام کے طور عطا ہوئی ہے یعنی لعنة فی الدارین وہ بہت بری ہے وہ اس لیے کہ دنیا کی لعنت آخرت کے عذاب کے لیے معین و مددگار بنی اور وہی معین و مددگار ان کا پیچھا کر کے آخرت تک اور پھر دائمی طور انہیں چمٹی رہی۔

ف: اس سے ثابت ہوا کہ فرعون ازلی بدبخت ملعون جہنمی تھا اور غرق ہوتے وقت اس نے جو ایمان قبول کیا تھا وہ ناقابل قبول ہوا۔ اور آخرت میں جہنمیوں کا قائد بنا۔

فتوحات مکیہ شریف کے ۶۲ ویں باب میں ہے کہ:

المجرمون اربع طوائف کلها فی النار لا یخرجون منها وھم المتکبرون علی اللہ کفرعون وامثالہ ممن ادعی الربوبیۃ لنفسہ وکفاہا عن اللہ تعالیٰ فقال یاایھا الملأ ما علمت لکم من الٰہ غیری وقال انا ربکم الاعلیٰ یرید انہ لیس فی السماء الٰہ غیری وکذٰلک نمرود وغیرہ۔

ترجمہ: مجرم چار قسم کے ہیں اور وہ سب جہنمی ہیں دوزخ سے ہرگز نہیں نکلیں گے۔ اللہ کے ساتھ تکبر کرنیوالے جیسے فرعون اور ان جیسے۔ اور جنہوں نے ربوبیت کا دعویٰ، اور اللہ کی الوہیت کا انکار کیا۔ چنانچہ فرعون نے کہا اے میری قوم! میرے سوا تو اور کوئی معبود ہے ہی نہیں۔ اور کہا میں ہی تمہارا بڑا رب ہوں۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ آسمان وغیرہ میں سوائے اس کے اور کوئی معبود نہیں۔ اسی طرح نمرود وغیرہ۔

اور فتوحات شریف میں دوسرے مقام پر فرمایا:

ھو معتقدی وغیر ھذا قلت علیٰ سبیل البحث والاستکشاف۔

ترجمہ: یہی میرا عقیدہ ہے اگر اس کے برعکس میں نے کہا ہے تو وہ بحث و استکشاف کے طور ہے۔

یہ عبارت لکھ کر صاحب روح البیان قدس سرہٗ نے لکھا کہ فصوص الحکم کی عبارت کو اسی معنے پر محمول کیا جائے گا جبکہ وہاں مروی ہے کہ فرعون کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔

تنبیہ فصوص الحکم کی عبارت کو لے کر بعض عاقبت نااندیش حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ شیخ کی فتوحات شریف کو دیکھیں اور شیخ کو مطعون نہ بنائیں اس لیے کہ اکابر پر طعن و تشنیع اچھی نہیں کیونکہ ان کی عبارات کے مفاہیم میں گہرائیاں ہوتی ہیں جیسے قرآن مجید کے عجائبات کا اندازہ مشکل ہے ایسے ہی مشائخ کی عبارات کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ ان کے مقاصد کو پہنچنا عام آدمی کا کام نہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو علم و عمل کی حقیقت سے آشنا کرے اور ہمیں کاملین کے طریقہ سے آگاہی بخشے۔

مسئلہ: آیت میں اہل ہویٰ کی اتباع اور اہلِ فسق کی صحبت کی مذمت کی گئی ہے اس لیے پسینہ بدبودار ہے اور طبع اسے جذب کرنے والی ہے۔ اس طرح صحبت کا اثر ضرور پڑتا ہے، اور بعض امراض متعدی ہوتی ہیں۔

ے

اے فغاں از یار ناجنس اے فغاں
ہمنشیں نیک جوئید اے مہان

ترجمہ: یار ناجنس سے دور بھاگو اے دوستو! نیک دوست تلاش کرو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف مشرکین کے ساتھ نہ ٹھہرو اور نہ ہی ان کے ساتھ زندگی گزارو اس لیے کہ جو ان سے مانوس ہو کر ان کے ساتھ ٹھہرتا اور زندگی بسر کرتا ہے تو وہ انہی میں سے ہے اور ہم سے وہ کوسوں دُور ہو گیا یعنی جس گھر میں مشرک ہو تم وہاں نہ رہو اور نہ ہی ایک مجلس میں بیٹھو تاکہ ان کے اخلاق خبیثہ تم پر اثر انداز نہ ہوں اور نہ ہی صحبتِ بد سے ان کی عادات تمہارے اندر آ جائیں۔ جیسے فرعون کی قوم نے جب اس کی متابعت کی تو فرعون انہیں جہنم میں لے گیا اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام کی فرمانبرداری کی تو وہ انھیں بہشت میں لے گئے۔

ے

اے خنک آں مردہ کز خود رستہ شد

در وجود زندۂ پیوستہ شد

سیل چوں آمد بدریا بحر گشت

دانہ چوں آمد بمزرع کشت گشت

چوں تعلق یافت نان با بوالبشر

نان مردہ زندہ گشت و باخبر

موم و ہیزم چوں فدای نار شد

ذات ظلمانیٔ او انوار شد

سنگ سرمہ چونکہ شد در دیدگاں

گشت بینائی شد آنجا دیدہ باں

وائے آں زندہ کہ با مردہ نشست

مردہ گشت و زندگی از وے بجست

ترجمہ: وہ مردہ خوش قسمت ہے جو دنیا سے رخصت ہوا اس لیے کہ وہ زندوں کی محفل میں چلا۔ سیلاب جب چل کر دریا میں جاتا ہے تو وہ دریا بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب دانہ کھیت میں جاتا ہے تو کھیت بن جاتا ہے جب دانۂ گندم نے آدم علیہ السلام سے ناطہ جوڑا تو وہ دانہ ان میں جذب ہو کر مٹ گیا۔ لیکن درحقیقت وہ زندہ ہو کر باخبر ہو گیا۔ موم اور لکڑی نے جب اپنی ذات آگ پر قربان کی تو ان کی ظلمات نور میں تبدیل ہو گئی۔ سُرمہ کا پتھر جب آنکھوں میں چلا گیا تو بینائی میں جذب ہو کر خود بینا ہو گیا۔ افسوس ہے اس انسان پر جس نے مُردے کے ساتھ بیٹھ کر اپنی زندگی گنوا دی اور مُردے کی صحبت سے مُردہ ہو گیا۔

ذٰلِكَ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! خبر سابق مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى تباہ شدہ بستیوں کی بعض خبریں ہیں حالانکہ تباہی سے پہلے وہ بہت خوشحال اور مالدار تھے نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ یہ مبتدا کی دوسری خبر ہے۔ ہم ان کے واقعات آپکو اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ واقعات آپ کی نبوت کے لیے دلائل بن سکیں مِنْهَا بعض ان دیہاتوں میں سے قَآئِمٌ قائم ہیں یعنی ان کے اثرات ونشانات اور ان کی دیواریں ایسے باقی ہیں جیسے کھیتی اپنی ساق پر کھڑی ہوتی ہے، جیسے دیارِ عاد وثمود وَّحَصِيْدٌ ۝ یہ مبتدا ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ یعنی بعض دیہات ایسے ہیں جن کے نشانات بھی مٹ چکے ہیں جیسے بلاد قوم نوح ولوط۔

ف: کاشفی نے لکھا کہ قائم سے باقی وآباد اور حصید سے مفقود یا خراب مراد ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ بعض اجساد قائم اور باقی ہیں کہ ان سے جو منازل ومقامات طے نہ ہو سکے اور وقت ضائع کر دیا تو انھیں اب وہ مقامات ومنازل طے کرائے جاسکتے ہیں اور ان کے نفوس سے جتنی خرابیاں صادر ہوئیں ان کی اصلاح کی جاسکتی ہے اور ان میں سے بعض موت کے جھٹکے سے ختم ہوگئے۔ اب ان سے منازل طے ہوں گے نہ اصلاحِ نفوس ہو سکے گی۔

تفسیر عالمانہ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ اور تباہ وبرباد کر کے ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ هُمْ کا مرجع اهل ہے جو قُرٰی سے پہلے محذوف مضاف ہے۔ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ لیکن انھوں نے اپنی تباہی کے اسباب شرک ومعاصی کا ارتکاب کر کے اپنے نفسوں پر خود ظلم کیا کیونکہ رزق تو اللہ تعالیٰ کا کھائیں اور عبادت غیر اللہ کی کریں، اور اس کے رسل کرام کی تکذیب کریں۔

تفسیر صوفیانہ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں روحانی استعداد پیدا فرمائی اور انھیں ایسے آلات بخشے کہ جن سے وہ کمالات حاصل کر سکیں اور یہ آلات اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کرام کو بھی نہیں بخشے لیکن ان بدقسمتوں نے ان آلات کو خلافِ شرع اپنے نفس کی خواہش کے مطابق استعمال کیا یعنی بت پرستی یعنی خواہشاتِ نفسانیہ اور دنیا کی محبت اور اس کے شہوات میں اپنی استعداد فطری اور آلات کمالیہ کو ضائع کر دیا اسی لیے اسماء جلالیہ کی ہلاکت سے تباہ وبرباد ہوگئے۔

تفسیر عالمانہ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ یہ ما نافیہ ہے پس انھیں نفع نہ دیا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچایا اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ[1] ان کے ان معبودوں نے جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ مضارع

---

[1] یہاں پر روح البیان ج ۴ ص ۱۸۵ میں یدعون کا ترجمہ یعبدون کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہابی، غلام خانی، دیوبندی، مودودی اس ترجمہ کا انکار کرتے ہیں۔ ۱۲

بمعنے ماضی ہے۔

سوال: تم نے دُعاء بمعنے عبادت کیوں کیا؟

جواب: جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے جیسا کہ معانی کا قاعدہ ہے اور دعاء عبادت کا جزء اور اس کے وسائط سے ہے اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دُعاء کو عبادت سے تعبیر فرمایا:

الدعاء هو العبادة۔

لیکن افسوس کہ وہابی دیوبندی دُعاء بمعنے عبادت مانتے ہی نہیں۔ یہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ درانحالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تجاوز کرنے والے ہیں مِنْ شَیْءٍ یہ مصدر کی جگہ پر ہے یہ دراصل شَیْئًا تھا اغنا کا مفعول ہے بمعنے معمولی طور پر بھی انھیں ان کے معبودوں نے فائدہ نہ دیا اور نہ عذابِ الٰہی سے کچھ بچاؤ کر سکے۔ لَمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ یہ اغنا کا مفعول فیہ ہے۔ یعنی عذابِ الٰہی کے نزول کے وقت جبکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے اعمال کی سزا دی وَمَا زَادُوْهُمْ یہ فاعل کی ضمیر ان کے بتوں کی طرف اور هُمْ ضمیر بُت پرستوں کی طرف راجع ہے۔

سوال: بت تو غیر ذوی العقول تھے ان کے لیے ضمیر ذوی العقول کیوں؟

جواب: چونکہ بُتوں کے پُجاری اپنے بتوں کو ذوالعقول سمجھتے تھے جیسا کہ ان کی پرستش کا طریقہ کار بتاتا ہے اور ساتھ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ وُہ انھیں نفع پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی روش کے مطابق ان کے بتوں پر ذوی العقول کے صیغے اور ضمائر استعمال فرمائے ہیں (یہی جواب دیوبندیوں، غلام خانیوں، وہابیوں، نجدیوں، مودودیوں) کے لیے ہوگا۔ وُہ سوال کرتے ہیں کہ ایسے مقامات پر انبیاء و اولیاء مراد ہیں۔ بُت تو غیر ذوی العقول تھے) تفصیل تفسیر اویسی میں دیکھیے۔

غَيْرَ تَتْبِيْبٍ۝ اس کا مادہ تبّ ہے بمعنے هلك وخسر وتبه وغیرہ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کو تباہ کرے اور اسے خسارے میں ڈالے۔ اس لحاظ سے غیر تتبیب بمعنے غیر اهلاک و تخسیر ہے بت پرست بتوں کی پرستش سے تباہ و برباد ہوئے حالانکہ ان کا عقیدہ تھا کہ بتوں سے انھیں نفع اور دفع ضرر حاصل ہوتا ہے۔ اس غلط عقیدے کی نحوست ان پر ایسی پڑی کہ وہ دنیا و آخرت کے منافع سے محروم ہوگئے بلکہ دنیا و آخرت کے خساروں میں مبتلا ہوئے۔ ان کے لیے اس سے بڑی ہلاکت اور خسارہ کیا ہو سکتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ کاف محلاً مرفوع ہے اس لیے کہ یہ مصدر مبتدا کی خبر مقدم ہے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ مواخذہ مذکور کی طرح اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى تیرے رب تعالیٰ کی گرفت ہوتی ہے۔ جب کسی بھی بستی والوں کو پکڑتا ہے۔ گرفت کو اهل کے بجائے بستی کی طرف اسناد میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی بدبختی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ گویا وہ بستیاں سراسر جرم و عصیان تھیں وَهِيَ ظَالِمَةٌ یہ القرٰی سے حال ہے۔ وُہ ظلم اہل قریٰ کا تھا جسے قریٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن چونکہ اخذ کا اسناد قُریٰ کی طرف تھا۔ اسی لیے ظلم کو بھی قُریٰ سے حال بنایا گیا ہے۔

اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس لیے تباہ و برباد کیا کہ وہ کافر و ظالم تھے اور اس لیے بھی تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں کہ کفر و ظلم کی سزا تباہی و بربادی ہے۔ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ۝ بیشک اللہ تعالیٰ کی گرفت سخت دردناک ہے یعنی جو اس کی گرفت میں آتا ہے وہ سخت درد و کرب میں مبتلا ہو جاتا طرح طرح کے مصائب اسے اطراف واکناف سے محصور کر لیتے ہیں۔ پھر اسے نجات کی امید بھی نہیں رہتی۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف "اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے لیکن اس کی گرفت کرتا ہے تو پھر اس کا بچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔" پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

وکذالك اخذ ربك۔ الآیۃ

۵

کے گر صر ظلمش دما دم
چراغ عیش مظلوماں بمیرد
نمی ترسد ازاں کایزد تعالےٰ
اگرچہ دیر گیرد سخت گیرد

ترجمہ: جس کے ظلم کی تیز آندھی مظلوموں کے عیش کے چراغ کو گُل کرتی ہے وہ اس سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اسے پکڑے گا اگرچہ دیر سے ہی۔

ف: اللہ تعالیٰ ظالم کو پناہ نہیں بلکہ مہلت دیتا ہے اور اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ بھی نفسِ امارہ کی ایک علامت ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب اس کی گرفت کرتا ہے تو یہ اس کا عدل ہے۔ ہاں جب کسی کو نظرِ عنایت سے نوازتا ہے تو نورِ عنایت سے اس کے نفس کی اماریت کو مٹا دیتا ہے۔ جس سے اس کا نفس امرِ شریعت کا پابند ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا ہر عمل عذابِ آخرت سے نجات کے حصول درجات و قربات کیلئے ہوتا ہے۔

سبق: گناہ کرتے وقت انسان کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈرنا چاہیے۔ خدانخواستہ اگر کسی وقت گناہ صادر ہو جائے تو فوراً توبہ و استغفار کرنی چاہیے۔ سستی اور ڈھیل کرے گا تو نقصان اُٹھائے گا۔ چنانچہ وارد ہے کہ هلك المسوفون۔

۵

قبول توبہ بر رب کریمست
فعجل ان فی التاخیر آفات

ترجمہ: توبہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ ہر ایک کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اس میں جلدی کرنی چاہیے کیونکہ

تاخیر میں بہت بڑی آفتیں ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ امم ہالکہ یا جن کے قصے ابھی بیان ہوئے ان میں لَاٰیَةً البتہ واضح عبرت اور بہت بڑی نصیحت ہے لِمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ اس کے لیے جو عذابِ آخرت سے ڈرتا ہے۔ یعنی اسے آخرت پر ایمان اور اس کے عذاب کا اقرار ہے وہ اس سے یوں عبرت حاصل کرتا ہے کہ ان کو عذابِ الٰہی نے کیونکر گھیر لیا۔ اور وہ ایسے عذاب میں اسی لیے مبتلا ہوئے کہ ان کے اعمال و کردار بہت بُرے تھے۔ اور وہ عذابِ آخرت کے بھی منکر تھے۔ وہ فنائے عالم کو محال سمجھتے تھے۔ یہ تمام کارروائیاں فاعل مختار حقیقی کی قدرت نہیں مانتا بلکہ وہ سمجھتا رہا کہ آسمانی فلکیات کی گردش سے ہوا اور یہ حوادث اتفاقی ہیں اسے کبھی خیال تک نہ آیا کہ یہ مصائب گناہوں کی شامت ہیں۔ اسی لیے اسے ایسے واقعات سے کبھی عبرت حاصل نہ ہوئی اور نہ کبھی ان میں اس نے فکر کیا۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

سیر سپہر و دور قمر را چہ اعتبار
در گردشند بر حسب اختیار دوست

ترجمہ: آسمان کی گردش اور چاند کے چکر کا کیا اعتبار۔ یہ تمام گردشیں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ اختیار میں ہیں۔

ذٰلِكَ یہ اشارہ یومِ قیامت کی طرف ہے۔ اس پر ذکرِ آخرت دلالت کرتا ہے۔ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ اس دن تمام لوگوں کو جمع کیا جائے گا یعنی اس روز حساب و کتاب اور سزا و جزا کے لیے سب ایک جگہ جمع ہوں گے۔

سوال: صیغہ اسم مفعول کیوں جبکہ یہ فعل ابھی واقع بھی نہیں ہوا۔

جواب: قاعدہ گزرا ہے کہ ایسے صیغے متحقق الوقوع امور کے وقت مجازاً استعمال ہوتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کا حال بحیثیت مجموعیت کے صیغہ مفعول استعمال کیا گیا ہے۔

وَذٰلِكَ عنوان مذکور یعنی لوگوں کو جمع کرنے کے وصف کے ساتھ یومِ قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝ وہ حاضری کا دن ہے یعنی حساب و کتاب کے لیے اہل السمٰوٰت والارض سب کے سب میدانِ حشر میں حاضر ہوں گے۔ کوئی بھی اس میدان سے چھپ نہیں سکے گا۔ یہاں پر مشہود میدانِ محشر اور الشاھدین سے حاضرین مخلوق، اور مشہود فیہ سے وہی دن مراد ہے۔ یوم کی ظرفیت کی وسعت کے پیشِ نظر اسے مفعول بہ کے قائم مقام لایا گیا ہے۔

ف: یوم کا لفظ جیسے مشہود فیہ ہوتا ہے۔ ان میں بعض ایام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طرف مخلوق کھنچی آتی ہے، ان کی کسی عظمت و شان کی وجہ سے۔ جیسے یومِ جمعہ، یومِ عرفہ، ایامِ حروب و قدوم اور یوم سلطان وغیرہ۔ اسی طرح اسے یعنی یوم کو مشہود بھی کہتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: یوم مدرك۔ اور کہتے ہیں: ادرکت یوم فلان۔ میں نے فلاں کے دن کو پا لیا۔ یہاں پر مشہود سے مشہود فیہ مراد ہے۔ اسی لیے یہ یوم بڑا ہولناک ہے۔ یہاں پر مشہود مراد نہیں ہو سکتا

کیونکہ اس طرح ہر یوم، یوم مشہود ہے۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗ جب قیامت کا دن قائم ہوگا تو ہم کسی ایک کو غیر حاضر نہیں ہونے دیں گے۔ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ۝

مگر واسطے ختم ہونے ایک مدت قلیل کے یہاں پر مضاف محذوف ہے۔ کاشفی نے لکھا کہ مگر ایک شمار کردہ مدت کے لیے یعنی جب تک وہ وقت مقررہ نہیں پہنچے گا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی اور یہی اس کی حکمت کا تقاضا ہے:

ف: آیت میں اللہ تعالیٰ سے تخویف و تہدید ہے اور بندوں کو اپنے حال کو صحیح رکھنے اور قلب کے تصفیہ اور تزکیۂ اعمال کے لیے ترغیب دینا مطلوب ہے تاکہ وقوع قیامت سے پہلے اپنے نفس کو محاسن کا خوگر بنائیں اس لیے کہ انسان جو کچھ بوتا ہے وہی کاٹتا ہے اور پانی اسی برتن سے پیتا ہے جس سے پانی پیا جاتا ہے۔

حدیث شریف قدسی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم حرام فرمایا ہے اور تمہارے لیے بھی ظلم حرام ہے۔ فلہٰذا ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سارے گمراہ ہو مگر جسے میں ہدایت دوں۔ فلہٰذا مجھ سے ہدایت طلب کرو تاکہ میں تمہیں ہدایت دوں۔ تم سارے بھوکے ہو مگر جسے میں کھلاؤں۔ فلہٰذا تم مجھ سے طعام مانگو تاکہ میں تمہیں کھلاؤں۔ اے میرے بندو! تم سارے ننگے ہو مگر جسے میں پہناؤں۔ فلہٰذا مجھ سے تن پوشی کی طلب کرو تاکہ میں پوشاک پہناؤں۔ اے میرے بندو! تم شب و روز خطا کاری میں لگے رہتے ہو اور میں تمہارے گناہ بخشتا رہتا ہوں۔ فلہٰذا مجھ سے گناہوں کی بخشش مانگو تاکہ میں تمہارے گناہ بخشوں۔ اے میرے بندو! تم سب مجھے نقصان پہنچا دینا چاہو تو پہنچاؤ اور تم مجھے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر کوئی نفع مجھے پہنچا سکتے ہو تو پہنچاؤ تو تم مجھے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے پہلے اور پچھلے اور تمہارے جن و انس ایک جان بن جائیں تو میرے ملک میں کمی نہیں آئے گی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے پہلے اور پچھلے اور تمہارے جن و انس ایک میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے علیحدہ علیحدہ سوال کرو تو سب کو جواب دوں گا۔ لیکن میرے خزانہ میں کمی نہیں آئے گی۔ یوں سمجھ لو کہ جیسے دریا میں سوئی ڈبو دی جائے تو دریا کے پانی میں کمی نہیں آئے گی۔ اسی طرح میرے خزانے میں کمی نہیں آسکتی۔ اے میرے بندو! تمہارے اعمال کو میں محفوظ کر رہا ہوں۔ قیامت میں تمہیں ان اعمال کی مکمل جزا عطا فرماؤں گا تم میں جو خیر و بھلائی پائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کرو۔ اگر اس کے برعکس پاؤ تو اپنے آپ کو ملامت کرو۔

سبق: عاقل وہ ہے جو مافات کا تدارک کرتا ہے اور تضییع اوقات نہیں کرتا۔ حضرت عارف جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

ہر دم از عمر گرامی ہست گنج بے بدل
میرود گنج چنیں ہر لحظہ باد آخ آخ

ترجمہ: عمر کا ایک ایک لمحہ بے نظیر خزانہ ہے لیکن یہ خزانہ ہوا میں ہوا ہوا جا رہا ہے۔

سبق : خسارے میں وہ ہے جس کا وقت غیر اللہ کی طلب میں گزرا۔ پھر اس بدقسمت کا کیا حال ہوگا جو اپنے اوقات خواہشِ نفسانی میں ضائع کرتا ہے۔

یَوۡمَ یَاۡتِ جب وہ دن آئے گا جسے مؤخر کیا گیا ہے جب دنیا کے لمحات ختم ہوں گے۔ اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔

سوال : وقت کا وقت کیسا یہاں تو یہی لازم آتا ہے۔

جواب : ایک وقت اپنے دوسرے کا جزء ہوتا ہے جیسے گھنٹہ یوم کا اور یوم ہفتے کا، ہفتہ مہینے کا اور مہینہ سال کا۔

ف : یاۡتِ کی یاء محذوف ہے جبکہ کسرہ اس کے قائم مقام موجود ہے جیسے لَا اَدۡرِیۡ کے بجائے لَا اَدۡرِ اور لَا اُبَالِیۡ کے بجائے لَا اُبَالِ بولتے ہیں اور یہ لغت ہذیل میں بکثرت ہوتا ہے۔

حکایت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک مصحف (لکھا ہوا قرآن مجید) پیش ہوا۔ اس میں حروف کے متعلق کتابت غلط دیکھ کر فرمایا کہ اگر کاتب قبیلۂ ثقیف اور پڑھنے والا قبیلۂ ہذیل کا ہوتا تو اس مصحف میں غلطیاں نہ ہوتیں۔ گویا آپ نے ہذیل کی فصاحت کی تعریف فرمائی۔

لَا تَکَلَّمُ نَفۡسٌ یہ ظرف کا ناصب ہے۔ یہ دراصل لا تتکلم تھا۔ یعنی کوئی نفس ایسی بات نہ کر سکے گا جو اس سے نفع یا نجات دے۔ یعنی کسی قسم کا جواب دے گا نہ شفاعت کرے گا۔ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ مگر اللہ تعالیٰ کے اذن یعنی حکم کے بعد شفاعت ہو سکے گی۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا :

لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن وقال صوابا۔

اور فرمایا :

من ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہٖ۔

ف : یومِ قیامت کی مقدار دُنیوی دنوں کے ہزار سال کے برابر ہوگی۔ اس میں میدان محشر ہوگا اور دُوسرے معاملات ہونگے اسی زمانے میں بندوں کے احوال مختلف ہوں گے۔ بعض اوقات گفتگو کریں گے بعض اوقات ایک دُوسرے سے سوال کرینگے کما قال :

یوم یأتی کل نفس تجادل عن نفسھا ولا یتکلمون۔

یعنی بعض اوقات قیامت کے ہول اور فزع اور قہر و جلالِ الٰہی کے سبب بات نہ کر سکیں گے۔ یا انھیں گفتگو کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ کما قال :

ھٰذا یوم لا ینطقون ولا یؤذن لھم فیعتذرون۔

بعض اوقات ان کی زبانوں پر مہر لگا کر ان کے ہاتھوں اور پاؤں سے ان کے اعمال کی گواہی لی جائے گی۔

حدیث شریف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے ہزار سال اندھیرے میں رہیں گے وہاں کوئی بات نہ کر سکیں گے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

اگر تیغ قہر بر کشد ولی ونبی سر در کشد

وگر غمزۂ لطف بجنباند بدانرا بہ نیکاں رساند

ترجمہ: اگر قہر وغضب کی تلوار کھینچے تو نبی وولی خوف زدہ ہو کر سر تسلیم خم کر دیں گے اور اگر لطف وکرم کا اشارہ فرمائے تو بدوں کو نیکوں کے ساتھ کر دے گا۔

؎

گر محشر خطاب قہر بود

انبیاء را چہ جائے معذرتست

پردہ از لطف گو بردار

کاشقیا را امید مغفرتست

ترجمہ: اگر محشر میں قہر وغضب سے خطاب فرمائے تو پھر انبیاء علیہم السلام کو عذر نہ ہو گا۔ لطف سے پردہ اٹھاؤ اس لیے کہ بدبختوں کو مغفرت کی امید ہے۔

فَمِنْهُمْ جب قیامت میں لوگ جمع ہوں گے یا محشر کے میدان میں۔ اس دوسرے معنے پر لا تکلم نفس دلالت کرتا ہے۔ ان میں بعض ہوں گے شَقِيٌّ بدبخت کہ بموجب وعید ان کے لیے جہنم واجب ہو گی وَسَعِيدٌ ۝ اور ان میں بعض سعادت مند ہوں گے کہ جن کے لیے بمقتضائے وعدہ بہشت واجب ہو گی۔

سوال: یہاں پر شقی کو سعید پر کیوں مقدم کیا گیا ہے۔

جواب: چونکہ یہ انذار وتحذیر کا مقام ہے اسی لیے شقی کو مقدم کیا گیا ہے۔

بدبختی کی علامات بدبختی کی پانچ علامتیں ہیں:

۱۔ سنگدلی

۲۔ خوفِ الٰہی سے آنسو نہ بہانا

۳۔ دنیا کی رغبت

۴۔ لمبی آرزوئیں

۵۔ حیاء کی کمی

نیک بختی کی علامات

سعادت کی بھی پانچ علامتیں ہیں:

۱۔ رقیق القلبی

۲۔ گریہ و زاری کی کثرت

۳۔ دُنیا کی بے رغبتی

۴۔ آرزوؤں کی قلت

۵۔ حیاء کی زیادتی (کذا فی التبیین)

صوفیانہ معنے دربارہ شقاوت وسعادت "تاویلات نجمیہ میں ہے کہ شقی وہ ہے جس کے متعلق ازل سے شقاوت لکھی گئی۔ اسی طرح سعید وہ ہے جو ازل سے سعادت مند لکھا گیا۔

بدبخت ازلی کی علامات: ۱۔ حق اور حق طلبی سے اعراض

۲۔ ندامت کیے بغیر معاصی پر اصرار

۳۔ دنیا کی حرص ایسی کہ حلال وحرام میں تمیز نہ کرے

۴۔ خواہش نفسانی کا اتباع اور نفس کی تقلید میں پھنسنے والا

۵۔ بدعت سئیہ کا مرتکب

ازلی سعادت مند کی علامات:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی طلب اور اس کی طرف ہمہ وقت متوجہ رہنے والا۔

۲۔ معاصی سے ہر وقت استغفار کرنے والا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہر وقت توبہ کا اظہار کرنے والا۔

۴۔ دنیا میں معمولی شے مل جانے پر قانع اور حلال کی طلب میں رہنے والا۔

۵۔ اتباع سنت اور اجتناب عن البلاغۃ ومخالفت ہوائے نفس پر مداومت کرنے والا۔

ف: حضرت ابو[illegible] رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آیت ہذا میں اللہ تعالیٰ نے دو شدید امر بیان فرمائے ہیں ہر

۱۔ سیاست جباری

۲۔ سطوت قہاری

کفار کو عالم دنیا میں ذلیل وخوار فرمایا اور ازلی بدبختی وازلی سعادت کا حکم واضح فرمایا کہ جسے سن کر خود سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خوف زدہ ہوئے اس لیے فرمایا کہ:

شیبتنی سورۃ ھود۔ مجھے سورہ ہود (کے سنگین واقعات) نے بوڑھا کر دیا ہے۔

آں یکے را از ازل سعادت بر کنار

ویں یکے را تا ابد داغِ شقاوت بر جبین

عدل او میراند ایں را سوئے اصحاب شمال

فضل او می خواند ازرا نزد اصحاب یمین

ترجمہ: ایک کو اللہ تعالیٰ نے سعادت سے بہرہ ور فرمایا، دوسرے کے ماتھے کو شقاوت سے داغا۔ اس کا عدل شقی اصحاب شمال میں لے جاتا ہے اور اس کا فضل سعادت مند کو اصحابِ یمین میں لے جاتا ہے۔

ف: ابن الشیخ نے اپنے حواشی میں لکھا کہ فمنھم شقی و سعید سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اہل محشر ان دو قسموں میں سے ہیں:

۱۔ دائماً جہنم میں رہیں گے مگر جنہیں رب تعالیٰ چاہے۔

۲۔ بہشت میں ہمیشہ رہیں گے مگر جنہیں اللہ تعالیٰ چاہے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اطفال المشرکین اور مجانین (پاگل)، اگرچہ انھیں علم و عمل کی خبر نہ تھی تب بھی انہی دو قسموں میں داخل ہیں۔

سوال: اگر کہو کہ وہ بہشت میں ہوں گے تو بھی غلط، کیونکہ بلا ایمان بہشت میں کوئی بھی داخل نہ ہوگا۔ اگر کہو کہ دوزخ میں جائینگے تو بلا گناہ کسی کو دوزخی سمجھنا اچھا نہیں۔

جواب: اسلامی ضابطہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دنیوی امور اشرف الابوین سے متعلق ہوتے ہیں یعنی ماں باپ اہلِ ایمان ہوں تو ان کے احکام انہی کے ساتھ متعلق ہوں گے اور امور آخرت کے متعلق حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فیصلہ فرمایا ہے۔

حدیث شریف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اطفال مشرکین کے متعلق سوال ہوا کہ کیا وہ بہشت میں ہوں گے یا دوزخ میں۔ آپ نے فرمایا کہ ان کی آنے والی زندگی کو اللہ جانتا ہے کہ بعد بلوغ وہ کافر رہتے ہیں یا مومن۔ اسی اعتبار سے ان کا فیصلہ قیامت میں اللہ تعالیٰ خود فرمائے گا ہمیں توقف کرنا چاہیے۔

فیصلہ کن تحقیق اس مقام پر تحقیق یہ ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ اہل فترات و اطفال صغار (چھوٹے بچے) اور مجانین (پاگل) ایک میدان میں جمع کیے جائیں گے تاکہ اللہ تعالیٰ کے عدل کا اظہار ہو کہ مجرم کو سزا ملے اور نیک عمل والوں کو ثواب (بہشت) انھیں لوگوں سے علیحدہ کر کے ایک کھلے میدان میں کھڑا کیا جائے گا۔ ان میں کسی ایک افضل کو نبی بنا کر مبعوث فرمائے گا اور اس کے ساتھ جہنم بھی متشکل کر کے لائی جائے گی ان کے ہاں وہ رسول جا کر فرمائے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بعض اس کی تصدیق کریں گے اور بعض تکذیب۔ پھر وہ رسول انھیں فرمائے گا کہ سب خود بخود اس جہنم

میں داخل ہو جاؤ۔ جو میری فرماں برداری کرے گا وہ نجات پائے گا۔ جو میری نافرمانی کرے گا تباہ و برباد ہوگا۔ پھر ان میں جو شخص اس آگ میں کُودے گا وہ ثواب پائے گا اور اسی عمل سے بہت بڑے مراتب حاصل کرلے گا اور وہ نار اس پر گلزار بن جائیگی۔ اور جو اس وقت اس نبی کی نافرمانی کرے گا وہ سزا کا مستحق ہو کر اسی جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اپنے عمل کی وجہ سے جہنم میں رہے گا۔ یہ کارروائی اس لیے ہوگی تاکہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے بارے میں عدل ظاہر ہو۔ (ہٰذا ورد فی صحیح الاخبار)

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا بہرحال جن کو ازلی شقاوت نصیب ہوگی اور ان کے لیے ازل سے جہنم لکھی جاچکی ہوگی فَفِی النَّارِ پس وُہ جہنم میں ہوں گے یعنی ہمیشہ جہنم میں ٹھہریں گے۔ یہ سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ ازلی بدبختوں کو جب جہنم میں ڈالا جائے گا تو ان کا کیا حال ہوگا؟ جواب لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ الزفیر وہ آواز جو پورا زور لگا کر نکالی جائے۔ الشہیق جو اسی آواز کے رد کنے کے وقت پیدا ہوتی ہے۔

ف : گدھے کی دُو آواز جو پہلے بڑے زور سے ہینگنے کے وقت نکالتا ہے اور پھر آخر میں دھیمی دھیمی آواز سے خاموش ہوتا ہے پہلی آواز کو زفیر، دوسری کو شہیق کہا جاتا ہے۔ یہ استعارہ تمثیلیہ ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ جہنمیوں کی آواز کو گدھے کی آواز سے تشبیہ دینا مطلوب ہے۔ یعنی جیسے گدھے کی ایسی مکروہ آواز ہے کہ سامع کی طبع منغص ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی جہنمیوں کی مکروہ آواز سے طبائع منغص ہوں گی۔ اسے دنیا میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو کراہتے وقت مکروہ آواز نکالتا ہے بالخصوص سُولی چڑھانے، گلا گھونٹنے اور گردن مارنے اور ہاتھ کاٹنے و دیگر سخت تکالیف کے وقت مکروہ آواز خارج ہوتی ہے۔

ف : قیامت میں بعض جہنمیوں کی آواز گائے بیل کی آواز کی طرح خارج ہوگی۔ جیسے ان کے اجسام وغیرہ کے رنگ میں تغیر آجائے گا۔ ایسے ہی ان کی آوازیں بھی متغیر ہوں گی اور آخرت کا حال دنیا کے حال سے ہزار گنا زیادہ سخت ہوگا۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ظرف کی ضمیر مستقر سے حال مقدرہ ہے۔ یعنی فی النار کی مستقر ضمیر سے یہ اس وقت ہے جب کہا جائے گا کہ ان کا داخلہ عالم آخرت میں بطور حدوث ہو یعنی یہ کہا جائے کہ وہ پہلے اس سے باہر تھے۔ پھر جب اس میں داخل ہوں گے تو ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ انھیں اس سے باہر کبھی نہ نکلنا ہوگا۔ بعض نے کہا کہ اسے حال مقدرہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ دُوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا، فادخلوھا خٰلدین کیونکہ ان کا دائمی طور جہنم میں رہنا جہنم میں داخل ہونے کے بعد ہی ہوگا۔ اسی لیے اسے حال مقدرہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یہ ما مصدریہ اور مصدر مؤول ظرف کے قائم مقام ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ وُہ دوزخ میں آسمان و زمین کے دوام کی مدت تک رہیں گے اس سے دوام غیر منقطع مراد ہے کیونکہ اہل عرب کی عادت ہے کہ جب کسی شے کے لیے دوام وخلود کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے لیے ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان و زمین کو دوام غیر منقطع ہے ان کے عقیدے کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے کہ جہنمیوں کے دوزخ میں دوام غیر منقطع کو ما دامت السمٰوٰت والارض سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہ قرآن مجید کا عام دستور ہے کہ کفار و مشرکین کو

مسائل سمجھاتے وقت بسا اوقات ان کے عقاید و مزعومات کو مدنظر رکھتا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) قرآن مجید میں وہی ثابت ہے جو کفار و مشرکین کا عقیدہ ہے[1]

سوال: تم نے کہاں سے سمجھ لیا کہ یہ آیت ان کے عقیدے کے مطابق کہی گئی ہے۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے تغیر و تبدل کے متعلق متعدد مقامات پر تصریح فرمائی ہے۔ کما قال:

یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت۔

اور فرمایا:

واورثنا الارض نتبوأ من الجنة حیث نشاء۔

عقلی جواب: اہلِ آخرت کو لامحالہ سایہ کی ضرورت ہوگی اور استقرار کی بھی۔ اسی لیے قیامت میں ان کے سایہ کے لیے انہی آسمانوں یا عرش معلّی کو ان کے اُوپر رکھے گا۔ اور قاعدہ ہے کہ کل ما علاك فھو سماء، جو شے بھی تیرے اُوپر ہو وہ آسمان ہے۔ اور جس شے پر انسان کا قدم قرار پکڑے وہ اہل عرب کے نزدیک ارض ہے۔ اس معنے پر سمٰوٰت وارض کہنا صحیح ہے کہ ان سے یہی معنیٰ مطلوب ہے نہ کہ موجودہ آسمان وزمین۔

سوال: ان آسمانوں اور زمینوں کو ایسی اشیاء سے تشبیہ دینا جن کا تاحال وجود ہی نہیں تو پھر تشبیہ کیسی۔ اور پھر اس کا اکثر مخلوق کو علم ہی نہیں۔

جواب ۱: شے کے عدم وجود سے تشبیہ کی نفی کیسی جبکہ اہلِ بلاغت نے ایسی تشبیہات کو جائز مانا ہے اور اکثر مخلوق کا نہ جاننا تشبیہ کے لیے موجب ممانعت نہیں۔ اسے یوں سمجھیے کہ بہت سی چیزوں کو کیمیا سے اور بہت سی اشیاء کو مدینۂ ارم سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان کا وجود مفقود اور ان کا علم اکثر کو غیر معلوم۔

جواب ۲: حضرت شیخ قدس سرہٗ نے فتوحات میں فرمایا کہ آسمان و زمین کا دوام ان کی موجودہ شکل و صورت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے اصلی جوہر کی وجہ سے ہے۔

صوفیانہ جواب: اہلِ تاویل یعنی صوفیاء کرام نے فرمایا کہ سمٰوٰت سے ارواح و قلوب اور ارض سے نفوس و بشریت مراد ہے۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ یہ خلود فی النار سے استثناء ہے یعنی بعض اہلِ نار کو خلود نہ ہوگا۔ ان سے وہ اہلِ ایمان مراد ہیں جنھوں نے دنیا میں گناہ کا ارتکاب کیا اور توبہ کیے بغیر مر گئے تو انھیں جہنم میں سزا کے طور ایک مدت تک داخل کر کے پھر نکالا جائے گا اور استثناء کے لیے اسی قدر کافی ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ زوال الحکم عن الکل کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس کے

---

[1] یہ قاعدہ وہابیہ دیوبندیہ مرزائیہ کے رد میں بہت کام دے گا۔

بعض سے حکم سے زائل ہو۔

ف: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ ایک ہی شخص میں سعادت وشقاوت کا اجتماع جائز ہے لیکن ان میں دو مختلف اعتبار و ں کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اہلِ شقاوت کا ذکر فرما کر الا ما شاء ربک فرمایا اس لیے کہ اشقیاء کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ شقی

۲۔ اشقی

شقی وہ ہے جسے دولتِ توحید تو نصیب ہوئی لیکن وہ شومیِ قسمت سے دنیا میں معاصی کا مرتکب رہا ہم اسے بوجہ توحید کے سعید کہیں گے اور معاصی کی وجہ سے شقی، اور یہی معاصی انھیں جہنم میں لے جائیں گے لیکن توحید کی برکت سے دوزخ سے نکل کر بہشت میں واپس آجائے گا۔

اشقیٰ وہ ہے جو کفر و شرک اور بدعت سیئہ کا مرتکب رہا اسے یہی امور جہنم میں لے جائیں گے اور انہی کی نحوست سے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اعجوبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ مدت تک اس کے اندر کوئی ہوگا ہی نہیں۔ یعنی جہنمیوں سے خالی پڑی رہے گی۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ وحضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

ف: اہل سنت نے فرمایا کہ اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ اس جہنم سے وہ مقامات مراد ہیں جہاں وہ اہلِ ایمان داخل کیے گئے جنھیں فسق وفجور اور معاصی کی وجہ سے سزا ملی۔ جب وہ سزا پا کر جہنم سے نکال کر بہشت میں داخل کیے جائیں گے تو ان کے یہ مقام خالی ہو جائیں گے ورنہ کفار کو جہنم کے جن مقامات پر ٹھہرایا جائے گا وہ ہمیشہ پُر رہے گی۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

دلا طمع مبر از لطف عنایت دوست

کہ می رسد ہمہ را لطف بے نہایت او

ترجمہ: اے دل! مالک الملک کے لطف سے نا امید نہ ہو کیونکہ اس کا لطف وکرم ہر ایک کو پہنچتا ہے۔

ف: اس شعر میں سرِ خفی کی طرف اشارہ ہے جسے صرف اہلِ الہام سمجھ سکتے ہیں۔

مسئلہ: بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ ترقی وتنزل دنیا میں جاری رہتا ہے۔ آخرت میں کوئی ترقی نہیں۔

سوال: ایسے مجرمین کو آخرت میں ترقی نصیب ہوئی کہ وہ پہلے جہنمی تھے پھر بہشتی ہوئے۔

جواب: یہ ترقی بھی دنیا سے متعلق ہے اس لیے کہ دنیا میں انہوں نے ایمان قبول کیا جس کی وجہ سے انھیں ایمان کی جزا آخرت میں نصیب ہوئی۔ یہ ترقی دراصل دنیوی تھی جس کا ظہور آخرت میں ہوا۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ چاہے تو کافروں کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل رکھے، چاہے تو فاسقوں کو جہنم سے نکال کر بہشت میں داخل فرمائے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں۔

ف: فعّال مبالغہ کا صیغہ اسی لیے کہ وہ اپنے ارادے کو کثرت میں لاتا ہے جیسے چاہتا ہے۔

ف: مولانا ابو السعود رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ الا ما شاء ربک کا استثناء خلود سے ہے اور یہ جائز ہے جیسے آیات لا یذوقون فیہا الموت الا الموتۃ الاولیٰ اور ما نکح اٰباءکم من النساء الا ما قد سلف۔

اور فرمایا: حتی یلج الجمل فی سم الخیاط۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ امور مذکورہ کا محال ہونا عقلاً ہے۔ اور بعض کا عدم خلود فی النار کا تعلق مشیتِ ایزدی سے محال ہونا نقلاً ثابت ہے۔ اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ ٹھہریں گے مگر وہ ہمیشہ نہیں چند روز جہنم میں رہیں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ چاہے گا اس لیے کہ مشیت نے بعض کے لیے خلود جہنم کا استثناء فرمایا ہے اور ان کے لیے مختصر مدت رہنے کا اشارہ فرمایا ہے اور جن کے لیے دائمی جہنم میں رہنے کا حکم ہے وہ بھی نصوص قاطعہ سے ثابت ہے کہ ان کے جہنم سے خارج ہونے کی کوئی مدت مقرر نہیں اور نہ ہی اس سے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے مشیتِ ایزدی پر واجب ہے کہ وہ ایسے ہی چاہے۔ اسی لیے فرمایا:

فعال لما یرید۔

یعنی اشقیاء کو جہنم کے خلود کا خلاف محال ہے جبکہ اس نے جو کچھ صادر فرمایا ہے وہ اس کے ارادے پر ہوا ہے اور اس کا ارادہ بھی اسی مشیت کے مطابق ہے جو اس نے اپنی حکمت کے مطابق طریقہ جاری فرمایا ہے تاکہ بندوں کے اعمال کا پورا تجربہ ہو سکے۔

ف: اس کی ایک اور صوفیانہ توجیہہ بھی صاحبِ رُوح البیان نے بیان فرمائی ہے وُہ یہ کہ یہ لوگ ہمیشہ جسمانی عذاب میں مبتلا نہیں رہیں گے بلکہ انھیں ایک روحانی عذاب ہو گا جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ عذاب آتنا شدید اور دردناک ہو گا کہ انھیں جہنم کا جسمانی عذاب بھی بھول جائے گا بلکہ جسمانی عذاب محسوس تک نہ کریں گے جبکہ روحانی عذاب کے درد کی شدت بہت سخت اور تیز ہو گی جیسے ایک شخص بہت بڑے غم میں مبتلا ہو اور بہت اہم معاملہ کی شدت اس کے عقل و فکر کو گھیرے تو وہ جسمانی درد کو بھول جاتا ہے یہاں تک کہ اسے چیونٹی، مچھر اور پسّو کے تکلیف پہنچانے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک جسمانی درد سخت ترین ہو تو دوسرا اس سے کم ہو تو تھوڑا اور سخت درد کے مقابلے میں محسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان کو جب فرحت و سرور نصیب ہوتا ہے تو درد کا احساس جاتا رہتا ہے۔ اس کی مزید تحقیق ہم آگے چل کر عرض کریں گے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا سعد بمعنے اسعد ہے دونوں لغتیں استعمال ہوتی ہیں جیسا کہ کسائی نے کہا۔ یعنی بہرحال وہ لوگ جن کے مقدر میں سعادت لکھی جا چکی ہے اور وہ اسی سعادت کے لیے پیدا ہوئے۔ فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ط تو وہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے مگر وُہ جن کے لیے

اللہ تعالیٰ چاہے۔

اس آیت کی تفسیر میں چند اقوال ہیں:

۱۔ قتادہ نے کہا کہ واللہ اعلم کہ یہاں پر استثناء کا کیا مطلب ہے۔

۲۔ ضحاک نے فرمایا کہ اس استثناء کا مطلب یہ ہے کہ الا ما مکثوا فی النار حتی ادخلوا الجنۃ۔ یعنی یہ استثناء ان لوگوں کے لیے ہے جو معاصی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہو کر پھر بہشت میں داخل ہوں گے۔ یہ تابید میں ابتداً سے ہے۔ جیسے کسی شے کا نقصان شے کے انتہا پر ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی شے کے نقصان کا اعتبار مبدا یعنی ابتداء سے بھی ہوتا ہے۔

۳۔ حضرت مولانا ابوالسعود نے فرمایا کہ اگر اسے تعلیق بالمحال کے طریقہ سے مانا جائے تو عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ کا منصوب ہونا ففی الجنۃ خٰلدین فیھا کے معنی سے (علی المصدریہ) مفعول مطلق ہوگا اس لیے کہ ففی الجنۃ اعطاء و انعام کے معنے کا مقتضی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے:

یعطیھم اعطاء غیر مقطوع بل ممتد الا الی نہایۃ۔

یعنی انھیں غیر مقطوع انعام سے نوازے گا اور ان انعامات کا انتہا نہ ہوگا۔ اس معنی پر عطاء یا اسم مصدر ہے یا مصدر ہے۔ لیکن اس سے اعطاء کے زوائد حذف کر کے عطاء پڑھا گیا ہے۔ جیسے انبتکم من الارض نباتا میں انباتاً سے نباتا (بحذف الزوائد) پڑھا گیا ہے۔

۴۔ یا اس معنی میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہشت میں جو انعامات اپنے نیک بندوں کے لیے تیار فرمائے ہیں وہ ایسے ہیں جنھیں صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اسے حدیث میں یوں تعبیر فرمایا کہ:

مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

اس معنے پر اس کا منصوب ہونا مشیت کے مفعول مقدر سے علی الحالیۃ یعنی یہ مشیت کے مفعول سے حال ہے۔

۵۔ بعض مشائخ کا قول ہے کہ بہشتی بہشت میں بھی ترقی کرتے رہیں گے۔ یہاں اسی طرف اشارہ ہے کہ ہر صاحب ترقی ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ کی طرف ترقی کرے گا۔

تفسیر صوفیانہ

تاویلات نجمیہ کی تحقیق یہ ہے کہ اہل سعادت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ سعید

۲۔ اسعد

سعید وہ ہے جو بہشت میں درجات و غرفات علیا بوجہ عبادت و عبودیت کے حاصل کرے۔

اسعد وہ ہے جو بہشت اور اس کے درجات سے ترقی کرتا ہوا مقام قربت الٰہی میں پہنچے بوجہ تقویٰ و معرفت و محبت۔

کما قال تعالیٰ:

ان المتقین فی جنات و نهر فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر۔

اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

اہلِ جنت اہلِ علیین کو بلند و بالا مراتب میں ایسے دیکھیں گے جیسے تم دنیا میں آسمان پر چمکتے دمکتے ستارے کو دیکھتے ہو۔ سیدنا ابو بکر و سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما انہی سے ہیں بلکہ ان سے بہترین اور اعلیٰ مکان میں ہوں گے۔ اہلِ جنت و اہلِ علیین کو بہشت میں دائمی خلود ہوگا لیکن جو مقعد صدق (بہشت کا ایک اعلیٰ مقام) ہیں، انھیں بہشت کے عام مقامات سے جذبات کے ذریعے نکال کر عالمِ وحدت میں پہنچایا جائے گا۔ اسے الا ماشاء ربك سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مزید تحقیق اس میں راز یہ ہے کہ سالک قدم معاملات کے ساتھ تنزلات بشریہ سے مقام روحانیہ کے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے۔ یہاں پر مقام دوئی ختم ہوجاتا ہے۔ یہی حقیقی سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ یہاں پر جنۃ الماویٰ ہے اس مقام کو ملک مقرب اور نبی مرسل جذبۂ عنایتِ الٰہی کی رفرف سے طے کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس پر ثقلین کا عمل قربان کیا جائے تو اس کے شایانِ شان ہے اسی سے ہی بندہ عالم وحدت میں واصل ہوتا ہے یہاں نہ دخول کو دخل ہے نہ خروج کو۔ اور الا ماشاء ربك کا استثناء بھی اسی مقام کے لیے ہے۔ اسی مقام کے لیے فرمایا:

عطاء غیر مجذوذ۔

اس لیے کہ اس مقام کے انعامات کو انقطاع نہیں اور ان میں تغیر و تبدل ہے۔

صاحبِ رُوح البیان کے پیر و مرشد کی تقریر

صاحب روح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ میں نے اپنے پیر و مرشد اور شیخ کامل سے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ ہر بہشتی اپنے دُوسرے مقام کو حاصل کرے گا تو وہ بلندی و شرافت میں ایسا بے نظیر ہوگا کہ اسے پہلے سے کسی قسم کی مشابہت نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے الا ماشاء ربك فرمایا ہے۔ اور بہشتیوں کا ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے کی طرف منتقل ہونا عرصۂ دراز کے بعد ہوگا۔ اس وقت انسان کو ابد الآباد کے شیشے سے ازل کا راز معلوم ہوگا۔ اسے یوں سمجھیے کہ جیسے تعینات کے مبداء کو ازل الآزال کہا جاتا ہے ایسے ہی اس مرتبہ حصول بہشت کے اندر مخصوص تجلی کے مقام کو ابد الآباد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تعینات کے مبدأ سے شئونات غیبیہ مراد ہیں۔ اس تقریر سے معلوم ہُوا کہ ابد مضاف ہے اور اس سے یہی تجلی کا مقام لا الی نہایۃ مراد ہے اور اس کا مضاف الیہ اس سے پہلے اوقات ہیں یعنی دخولِ بہشت سے لے کر تا حصول تجلی مخصوص اور ازل کو بھی اسی طرح سمجھئے یعنی ازل سے مذکور مبدا کا ما فوق مراد ہے اور یہی ازل مضاف ہے اور اس مبداء کا ماتحت مضاف الیہ ہے۔ اس کی نظیر یہی ہے جو دنیا میں اہل فنا کلی کو مراتب حاصل ہوتے ہیں وہ اس لیے کہ ان حضرات کو ارزاق معنویہ مکمل طور پر نصیب ہوئے یہاں تک کہ ان کے مراتب اور خاص تعین میں ان کے لیے کوئی شے باقی نہیں چھوڑی جاتی وہ اسرار افعال و صفات و ذات کے جمیع مراتب و تعینات کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ

انھیں کسی دوسری ایسی صورت میں تجلیِ خاص سے نوازتا ہے کہ مرتبہ سابق کو اس سے معمولی مشابہت بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے وُہ دائمی زندگی پاتے ہیں۔

ف : جیساکہ اوپر کی تقریر اہلِ جنت و اہلِ علیین کے لیے آپ نے پڑھی ایسے ہی اہلِ نار کے لیے بھی یہی تقریر جاری ہوسکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اہلِ جنت و اہلِ علیین اہلِ جمال ہیں اور اہلِ نار اہلِ جلال ان کے مقام کا نام مقام فردیت ہے اسی لیے آخرت میں انھیں نہ تزوج سے نوازا جائے گا نہ تنعم سے، جیسے کہ اہلِ جنت کو تزوج بھی نصیب ہوگا اور تنعم بھی۔ اور جیساکہ سب کو معلوم ہے کہ اہلِ جنت اہلِ جمال ہیں اسی لیے ان کے مقام کا نام مقامِ صفت ہے اور مقامِ صفت تنعم و تلذذ چاہتی ہے بنا بریں انھیں تنعم و تلذذ سے نوازا جائے گا۔

ف : اہلِ جنت و اہلِ نار میں فرق یہ ہے کہ اہلِ جنت کا ظہور صفات سے ہُوا اور ہر ظہور کا بطون ہوتا ہے اہلِ جنت کے بطون کو سر الذات کہا جاتا ہے۔ اور اہلِ نار بطون سے متعلق ہیں اور بطون کا کوئی ظہور نہیں اور اہلِ کمال کو وہ احاطہ و وسعت نصیب ہوتی کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا اور یہ پروگرام دونوں جہانوں میں جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقربین کو ابرار کے احوال معلوم ہیں اور ان کے مقامات و منازل مقربین کے سامنے ہیں لیکن ابرار کو مقربین کے احوال معلوم نہیں اور نہ ہی وہ ان کے مقامات و منازل کو جانتے ہیں ایسے ہی ابرار کو اصحاب المشئمۃ (جہنمیوں) کے احوال سے واقف ہیں لیکن اصحاب المشئمۃ ابرار کے احوال سے بیخبر ہوتے ہیں۔ اسی طرح حال دنیا کا ہے کہ وہ برزخ سے محجوب ہے اور برزخ سے آخرت کا حال پوشیدہ ہے اسی قانون پر بعض مشائخ نے فرمایا کہ رُوح جب قفسِ عنصری کی قید و بند سے خلاصی پا جاتا ہے۔ اگر وہ علوی ہے تو ان کے بعض کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک برزخ کو طے کرتا ہے بعض اس سے زاید کو اور بعض تو تمام برازخ طے کر لیتے ہیں۔ ایسے ارواح جب ایک برزخ کو طے کرتے ہیں تو اس کا احاطہ بڑھتا ہُوا محیط حقیقی سے جا ملتا ہے اور محیط حقیقی میں پہنچ کر مضمحل ہوجاتا ہے پھر سوائے محیط کل کے باقی کون۔ اگر وہ رُوح سفلی ہے تو وہ بلا و عذاب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

ف : سالک کو مکاشفہ کے بعد علمِ الٰہی کی چالیس سال کے بعد ہوتی ہے ایسے علم الٰہی یعنی انسان اپنے منتہی مراتب کو چالیس سال کے بعد مکمل کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانی سلوک کا طریقہ جاری فرمایا اور یہ وُہ مراتب ہیں جن کے حصول کا علم انسان کو پہلے نہیں تھا اور علم کی حد یہی ہے اس کے بعد تحقیق کے مراتب کا آغاز ہوتا ہے۔ تحقیق کے مقام کی علامت یہ ہے کہ اس وقت انسان کل اوصافِ طبعیہ و نفسانیہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں دے دیتا ہے۔ اس کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں ہوتا اور وُہ اپنا ہر کام اللہ تعالیٰ کی مدد سے کرتا ہے۔

سبق : سالک کو غور کرنا چاہیے کہ مقامِ سلوک کے مراحل کتنے پُر کٹھن ہیں اور کتنی مشکلات کے بعد مطلب نصیب ہوتا ہے۔ (لیکن ہمارے دور میں تو آسان ہے وہ یہ کہ 'ذکر کر کہا شکر')

ف : یہ مراحل و منازل کسی شیخ کامل کی رہبری کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔ اسی لیے سالک پر لازم ہے کہ وہ کسی رہبر کامل کا

دامن تھامے۔ حضرت مولانا روم قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

پیر را بگزیں بے پیر ایں سفر ہست رہ پر آفت و پر خطر
آں رہے کہ بارہا تو رفتہ بے قلاؤز اندر آں آشفتہ
پس رہے را کہ ندیدستی تو ہیچ وین مرو تنہا ز رہبر سر مپیچ
گر نباشد سایہ پیر اے فضول پس ترا کشتہ دارد بانگ غول

اے اللہ تعالیٰ! ہمیں اپنی مدد سے ہمکنار فرما اور ہر آن تو ہی ہمیں دستگیری سے نواز۔

تفسیر عالمانہ فَلَا تَكُ دراصل لا تکن تھا بوجہ کثرت استعمال نون حذف کر دیا گیا ہے۔ یعنی جب ہم نے واضح طور سابق لوگوں کے واقعات اور اُن کے بُرے انجام کی تفصیل سُنا دی تو نہ ہو جاؤ فِیْ مِرْیَةٍ شک میں مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ یہ ما مصدریہ ہے یعنی موجودہ دور کے بُت پرستوں کی وجہ سے بلکہ پُورا یقین کیجیے کہ مشرکین گمراہ اور ان کا انجام بربادی ہوگا۔ گویا یہ سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ شک کیوں نہ کروں تو اس کا جواب ملا کہ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ یہ اسی طرح بُت پرستی کرتے ہیں جیسے ان سے پہلے ان کے آبا و اجداد کرتے تھے یعنی بطلان و بُری تقلید میں ان کا اور ان کے آبا و اجداد کا ایک طریقہ ہے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نہ انھیں حق و تحقیق نصیب ہے نہ ان کے آباؤ اجداد کو نصیب تھا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اہل فترت میں جنھوں نے بت پرستی کی تھی وہ یقیناً جہنمی ہیں جیسا کہ آیت ہذا کی مذمت سے واضح ہے۔

وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ اور بے شک ہم پورے طور دیں گے۔ یہ توفیۃ سے ہے بمعنے کوئی شے کسی کو علیٰ وجہ التمام او العطا کرنا اور هُمْ کا مرجع مذکورہ بالا کفار بُت پرست ہیں نَصِيْبَهُمْ ان کے متعین عذاب کا حصہ جو ان کے لیے دنیا و آخرت میں مقدر ہو چکا ہے۔ یعنی جیسے ہم نے ان کے آباو اجداد کو مقرر کردہ عذاب مکمل طور پر دیا۔ ایسے ہی انھیں بھی۔ خلاصہ یہ کہ جیسے انھوں نے اپنے جرائم کی پوری سزا پائی یہ بھی اپنے کردار کی سزا بھگتیں گے۔

قاعدہ: اسباب کا تماثل مسببات کے تماثل کا متقاضی ہے۔ چونکہ موجودہ کافروں کے اسباب اپنے اجداد کے اسباب سے متماثل ہیں اسی لیے جیسے انھیں عذاب نصیب ہوا ایسے ہی انھیں بھی ہوگا۔

سوال: ہم اللہ تعالیٰ کے لیے اسباب کے قائل نہیں تو یہاں اسباب کا کیا مطلب۔

جواب: یہاں پہ اسباب عادیہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بندوں کے لیے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اسباب سے متعلق کیا ہے تو پھر جو شے جس سبب سے حاصل ہوگی وہ حسب عادت اسی طرح حاصل ہوگی اس کے خلاف نہ ہو سکے گا۔ (الا ما شاء اللہ)

غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝ یہ نصیب سے حال مؤکدہ ہے جیسے مُصَدِّقًا، هو الحق مصدقاً میں حال موکدہ ہے۔ اس حال کو

لانے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ذوالحال میں مجازی معنیٰ متصور نہ ہو حال سے ذوالحال میں ایسا مقرر اور ثابت ہو جاتا ہے کہ اس میں غیر کا احتمال بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: آیت میں تقلید کی مذمت کی گئی ہے لیکن یاد رکھنا ضروری ہے کہ تقلید فروع و مسائل فقہیہ میں جائز لیکن اصولِ دین و عقاید میں ناجائز ہے کیونکہ اعتقادیات و اصول دین میں نظر و استدلال ضروری ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص اصول دین و اعتقادیات میں نظر و استدلال کے بغیر کسی کی تقلید میں ایمان لاتا ہے تو احناف اور اہلِ ظواہر کے نزدیک اس کا ایمان قابل قبول ہوتا ہے اگرچہ وہ اس نظر استدلال کے نہ کرنے سے گنہگار ہے اور ترک وجوب گناہ ہے۔

مسئلہ: تقلیدی ایمان یہ ہے کہ دل سے مانے کہ یہ جملہ حادث اور صانع خالق ہے اور اس کے جملہ صفات حق ہیں اور اس کا رسل کرام کا بھیجنا حق ہے اور وہ جو احکام اللہ تعالیٰ سے لائے وہ تمام حق ہیں ان عقاید کو ماننے میں اپنے نظر و استدلال کو کام میں نہ لائے بلکہ دوسروں کے کہنے پر عقیدہ رکھے جیسے عوام کا حال ہے۔ اور ہمارے (احناف کے) نزدیک تقلیدی ایمان اس لیے قابل قبول ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بادیہ نشینوں، چھوٹے بچوں اور عورتوں کا بلا نظر و استدلال ایمان قبول فرمایا۔ اسی طرح ان پڑھ غلاموں اور کنیزوں کا بھی، اور پھر انھیں آپ نے کسی قسم کی دلیل کی تلقین بھی نہ فرمائی۔

فائدہ صوفیانہ یقین ترک تقلید و وصول الیٰ عین التوحید سے حاصل ہوتا ہے۔
عارف جامی قدس سرہٗ نے فرمایا:

سیراب کن ز بحر یقین جان تشنہ را
زیں بیش خشک لب منشین بر سراب ریب

تقلید کسے کہتے ہیں صاحب روح البیان نے تقلید کی تعریف یوں بیان فرمائی کہ:
ھو قبول قول الغیر بلا دلیل۔ کسی کا قول بلا دلیل مان لینا[1]

---

[1] چونکہ ہمارے دور میں غیر مقلدوں (وہابیوں) نے تقلید کو شرک کا درجہ دیا ہے یہ غلط ہے کیونکہ تقلید لغت میں بمعنے قلادہ در گردن بستن یعنی گلے میں ہار یا پٹہ ڈالنا۔ شریعت میں کسی کے قول و فعل کو اپنے پر لازم شرعی جاننا یہ سمجھ کر کہ اس کا کلام اور اس کا کام ہمارے لیے حجت ہے کیونکہ یہ شرعی محقق ہے۔ جیسے کہ ہم مسائل شرعیہ میں امام صاحب کا قول و فعل اپنے لیے دلیل سمجھتے ہیں اور دلائل شرعیہ میں نظر نہیں کرتے۔

۱۔ روح البیان کا قول اوپر دیکھیے۔

۲۔ حاشیہ حسامی باب متابعتِ رسول اللہ علیہ السلام میں ص ۸۶ پر شرح مختصر المنار سے نقل کیا اَلتَّقْلِیْدُ اِتِّبَاعُ الرَّجُلِ غَیْرَہٗ فِیْمَا سَمِعَہٗ یَقُوْلُ اَوْ فِیْ فِعْلِہٖ عَلٰی زَعْمِ اَنَّہٗ مُحِقٌّ بِلَا نَظَرٍ فِی الدَّلِیْلِ۔

(باقی بر صفحہ آیندہ)

سبق صوفیانہ: جملہ اصحاب تقلید وارباب طبیعت درحقیقت دُنیا اور خواہشاتِ نفسانی کی پرستش کرتے ہیں۔ اسی لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۳۔ یہی عبارت نورالانوار بحث تقلید میں بھی ہے۔ تقلید کے معنے ہیں کسی شخص کا اپنے غیر کی اطاعت کرنا۔ اس میں جو اُس کو کہتے ہوئے یا کرتے ہوئے سُن لے یہ سمجھ کر کہ وہ اہل تحقیق میں سے ہے بغیر دلیل میں نظر کیے ہوئے۔

۴۔ امام غزالی کتاب المستصفےٰ جلد دوم صفحہ ۳۸۷ میں فرماتے ہیں:

اَلتَّقْلِيْدُ هُوَ قَبُوْلُ قَوْلٍ بِلَا حُجَّةٍ۔

۵۔ مسلم الثبوت میں ہے:

اَلتَّقْلِيْدُ الْعَمَلُ بِقَوْلِ الْغَيْرِ مِنْ غَيْرِ حُجَّةٍ۔ ترجمہ وہی جو اُوپر گزرا

تقلید کے دلائل سمجھنے سے پہلے چند قواعد یاد رکھنے ضروری ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کرنے کو تقلید نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کا ہر قول وفعل دلیل شرعی ہے۔ تقلید میں دلیل شرعی کو نہیں دیکھا جاتا۔ لہٰذا ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُمتی کہلائیں گے نہ کہ مقلد۔ اسی طرح صحابہ کرام و ائمہ دین حضور علیہ السلام کے اُمتی ہیں نہ کہ مقلد۔

۲۔ عالم کی اطاعت جو عام مسلمان کرتے ہیں اُس کو بھی تقلید نہ کہا جائے گا کیونکہ کوئی بھی ان عالموں کی بات یا ان کے کام کو اپنے لیے حجت نہیں بناتا، بلکہ یہ سمجھ کر ان کی بات مانتا ہے کہ یہ مولوی آدمی ہیں۔ کتاب سے دیکھ کر کہہ رہے ہوں گے۔ اگر ثابت ہو جائے کہ ان کا یہ فتویٰ غلط تھا، کتاب کے خلاف تھا تو کوئی بھی نہ مانے بخلاف قول امام ابوحنیفہ کے۔ کہ اگر وہ حدیث یا قرآن یا اجماعِ امت کو دیکھ کر مسئلہ فرمادیں تو بھی قبول۔ اور اگر اپنے قیاس سے حکم دیں تو بھی قبول ہو گا۔

۳۔ 'تقلید شرعی' شریعت کے احکام میں کسی کی پیروی کرنے کو کہتے ہیں۔ جیسے روزے، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل میں ائمہ دین کی اطاعت کی جاتی ہے اسی لیے دنیاوی باتوں میں کسی کی پیروی کرنا' جیسے طبیب لوگ علم طب میں، شاعر لوگ داغ، امیر یا مرزا غالب کی، اور نحوی وصرفی لوگ سیبویہ اور خلیل کی پیروی کرتے ہیں۔ اسے شرعاً تقلید نہ کہا جائے گا۔

۴۔ عقاید میں تقلید جائز نہیں جیسا کہ ہم نے اُوپر رُوح البیان کے ترجمہ میں لکھا ہے اور باقی عبارات ہم نے کتاب التقلید میں لکھ دی ہیں۔ صریح احکام میں بھی تقلید نہیں۔

۵۔ جن آیات میں تقلیدِ آباؤ اجداد کی مذمت ہے اس سے وہ تقلید مراد ہے جو شریعت کے مقابلے میں شرکیہ امور اور جاہلانہ رسمیں مراد ہیں۔ جس کی تفصیل کتاب التقلید میں ہم نے عرض کر دی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جو مسائل قرآن وحدیث یا اجماع سے اجتہاد کر کے ثابت کیے جائیں ان میں غیر مجتہد عامی کو مجتہد کی تقلید واجب ہے۔ اختصاراً چند دلائل درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱۔ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔

(باقی برصفحہ آئندہ)

خواہشاتِ نفسانی کا ترک اور اتباعِ ہُدیٰ ضروری ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اس سے معلوم ہوا کہ اجماعی طور سے جس نے اس رسی کو پکڑا وہی ایمان پر مرے گا۔ کیونکہ یہی سوادِ اعظم جماعت ہے۔

۲۔ حدیث میں ہے:

اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ۔ یعنی بڑی جماعت کی پیروی کرو۔

۳۔ لَا یَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ اسی کی تائید پر ہے۔

۴۔ قرآن مجید میں فرمایا کہ ناجی فرقہ وہ ہے جو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے لوگوں کی اتباع کا خواہشمند ہے۔ وہ لوگ مقدس و برگزیدہ ہیں اور ان کی پیروی سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ یہ ہیں مِنَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ اور انہی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آجاتے ہیں اور ان کی اتباع کرنے کا نام مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ ہوا۔ اور جو سبیل المؤمنین کی پیروی سے منحرف ہوا وہ یقیناً ناری ہوا۔

۵۔ وَمَنْ یَّتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا۔ اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ بہتر فرقے کس لیے ناری ہیں کیا وہ خدا کو نہیں مانتے اور رسول و خدا کو پیشوا نہیں جانتے اور قبلہ و کعبہ کی طرف نماز نہیں پڑھتے۔ سب کچھ کرتے ہیں لیکن خلاف اجماعِ امت کے ہو کر طرح طرح کے راستے مطابق نفس و ہوا کے نکالتے ہیں۔

۶۔ غیر مقلدین نے تقلیدِ شخصی کو حرام و شرک و بدعت قرار دے رکھا ہے حالانکہ صحابہ کرام ایک دوسرے کی تقلید کرتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت عثمان ذی النورین کو کہا کہ قرآن مجید میں ذکر آچکا ہے فَاِنْ کَانَ لَہٗ اِخْوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ۔ یعنی میت کے کم از کم تین بھائی بہنیں ہوں تو ان کی ماں کو چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ چونکہ اخوت جمع کا صیغہ ہے جو زبانِ عرب میں تین سے کم پر نہیں بولا جاسکتا۔ اور آپ دو بہن بھائی پر بھی بطور رواج ماں کو چھٹا حصہ دلا دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے میں انکی پیروی نہ چھوڑوں گا۔

۷۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ایک روز عوام الناس کو اس طرح کہا کہ میں ابوبکر صدیق کی رائے کو کبھی نہ چھوڑوں گا کیونکہ وہ ہم سے بہتر ہیں۔ اور ایک دن کا ذکر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ کے خزانے کو بیت المال کی طرح تقسیم کر دینے کا خیال ظاہر کیا۔ اور ایک صحابی نے کہا کہ آپ کے دونوں رفیقوں نے یہ کام نہیں کیا ہے تو فرمایا کہ میں ان کی پیروی کو نہ چھوڑوں گا۔ پس ان دلائل مختصرہ سے یہ معلوم ہوا کہ بدوں تقلیدِ شخصی ائمہ و مجتہدین کے کسی فرد کا چارہ نہیں۔ اور اس لیے ہمارے بزرگانِ دین نے لکھ دیا ہے کہ جو شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا پیرو ہو کر نہ چلے وہ ناری اور اہل بدعت ہے۔ چنانچہ طحطاوی حاشیہ درمختار سے نقل کیا ہے مَنْ کَانَ خَارِجًا مِنْ ھٰذَا الْمَذَاھِبِ الْاَرْبَعَۃِ فِیْ ذٰلِکَ الزَّمَانِ فَھُوَ مِنْ اَھْلِ الْبِدْعَۃِ وَالنَّارِ۔

اور صاحب مجالس الابرار نے صفحہ ۳۰ پر لکھا ہے کہ اہل بدعت گناہگار سے بدتر ہے کیونکہ گناہگار اپنے گناہ سے (باقی برصفحہ آئندہ)

اعجوبہ صوفیانہ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کا بی بی حوا سے نکاح ہوا تو شیطان کا نکاح دنیا سے ہوا - آدم علیہ السلام سے نوع بشر پیدا ہوئے اور ابلیس سے خواہشات نفسانی - تمام ادیان باطلہ اور اخلاق ذمیمہ سی شیطانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) توبہ کرتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے اور مبتدع اپنی بدعت سے توبہ واستغفار نہیں کرتا بلکہ وہ اس کام کو طاعت سمجھ کر ادا کرتا ہے
لان المعاصی یتاب عنہا والبدعۃ لایتاب عنہا وصاحب المعاصی یعلم یکون مرتکب المعاصی فیوجی لہ التوبۃ والاستغفار واما صاحب البدعۃ یعتقد انہ فی طاعۃ وعبادۃ ولایتوب ولایستغفر -

اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ مبتدع کے ساتھ موانست ومجالست نہ کی جائے اور ان کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے - اور گنہگار کے ساتھ نماز کا ادا کرنا مکروہ تحریمہ ہے -

چنانچہ حاشیہ طحطاوی میں لکھا ہے :

اما الفاسق العالم ولایقدم لان فی تقدیمہ تعظیم وقد وجب علیھم اھانۃ شرعًا ومفاد ھذا کراھۃ التحریمہ -

یاد رہے کہ بدعت کی مذمت میں جو روایات وارد ہیں وہ انہی گمراہ فرقوں کے لیے ہیں جن کے عقائد و مسائل اجماع امت وعلمائے اہلسنت کے خلاف ہیں - مثلاً :

عقائد دیوبندی اور غیر مقلدین کو دیکھیے - وہ کہتے ہیں خدا پاک کا جھوٹ بولنا ممکن ہے - اور اس کا عرش پر مکان کرنا، کرسی پر پاؤں رکھنا - یا رسول اللہ کہنے سے منع کرنا اور ذکرِ میلاد مبارک کو جنم کنہیا سے مشابہت دینا، اور گیارھویں وعرس بزرگانِ دین کو بدعت کہنا - اور آپ کی ذات کا علم شیطان سے کم سمجھنا اور علم غیب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مطلقاً انکار کرنا - اور آپ کے علم غیب کو تشبیہ مجنون وبہائم وجمیع حیوانات، سے دینا - حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم چھوٹے بڑے بھائی جیسی سمجھنی - تمام انبیاء و اولیاء کرام کو خدا کے سامنے چمار سے ذلیل بیان کرنا - آپ کے تصور کو نماز میں گاؤ وخر سے بدتر سمجھنا - ائمہ اربعہ اور خاص کر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ہر مسئلہ میں مخالف احادیث سمجھ کر مرجیہ اور رائی اور اپنے سے کم فہم اور لاعلم تصور کرنا - تمام کتب حنفیہ کو بنظرِ حقارت دیکھنا اور یہ کہنا کہ ان تمام کتب متداولہ حنفیہ کو جلا دینا چاہیے - کیونکہ ان کے پڑھنے سے انسان ایمان سے خارج ہو جاتا ہے - تمام مقلدین احناف بزرگانِ خدا کو رافضی، پلید، گدھے، نالائق، مشرک، بدعتی، منکر احادیث، مثل منافق، قبر پرست اور جہنمی کہنا - سلسلۂ نبوت کا حضور کے بعد جاری سمجھنا - تقلید شخصی کو شرک و بدعت کہنا - حضرت عمر فاروقؓ کے فیصلہ وقوع طلاق ثلاثہ سے صاف انکار کرنا اور استمداد اولیائے کرام سے صاف انکار کرنا اور بعض کا قائل ہونا وغیرہ - اگر کسی صاحب کو شک ہو تو رسالہ اہلحدیث ثناء اللہ ومعیار تقلید وتقویۃ الایمان وبوئے غسلین وشعار الحق وبراہین قاطع وتحذیر الناس وحفظ الایمان واشتہار فقیر اللہ درحق ثناء اللہ وتفسیر ثنائی واصولِ زندگی وفتاوٰی رشیدیہ وظفر المبین وغیرہ کا مطالعہ کرے - مزید فقیر کے رسالہ دیوبندی بریلوی فرق (و) آئینہ غیر مقلدین میں دیکھیے -

خواہشات نفسانی کی تاثیر سے ہیں۔

صوفیانہ تقریر بعض محققین فرماتے ہیں کہ جب سلطان روح کو بدن کے ملک کی شاہی سپرد ہوئی تو عقل کو اس کا وزیر مقرر کیا گیا اور نفس روح کا دوست معین ہوا جب نفس خواہشات نفسانی لے کر مائل ہوا تو وزیر سے اس کے متعلق سوال ہوا تو وزیر (عقل) نے کہا کہ اے بادشاہ (روح) نفس کو خواہشات نے گھیر لیا ہے تم اپنے مالک حقیقی کی طرف بعجز و نیاز توجہ کیجیے جب سلطان (روح) نے وزیر (عقل) کی بات مان کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور عجز و نیاز سے نفس کی اصلاح کے لیے عرض کی تو نفس اچھا ہو گیا جسے اپنے نفس کی اصلاح مطلوب ہو وہ اپنے قادر مطلق سے عجز و نیاز سے عرض کرے اس طرح سے نفس اصلاح پذیر ہو گا۔

بدعت سیئہ کی مذمت صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ بدعت سیئہ اور خواہشات نفسانی کی اتباع معصیت سے بدتر ہے اس لیے کہ صاحبِ معصیت تو اپنے گناہوں کو قبیح سمجھتا ہے اور ان کے لیے کسی وقت استغفار و توبہ بھی کرتا ہے۔ لیکن صاحبِ بدعت سیئہ اور خواہشات نفسانی کا مرتکب توبہ و استغفار سے محروم ہے۔

بدعت کا صوفیانہ معنیٰ ہم صوفیا کرام کے نزدیک سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنت صحابہ کرام و سنت مشایخ عظام کے خلاف عمل کا نام بدعت ہے[1]۔ اسی طرح ہر فعل و ترک فعل میں عقل جزئی و طبع کی اتباع کو بھی صوفیاء کرام بدعت کہتے ہیں۔

سبق سالک پر لازم ہے کہ وہ سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ کرے اور نہ ہی آثار اخیار (صحابہ کرام و اولیاء عظام) سے روگردانی کرے۔ اگرچہ اغیار (مثلاً وہابیہ) ان حضرات کے معمولات پر لاکھ طعن و تشنیع کریں[2]۔ اس لیے کہ حق کی اتباع ضروری ہے۔

۵

دین ما عشقست اے زاہد مگو بیہودہ پند
ما بترک دین خود گفتن نخواہیم از گزاف

ترجمہ: ہمارا دین عشق ہے لہٰذا اے زاہد! تو اپنی بیہودہ نصیحت اپنے گھر رکھ ہم اپنا دین کسی کے کہنے پر نہیں چھوڑ سکتے۔

---

[1] دیوبندی وہابی نہ صرف اس معنے کے منکر بلکہ سنت مشایخ کے عمل کو بدعت کہتے ہیں۔ ۱۲

[2] جیسا کہ وہابی دیوبندی مشایخ کرام کے معمولات پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ ۱۲

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ
وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ
الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ
اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ
فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ
كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝ وَلَوْ
شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ
رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ۝ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ
فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا
عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ: اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر آپ کے رب کی بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو فوراً ان کا فیصلہ ہو جاتا اور یقیناً وہ اس سے دھوکہ ڈالنے والے شک میں ہیں اور بیشک آپ کا رب ہر ایک کو پورا پورا عمل دے گا بیشک اسے ان کے اعمال کی خبر ہے۔ پس آپ قائم رہیے جیسے آپ کو حکم ہے اور وہ بھی جو تائب ہو کر آپ کے ساتھ ہے اور اے لوگو حد سے تجاوز نہ کرو بیشک وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور ظالموں کی طرف میلان نہ رکھو ورنہ تمہیں آگ چھو جائے گی اور اللہ کے سوا تمہارے کوئی حامی نہ ہوں گے پھر تم مدد نہیں دیے جاؤ گے اور دن کے دونوں کناروں اور کچھ رات کے حصوں میں نماز قائم رکھو بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں یہ قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے اور صبر کیجیے اللہ نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا پھر اگر کیوں نہ ہوئے تم میں سے اگلی نسلوں والے اچھے لوگ کیوں نہ ہوئے جو فساد سے روکتے

مگر ان سے ایسے تھوڑے تھے وہی جنھیں ہم نے نجات دی اور جو ظالم تھے وہ عیش و عشرت میں لگے رہے جو انھیں دی گئی اور وہ مجرم تھے اور آپ کا رب ایسا نہیں جو کہ بستیوں کو بوجہ ظلم کے تباہ کر دے اور ان کے باشندے نیک ہوں اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی فرقہ کر دیتا اور وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے مگر وہ جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا اور اسی لیے انھیں اس نے پیدا فرمایا اور آپ کے رب کا کلمہ پورا ہو گیا میں جنوں اور انسانوں کو جمع کر کے دوزخ کو ضرور بھر دوں گا اور سب کچھ ہم آپ کو رسولوں کی خبروں سے بتاتے ہیں اس سے ہم آپ کا قلب مبارک مضبوط کرتے ہیں اور اس میں آپ کے پاس حق آیا اور اہلِ ایمان کے لیے وعظ و نصیحت ہے اور کافروں کو فرمائیے کہ تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ ہم اپنا کام کرتے ہیں اور تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کا غیب اللہ کے لیے ہی ہے اور اسی کی طرف جملہ امور لوٹائے جاتے ہیں سو اس کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو اور آپ کا رب تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔

تفسیر عالمانہ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ بخدا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ عنایت فرمائی۔

ف: توراۃ پہلی آسمانی کتاب ہے جو احکام و شرائع پر مشتمل تھی ورنہ اس سے قبل جتنی آسمانی کتابیں تھیں ان میں صرف ایمان و توحید کا بیان تھا اسی لیے انھیں صحائف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وقت انھیں کتاب کہا گیا تو وہ ان کا مجازی معنیٰ تھا فَاخْتُلِفَ فِیْهِ اس کے متعلق اختلاف کیا گیا۔ مثلاً بعض خوش بختوں نے کہا کہ یہ کتاب (توراۃ) منجانب اللہ اتری ہے اسی لیے وہ اس پر ایمان لائے۔ اور بعض بدبختوں نے اس کا انکار کر کے اسے ٹھکرا دیا فلہٰذا اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اپنے زمانہ کے کافروں کے انکار کی پروا نہ کیجئے جبکہ وہ آپ کے قرآن کا انکار کرتے ہیں، آپ موسیٰ علیہ السلام کی طرح مخالفین کی مخالفت پر صبر کیجئے۔

ف: اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے۔

منافقین کی طعن و تشنیع حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے آئے ہوئے مالِ غنیمت کی تقسیم فرمائی تو منافقین نے شور برپا کر دیا اور کہا کہ آپ نے عادلانہ تقسیم نہیں فرمائی۔ اس سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ (اے بدبختو!) رسول اللہ اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور کون عادل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اخی موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے وہ مجھ سے بھی زیادہ ایذا دیے گئے مگر انہوں نے صبر کیا۔

ف: یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی طرف سے سخت اذیتیں پہنچیں مگر انہوں نے صبر کیا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان ایذاؤں کی کبھی شکایت نہ کی۔ میرے لیے بھی ضروری ہے کہ میں تمہاری ایذا سے صبر کروں۔ کیونکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جمیعتہ کمالیہ اتم و اکمل تھی۔ آپ کے اندر صفاتِ الٰہیہ و اخلاقِ حمیدہ ربانیہ کا وافر حصہ ہونا چاہیے۔

حضرت جامی قدس سرہ حضور علیہ السلام کے مناقب میں لکھتے ہیں: ؎

بر دفتر جلال تو تورات یک رقم
وز مصحف جمال تو انجیل یک ورق

ترجمہ آپ کی صفت جلال کا کیا کہنا توراۃ صرف اس کا ایک نمونہ ہے۔ اور آپ کے مصحف جمال کی کیا بات ہے کہ انجیل اس کا صرف ایک ورق ہے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ اگر انھیں قیامت تک مہلت دینے کی تقدیر کا کلمہ نہ لکھا ہوتا۔

ف: سعدی مفتی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ قیامت کی قید نہ ہو تو بہتر ہے اس لیے کہ کفارِ مکہ کے بڑے بڑے لیڈروں پر غزوۂ بدر میں عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ اسی طرح ان میں سے بعض پر دیگر غزوات میں عذاب پہنچا۔

لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ تو آپ سے اختلاف کرنے والوں پر قضائے الٰہی سے نزولِ عذاب ہوتا جس کے اہلِ باطل مستحق ہوتے ہیں تاکہ حق و باطل واضح ہو جاتا وَإِنَّهُمْ یہ ضمیر کفارِ مکہ کے بعض کی طرف راجع ہے لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ قرآن کی وجہ سے بہت بڑے شک میں ہیں اگرچہ قرآن کا ذکر صراحۃً نہیں لیکن مقام تسلی سے یہی معنیٰ واضح ہوتا ہے۔ مُرِيبٍ ○ یہ شک کی صفت ہے ارابہ سے ہے بمعنے اوقعہ فی الریبۃ بمعنے نفس کو مضطرب اور دل کو پریشان کرنے والا۔ وَإِنَّ كُلًّا كُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کا عوض ہے۔ دراصل عبارت یوں تھی:

وان کل المختلفین اور وہ مومن بھی تھے اور کافر بھی۔ لیکن مومن تو یقین کی بنا پر اور کافر شک کی وجہ سے۔ یعنی بیشک ان میں سے ہر ایک کو لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ اس کی پہلی لام قسمیہ کی توطیۃ کے لیے ہے اور دوسری قسم محذوف کا جواب ہے۔

فائدہ صرفی لمّا بتشدید المیم دراصل لَمِنْ مَا (بکسر المیم) تھا مِنْ جارہ ہے مَا موصولہ یا موصوفہ پر داخل ہوا ہے جب نون ساکن میم کے ساتھ جمع ہوا تو نون کو میم میں مدغم کیا گیا۔ یہاں پر تین میم جمع ہو گئے۔ ایک قول میں پہلے کو، دوسرے قول میں درمیانے میم کو حذف کر کے ایک میم کو دوسری میں مدغم کیا گیا۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ بخدا تیرا رب ان سب کو ان کے ایمان و اعمال حسنہ اور کفر اور تمام برائیوں کی جزا و سزا دے گا۔ یعنی نیک کو اچھی جزا کامل اور بُرے کو بری سزا مکمل طور دے گا۔

إِنَّهُ بیشک وہ اللہ تعالیٰ بِمَا يَعْمَلُونَ ان مختلفین میں نیک یا بُرا جو بھی عمل کرتے ہیں خَبِيرٌ ○ سب کو جانتا ہے کوئی شے اس سے پوشیدہ نہیں ہر بڑا چھوٹا عمل اس کے سامنے ہے۔ فلہذا ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق پوری جزا و سزا ملے گی۔ اس میں نیک کو اچھی وعید اور بُرے کو سخت وعید کی گئی ہے۔

سبق: عاقل وہ ہے جو غفلت سے بیدار ہو کر اللہ تعالیٰ کے اوامر کی مخالفت سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ اس سے

کسی کا کوئی عمل مخفی نہیں۔

ے

ہمہ کار بندۂ دانا اوست

بمکافات او توانا اوست

ترجمہ: بندے کے ہر عمل کو وہ جانتا ہے اور اس کی جزا و سزا پر بھی وہ قدرت رکھتا ہے۔

تقریر صوفیانہ کلمہ الہیہ اہل ایمان کی سعادت اور اہل کفر کی شقاوت کے لیے سبقت کر چکا ہے۔ اسی لیے ان میں بعض زمرۂ اہل ایمان میں داخل ہیں کوئی زمرۂ کفر ہیں۔ اور اس چند روزہ زندگی ہیں نفوس کی اسی سعادت و شقاوت کے لیے تکمیل ہو رہی ہے۔ کتاب اللہ یعنی قرآن مجید تو نفوس کی کسوٹی ہے جو اس پر ایمان لاکر اس پر عمل کرتا ہے تو اُس کی سعادت کی تکمیل ہو جاتی ہے اور جو اس سے کفر کر کے اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کی شقاوت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اہلِ ایمان کو یقین و نجات اور اہل کفر کو شک و ہلاکت نصیب ہوگی۔

ف: اہلِ انکار یعنی کفار و فجار و فساق کو اہل ایقان یعنی مومنین و ابرار و صالحین پر کبھی مسلط کر دیتا ہے تاکہ ان کے نفوس کے اندر کے خزینوں سے جواہر نفیسہ جیسے صبر علی الاذی اور تحمل علی البلاءُ اور حلم علی السفہاءُ اور عفو عن الجہلاءُ اور بے حیا کی شرارتوں سے درگزر کا ظہور ہو تاکہ ان کو اخلاقِ الہیہ سے متخلق ہونے کا موقعہ نصیب ہو اور ان سے صدق عبودیت ظاہر ہو تاکہ عوام کو ان کے مراتب کا فرق معلوم ہو اس لیے کہ مراتب صرف لفاظی اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا نام نہیں بلکہ حقائق و معانی کا نام ہے۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ے

بے رنج کسے چوں نبرد رہ بسر گنج

آں بہ کہ بکوشم بتمنا نہ نشینم

ترجمہ: تکلیف کے بغیر کسی کو خزانہ نہیں ملتا۔ اسی لیے ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے صرف امید پہ نہ رہنا چاہیے۔

ف: حضرت شیخ عزالدین بن عبدالسلام قدس سرہٗ نے فرمایا کہ طریقہ صوفیاء کی بنا چار چیزوں پر ہے:

۱۔ اجتہاد (جدوجہد کرنا)

۲۔ سلوک

۳۔ سیر

۴۔ طیر

اجتہاد تو یہی ہے کہ حقائق ایمان کی تحقیق۔ اور سیر حقائق احسان کی تحقیق۔ معرفت ملک منان کے لیے جذبہ بطریق جود و احسان کو طیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اجتہاد کو سلوک سے وہی نسبت ہے جو استنجا، کو وضو سے۔ جس طرح استنجا کے

بغیر وضو نا مکمل ہے۔ ایسے ہی اجتہاد کے بغیر سلوک نا مکمل ہے۔ ایسے ہی سلوک کو سیر سے وہی نسبت ہے جو وضو کو نماز سے۔ جیسے بلا وضو نماز نہیں ہوتی ایسے ہی سلوک کے بغیر سیر الی اللہ کا حصول محال ہے۔ اس کے بعد درجۂ طیر ہے یعنی وصال الٰہی۔

ف: تصوف میں ادنیٰ درجہ یہی ہے کہ اہل اجتہاد سے کم از کم محبت وعقیدت اور واصلین کے مبدا و معاد کے سر کی تصدیق اور جنہیں حقائق قرآن کی تحقیق نصیب ہے ان کے آداب کی رعایت ضروری ہے۔ (بحمدہٖ تعالیٰ ہم اہلسنت کو یہ نصیب ہے) اور ان سے بغض وعداوت اور ان پر طعن وتشنیع اپنے ایمان کا بیڑا غرق کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

من عادیٰ لی ولیا فقد اٰذنتهٗ بالحرب۔

جو ولی اللہ سے عداوت رکھتا ہے میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔

یعنی اس کا ولی اللہ کا دشمن ہونا میرے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ اور میں بھی اس کے ساتھ دشمنی کی خبر دیتا ہوں اس لیے ولی اللہ کے ساتھ دشمنی کرنے والا اور اس کے علوم کو پسِ پشت ڈالنے والا دراصل اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے۔

وہابی دیوبندی کو سبق وعبرت

جب ایک ولی اللہ کے دشمن کا یہ حال ہے تو نبی علیہ السلام کے ساتھ بغض وعداوت اور اس کی لائی ہوئی کتاب کے تارک کا کیا حال ہوگا۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام اور وارثِ رسول یعنی ولی اللہ کے دشمن کا انجام بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی گرفت بہت سخت ہے جب وہ کسی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی نجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت ووفا وصفا کا سوال کرتے ہیں اور ہم رسوائی اور رسوائی والوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ صاحبِ روح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جب آپ کو قرونِ اولیٰ کے حالات معلوم ہوئے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کا کفار کے ایذا پر تحمل اور صبر واستقامت کا علم ہوا اور آپ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے یہاں تک صبر کیا کہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔ فلہٰذا آپ بھی توحید اور دعوت الی الاسلام پر مداومت فرمائیے جیسے آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ اس کا عطف استقم کی ضمیر مستتر پر ہے۔

سوال: ضمیر مستتر پر اسم ظاہر کا عطف ناجائز ہے ہاں اسے ضمیر منفصل سے مؤکد کیا جائے تو جائز ہے یہاں ضمیر منفصل کے بغیر عطف کیسا۔

جواب: جب معطوف ومعطوف علیہ کے درمیان کوئی شے فاصل ہو تو جائز ہے اور یہاں کما امرت درمیان میں فاصل موجود ہے اور یہی فاصل اسی ضمیر منفصل کے قائم مقام ہے۔ یعنی جو شرک وکفر سے توبہ کرکے آپ کے ساتھ ایمان لائے معیت کا یہی معنیٰ ہے ورنہ انبیاء علیہم السلام سے توبہ عن الکفر والشرک کا کیا معنیٰ۔

مسئلہ: انبیاء علیہم السلام کفر سے مطلقاً معصوم ہیں۔ اسی طرح وحی کے نزول سے پہلے اور اس کے بعد بالاجماع عمداً کفر و شرک سے بھی۔

ف: اگر یہاں یہ مطلب بیان کیا جائے کہ حضور علیہ السلام توبہ و استغفار میں اپنے صحابہ کے مصاحب بایں معنیٰ ہیں کہ آپ اُمت کی تعلیم کے لیے توبہ و استغفار فرماتے ان کے لیے ضروری نہیں کہ ان سے کفر و معاصی کا صدور ہو۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز ستر سے زائد بار استغفار فرماتے۔ (کذا فی حواشی سعدی المفتی رحمہ اللہ تعالیٰ)

نکتہ عجیبہ: صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یہاں حضور علیہ السلام کی استغفار کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ جب ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبۂ رجوع الی اللہ کی طرف ترقی فرماتے تو پہلے مرتبہ کی کمی پر استغفار فرماتے اور ایسے ہی اولیاء اللہ کے لیے بھی ہوتا ہے۔ خواہ ان سے کفر جیسی بت پرستی وغیرہ کا صدور ہو یا نہ۔ اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں ان سب کے امام حضور تاجدارِ رسل صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

حضرت علی کی شان: صحیح حدیث میں ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق گواہی دی کہ انھوں نے آنکھ جھپکنے کی مقدار بھی کفر نہیں کیا۔

سوال: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ انھوں نے کسی سے فرمایا:

ادعوك الی الکفر باللات والعزّٰی۔

جواب: اس سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کفر ثابت نہیں ہوتا کیونکہ کبھی انسان کفر کی دعوت دیتا ہے لیکن خود اس کا مرتکب نہیں ہوتا بالخصوص ایسا انسان جس سے کفر و انکار از اسلام کا صدور نہ ہونا لائق ہے۔

وَلَا تَطْغَوْا: وہ حدود جو تمہیں متعین کر دیے گئے ہیں ان میں کمی و بیشی کر کے انحراف نہ کرو۔

سوال: تم نے افراط و تفریط (کمی و بیشی) کی قید کیوں لگائی؟

جواب: نیک امر وہی محمود ہوتا ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو۔ اگر اس میں افراط یا تفریط ہو تو وہ مذموم ہوتا ہے۔

سوال: اسے طغیان سے کیوں تعبیر کیا گیا جبکہ طغیان بمعنے تجاوز الحد۔ اور یہاں اس معنے کو کون سی مناسبت ہے۔

جواب: تغلیباً یا عام مؤمنین کو مدنظر رکھ کر کیونکہ عام مؤمنین سے افراط و تفریط واقع ہو جاتا ہے۔ اسی معنے پر تغلیباً کہا گیا ہے اسی قسم کا مضمون سورۂ شوریٰ میں ہے:

واستقم کما امرت ولا تتبع اھوائھم۔

خلاصہ یہ کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! اہلِ کفر کی خواہشات کا اتباع نہ کریں اس لیے کہ ان کی اتباع کا نام طغیان اور ان کی اتباع سے اجتناب کا نام استقامت ہے۔

اِنَّهٗ بیشک اللہ تعالیٰ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ○ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے کیونکہ اس سے کوئی شے مخفی

نہیں۔ وہ تمہارے ہر عمل کی جزا و سزا دے گا اسی لیے اس سے ڈرو اور اس کے متعین کردہ حدود کی حفاظت کرو۔ یہ جملہ امر و نہی کی تعلیل ہے۔

خواب میں حضور علیہ السلام کی زیارت

حضرت ابوعلی سنوسی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھ کر عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے سورۂ ہُود نے بُوڑھا بنادیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں یہ صحیح ہے۔ میں نے عرض کی: اس کی وجہ قصص الانبیاء یا کفار کی تباہی و بربادی کے واقعات۔ آپ نے فرمایا: ان دونوں میں کوئی بھی نہیں بلکہ مجھے 'امر استقامت' نے بوڑھا بنادیا۔

نکتہ: واقعی استقامت ایک مشکل امر ہے اس لیے کہ حقیقی استقامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمام کیے گئے وعدوں کو پورا کرنا اور ہر امر دینی ہو یا دنیوی۔ یہاں تک کہ کھانے پینے اور لباس وغیرہ اسی طرح ترغیب و ترہیب یا ہر حال یا ہر حکم یا ہر صفت ہر معاملہ میں امر اوسط کی رعایت کرکے صراطِ مستقیم پر مداومت۔ اس استقامت کو دنیوی پلصراط سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسی پلصراط یعنی استقامت اعتدالیہ پر چلنا امکان بشر سے باہر ہے۔ اسی لیے بحرالعلوم میں لکھا کہ جمیع حدود اللہ پر اسی طرح استقامت رکھنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے بمشکل ہی کوئی فرد بشر اس سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے[1]۔ اسی لیے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شیبتنی سورہ ہود۔

اس کا خطاب بھی اس ذات کو ہوتا ہے جو مشاہدات قویہ و آثار صادقہ سے مؤید ہو اسی لیے انھیں تثبت کا مژدہ سنایا۔ کما قال:

لولا ان ثبتناک۔

اور یہ دولت ہر اس خوش بخت کو نصیب ہوتی ہے جس کے اوقات مشاہدہ و مشافہۃ خطاب کی خود اللہ تعالیٰ محافظت فرماتا ہے۔ اگر ایسے مقامات ایسے محبوب بندے کو نصیب نہ ہوں تو ایسے خطابات سے پہلے ہی وہ جادۂ استقامت سے ہٹ جائے۔

جیسے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو فرمایا:

استقیموا ولن تحصوا۔ استقامت پر مداومت کرو۔

لیکن یاد رکھو کہ جس طرح کی استقامت کا حکم اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس پر مداومت کی تمھیں طاقت نہیں۔

استقامت کے فضائل

۱۔ حضرت محمد بن فضل رحمہ اللہ تعالیٰ سے پُوچھا گیا کہ عارفین کی اصل غرض و غایت کیا

---

[1] اسی لیے مشائخ کا قول مشہور ہے، الاستقامت خیر من الف الکرامۃ۔ ۱۲

ہوتی ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ انھیں ایک ایسی عادت کے حصول کی خواہش ہوتی ہے کہ جس سے انھیں تمام محاسن حاصل ہوجاتے ہیں اس عادت کا نام استقامت ہے ۔ صوفیاء کرام کے نزدیک سب سے بڑا عارف باللہ وہ ہوتا ہے جس کی استقامت میں ہمت بلند ہوتی ہے ۔

۲۔ حضرت ابن عطا نے فاستقم کا معنیٰ کیا ہے کہ اے سالک ! اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت کا دامن پکڑ ا ۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں عجز و نیاز کا اظہار کر ۔

۳۔ تفسیر فارسی للامام القشیری رحمہ اللہ تعالیٰ میں ہے کہ مستقیم وہ خوش قسمت ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے قدم پیچھے نہ ہٹائے ۔

۴۔ حضرت شیخ ابوعلی دقاق نے فرمایا کہ استقامت کا معنیٰ یہ ہے کہ سالک اپنے اُوپر اتنا کنٹرول کرے کہ اس کا کوئی تصور بھی ماسوی اللہ کی طرف نہ جائے ۔

۵۔ حضرت خواجہ عصمت بخاری نے اہل استقامت کے بارے میں لکھا ہے ؎

کسے دانم از اہلِ استقامت
کہ باشد بر سر کوئے ملامت
ز اوصاف طبیعت پاک بردہ
باطلاق ہویت جان سپردہ
تمام از گرد تن دامن فشاند
برفتہ سایہ و خورشید ماندہ

ترجمہ : میں اہل استقامت انھیں سمجھتا ہوں کہ مخلوق کی ملامت میں رہتے ہیں لیکن نفسانی خواہشات سے پاک اور ہویت کے ملک میں جان کو سپرد کیے دیتے ہیں وہ اپنے جسم وجان سے فارغ جیسے سایہ مٹ جائے اور سُورج باقی ہوتا ہے ۔

۶۔ حضرت ابوعلی جرجانی نے فرمایا کہ کرامت کی طلب مت کرو بلکہ استقامت کی طلب کرو اس لیے کہ نفس ہر وقت کرامت کا خواہشمند رہتا ہے اور ہر آن چاہتا ہے کہ اس سے کرامت کا ظہور ہو تاکہ اس کی عالم دنیا میں شہرت ہو لیکن ولی اللہ اپنے لیے سب سے بڑی کرامت یہی سمجھتا ہے کہ اسے خالق کی بندگی کی استقامت نصیب ہو اور خدا کرے اس سے کبھی خوارق (کرامت) کا صدور نہ ہو[1]

---

[1] میرے دور کے سجادہ نشینو ! اور شیخی بگھارنے والو ! توجہ فرماؤ ۔ آپ کے اکثر حضرات کو دیکھتا ہوں کہ جادۂ شریعت سے ہٹ کر اپنے آپ کو خواص حقیقت و معرفت ظاہر کرکے کرامات (ہوں نہ ہوں) کے پل باندھتے ہو ۔ خدا کرے بے عمل پیروں فقیروں کو فقیر کی بات سمجھ آجائے ۔

۷۔ حضرت الشیخ الشہیر بالهداني قدس سرہٗ نے نفائس المجالس میں فرمایا جب تک شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت کے جمیع مراتب کے حقوق کو مکمل طور پر پورا نہ کیا جائے استقامت نصیب نہیں ہوتی۔ شریعت کے حقوق کی رعایت عدالت فی الاحکام (لیکن میرے دور کے بعض پیری مریدی کا دھندا کرنے والے شریعت کو لاف گزاف اور ملائیت کا نام دیتے ہیں) اور مرتبۂ طبیعت میں استقامت تب نصیب ہوگی جب شریعت کے احکام پر پوری پابندی کی جائے اور مرتبۂ نفس میں طریقت کی نگرانی سے اور مرتبۂ رُوح میں معرفت کی نگرانی سے اور مرتبۂ سِر میں معرفت وحقیقت دونوں کی نگرانی سے استقامت نصیب ہوگی لیکن ان امور کی نگرانی اور ان کے حقوق کی مکمل طور ادائیگی نہایت مشکل ہے اسی لیے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا،

شیبتنی سورۃ ھود۔

خلاصہ یہ کہ انسانی تکمیل ان امور کی تکمیل پر منحصر ہے ورنہ خوارق (کرامت) تو کچھ نہیں[1]

۸۔ حکایت حضرت شیخ ابوسعید سے عرض کی گئی کہ فلاں ولی پانی پر تیرتا ہے۔ آپ نے فرمایا! کیا ہوا مینڈک اور مچھلی بھی تو پانی پر تیرتے ہیں۔ پھر عرض کی گئی کہ فلاں ولی ہواؤں میں اُڑتا ہے۔ آپ نے فرمایا! کیا ہوا ہوا میں تو پرندے بھی اڑتے ہیں۔ پھر عرض کی گئی کہ فلاں ولی ایک آن میں مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا ہوا اس طرح ابلیس بھی آنِ واحد میں مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے۔ آپ سے عرض کی گئی: آپ کے نزدیک کمال کس شے کا نام ہے؟ آپ نے فرمایا کہ باکمال انسان وہ ہے جو بظاہر مخلوق کے ساتھ اور بباطن اللہ کے ساتھ ہو۔

حکایت از اویسی غفرلہ حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ کے ہاں کوئی شخص مرید ہونے کے لیے حاضر ہوا کامل سال گزار کر مرید ہوئے بغیر گھر کو لوٹنے لگا تو حضرت بایزید نے پوچھا کہ بھائی! کیوں آئے۔ اتنا عرصہ گزار کر کچھ کیے بغیر جا رہے ہو۔ اس نے عرض کی کہ میں آپ کا مرید ہونے آیا تھا لیکن آپ سے سال بھر کوئی ایک کرامت بھی ظاہر نہیں ہوئی۔ اس لیے بدظن ہو کر واپس جا رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اس اثنا میں مجھ سے کوئی عمل خلافِ شرع بھی دیکھا۔ اس نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا، ولی اللہ کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ اس سے خلافِ شرع کوئی امر نہ ہو (لیکن میرے دور کے بعض پیرصاحبان خلافِ شرع امور کو ولایت گردانتے ہیں اور شریعت کو ملائیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

نفس کی شرارت نفوس فطرۃً جادۂ استقامت سے ہٹ کر رہنے کے خواہشمند ہیں۔ اسی لیے ٹیڑھا راستہ اختیار کرنے کی

---

[1] لیکن میرے دور میں میری جماعت (عوام) نے ولایت صدور کرامات کو سمجھ رکھا ہے اور عوام کی ذہنیت کو بعض واعظین اور بعض جاہل پیروں نے بگاڑا ہے۔ میری درد بھری استدعا ہے واعظوں اور گدی نشینوں اور پیری مریدی کے شعبے سنبھالنے والوں سے کرامت کے حال پر رحم فرما کر انہیں ولایت کا صحیح معیار سمجھائیں ورنہ قیامت میں اس کی سزا آپ حضرات کو ملے گی۔

عادی ہیں۔ ہاں جسے عنایت ازلیہ وجذبات الٰہیہ اپنے فضل وکرم سے مخصوص فرمائے۔

حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

سالکان بے کشش دوست بجائے نرسند

سالہا گرچہ دریں راہ تگ و پوے کنند

ترجمہ: کوئی سالک اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اگرچہ سال ہا سال اس میں جدوجہد کریں۔

تفسیر عالمانہ وَلَا تَرْكَنُوْٓا الرکون سے مشتق ہے بمعنے المیل الیسیر (تھوڑا سا جھکاؤ)۔ اب معنی یہ ہُوا کہ معمولی جھکاؤ بھی نہ کرو۔ یہ خطاب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو ہے اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ان لوگوں کی طرف جن سے کسی قسم کا ظلم پایا گیا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ اسی سبب سے تمہیں پہنچے گی۔ یہ فعل ان مقدر کی وجہ سے منصوب اور لا ترکنوا کا جواب ہے النار جہنم کی آگ۔

ف: جب ظالم کی طرف صرف معمولی جھکاؤ کی سزا جہنم کی آگ ہے تو پھر اس کا کیا حال ہوگا جو سراپا ظلم ہی ظلم ہو۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ اور تمہارا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حامی کار نہیں جو تمہیں جہنم کی آگ سے بچا سکے۔ جمع کی ضمیر جمع کے صیغے کے مقابلے میں واقع ہوئی ہے تو انقسام الاحاد علی الاحاد کے قبیل سے ہے اور جملہ محلاً منصوب فتمسکم النار کی ضمیر کُم سے حال ہے۔ یعنی جب تمہیں جہنم کی آگ پہنچے تو تمہارا حال یہ ہو کہ تمہارا کوئی یار و مددگار نہ ہو ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ پھر تمہاری کسی قسم کی مدد نہ ہو۔ اس کا عطف پچھلے جملہ اسمیہ پر ہے یہ ثُمّ استبعادیہ ہے بایں معنیٰ کہ تم سے اللہ تعالیٰ کی مدد بہت دُور ہو جائے گی جبکہ تم بسبب کفار کی طرف جھکاؤ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ تو پھر اللہ تعالیٰ تمہاری کسی قسم کی مدد نہیں فرمائے گا کیونکہ اس نے اپنا حکم لکھ دیا کہ ایسے لوگوں کو ضرور عذاب دے گا اور جب تم سے (بفرض محال) ایسا کام ہو گیا تو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ف: آیت میں ظلم کی رُکاوٹ اور تہدید کا جس قدر تصور ہو سکتا ہے بلیغ ترین طریق سے نہی و تہدید کی گئی۔

سبق: افسوس ان لوگوں پر ہے جو اس آیت کو پڑھنے سننے کے باوجود ظلم سے باز نہیں آتے بلکہ ظالمین سے بہت بڑا گٹھ جوڑ رکھتے ہیں اور انھیں اس کا کبھی خیال تک نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کی مہلت دینا ان کے لیے سخت مضر ہے اور قیامت میں اس ظلم کی سزا یہ جہنم کے عذاب سے کوئی ان کی مدد نہیں کرے گا۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

کرازے بچاہ اندر افتادہ بود

کہ از ہول او شیر نر مادہ بود

بد اندیش مردم بجز بد ندید
بیفتاد و عاجز تر از خود ندید
ہمہ شب ز فریاد و زاری نخفت
یکے بر سرش کوفت سنگے و گفت
تو ہرگز رسیدی بفریاد کس
کہ میخواہی امروز فریاد رس
کہ بر ریش جانت نہد مرہمے
کہ دلہا ز دردت بنالد ہمے
تو ما را ہمی چاہ کندی براہ
بسر لاجرم در فتادی بچاہ
اگر بد کنی چشم نیکی مدار
کہ ہرگز نیارد کنز انگور بار

ترجمہ: ایک ظالم کنویں میں گر پڑا۔ وہ ایسا تھا کہ شیر بھی اس سے کانپتا تھا۔ ظالم کا انجام بُرا ہے جب کنویں میں گرا تو اپنے سے عاجز تر اور کسی کو نہ دیکھا۔ ساری رات روتا رہا اسے نیند بھی نہ آئی کسی نے جا کر اس کے سر پر پتھر دے مارا اور کہا تم نے کبھی کسی کی مدد نہ کی آج کس سے فریاد چاہتا ہے تاکہ کوئی تیرے زخموں کی مرہم پٹی کرے تو تیرے سے ہزاروں دل رو رہے ہیں تو ہمارے لیے کنواں کھودتا تھا بالآخر تُو ہی اس میں جا گرا۔ برائی کر کے نیکی کی اُمید مت رکھو اس لیے کہ جھاؤ سے انگور کا پھل نہیں ملتا۔

حدیث شریف
حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ظلم سے بچو کیونکہ وُہ قلوب کو تباہ و برباد کرتا ہے۔

ف: قلب کی تباہی تمام جسم کی بربادی ہے اسی لیے ظالم کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ظلم کر کے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہا ہے اس لئے کہ ظلم سے اعضائے ظاہری و باطنی ہر دو برباد ہو جاتے ہیں۔

مسئلہ: جو اللہ تعالیٰ کی تعمیر کردہ بنیاد کو برباد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جڑ سے کاٹ دیتا ہے اس لیے جو اس کے بندوں پر ظلم کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتا ہے۔

حدیث شریف
حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"انا من اللہ والمؤمنون منی ۔ میں اللہ سے ہوں اور مومن میرے سے ہیں"۔ جو مومن کو ایذا

دیتا ہے وہ مجھے ایذاء پہنچاتا ہے۔ اور جو مجھے ایذاء پہنچاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ایذاء دیتا ہے۔

ظالم کی مذمت ظالمین کے اقوال و افعال و اعمال سے راضی ہونا اور ان سے چشم پوشی کرنا بھی اسی آیت کے حکم میں داخل ہے بلکہ ان کی دوستی و تعلق کی خواہش اور ان کے معاشرے کو بہتر سمجھنا بلکہ ان کے ٹھاٹھ باٹھ سے رشک کرکے ان کی طرف رضا و رغبت سے آنکھ اٹھا کر دیکھنا اور سمجھنا کہ یہ تو بڑے مزے کر رہے ہیں اور نہایت عیش و زندگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں بلکہ ان کے عہدے کی ترقی کے لیے دعا کرنا اور تعظیم و تکریم سے انھیں یاد کرنا اور ان کے معاملات میں ان کا تعاون کرنا یہاں تک کہ ان کے لیے کاغذ و قلم اور سیاہی اور دیگر اشیاءِ ضروریہ تیار کرکے دینا اور ان کے عہدوں سے خطرہ کرکے ان کے پیچھے چلنا اور ان کے طرز طریق کو لباس و خوراک و معاشرہ وغیرہ کو اپنانا اور ان کی مشابہت و مشاکلت اختیار کرنا ان کے لیے ملبوسات تیار کرنا اور ان کی خدمات بجالانا، یہاں تک کہ حجامت بنوانا اور غسل وغیرہ کرنا کرانا تمام اسی آیت کے حکم میں ہیں۔

مسئلہ: ہمارے بعض اکابر نے ایسے ظالمین کے سلام کے جواب دینے کو بھی ناجائز لکھا ہے۔

حکایت حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ظالم جنگل میں پیاس سے مر رہا ہو تو کیا اس کی جان بچانے کی غرض سے اسے پانی کا ایک گھونٹ دینا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: ایسے موذی کو مرنے دو۔ اگر اسے پانی کا ایک گھونٹ دوگے تو یہ اس کے ظلم کی اعانت کے مترادف ہے۔

حکایت ایک اور بزرگ نے فرمایا: ایسے ظالم کو ذلیل و خوار کرکے مارو۔ مثلاً پانی اس کے قریب لے جاؤ یہاں تک کہ وہ پانی کے لیے منہ کھولے تو پانی کا برتن پیچھے ہٹا لو۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لیے رسل کرام علیہم السلام کے امین ہیں جب تک بادشاہوں (حاکموں، امراء و رؤساء، دنیاداروں) کی مجالس میں آمد و رفت نہ رکھیں۔ بادشاہوں کی مجلسوں میں آمد و رفت کرنے والے علماء سے بچو اور ان سے کوسوں دور بھاگو۔

ف: اے برادر! جب تمھیں اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث معلوم ہوئی تو تم پر واجب ہے کہ تم ایسے علماء سے اتنا پرہیز کرو کہ نہ تم انھیں دیکھو نہ وہ تمہیں دیکھیں کیونکہ سلامتی اسی میں ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ تمہیں ان کے حالات سے آگاہی کی بھی ضرورت نہیں وہ غلط کریں یا صحیح کریں تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے (کیونکہ ممکن ہے وہ عالمِ دین اپنے نفس پر کنٹرول کرکے ظالمین کو راہِ راست پر لاسکے لیکن یہ بہت مشکل ہے ہمیں ان کے گلہ شکوہ سے بچنا لازمی ہے) بلکہ ایسے علماء کے حاشیہ برداروں اور ان کے متعلقین احباب و دوست یہاں تک کہ ایسے علماء کی مساجد کے

ہ میں اپنے زمانہ کے عوام و خواص سے جرأت کرکے پوچھ لوں کہ کہیں وہ تو اپنے زمانے کے ظالمین کے ان امور میں شامل نہیں۔ خود سوچیے۔ ۱۲

ائمہ و مؤذنین سے دُور بھاگنا ضروری ہے۔

برادرانِ اسلام! سوچئے، جب ظالمین کے مصاحبین علماء کے متعلقین کی صحبت سے شریعت روکتی ہے تو پھر ظالمین کی خدمت اور ان سے وابستگی سے کتنی سخت ممانعت ہوگی۔[۱]

ف: اے برادرِ دینی! اگر تجھے رُوکھی سُوکھی روٹی ملتی ہے تو اسی کو رحمتِ ایزدی سمجھ۔ لیکن سرکاری مولویوں کی تنخواہوں، مشاہروں، کروفر دیگر مراعات پر رشک نہ کرنا اور نہ ہی کفِ افسوس ملنا کہ کاش میں بھی ان کے قریب ہوتا تو مجھے بھی سہولتیں اور آرام نصیب ہوتا (حاشا وکلا)۔ دُور بھاگ، جتنا تجھ سے ہوسکتا ہے، ان سرکاری درباری مولویوں سے۔ اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کو یاد کیجیے جو آپ بار بار اپنی اُمت کے علماء کو بطورِ تنبیہ فرماتے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کا کوئی فرد قرآن کی تعلیم حاصل کرکے اسلامی مسائل (فقہ) کو پُورے طور عبور کرکے اگر بادشاہ (حاکم، امیر، رئیس، لیڈر وغیرہ) کے دروازے پر کسی لالچ وطمع کے ساتھ جائے گا تو جتنے قدم چل کر جائے گا وہ قدم جہنم کی نار میں جائیں گے۔

ف: حدیث شریف آیت مذکورہ کی تفسیر ہے۔ آیت اور حدیث شریف کا مضمون ایک ہی ہے۔

حکایت بروایت حضرت یُوشع بن نون علیہ السلام کے ہاں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حکم فرمایا کہ میں تیری قوم کے چالیس ہزار نیک اور ساٹھ ہزار بد تباہ کروں گا آپ مطلع رہیں۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ! بُرے تو عذاب کے مستحق ہیں لیکن نیک کیوں برباد ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نیک اس لیے ہلاک ہوں گے کہ وہ ان بُروں پر کبھی ناراض نہیں ہوئے حالانکہ انھیں اللہ تعالیٰ کی رضا کو مدِنظر رکھ کر ان سے ناراضگی کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ وہ بجائے ناراضگی کے اُن سے گھُل مِل کے رہے۔ (جیسے آج ہمارے دَور میں ہو رہا ہے)

مسئلہ: اس سے معلوم ہُوا کہ ظالمین میں سے بغض اور ان سے ناراضگی ضروری ہے (لیکن فی زمانہ اس عمل کو تو مذموم سمجھا رہا ہے)

نکتہ: رعایا میں بلکہ روئے زمین پر اسی لیے فساد برپا ہے کہ ملک کے سربراہوں (حاکموں وغیرہم) میں ظلم کی عادت ہے اور ان کے ظلم کی سزا علماء بھگتیں گے[۲] اس لیے کہ بُرے مفتی و قاضی وعلماء نہ ہوتے تو بادشاہوں سے فساد سرزد نہ ہوتا بلکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر ہر زمانے میں تمام علماء حق کے لیے ڈٹ کر ظالموں کو برائیوں سے روکیں بلکہ اس کے لیے جدّوجہد

---

[۱] افسوس کہ میرے زمانہ کے بعض علماء اس طرح کی بدبختی کا شکار ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ فرمائے۔ آمین

[۲] لیکن ہمارے دَور میں علماء کی سنتے ہی نہیں فلہذا جو حضرات علمائے کرام اپنے لیڈروں کو افہام وتفہیم کرتے ہیں وہ اس حکم میں نہیں البتہ وہ اس حکم میں ہیں جو لیڈروں کے پیچھے بنے ہوئے ہیں۔ ۱۲

کریں اور اپنا پورا زور لگائیں تو ظالموں کو ظلم کرنے کی جرأت بھی نہ ہو بلکہ ظلم عالم دنیا سے مٹ جائے۔ (لیکن شومیٔ قسمت سے (سبب خود بعض علماٗ ان کے پیچھے بن جائیں تو پھر)

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
میری اُمت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہے گی جب تک میری اُمت کے قرّا امراء کی پا پلوسی نہ کریں۔

ف: یہاں پر قرّاٗ سے مراد علماء ہیں کیونکہ زمانۂ نبوی میں قرآن مجید پڑھتے ہی علومِ اسلامیہ سے واقف و ماہر ہو جاتے تھے۔

بدعتِ حسنہ قرآن مجید کے سمجھنے کے لیے جتنے علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں تمام بدعت (حسنہ) ہاں۔ (کذا فی بحر العلوم للشیخ علی سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ) یہی ہم اہلسنت کہتے ہیں لیکن وہابیہ دیوبندیہ کو کون سمجھائے۔

مسئلہ: صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ احیاء العلوم میں مذکور ہے کہ جو شخص بادشاہ (حاکم وغیرہ) کے ہاں بلا دعوت جائے وہ جاہل ہے اور جو اس کی دعوت پر (بلا مانع شرعی) نہ جائے وُہ بدعتی ہے۔

مسئلہ: آیت میں ہر مخاطب کو ظالمین کی طرف جھکاؤ کی نہی ہے لیکن اس وقت مذموم ہے جب بادشاہوں (حکام و امراء) کے ہاں آمد و رفت اور میل جول اور تعلقات و وابستگی علماء کی طرف سے ہو۔ اگر بادشاہ و امراء و حکام علماء کو ایسے امور پر مجبور کریں اور وہ ان کے مجبور کرنے سے بے بس ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ علماء کو ان کے مجبور کرنے پر دینی منافع کو مدنظر رکھیں تو جائز ہے اس لیے کہ مجبور محض کو اللہ تعالیٰ کی تائید نصیب ہوتی ہے۔ لیکن علماء، چاہیے کہ ایسی مجبوری میں اپنی نفسانی خواہش کو دخیل نہ بنائیں۔ اگر اس وقت بھی نفسانی خواہشات کو سامنے رکھیں گے تو انہیں ان کے نفوس کے سپرد کر دیا جائے گا جس سے شیطان کو بہکانا آسان ہو جائے گا اور شیطان کے بہکانے سے تباہ ہوں گے۔ (نعوذ باللہ)

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ افعالِ خیر میں خطاب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن ان افعالِ خیر میں امت مراد ہوتی ہے اور یہ قرآن مجید کی بہترین بلاغت میں شمار ہوتا ہے اور اقامۃ الصّلٰوۃ سے نماز کی ادائیگی مراد ہے۔ اقامۃ الصّلٰوۃ میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز دین کا ایک اہم ستون ہے۔ طَرَفَیِ النَّهَارِ دن کی دونوں طرفوں، صبح و شام مراد ہے اور اس کا منصوب ہونا علی الظرفیۃ ہے اس لیے کہ اس کا مضاف الیہ وقت محذوف ہے اور قاعدہ ہے کہ مضاف الیہ کے محذوف ہونے پر اس کے احکام مضاف پر جاری کیے جاتے ہیں وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ یہ بھی بوجہ ظرفیت کے منصوب ہے۔ اس کا عطف طرفی النہار پر ہے بمعنے ساعاتٌ من اللّیل یعنی وہ ساعات جو دن کو قریب ہیں۔ یہ ازلفہ سے ہے بمعنے قربہ۔ زُلَفًا، زلفۃٌ کی جمع ہے جیسے غُرَفٌ، غُرْفَۃٌ کی جمع ہے اور صلٰوۃ الغدوۃ صبح کی اور العشیۃ سے ظہر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں اس لیے کہ عربی میں مابعد الزوال کو العشیۃ کہا جاتا ہے اور صلٰوۃ الزلف سے مغرب و عشاء کی نماز مراد ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمع کا اطلاق

دو پر بھی ہوتا ہے اس لیے کہ زلفٌ جمع ہے۔ لیکن اس سے دو نمازیں مراد ہیں۔

تردید پرویزی ٹولہ آیت سے پانچ نمازوں کا ثبوت ملا اس کی نظیر سورۂ ق میں ہے۔ کما قال تعالیٰ؛ وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس۔ یعنی صبح کی نماز۔ وقبل الغروب یعنی عصر اور ظہر کی نمازیں۔ اس جملہ میں عصر کی نماز کا اصالۃً ذکر اور ظہر کا تبعاً۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مناسبات کا ذکر ہوتا ہے۔ ومن اللیل فسبحہ اس سے مغرب و عشا کی نمازیں مراد ہیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ طرفی النھار سے صبح اور مغرب۔ اور زلفاً من اللیل سے عشا اور تہجد کی نمازیں مراد ہیں۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں تہجد ہر مکلف پر واجب تھی اور یہ تفسیر ومن اللیل فتھجد کے موافق ہے یا اس سے وتر مراد ہیں جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے کہ ان کے نزدیک وتر واجب ہیں یا اس سے مجموعہ عشا، وتر اور تہجد کی نمازیں مراد ہیں جیسا کہ لفظ زلفا کا جمع کے صیغے کا تقاضا ہے۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ تمام نیکیاں بالخصوص پانچ نمازیں یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یعنی صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس کا معنیٰ یہ نہیں کہ کل برائیاں معاف ہو جاتی ہیں اس لیے کہ نیکیوں کے باوجود کبائر نہیں مٹتے۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ نمازیں ایک سے دوسرے جمعے تک، ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک برائیوں کو مٹا دیتی ہیں جب کہ کبائر سے اجتناب کیا جائے۔

ف : بہت سی نیکیاں بالخصوص پانچ نمازیں برائیوں سے بچاتی ہیں۔ کما قال تعالیٰ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔

شانِ نزول اس آیت کے شانِ نزول میں مروی ہے کہ ابوالیسر کھجوریں بیچتے تھے ایک عورت ان کے ہاں کھجوریں لینے آئی تو ان کا عورت کی طرف میلان ہو گیا اسے فرمایا کہ میرے گھر کے اندر بہترین کھجوریں ہیں وہاں چلو۔ جب وہ اندر چلی گئی تو اس نے اسے گلے لگا کر ایک بوسہ لے لیا اور سوائے جماع کے وہ سب کچھ کر ڈالا جو کچھ عورتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ عورت نے اسے کہا؛ خدا کا خوف کرو۔ یہ سن کر انھوں نے عورت کو چھوڑ دیا اور اپنے کیے پر نادم ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں حاضر ہوئے اور اپنا سارا ماجرا سنایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ معاملہ کو پوشیدہ رکھ، توبہ و استغفار کر۔ لیکن ان سے صبر نہ ہو سکا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں حاضر ہوئے انہوں نے بھی وہی مشورہ دیا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دیا تھا لیکن وہ بے صبر ہو کر حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا سارا حال سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات اپنے تک محدود رکھنا، اور خداوند کریم کے حکم کا انتظار کیجئے۔ جب نمازِ عصر پڑھی گئی تو یہی آیت نازل ہوئی۔ آپ نے ابوالیسر انصاری (صاحبِ واقعہ) کو فرمایا : تو نے ہمارے ساتھ عصر کی نماز پڑھی ہے ؛ انہوں نے عرض کی : ہاں۔ آپ نے

لہ اسے چکڑالوی ٹولہ بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے دور میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر ان کا گہرا اثر ہے۔ ان کے نزدیک نمازیں صرف تین ہیں۔ یہ لوگ منکرین حدیث ہیں اپنے طور قرآن مجید کے معانی بناتے ہیں۔ ان کے مذہب کا نمونہ ہم نے مقدمۃ التفسیر للادیسی میں لکھا ہے۔

فرمایا: جا، یہی نماز تیرے اس گناہ کا کفارہ بن گئی۔ حاضرین صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یہ صرف اس کیلیے ہے یا تمام لوگوں کیلیے عام ہے۔ آپ نے فرمایا: تم لوگوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔

حدیث شریف کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے کسی ایک کے گھر کے قریب نہر جاری ہو اور وہ روزانہ اس سے پانچ مرتبہ نہائے تو بتاؤ کہ اس کے جسم پر میل کچیل باقی رہے گی؟ سب نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: یہی کیفیت نماز کی ہے کہ جو پانچ وقت نماز پڑھتا ہے اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

ف: ہر گناہ نجاست ہے اور نیکی اسے پاک کرنے والی ہے۔ یہی وجہ ہے وضو کرنے سے جسم کے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ وضو سے جو پانی گرتا ہے وہ نجاست (معنوی) ہوتا ہے۔

مسئلہ: اس سے فقہاء کرام نے مسئلہ استنباط کیا ہے کہ جس رومال سے وضو کا پانی پونچھا جائے نماز میں اس کا استعمال مکروہ ہے۔

اعجوبہ حدیث اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو وضو کا حکم فرماؤں گا جب وہ وضو کریں گے تو ان کے وضو کے پانی کے ایک ایک قطرے کے بدلے باغات عطا فرماؤں گا جن میں سے ہر ایک کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہوگی۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا:

خوشا نماز و نیاز کسے کہ از سر درد
بآب دیدہ و خونِ جگر طہارت کرد

ترجمہ: بہتر وہ نماز و نیاز ہے کہ جس کا وضو آنسو اور خونِ جگر سے کیا گیا ہو۔

فائدہ صوفیانہ بہتر نیکی اور افضل طاعت عرفانِ الٰہی و طریقۂ توحید اور نفس کی خواہشات کے خلاف کرنا ہے۔ ذکر الٰہی سے گناہوں کی صفائی ہوتی ہے اور تزکیۂ نفوس و تصفیۂ قلوب بھی ذکر اللہ سے نصیب ہوتا ہے بلکہ اسی سے بندے کو طاعتِ الٰہی پر تقویت حاصل ہوتی ہے اور شیطان کے مکر و فریب سے بھی بچ جاتا ہے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ لا الٰہ الا اللہ بھی نیکی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ تو تمام نیکیوں سے حسین ترین نیکی ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ سالک پر لازم ہے کہ رات دن، صبح و شام غرضیکہ ہر آن اللہ تعالیٰ کے ذکر و طاعت میں زندگی بسر کرے۔ قضائے حاجاتِ ضروریہ اور کسبِ معاش کے لیے دن کے چند لمحات اور آرام کرنے کے لیے رات کے چند ساعات مستثنیٰ کرے تو جائز ہے اس لیے کہ انسانی ڈھانچے کے لیے یہ باتیں ضروری ہیں ورنہ انسانی مشینری بیکار ہو جائے گی اسی لیے رات کو چند لمحات کے لیے آرام ضروری ہے تاکہ پھر ذکر و فکر کے لیے تازہ دم ہو سکے۔

ان الحسنٰت یذھبن السیّاٰت میں الحسنٰت سے انوار الحسنات مراد ہیں ۔ اور انوار الحسنات صوفیاً کے نزدیک اعمالِ صالحہ و ذکر ذکر اور مراقبہ وغیرہ مراد ہے ۔ یہ امور سالک کو دن اور رات کے اکثر اوقات میں ضروری و لازمی ہیں اور السیّاٰت سے ظلمات السیّاٰت مراد ہیں اور ان سے وہ اوقات مراد ہیں جو سالک نے اپنے قضائے حاجات وکسبِ معاش اور رات کے آرام میں ضایع کیے اسی طرح اس کے دیگر وہ مشاغل دنیویہ ہیں جنہیں ذکر وفکر و مراقبہ اور طاعتِ الٰہی سے تعلق نہیں۔

ف : صوفیائے کرام نے فرمایا کہ روح نورانی علوی کا جسد ظلمانی سفلی سے متعلق ہونا روح کے لیے خسران کا موجب ہے ۔ ہاں یہ خسارہ اعمال صالحہ شرعیہ کے انوار سے پُورا ہو سکتا ہے انہی انوار سے رُوح کو تربیت اور بشریت کے گڑھے سے روحانیت بلکہ وحدانیت ربانیہ کی طرف سے ترقی نصیب ہوتی ہے اور انہی انوار سے جسد سفلی کی ظلمات دُور ہوتی ہیں اس کی مثال اس دانہ کی ہے جسے زمین کے اندر ڈالا جاتا ہے اس دانہ کے لیے زمین میں پڑنا خسارہ ہے لیکن اسے زمین میں ڈال کر اس کی پانی سے تربیت کی جائے تو وہ بڑھ کر سات سَو تک ہو جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زاید، جیسے اللہ تعالیٰ چاہے ۔ یونہی سالک اپنے لیے تصوّر فرمائے۔

سبق : سالک پر لازم ہے کہ وہ طاعات وعبادات کی مشقتیں اور تکالیف برداشت کرے اس لیے کہ سالک کو ان مشقتوں اور تکلیفوں سے انوار اور باقی و دائمی زندگی نصیب ہوگی۔

ے

مدہ براحت فانی حیات باقی را
بمحنت دو سہ روز از غم ابد بگریز

ترجمہ : دائمی اور باقی رہنے والی زندگی کو فانی راحت میں ضائع نہ کر۔ دو تین دنوں کی محنت سے ڈر کر دائمی حُزن وغم نہ خرید۔

ذٰلِکَ یعنی مذکورہ استقامت واقامت وغیرہا ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ ۞ نصیحت پانے والوں کے لیے پند و نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کر کے استقامت واقامت کا پابند ہوا تو اسے حقیقۃً حال و مقام نصیب ہوگا۔

ف : حکماء فرماتے ہیں کہ استقامت پہاڑوں سے سیکھیے ۔ جو استقامت کا خواہاں ہے اسے اپنے عزم میں پہاڑ بن جانا چاہیے۔ کیونکہ پہاڑ میں یہ چار علامات ہیں :

۱۔ اسے گرمی نہیں پگھلاتی ۔
۲۔ اسے برف منجمد نہیں کرتی۔
۳۔ اسے ہوا نہیں ہلاتی ۔
۴۔ اسے سیلاب بہا کر نہیں لے جاتا۔

صاحبِ استقامت کے اوصاف

صاحبِ استقامت کی ایک علامت یہ ہے کہ اس پر لاکھ احسان کرو وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹتا۔ ہمارے دَور کے اقتدار کے بھوکے لیڈروں کی طرح نہ ہونا چاہیے کہ انھیں کہیں سے کچھ چانسہ ملے یا سبز باغ دکھائے جائیں تو فوراً اپنا موقف بدل دیتے ہیں اور بڑے لمبے دعاوی کو بھول کر جادۂ استقامت سے ہٹ کر لالچ کا شکار ہو جاتے ہیں پھر ان لوگوں کو کسی کی نصیحت کیا اثر کرے گی۔

۲۔ صاحبِ استقامت کو کتنا ہی ستاؤ اسے گالی دو لیکن وہ اپنے مشن کو نہیں چھوڑتا۔

۳۔ وہ خواہش نفسانی کے تابع ہو کر حکم الٰہی کے خلاف نہیں کرتا۔

۴۔ دنیا کے چند ٹکے اسے طاعتِ الٰہی سے نہیں ہٹاتے۔

حضرت حافظ نے فرمایا: ؎

ببال و پر مرو از رہ کہ تیر پُر تابے
ہوا گرفت زمانے ولے بخاک نشست

ترجمہ: دنیا کی لالچ میں نہ آؤ بلکہ اپنے مقصد پر ڈٹ جاؤ ورنہ تیر کتنا ہی زور سے ہوا پہ اڑتا ہے لیکن دو منٹوں میں زمین پر گر جاتا ہے۔

یعنی قدرت دنیویہ اور قوت مالیہ کو دیکھ کر جادۂ مستقیم کو نہ چھوڑنا اس لیے کہ ہر دنیوی ترقی کو تنزل ہے دیکھیے تیر کتنا آسمان کی بلندیوں پر چڑھ جاتا ہے لیکن تابکے۔ بالآخر زمین پر گر جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی دنیوی ترقی میں کتنی بڑی پرواز کرے بالآخر زیرِ زمین ہوگا۔

تفسیر عالمانہ

وَاصْبِرْ اے محبوب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اوامر الٰہی کی مشقتوں پر صبر فرمائیے۔ اس حکم میں آپ کی اُمت تبعاً داخل ہے۔

نکتہ: قرآن مجید میں اوامر کے اکثر خطابات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہیں اور اکثر نواہی آپ کی امت کو۔ اس سے حضور تاجدارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کریمی کا اظہار مطلوب ہے کہ اعلیٰ شئے کی نسبت ان کی طرف اور نواہی (قبائح) کی نسبت آپ کی امت کی طرف۔

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کا اجر ضایع نہیں کرتا یعنی ان کے اعمال صالحہ نماز ہو یا صبر یا اور اعمال جیسے فرائض ومندوبات ومکارم اخلاق واچھی عادات وخصائل کہ انھیں ان کی پوری جزا عطا فرمائے گا اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی۔

سوال: آیت میں ثواب کے ضیاع کی نفی کیوں، اس لیے کہ ہمارے نزدیک اعمال صالحہ ثواب کا موجب نہیں بایں معنیٰ کہ اللہ تعالیٰ کو ان اعمال کا ثواب عطا فرمانا ضروری نہیں بلکہ یہ اس کا فضل وکرم ہے کہ ان اعمال صالحہ پر بہت بڑا اجر عنایت

جواب : اس میں کمال تنزیہہ کا بیان ہے کہ وہ ایسا کریم ہے کہ باوجودیکہ اس پر کسی قسم کا اجر وثواب دینا ضروری نہیں ۔ لیکن تاہم بندوں کے اعمال ضائع نہیں فرمائے گا تاکہ معمولی سی غلط فہمی بھی کسی کے ذہن میں نہ ہو کہ ہم نے اس کے نیک کام کیے لیکن اس نے ہمیں اس کا اجر بھی نہ دیا۔

ف : اس جملہ میں واصبر کی علت بتائی گئی ہے ۔

فائدہ صوفیانہ یاد رہے کہ صبر باب احسان سے ہے جسے ان تعبد اللہ کانک تراہ کی مشق سے مشاہدۂ حق کی مشقت وتکلیف کا احساس نہ ہو۔ لیکن یاد رہے کہ مشقتوں اور تکلیفوں کی برداشت مشق کے طور نہ ہو بلکہ ان میں اخلاص قلبی لازمی ہے ۔ ع

گر نباشد نیت خالص چہ حاصل از عمل

ترجمہ : اگر نیت خالص نہ ہو تو عمل کا کوئی فائدہ نہیں ۔

پند صوفیانہ بعض مشائخ اپنے مریدین کو تین باتوں کی سخت تاکید فرماتے ہیں :

۱۔ جو صرف آخرت کے لیے اپنے اوقات صرف کرے دنیوی امور کی کفالت خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

۲۔ جو اپنے باطن کو صاف رکھے اس کے ظاہر کی صفائی اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے ۔

۳۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلصانہ معاملہ رکھے اللہ تعالیٰ اس کے لیے لوگوں کو مخلص بنا دیتا ہے ۔

نکتہ : اوامر ونواہی سے اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں ان سے اپنے بندوں کا خلوص دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اوامر کی پابندی کرتا ہے اور کون نواہی سے بچتا ہے ۔ اسی لیے بندوں کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ طاعت وقبول ورضا میں سر تسلیم خم کریں ۔

حضرت حافظ نے فرمایا : ؎

مزن ز چون وچرا دم کہ بندۂ مقبول
قبول کرد بجان ہر سخن کہ جاناں گفت

ترجمہ : مالک کے حکم کے سامنے چون وچرا نہ کرنی چاہیے ۔ عاشق وہ ہے جو اپنے محبوب کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے ۔

روحانی نسخے حضرت ابوبکر وراق رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے سالہا سال چار چیزوں کو طلب کیا وہ ان چاروں میں حاصل ہوئیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کی طاعت میں پائی ۔

۲۔ معیشت کی وسعت نماز چاشت میں ۔

۳۔ دین کی سلامتی زبان کی حفاظت میں۔

۴۔ قبر کا نور رات کی نماز میں۔

سبق : دانا وہ ہے جو طریق طاعات میں جد و جہد کرتا اور اپنے دل کو نور عبادات سے منور کرتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اے طالبِ صادق اور عاشق دیوانہ اگر محبوب حقیقی کا وصال چاہتے ہو تو تمہیں اپنی زندگی کے جملہ لمحات اس کی طاعت، ذکر و فکر اور مراقبۂ قلب و ترک شہوات و مخالفت ہوائے نفسانی میں صرف کرنے چاہئیں۔ فان اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے طالبین کی مساعی کو ضائع نہیں فرماتا۔ چنانچہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

الا من طلبنی وجدنی۔

خبردار جو مجھے طلب کرتا ہے وہ مجھے ضرور ملے گا۔ اور اس کی عادتِ کریمہ ہے کہ جو اس کی طلب میں ایک بالشت چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہے۔

ف : اس میں اللہ تعالیٰ کے فیض عموم علی العباد کا بیان ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا معنیٰ یہ ہے کہ بندے کے تعینات کو مٹا دیا جاتا ہے اور اس کے درمیان جتنے حجابات ہیں وہ ہٹا دیے جاتے ہیں تاکہ بندہ وحدت ذاتیہ کا (بلا حجاب) مشاہدہ کر سکے لیکن اس کے چند شرائط و اسباب ہیں۔ اور وہ شرائط و اسباب صرف جذبۂ الٰہیہ و دعوتِ ربانیہ سے طے ہو سکتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنا وصال عنایت فرماتا ہے تو اس سے تمام موانع ہٹا دیتا ہے ورنہ اس بندے کا راہ طے کرنا نہ صرف مشکل ہو جاتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ حیران و سرگردان رہتا ہے۔

داد حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد اوست

ترجمہ : عطائے الٰہی کے لیے قابلیت شرط نہیں بلکہ وہ اپنی کریمی سے جسے جو کچھ عطا فرمائے۔

اے اللہ ! ہمارے حال پر رحم فرما کیونکہ ہمارے گناہ بہت بڑے گناہ ہیں ہمارے آگے ہزاروں حجابات ہیں اور ہمارے تمام اسباب و وسائل بھی منقطع ہو گئے صرف تیری توفیق و عفو و غفران اور لطف و کرم و احسان کا سہارا ہے تو ہی ہر آن و ہر زمان ہمارے اوپر احسان فرماتا ہے۔

تفسیر عالمانہ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ لولا بمعنے ھلّا اور کان بمعنے وجد ہے پس کیوں نہ موجود رہے گزشتہ ہلاک شدہ قوموں میں سے جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں القرون کے بعد الھالکۃ الکائنۃ محذوف ہے۔ یہ اس مذہب پر ہے جنھوں نے موصول کو اپنے بعض صلہ کے ساتھ حذف کرنے کو جائز رکھا ہے۔ بعض کے نزدیک من قبلکم سے پہلے کائنۃ محذوف ہے اور وہ القرون سے حال ہے۔ القرون، قرن کی جمع ہے۔ ہر گزشتہ

آنے والے دور کے لیے قرن ہے اس لیے پچھلے لوگوں سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ بنابریں انھیں قرن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ف : قاموس میں ہے کہ قرن ایک صدی کا ہوتا ہے۔ یہی اصح ہے۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو دعا دی کہ :

حُسن کا معجزہ عش قرناً۔ تو ایک قرن تک زندہ رہ۔

چنانچہ وہ ایک صدی زندہ رہا۔

ف : ان گزشتہ امم سے تمام فنا ہو گئے۔ ان میں کوئی بھی زندہ نہ رہا۔

اُولُوا بَقِیَّۃٍ اصحابِ فضل وخیر کو بقیہ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بقیۃ کی تاء ذبیحۃ کی تاء کی طرف نقل کے لیے ہے اسی لیے کہ ہر انسان کی عادت ہے کہ اپنی کمائی سے ہر وہ شے باقی رکھتا ہے جو اچھی اور افضل ہو۔ اسی معنے پر اب یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا۔ مثلاً کہا جاتا ہے :

فلان بقیۃ القوم۔

یعنے خیارھم۔ اور کہا جاتا ہے :

الزوایا خبایا وفی الرجال بقایا۔

یَنْہَوْنَ یہ اولوا بقیۃ کی صفت ہے۔ یعنی مفسدین کو روکتے۔ عَنِ الْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ زمین پر فساد برپا کرنے سے یہ انکار کے طور پر کہا گیا ہے۔ یعنی ان میں اہلِ خیر موجود نہ تھے جو انھیں روکتے تاکہ ان پر عذاب نازل نہ ہوتا۔ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْھُمْ یہ استثناء منقطع ہے یعنی مگر ان گزشتہ قوموں میں بہت تھوڑے ہیں جنھیں ہم نے نجات بخشی انھوں نے مفسدین کو فساد سے روکا ان سے رسل کرام علیہم السلام کے متبعین مراد ہیں جو ان فساد کنندگان میں موجود تھے مگر تھے وہ بہت قلیل جن کی بات کو فساد کنندگان نے نہ مانا اگرچہ انھیں ان مفسدین کو فساد کرنے سے روکا۔ ممن انجینا میں من تبعیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے اس لیے کہ ان نجات یافتہ لوگوں نے مفسدین کو بعض نے نہیں بلکہ سب نے روکا تھا وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اس کا عطف ضمیر پر ہے جیسا کہ اس پر خود کلام دلالت کرتا ہے یعنی وہ ہلاک شدگان فساد سے نہ رکے بلکہ فساد وترک نہی کا ارتکاب کر کے ظالمین کا اتباع کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اتبع کے بعد الذین ظلموا کو مظہر کر کے اسی لیے لایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ ظلم کا ارتکاب کرنے والوں میں شریک ہیں اور یہ بھی ان کی طرح ظالم ہیں اور اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان پر عذاب کا گھیرا ان کے گندے کرتوتوں یعنی ظلم و اتباع ظلم کی وجہ سے تھا مَآ اُتْرِفُوْا فِیْہِ الاتراف یعنے انعام۔ ترف سے ہے یعنے انھیں شہوات ولذات کی ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا گیا تو ان بدبختوں نے امرِ آخرت کے بجائے انھیں شہوات ولذات کو پسند کیا۔ مثلاً کہا جاتا ہے :

اترفتہ النعمۃ بمعنے اطغتہ۔ اس معنے پر ما اترفوا بمعنے ما اطغوا ہے اور اس میں علیٰ سببیہ ہے اس سے ان کے اموال واملاک مراد ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وان لیس للانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ۔ اب آیت کا معنیٰ یہ ہوا

یعنی انہوں نے املاک و اموال کے حصول کا اہتمام کیا اور ان کے جمع و حاصل کرنے میں اپنی تمام جد وجہد صرف کر دی۔ اسی شغل میں ان کی زندگی کٹ گئی۔ اس کے مترجمین کا حال تو ظاہر ہے اور دوسرے اگرچہ ان کی طرح منہمک نہیں تھے لیکن ان کے لذات و شہوات میں مبتلا ضرور تھے وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ○ اس کا اتبع الخ پر عطف ہے۔ اس میں تباہ شدگان کی تباہی و بربادی کا سبب بتایا گیا ہے یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ترک اور اتباع شہوات کے جرائم کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے۔

حدیث شریف اللہ تعالیٰ عوام کو خواص کے اعمال کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ ہاں جب خواص عوام برے اعمال سے نہی عن المنکر اور امر بالمعروف ترک کر دیں حالانکہ انہیں اس پر قدرت بھی ہو تو اللہ تعالیٰ عوام و خواص سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ف: جس قوم میں سچے امر بالمعروف و ناہی عن المنکر نہ ہوں تو وہ قوم فساد برپا کرتی ہے اور جو لوگ امر بالمعروف پر عمل نہیں کرتے اور نہی عن المنکر سے باز نہیں آتے وہ ہلاک ہوں گے۔

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

گرت نہی منکر بر آید ز دست
نشاید چو بے دست و پایان نشست
بگو آنچہ دانی سخن سود مند
وگر ہیچ کس را نیاید پسند
چو دست و زبان را نماند مجال
بہمت نمایند مردی رجال

ترجمہ: اگر تجھے نہی عن المنکر کی طاقت ہے تو لنگڑا پن کر نہ بیٹھے رہو۔ تجھے جو نصیحت کرنی آتی ہے وہ کہہ دے اگرچہ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے تو اس کی قسمت۔ ہاں جب ہاتھ اور زبان دونوں سے تیری طاقت کمزور پڑ جائے تو پھر اللہ والے دعا کر کے اس برے کو راہِ حق دکھاتے ہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى یہ لام بصریوں کے نزدیک جحود کی ہے۔ اور اس کا ناصب اَنْ مضمر ہے اور یہ کان کی خبر محذوف کے متعلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ قریٰ کو تباہ و برباد کر دے اور کوفیوں نے فرمایا کہ یہاں کان کی خبر ہے اور لام تاکید کے لیے بڑھائی گئی ہے بِظُلْمٍ فاعل سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کسی پر بلا جرم اور استحقاق تباہی نازل نہیں فرماتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر ایسا کرنا محال ہے وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ○ مفعول سے حال ہے بمعنے اھلہا غیر ظالمین۔

مسئلہ: آیت میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ و تقدیس کا بیان ہے کہ وہ ظلم کرنے سے بالکل منزہ و پاک ہے۔ اور اسے ایسے

طریق سے بیان کیا گیا ہے جس کا صدور ایسی ذات سے محال وغیر ممکن ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے جو چاہے کرے ، اسے ظلم نہیں کہا جاتا۔ لیکن چونکہ وہ بظاہر متصور ہوتا ہے اس لیے اس کی تنزیہہ وتقدیس بیان کی گئی۔

ف : بعض مفسرین نے فرمایا کہ بظلم متقدم فعل کے متعلق ہے اور اس سے شرک مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ امم سابقہ کو شرک کی وجہ سے تباہ وبرباد نہیں کرتا درانحالیکہ ان میں مصلح موجود ہوں کہ وہ مصلح ان کو شرک کے سوا کوئی دوسرا فساد برپا نہیں کرنے دیتے۔

ف : یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ وہ اپنے حقوق میں بندوں سے چشم پوشی فرماتا ہے اسی لیے فقہاء کرام نے فرمایا کہ حقوق اللہ میں مسامحت اور حقوق العباد میں مضایقہ (تنگی وسختی) ہے اسی لیے وہ حقوق اللہ پر حقوق العباد کو ترجیح دیتے ہیں جب ان دونوں میں مبتلا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کفر وشرک کی وجہ سے عذاب نہیں کرتا جب تک حقوق العباد کے معاملات میں غلطی اور خلقِ خدا کی ایذا میں تعدی نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں محض شرک وکفر کی وجہ سے تباہ وبرباد نہیں کیا بلکہ اس لیے کہ کفر وشرک کی سزا جہنم ہے اور جب وہ دوسرے گناہوں کو کفر وشرک سے ملاتے تو عذاب میں مبتلا ہوتے جیسے صالح علیہ السلام کی قوم اونٹنی کی کوچیں کاٹنے اور لوط علیہ السلام کی قوم لواطت، شعیب علیہ السلام کی قوم بھر تول کی کمی، فرعون اور اس کی برادری موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو ایذا دینے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوئی۔

نکتہ : سلطنت وحکومت کفر وشرک سے باقی رہ سکتا ہے لیکن ظلم وستم کی وجہ سے جلد تباہ وبرباد ہوجاتا ہے (خواہ اس کا حاکم مسلمان ہو)۔

نکتہ : یہی وجہ ہے کہ جیسے حاتم طائی سخاوت میں مشہور ہوا ایسے ہی نوشیرواں عدل کی وجہ سے مشہور ہوا۔

مسئلہ : نوشیرواں کو عادل بایں معنیٰ کہا جائے کہ اس سے ظلم وستم کا صدور کم ہوا مدح وثنا کے ارادہ پر اسے عادل نہ کہا جائے اس لیے کہ کافر کی مدح وثنا نہیں کرنی چاہیے۔

مسئلہ : مسلمان بادشاہ اگر ظالم ہوں تو بھی انھیں عادل کہنا گناہ ہے اس لیے کہ عدل کا اطلاق مدح وثنا کے لیے ہوتا ہے اور ظالم کی مدح وثنا ناجائز ہے کیونکہ اس سے قائل کا کذب یا کافر کی مدح سے کفر ثابت ہوتا ہے۔

حکایت نوشیرواں جب فوت ہوا تو اس کے تابوت کو تمام مملکت میں پھیرا گیا اور ساتھ اعلان ہوتا رہا کہ نوشیرواں نے جس کسی کا کچھ دینا ہو تو بتائے۔ لیکن کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنے حق (درہم ودینار) کا مطالبہ کرتا۔

~

شہِ کسریٰ از ظلم ازاں سادہ است

کہ در عہد او مصطفیٰ زادہ است

ترجمہ : نوشیرواں سے اس لیے ظلم سرزد نہ ہوا کہ اس کے زمانے میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ ہوئی۔ (گویا نوشیرواں کا عدل بھی ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم) کا صدقہ ہے۔

حضرت ابومیسرہ سے منقول ہے فرمایا کہ کسی ایک کے ہاں منکر نکیر تشریف لائے تو اسے فرمایا کہ ہم تجھے سو کوڑا ماریں گے

حکایت اس نے کہا میں نے فلاں نیک کام کیا تھا۔ انہوں نے اس کے دس کوڑے معاف کر دیے۔ پھر انہوں نے مارنے کا ارادہ کیا تو اس نے کوئی اور نیکی بتائی یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ ہم ایک کوڑا ضرور ماریں گے۔ تو وہ خاموش ہو رہا جب انہوں نے اسے ایک کوڑا مارا تو اس کی ساری قبر آگ سے بھر گئی۔ اس نے منکر نکیر سے پوچھا کہ مجھے اس کوڑے کی سزا کیوں؟ انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ ایک مظلوم پر تیرا گزر ہوا اس نے تجھ سے مدد چاہی تو نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ اس گناہ سے تجھے کوڑا مارا گیا ہے۔

سبق: غور کیجیے جب مظلوم کی مدد نہ کرنے کی یہ سزا ہے تو ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھانے والے کو کیا سزا ملے گی۔ اس سے حکام، امراء و رؤسا، بادشاہ عبرت پکڑیں اور اپنے لیے عدل اختیار کریں۔ ہر ایک کا خیال رکھیں اور اہلِ اسلام کی جتنی ہو سکے معاونت کریں۔

ع

نیاید بنزدیک دانا پسند
شبان خفتہ و گرگ در گوسفند
مکن تا توانی دل خلق ریش
وگر میکنی میکنی بیخ خویش

ترجمہ: دانا کے نزدیک بہت قبیح ہے کہ بھیڑیا بکریوں میں ہو اور چرواہا آرام کر رہا ہو۔ جہاں تک ہو سکے کسی کے دل کو رنج نہ پہنچا۔ اگر ایسے کرے گا تو تُو اپنی بیخ کنی کر رہا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ یہاں مشیت قسری مراد ہے (کذا فی الحواشی) لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً اور اگر تیرا رب چاہے تو تمام لوگوں کو ایک اُمت بنا دے۔ یعنی حق اور دین اسلام پر متحد کر دے یہاں تک کہ اس سے کوئی بھی کسی مسئلہ میں اختلاف نہ کرے جیسے اختلاف سے پہلے تھے۔ کما قال تعالیٰ:

وما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا۔

جیسے قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو تمام لوگ صرف ایک دین اسلام پر متفق ہوں گے جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا اس لیے کہ اس کے علم میں ہے کہ وہ اس کے اہل نہیں اس لیے ایک اسلام پر متفق نہیں۔

ف: صاحب روح البیان رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابتدائی تخلیق میں ہر ایک دینِ حق پر تھا پھر بعد کو مختلف ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو اسی پہلی حالت پر سب متفق ہو جائیں گے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یونہی ہے۔

مسئلہ صوفیانہ: اس میں اشارہ ہے کہ ازل و ابد ایک ہے۔

سوال: آدم علیہ السلام کے پہلے بھی تو (جنات) مختلف ہوئے تھے۔

جواب: آدم علیہ السلام سے پہلے کا اختلاف ہمارا موضوع بحث نہیں اس لیے وہ غیر معتبر ہے کیونکہ وہ انسانی جنس سے نہیں تھے۔

سوال: عیسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد پھر اختلاف برپا ہوگا وہ تو جنس انسانی سے ہوں گے۔

جواب: چونکہ عیسیٰ علیہ السلام ولایت محمدیہ کا خاتمہ ہوں گے اس لیے ان کی موجودگی میں اختلاف نہیں ہوگا۔ جب ان کا وصال ہوگا تو اختلاف ہو تو حکمتِ الٰہیہ کے خلاف نہیں کیونکہ اختلاف کا ازالہ ولایت سے تھا جب وہ نہ رہی تو اختلاف کا ہونا ضروری ہوا اس لئے کہ اختتامِ ولایت پر انسان کی نشأۃ ثانیہ کا دور شروع ہوتا ہے اور وہ دور اختلاف کو مستلزم ہے۔

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ اور دین حق کے متعلق لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے اور اس کی مخالفت کرتے رہے۔ کما قال:

وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ما جاءتھم البینات ۔ یعنی اس میں اختلاف صرف انہوں نے کیا جن کے پاس بینات آئے۔ یہ بھی صرف آپس میں یا انبیاء علیہم السلام پر بغاوت کی وجہ سے۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث شریف مجھے اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے فلہذا تم مجھ سے فائدہ اٹھاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا اور حواریین کی طرح نہ ہو جاؤ کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختلاف کیا جب انھوں نے میری طرح انھیں دین حق کی دعوت دی۔

مسئلہ: آیت میں بندے کے اختیار کا اثبات ہے کہ بندہ اپنے اختیار و تصرف کو بروئے کار لا کر ہی اختلاف کرتا ہے اس لیے فعل کا فاعل کے بغیر صدور محال ہوتا ہے جب ان کا اختلاف ہے تو ثابت ہوا کہ فاعل وہی خود نہیں نہ اللہ تعالیٰ (العیاذ باللہ) یہی مذہب اہلسنت کا ہے جو دو مذہبوں کے درمیان ہے اس لیے کہ جبریہ دو فرقے ہیں: ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ فعل میں بندے کے کسب کو دخل ہے یہی اہلسنت اشعریہ ہیں اسی میں ہم شامل ہیں (انھیں جبریہ صرف لفظاً کہا گیا)۔ دوسرا خالص جبریہ ہیں جو فعل میں بندے کے کسب کو دخل نہیں مانتے یہ جہنیہ کہلاتے ہیں اور ان کے خلاف قدریہ کا عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے فعل میں خود خالق ہے وہ کفر و معاصی کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق و تقدیر نہیں مانتے۔ ہم اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ ہر فعل کا خالق اللہ تعالیٰ اور اس کا کسب (دخل) بندہ اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ یعنی بندے کے فعل کی تخلیق اللہ تعالیٰ اس وقت فرماتا ہے جب بندہ اس فعل کا اپنے اختیار سے ارادہ بلکہ اس کے لیے عزم بالجزم رکھتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ ہے کہ بندے کے کسی فعل کو اس کے قصد و ارادہ کے بغیر پیدا نہیں فرماتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایک فعل مقدور کا صدور دو مختلف قدرتوں کے تحت ہوتا ہے اس لیے کہ فعلِ بندہ اللہ تعالیٰ کا مقدور ہے بوجہ ایجاد و تخلیق کے، اور بندے کا مقدور ہے بوجہ کسب کے[1]۔

---

[1] آجکل عوام اور پڑھے لکھے لیکن علمِ دین سے کورے اس مسئلہ میں سخت الجھے ہوئے ہیں انھیں یہی تقریر کام دے گی۔ مزید تشریح تفسیر اویسی میں ہے۔

سوال : وما رمیت اذ رمیت الخ میں اختیار کی نفی ہے اس سے اہلسنت کے مذہب کی تردید اور جبریہ کی تائید ہوتی ہے۔
جواب : یہ مقام فنا ہے اور ہم اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ ہر فعل کا موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے بندہ تو مظہر محض ہے۔
حضرت عارف جامی قدس سرہٗ نے فرمایا :

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود
تاثیر ز آلت از محالات بود
ہستی موثر حقیقی است یکیست
باقی ہمہ اوہام و خیالات بود

ترجمہ : فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے باقی ہر شے صرف آلات ہیں تاثیر آلات سے محال ہے موثر حقیقی صرف ایک ہے باقی ہستیوں کا خیال وتصور خیالی ووہمی ہے۔
اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ : یہ مختلفین کی ضمیر متصل سے مستثنیٰ متصل ہے یا لایزالون کے فاعل سے ہے۔ اب عبارت یوں ہوگی :

الا قوماً ھداھم اللہ بفضلہ الی الحق الخ

مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ یعنی جس قوم کو اپنے فضل وکرم سے حق کی ہدایت بخشے کہ وہ دینِ حق میں اختلاف کریں اور نہ اس کی مخالفت کریں۔
وَلِذٰلِكَ اسی رحمت کے لیے بتاویل ان مع الفعل۔ خَلَقَهُمْ : ھُمْ کی ضمیر مَنْ کی طرف راجع ہے۔ ایسے ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ نے اہلِ رحمت کو رحمت کے لیے پیدا فرمایا جیسے اہلِ اختلاف کو اختلاف کے لیے۔
مثنوی شریف میں ہے :

چوں خلقت الخلق کے یربح علی
لطف تو فرمود اے قیوم و حی
لاالان تربح علیہم جود تست
کہ شود زو جملہ ناقصہا درست
عفو کن زیں بندگان تن پرست
عفو از دریائے عفو اولیٰ تر ست

ترجمہ : جب تُو نے تمام مخلوق کو پیدا فرمایا اور تُو نے ہی سب کو لطف کا امیدوار بنایا اور سب تیرے لطف سے

آرام پاتے ہیں نہ کہ تجھے ان سے کوئی راحت کی ضرورت ہے فلہذا ہم تن پرستوں کو معاف فرما اس لیے کہ عفو ہر حال میں بہتر ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ اور تیرے رب قول ملائکہ کو یا اس کا حکم واجب ہوا وہ یہ کہ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ یعنی جن وانس کے عاصیوں سے جہنم کو بھردوں گا یعنی جہنم میں جن وانس کا صرف ایک فریق نہیں بلکہ ہر دو سے جہنم پُر ہوگی اَجْمَعِيْنَ ○ جن وانس کے عموم کی تاکید ہے اس لیے کہ ان دونوں میں دین کے اندر اختلاف کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے حق کو جھلانے والے تھے اور احکام شرعیہ جن وانس ہر دو پر جاری ہے جیسے انسانوں سے کافر وعاصی جہنم میں جائیں گے ایسے ہی جنات کے کافر وعاصی سزا کے مستحق ہو کر جہنم میں جائیں گے۔

ف : دین کے متعلق انسان چار قسم کے ہیں :

۱۔ رُوح ونفس دونوں کے اعتبار سے لباس سعادت میں سعید انسان۔ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور جملہ اولیاء کرام ہیں۔

۲۔ نفس کے اعتبار میں لباس شقاوت کے شقی۔ یہ جملہ کفار کے لیے ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہوا۔

۳۔ نفس کے اعتبار سے شقی۔ لیکن لباسِ سعادت میں سعید جیسے بلعم بن باعورا و برصیصا و ابلیس۔

۴۔ نفس کے اعتبار سے سعید۔ لیکن چند روز لباس شقاوت میں جیسے حضرت بلال وصہیب وسلمان رضی اللہ عنہم اوائل عمر میں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شقاوت کو سعادت اور تقویٰ وطہارت اور ہدایت میں تبدیل فرمایا۔

ف : احیاء العلوم میں ہے کہ وصول الی سے مانع عدم سلوک اور سلوک کا مانع عدم الارادہ اور ارادہ کا مانع عدم ایمان اور عدم ایمان کا مانع عدم ہدایت ہے۔

ے

قرب تو باسباب وعلل نتواں یافت
بے سابقۂ فضل ازل نتواں یافت

ترجمہ : تیرا قرب اسباب وعلل سے نصیب نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ فضلِ ازلی شامل نہ ہو۔

تفسیر صُوفیانہ

تاویلات نجمیہ میں ہے :
ولو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو طلبِ حق میں تمام لوگوں کو بُرا منا دے ولا یزالون مختلفین طلب میں لوگ مختلف رہے۔ ان کے بعض تو طلبِ دنیا میں مشغول ہو گئے اور بعض طلبِ آخرت میں اور بعض طلب حق میں الا من رحم ربك مگر جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے تو اپنی رحمت کے نور سے ان کی طبیعت جسمانیہ وروحانیہ کی ظلمت نکال کر ان کو طلب ربوبیت کے نور کی طرف پہنچا دیتا ہے انھیں دنیا سے غرض نہ آخرت سے واسطہ بلکہ وہ جمال وجلال الٰہی کی طلب میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ اور انھیں طلبِ حق کیلیے

پیدا فرما کر انہیں حسن استعداد طلب سے کرم فرمایا اور طلب کی توفیق بخشی اور فضیلت وجدان سے جملہ عالم پر ان کو فضیلت بخشی۔ وتمت کلمۃ ربك تیرے رب کا کلمہ ازل میں واجب ہوا جیسے فرمایا کہ هٰؤلاء فی الجنۃ ولا ابالی وهٰؤلاء فی النار ولا ابالی یہ بہشت میں ہوں گے اور مجھے کوئی پروا نہیں اور یہ جہنم میں ہوں گے۔ لاملئن جهنم من الجنة میں جہنم کو ان جنات یعنی ان ارواح سے پُر کروں گا جو ازلی متمرد اور تباہ و برباد ہونے والے ہیں جیسے ابلیس اور اس کے چیلے۔ والناس اور وہ لوگ جن کے نفوس امارہ بالسوء ہیں اجمعین ہر دو گروہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کی طلب سے روگرداں ہیں۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

یا من ملکوت کل شیٔ بیدہ
طوبیٰ لمن ارتضاك ذخرا لغدہ
ایں بس کہ دلم جز تو ندارد کامے
تو خواندہ بدہ کام دلم خواہ مدہ

ترجمہ: اے وہ ذات کہ جس کے قبضۂ قدرت میں جملہ ملکوت ہے مبارک ہو اسے جو تیری عطا پر خوش ہے مجھے بھی فخر ہے کہ میرا دل سوائے تیرے اور کسی سے وابستہ نہیں تم اس کی مراد پوری کرو یا نہ کرو۔

حضرت مغربی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

نیست در باطن ارباب حقیقت جز حق
جنت اہل حقیقت بحقیقت اینست

ترجمہ: اربابِ حقیقت کے باطن میں سوائے حق کے اور کچھ نہیں اہل حقیقت کی حقیقی جنت یہی ہے۔

سبق: جب تمہیں حقیقت حال معلوم ہوئی اور راز کی بات سمجھ میں آئی تو ہر حال اور خیال سے اپنے تعلقات کو منقطع کر کے واصل باللہ ہو جا اور انسان کا حقیقی مقصد تو یہی ہے اور بس۔

تفسیر عالمانہ وَكُلًّا یہ نقص کا مفعول بہ ہے۔ اس کا تنوین مضاف الیہ محذوف کا عوض ہے در اصل کل بناد و خبر تھا نَقُصُّ عَلَيْكَ یعنی ہم ہر واقعہ اور خبر کی آپ کو خبریں دیں گے مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ لفظ کا بیان ہے یا لفظ کل کے مضاف الیہ کی صفت ہے۔ یہ لفظ کل کی صفت نہیں ہو سکتی کیونکہ فصاحت کل کے مضاف الیہ کی صفت بنانے میں ہے اور من تبعیضیہ ہے مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ یہ کلًّا کا بدل یا اس کے مضاف الیہ کی صفت ہے۔ لیکن اقویٰ یہ ہے کہ یہ کلًّا کے مضاف الیہ محذوف کی صفت ہے اور وہ نقص کا مفعول مطلق ہے کہ در اصل کل اقتصاص نقص الخ تھا۔ یعنی ہم آپ کو انبیاء علیہم السلام کی خبروں کے بھلے طریقے و اسلوب بیان فرماتے ہیں ما نثبت الخ نقص کا مفعول ہے یعنی ان خبروں سے آپ کے دل کو ہم مضبوط کرتے ہیں تاکہ آپ کے یقین میں اضافہ اور ان سے آپ کا جی

نوش ہوگا جبکہ آپ کو آگاہی ہوگی کہ مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ان کی قوم نے ایسے کیا۔
نکتہ : عام قاعدہ ہے کہ انسان جب کسی مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر جب دیکھتا ہے کہ اس کے غم اور تکلیف میں شریک ہیں تو اس سے محزون و ملال کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے جیسے اہلِ عرب کا مقولہ ہے کہ :

البلیة اذا عمت خفت وطابت۔

مصائب جب عام ہو جائیں گے تو ہلکے ہو کر جی کو خوش لگتے ہیں۔

(جیسے دن کو بھوکا پیاسا رہنا نفس کے لیے ایک مصیبت ہے لیکن جب دوسرے لوگوں کو اپنی طرح بھوکا پیاسا دیکھتا ہے تو اسے تکلیف محسوس نہیں ہوتی یہ ان حضرات کے لیے ہے جو روزے کے راز سے آشنا نہیں)

فائدہ صوفیانہ : حضرت قاشانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح القصیدہ التائیہ میں لکھا کہ قلب کا ایک چہرہ ہے جو روح کی طرف متوجہ ہے اسے اہلِ حقیقت فؤاد سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں مشاہدۂ جمالِ حق کا مرکز یہی فؤاد ہے۔ کما قال سبحانہٗ و تعالیٰ :

ماکذب الفؤاد ما رأی۔

اسی قلب کا ایک رُخ نفس کی طرف ہے اسے صدر (سینہ) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علوم کی صورتوں و شکلوں کا مرکز یہی مقام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فؤاد کا درمیانہ مقام عالمِ غیب میں رُوح کا عرش ہے جیسے عالمِ شہادت میں عرش جملہ کائنات کا قلب ہے۔

وَجَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ اور آپ کے پاس اسی سُورۃ میں حضرت عبداللہ بن عباس نے بصرہ کے منبر پر اس کی یہی تفسیر فرمائی۔ اور اکثر مفسرین نے اسی طرح فرمایا ہے **الْحَقُّ** وہ شے جو حق اور بیان صدق ہے۔

سوال : اس سورۃ میں مجئ حق کی کیا تخصیص ہے حالانکہ تمام سورتوں میں جو کچھ ہے وہ حق ہے اور ان کے تمام مضامین میں تدبر و تفکر اور ان پر یقین کرنا حق اور ان کے مقتضا کے مطابق عمل کرنا حق۔

جواب : اس کی سورۃ کی شرافت اور اس کی رفعت منزلت کا اظہار ہے۔

وَمَوْعِظَةٌ بہت بڑی نصیحت **وَّذِكْرٰی** اور تذکیر **لِلْمُؤْمِنِیْنَ** ○ اہلِ ایمان کے لیے۔ اہلِ ایمان کی تخصیص اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام و ایام (عقوبۃ و مثوبۃ) سے صرف وہی منتفع ہوتے ہیں۔

سوال : الحق کو معروف باللام اور موعظۃ و ذکرٰی الف ولام کے بغیر کیوں ؟

جواب : یہ فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ یہ موعظہ و پند بھی ہے اور حقانیت کی حالت اولیٰ میں یہی اوّل ہے باقی اس کے اُوپر قیاس کے طور وارد ہوتے ہیں اسی لیے اسے معرف باللام لایا گیا کہ وہ حروف پر بمنزلہ زیور کے ہے۔

سوال : فاعل پر ظرف کی تقدیم کیوں ؟

جواب : اس سورۃ کے منافع بیان کرنا مقصود ہے اور حق کے منافع بیان کرنا مطلوب نہیں اور نہ ہی دُوسری صورتوں میں

ان کے منافع بیان ہوئے اسی مقصد پر یہاں ظرف کو مقدم کیا گیا۔
وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ان اہلِ مکہ اور ان کے غیروں کو فرمائیے جو حق پر ایمان لاتے ہیں نہ اس سے پند و نصیحت پاتے ہیں۔ اِعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ ط کہ تم اپنے حال اور طریقے پر عمل کرو یعنی ایمان نہیں لاتے ہو تو نہ لاؤ۔ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۙ ہم اپنے حال اور طریقے پر عمل کرتے ہیں یعنی ایمان لاتے اور پند و نصیحت بھی حاصل کرتے ہیں وَ انْتَظِرُوْا ۚ وہ باتیں جو تمہیں شیطان سکھاتا ہے کہ اہلِ ایمان پر مصائب و تکالیف نازل ہوں گے تم ان کا انتظار کرلو اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ○ ہمیں کا ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جیسے کافروں پر نزول عذاب ہوا ان پر بھی ہوگا ہم اس کے منتظر ہیں۔ یہ آیت سیف سے منسوخ نہیں ہوئی۔ بلکہ اس میں کافروں کو تہدید کے طور فرمایا ہے۔
ف : دین و طاعت پر ثابت قدمی صرف اللہ تعالیٰ سے نصیب ہوتی اس میں کسی دوسرے کو دخل نہیں ہوتا اس لیے کہ تثبیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف مسند فرمایا ہے۔ یاد رہے کہ تثبیت دو قسم ہے :

۱۔ بلا واسطہ

۲۔ بالواسطہ

بالواسطہ کی مثال یہی آیت ہے۔ کما قال تعالیٰ :

ما نثبت به۔ یعنی رسل کرام کے قصوں سے ہم آپ کے قلب اطہر کو تثبت بخشا اور فرمایا،

یثبت اللہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت۔

اور بلا واسطہ کی مثال یہ ہے قال تعالیٰ ؛

ولولا ان ثبتناك لقد كدت تركن اليهم شيئاً قليلا۔

اور انزال سکینہ بھی بلا واسطہ ہوا کما قال ؛

فانزل اللہ سکینۃ علیٰ رسوله۔

اور فرمایا ؛

هو الذی انزل السکینة فی قلوب المومنین لیزدادوا ایمانا مع ایمانهم۔

ف : جیسے ایمان انزال سکینہ سے دل مضبوط ہوتا ہے ایسے ہی حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام و امم سابقہ کے واقعات و حکایات سے بھی دل مضبوط ہوتا ہے جیسا کہ مقولہ مشہور ہے ،

حکایات الصالحین جند من جنود اللہ تعالیٰ۔

نیک لوگوں کی کہانیاں اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں۔

ف : لیکن یہ تثبت ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کا ازلی نصیب روشن ہے۔ اور جو ازلی بدنصیب ہیں ایسے واقعات و حکایات سے

ان کے دل میں شک بڑھتا ہے اوران کے کفر میں اور اضافہ ہوتا ہے جیسے ابوجہل وغیرہ۔

ف : اللہ تعالیٰ نے ہر ایک میں لطف و قہر امانت رکھی ہے۔ جس پر لطف کا دروازہ کھولتا ہے اس پر قہر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور جس پر قہر کا دروازہ کھولتا ہے اس پر لطف کا درواز بند ہو جاتا ہے۔

مثنوی شریف میں ہے : ؎

ماہیانرا بحر نگزارد بروں
خاکیانرا بحر نگزارد دروں
اصل ماہی ز آب و حیوان از گلست
حیلہ و تدبیر اینجا باطلست
قفل زفتست و کشاینده خدا
دست در تسلیم زن اندر رضا

ترجمہ : مچھلیوں کو دریا سے باہر اور آدمیوں کو دریا کے اندر نہیں کیا جاتا۔ مچھلی کا اصل پانی اور حیوان کا اصل مٹی ہے۔ اسی لیے اس کے برعکس ہر دو کو اسباب کیسے موافق ہو سکتے ہیں۔ "تالے بند ہوں تو انھیں اللہ تعالیٰ کھولتا ہے اس لیے ہمیں سوائے تسلیم و رضا کے اور کچھ نہ کرنا چاہیے۔

تفسیر صوفیانہ جس پر لطف کا دروازہ کھلتا ہے اسی دروازے سے اس کے لیے حق آتا ہے کما قال ؛ **وجاءك الحق** یعنی تم اس دروازے میں حق کو لانے کی قدرت نہیں رکھتے اس لیے کہ لطف و قہر کے دروازے بند ہیں اوران کی چابیاں فتاح کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ انھیں سوائے فتاح کے اور کوئی نہیں کھول سکتا۔ جس پر اپنے لطف وکرم سے لطف کا دروازہ کھولتا ہے تو لطف وکرم بلاکیف وبلا این اس کے پاس آتا ہے **وموعظة وذكرى للمومنين** مومنین کو پند و نصیحت نصیب ہوتی ہے تاکہ وہ ہر شے میں اس کے لطف کے باب سے حق کو طلب کریں انھیں قہر کے دروازے سے حق کو طلب نہ کرنا چاہیے۔

؎

اطلبوا الارزاق من اسبابہا
ادخلوا الابیات من ابوابہا

ترجمہ : رزق اسباب کے ذریعے سے تلاش کرو اور گھروں میں دروازوں سے داخل ہو۔

وقل للذین لا یؤمنون اوران لوگوں سے فرمائیے جو طلب و وجدان پر ایمان نہیں رکھتے **اعملوا علیٰ مکانتکم** طلب مقاصد میں قہر حق کے دروازے سے تم اپنا کام کیے جاؤ **انا عاملون** ہم باب لطف الٰہی سے طلب حق کیے جاتے ہیں۔

وانتظروا تم باب قہر سے قہر حق کا انتظار کرو انا منتظرون ہم باب لطف سے وجدان حق کے منتظر ہیں۔

ف: اہلِ تحقیق فرماتے ہیں کہ وجودِ عینی علم الٰہی کے تابع ہے اور علم الٰہی معلوم کے تابع ہے اور افرادِ انسان کے ہر فرد کے لیے عین ثابتہ کو معلوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر فرد نے اسی مرتبہ (یعنی جب وہ اعیان ثابتہ تھے) میں مالھم و ما علیھم لسان استعداد کے ساتھ سوال کیا۔ اب عالمِ دنیا میں ان کا اعمال قہریہ پہ چلنا اور باب جلال الٰہی کھٹکھٹانا اسی پہلی استعداد اور اسی ازلی تقاضا و سوال کی وجہ سے ہے۔ یہی اہلِ لطف و جمال کا حال ہے۔

ف: جیسے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی نصرت فرماتا ہے ایسے ہی اولیاء و صالح المومنین کی نصرت کرتا ہے اور ان پر لطف و کرم کا دروازہ کھولتا ہے اور ان کی تائید و تثبیت فرماتا اور ان کے مراتب کے مطابق انہیں پھسلنے سے بچاتا ہے بلکہ ان کے قلوب سے درد و الم دور فرماتا ہے۔ ان کے قلوب کا درد و الم یہ ہے کہ ان سے عیان کا فقدان ہو۔

حکایت حضرت شبلی کے زمانے میں ایک نوجوان کو کسی وجہ سے سو کوڑے مارے گئے۔ وہ خاموشی سے کوڑے کھاتا رہا جونہی آخری کوڑا پڑا تو چلا اٹھا۔ جب وہ فارغ ہو کر چلا تو شیخ شبلی اس کے پیچھے ہو لیے تنہائی میں ماجرا پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ننانوے کوڑے کھاتا رہا تو یار کے جلوے سامنے تھے اس آخری کوڑے سے جلوے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میری چیخ نکل گئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس کا چیخنا کوڑے کے درد سے نہیں بلکہ یار کا جلوہ پوشیدہ ہونے کی وجہ سے تھا۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

ہر کجا باشد شہ ما را بساط
ہست صحرا گر بود سم الخیاط
ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ
جنتست آں گرچہ باشد قعر چاہ

ترجمہ: جہاں ہمارے بادشہ کا قیام ہوگا وہ جنگل بھی باغ و بہار ہوگا۔ جہاں یوسف جیسا قیام فرما ہو تو کنویں کی گہرائی بھی باغِ جنت بن جاتی ہے۔

ف: خلاصۃ المرام اینکہ بندے پر لازم ہے کہ ہر وقت جلوۂ حق میں محو و مستغرق رہے۔

تفسیر عالمانہ وَلِلّٰهِ یہ لام اختصاص کی ہے غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الغیب دراصل مصدر ہے اور مصدر کی اضافت صیغہ عموم سے ہوتی ہے اور یہ اضافت بمعنے فی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمینوں میں جو شے غیب ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے بندوں سے اس کا علم مخفی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے علم کی یہ شان ہے تو پھر تمہارے اعمال اس سے کیسے پوشیدہ ہو سکتے ہیں وَاِلَيْهِ اور اسی اللہ تعالیٰ کی طرف يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ یرجع بضم الیاء و فتح الجیم بمعنے یرد لوٹائے جاتے ہیں۔ و بفتح الیاء و کسر الجیم بمعنے یعود لوٹتا ہے یعنی قیامت میں جملہ امور اللہ تعالیٰ کی

طرف لوٹائے جائیں گے ایسے ہی اے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ کے اور کفارِ مکہ کے جملہ امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹیں گے وہاں پر اللہ تعالیٰ کفار کو سزا دے گا اور آپ کے ماننے والوں کو اجر اور ثواب فَاعْبُدْهُ کا اسی لیے آپ صرف اس کی عبادت و اطاعت کیجئے اور امرِ توحید پر استقامت فرمائیے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ اور اسی پر توکل کیجیے اور اپنے جملہ امور اسی کے سپرد فرمائیے اسی لئے وہی آپ کو کافی ہے اور کفار کے جملہ شرور سے آپ کو وہی محفوظ فرمائے گا۔ آپ کھلے دل سے اس کے بھیجے ہوئے احکام کی تبلیغ کیجیے۔ کسی کی عداوت و شرارت اور سفاہت کو دل میں نہ لائیے۔ توکل کو عبادت کے بعد ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ وہ توکل بیکار ہے جو عبادت کے بغیر ہو وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کردار سے بے خبر نہیں۔ تمہارے اور کفار کے تمام اعمال کو جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے عمل کو جانتا ہے اسے غفلت و سہو کیسی جبکہ اس پر آسمان و زمین کا ذرہ ذرہ پوشیدہ نہیں اسی لیے ہر ایک کو عمل کے مطابق جزاو سزا دے گا۔

ف : کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ توراۃ کی سورۂ انعام بھی اسی آیت و للہ غیب السمٰوٰت والارض الخ پر ختم ہوتی ہے۔

علمِ غیب کی تصدیق

ہمارا عقیدہ ہے کہ غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انبیاء و اولیاء کو وحی و الہام کے ذریعے علمِ غیب عطا فرماتا ہے۔ صاحب روح البیان کا عقیدہ ہے کما قال تعالیٰ :

اعلم ان علوم الغیب بالذات مختص باللہ تعالیٰ واما اخبار الانبیاء والاولیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین فبواسطۃ الوحی والالہام و تعلیم اللہ تعالیٰ۔	ذاتی علوم غیب اللہ تعالیٰ سے خاص ہیں ہاں اولیاء اور انبیاء علیہم السلام کو بواسطۂ وحی الہام غیب کی خبریں دیتا ہے (اسے ہم اہلسنت علمِ غیب عطائی سے تعبیر کرتے ہیں) (ولکن الوہابیۃ قوم لا یعقلون)

(روح البیان ج ۴ ص ۲۰۵ تحت آیت ہذا)

حضور علیہ السلام کے لیے علمِ غیب کے دلائل از صاحب روح البیان

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب کی بے شمار خبریں دیں :

۱۔ عشرہ مبشرہ کے بہشتی ہونے کی خبر

۲۔ بیشتر صحابہ کرام و آنے والے بے شمار لوگوں کے حالات بتلائے۔

۳۔ حضرت محمد بن کعبؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج سب سے پہلے اس دروازے سے آنے والا انسان بہشتی ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اس دروازے سے تشریف لائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا آپ کو مبارک ہو کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بہشتی فرمایا ہے۔ لیکن ہمیں بتائیے کہ آپ ایسا کون سا عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کو حضور علیہ السلام نے بہشتی فرمایا ہے۔ انہوں نے فرمایا ، میں تو ایک کمزور سا انسان ہوں میرے ہاں کون سا نیک عمل ہوگا البتہ مجھے یقین ہے کہ میرا یہی عمل قبول ہو گا کہ

میں کسی کے متعلق دل میں بُغض و کینہ نہیں رکھتا اور نہ ہی لغویات میرے منہ سے نکلتے ہیں۔
۴۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامات کو ایک ایک کر کے بتایا۔
۵۔ قربِ قیامت میں جتنے نئے نئے مذاہب نکلیں گے ان سب کے طریقے اور علامات بتائیں۔
۶۔ آخری دَور میں نماز پڑھنے کی کمی، اور
۷۔ شہوات کی اتباع کی خبر دی۔

ثبوت علم غیب برائے ولی اللہ

سید الطائفہ حضرت سیدنا جنید بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے ماموں حضرت سری سقطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرو۔ میں چونکہ اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا اس لیے میں خاموش رہا۔ ایک شبِ جمعہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں زیارت سے مشرف فرمایا اور فرمایا کہ اے جنید! وعظ کیا کرو۔ میں بیدار ہو کر اپنے ماموں کے ہاں پہنچا تو انہوں نے فرمایا تو نے میری تصدیق نہ کی۔ بالآخر ارشادِ گرامی ہُوا تو میں نے لوگوں کو وعظ سنانا شروع کیا۔ ایک دن ایک نصرانی نوجوان میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور اعتراض کے طور پر کہنے لگا، اے جنید! اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله (یعنی مومن کی فراست سے ڈرو اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے) کا کیا مطلب ہے؟ جنید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے ذرا سر کو جھکایا پھر سر اٹھا کر میں نے کہا مسلمان ہو جا۔ اب تیرے اسلام لانے کا وقت ہے۔ یہ سُن کر وہ نوجوان فوراً مسلمان ہو گیا۔

ف: اولیاء کرام کا لوگوں کے مخفی حالات سے باخبر ہو جانا اللہ تعالیٰ کے مطلع فرمانے کے بغیر مشکل ہے ورنہ ہر ولی اور ہر نبی اپنے غیر کے حالات میں متحیر ہے جیسا کہ حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

اے تو آں فضولی و بوالعجبی
از من چہ نشان عافیت می طلبی
سرگشتہ بود خواہ ولی خواہ نبی
در وادیٔ ما ادری ما یفعل بی

ترجمہ: اے تو الفضول و بوالعجب ہے مجھ سے عافیت کا مطالبہ کیسا جبکہ تمام انبیاء و اولیاء ما ادری ما یفعل بی کی وادی میں حیران و سرگرداں ہیں۔

توکل کا معنیٰ

جمیع امور میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا نام توکل ہے اس کا مرکز قلب ہے ظاہری اسباب کو بروئے کار لانا قلب کے توکل کے منافی نہیں۔ جب بندے کے قلب کو یقین ہو کر ہر کام تقدیرِ ربانی کے تحت ہوتا ہے اس لیے کہ جب اسباب کو بروئے کار لانے کے باوجود کام نہ بنے تو یقین کر لینا چاہیے کہ تقدیر کا حکم ایسے ہی ہے۔

سبق: بندگانِ خدا پر واجب ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اسی پر بھروسہ رکھیں۔ انسان کو جاہ و جلال

اور عقل وفہم اور اولاد اور مال واسباب پر سہارا نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق اور مرزوق کا رازق ہے۔

حدیث شریف ۱ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہر کھیتی اور درخت کے ہر پھل پر لکھا ہوتا ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم: ھذا رزق فلان بن فلان (یہ فلاں بن فلاں کا رزق ہے)

حدیث شریف ۲ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا رزق ان کے اجساد کی تخلیق سے ہزار سال پہلے پیدا فرما کر رزق کو آسمان و زمین کے درمیان پھیلا دیا پھر ہوا نے ان کے رزق کو مشارق ومغارب کے کونے کونے تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کا رزق ہزاروں مقامات پہ ہوتا ہے، بعض کا ایک سو اور بعض کا صرف ایک گھر میں۔ جسے وہ وہاں سے صبح وشام آکر لے جاتا ہے۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

حرص چہ ورزی کہ نبودت او سود

ہیچ دو شش کرد دو ہشت تو نہ

رنج طلب را ہمہ بر خود بگیر

یطلبك الرزق کما تطلبه

ترجمہ: حرص کیوں کر رہا ہے یہ تجھے کوئی فائدہ نہ دے گی رنج طلبِ رزق کا کیوں اٹھاتا ہے تجھے رزق ایسے ڈھونڈتا ہے جیسے تم اسے تلاش کرتے ہو۔

ف: مقام توکل میں توکل اور مقامِ رضا میں رضا اور مقامِ فنا میں فنا ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے فرمایا کہ عبادت کے انواع اگرچہ کثیر ہوں لیکن درحقیقت عبادت یہ ہے کہ انسان اپنی عاداتِ قبیحہ اور خواہشاتِ نفسانیہ کو ترک کر کے اور جہاں تک ہو سکے نفس کو مجاہدات میں ڈال کر ہر وقت اس کے خلاف کرے اور ماسوی اللہ سے انقطاع اختیار کرے یہاں تک کہ بندہ مقامِ عبادت سے نکل کر مقامِ عبودیت میں پہنچ جائے اور کمال توحید کے بغیر یہ مرتبہ حاصل نہ ہوگا اور کمال توحید مداومت علی العبادات وملازمت علی ذکر اللہ اور جمیع حالات نصیب ہوگی۔ ؎

یا رب ز کون بے نیازم گردان

و از افسر فقر سر فرازم گردان

در راہ طلب محرم رازم گردان

زان رہ کہ نہ سوئے تست بازم گردان

ترجمہ: اے اللہ مجھے دونوں جہانوں سے بے نیاز فرما اور فقر کے تاج سے مجھے سرفراز فرما۔ اپنی طلب کی راہ میں مجھے محرم راز بنا۔ مجھے اس راہ سے ہٹا دے جو تیرے ہاں نہیں پہنچتا۔

اور اللہ تعالیٰ توفیق کا مالک ہے اور یقیناً تمام عواقب اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

حضرت اسماعیل حقی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سورۂ ہود ہفتے کی سحر کے وقت ۲۴۔ ربیع الاول شریف ۱۱۰۳ھ کو ختم ہوئی۔

فقیر قادری ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہ اس کے ترجمہ سے ۱۷ محرم الحرام ۱۳۹۷ھ بروز ہفتہ بوقت اشراق فارغ ہوا۔ بفضلہٖ وکرمہٖ تعالیٰ وبطفیل حبیبہٖ الاعلیٰ و بوسیلہ غوث الوریٰ وسائر الاولیاء فصلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسولہ خیر خلقہ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ واولیاء امتہٖ وعلماء ملتہٖ اجمعین۔

تحریر ہٰذا غریب کدۂ فقیر میں اختتام پذیر ہوئی۔

بہاول پور۔ پاکستان

کتبہ محمد شریف عابد گل ساکن کریال کلاں ضلع گوجرانوالہ، براستہ شیخوپورہ

سورۃ یوسف

سُوْرَۃُ یُوْسُفَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اِحْدٰی عَشْرَۃَ اٰیَۃً وَّ اثْنَا عَشَرَ رُکُوْعًا
الٓرٰ قف تِلْكَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ②
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ق وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ
لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ③ اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ④

ترجمہ : یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔ بے شک ہم نے قرآن مجید عربی میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو ہم آپ کو سب سے بہتر قصہ بیان کرتے ہیں اس لیے کہ ہم نے آپ کی طرف اس قرآن شریف کی وحی بھیجی اگرچہ بیشک آپ اس سے پہلے بے توجہ تھے۔ جب یوسف علیہ السلام نے والد گرامی سے عرض کیا ؛ ابا جی ! میں نے خواب میں گیارہ تارے اور ایک سورج اور ایک چاند دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

تفسیر عالمانہ سورۃ یوسف مکیہ ہے اس کی ایک سو گیارہ آیات ہیں یہی قول مضبوط ہے۔

فضائل سورۃ یوسف حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ یوسف اپنے غلاموں کو سکھاؤ اس لیے کہ جو کوئی یہ سورۃ اپنے اہل کو سکھاتا پڑھاتا ہے اسی طرح اپنے ماتحت لوگوں کو سکھائے پڑھائے تو اللہ تعالیٰ اس پر سکرات الموت آسان فرمائے گا اور اسے ہر طرح کی قوت و طاقت بخشے گا اور نہ وہ کسی پر حسد کرے گا۔ (کذا فی تفسیر التبیان)

ف : اس کی وجہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے حسد اور کنویں اور قید کی سختیوں میں مبتلا ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاں جبریل علیہ السلام کو بھیج کر تسلی دی اور انہیں شدائد و مصائب سے نجات دلا کر مقامِ اُنس عطا فرمایا اور انہیں حضوری نصیب ہوئی، پھر انہیں قوت و طاقت اور عزت اور سلطنت عطا ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ یوسف علیہ السلام کو بہت بڑی تکالیف کے بعد سکون و قرار نصیب ہوا، پھر جو بھی سورۂ یوسف کی تلاوت پر مداومت کرتا ہے تو

اسے یوسف علیہ السلام کی طرح عزت وسکون اور راحت نصیب ہوگی۔ (کذا قال ابن عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ)

۲۔ سورۂ یوسف کے پڑھنے والا ہر طرح کی راحت وفرحت سے نوازا جاتا ہے۔ (کذا فی التفسیر الکواشی)

ہم اللہ تعالیٰ سے ہر مصیبت وتکلیف سے سکون وآرام اور فرحت کا سوال کرتے ہیں۔

شانِ نزول رؤساءِ مشرکین نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آلِ یعقوب (علیہ السلام) شام سے مصر کی طرف کیسے منتقل ہوئی اور یوسف علیہ السلام کا مکمل قصہ کس طرح ہے۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

الٓرٰ معنی انا اللہ اریٰ واسمع سوالھم ایاك عن ھذا القصہ۔ میں ان کو دیکھ رہا تھا جبکہ وہ آپ سے اس قصہ کے متعلق پوچھتے تھے یا یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کے حسد کی کارروائی اور ان کے جملہ معاملات کو دیکھ رہا تھا یا یہ معنیٰ ہے کہ میں ان جملہ امور کو دیکھتا ہوں جسے مخلوق دیکھتی ہے یا نہیں دیکھتی۔ بعض نے کہا کہ الٓرٰ کا کوئی اعراب نہیں یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے دراصل یہ عبارت یوں تھی: ھٰذہ السورۃ الٓرٰ یعنی یہ سورۃ الٓرٰ سے موسوم ہے۔

ف: صاحبِ روح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا:

الحروف المقطعہ من الاسرار المکتومۃ التی یحرم افشاءھا لغیر اھلھا۔	حروف مقطعہ اسرار مکتوم سے ہیں ان کا نااہل کو ظاہر کرنا حرام ہے۔

(ص ۲۰۷، ج ۴، تحت آیت ہٰذا)

بعض بزرگوں کے نزدیک یہ حروف (مقطعات) متشابہات قرآنیہ سے ہیں، ان کے معنی صرف اللہ جانتا ہے۔ ان کے متعلق احسن طریقہ یہ ہے کہ خود ان کے معانی کے درپے نہ ہو بلکہ ان کے معانی ان کے اہل کی طرف لوٹا دے۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ ان کے اسرار ورموز سے اللہ والے واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ صاحبِ روح البیان قدس سرہٗ نے لکھا:

ولیس ببعید من کرم اللہ تعالیٰ ان یفیض معانیھا علی قلوب الکمل لکن یرمزون بھا ویشیرون بغیر تصریح بحقائقھا صونا للعقول الضعیفۃ وحفظا للعھد الماخوذ منھم۔	اللہ تعالیٰ کے کرم سے بعید نہیں کہ کاملین کے دل پر ان کے معانی ظاہر کر دے لیکن یہ حضرات ان معانی کو اشاروں کنایوں سے ظاہر کرتے ہیں ان کے حقایق واضح طور نہیں بیان کرتے عقول ضعیفہ اس کے حامل نہیں اور ان سے اس قسم کا معاہدہ لیا جاتا ہے۔

(ص ۲۰۷، ج ۴، تحت آیت ہٰذا)

ؔ

قدر گوہر چہ گوھری داند
چہ نہی در دکان خردہ فروش

ترجمہ: موتی کی قدر گوہری جانتا ہے جوہر کسی کریانہ فروش کی دکان پر مت رکھو۔

ؔ

قیمت در گرانمایہ چہ دانند عوام
حافظا گوھر یکدانہ مدہ جز بخواص

ترجمہ: قیمتی چیز کا عوام کو کیا پتہ، اے حافظ! گوہر صرف خواص کو دیے جاتے ہیں۔

ف: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ اسرار جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے، اگر آج بیان کروں تو لوگ مجھے بہت بڑا جھوٹا کہیں گے اور بہت بڑا فاسق۔ (معاذ اللہ) (کذا فی شرح المثنوی)

حضرت شیخ عطار قدس سرہٗ نے فرمایا: ؔ

دِلے پر گوھر از اسرار دائم
ولے اندر زبان مسمار دارم

حضرت مولانا قدس سرہٗ نے فرمایا: ؔ

ہر کرا اسرار کار آموختند
مہر کردند و دہانش دوختند

ترجمہ: جسے اسرار سکھاتے ہیں اس کے منہ پر مُہر لگا دیتے ہیں۔

ازالۂ وہم ان حروف (مقطعات) کی وضع لغوی اور معنی عرفی معلوم کے نہ ہونے سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت میں ان کے معانی حقیقۃً نہیں ہیں اس لیے کہ ان کا واضع خود اللہ تعالیٰ ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے اس کے معانی معلومہ ان لوگوں کے لیے وضع کیے ہوں جو اس کے کامل اور خالص بندے ہوں بلکہ یہی احتمال قوی ہے اس لیے کہ ہمارے دادا آدم علیہ السلام پر وحی حروف تہجی کے ساتھ نازل ہُوئی تھی جیسے ان کے حروف تہجی کی وحی کے معانی معلومہ تھے لیکن صرف ان کے لیے ایسے ہی یہ حروف (مقطعات) حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی نازل ہُوئے ہیں بنا بریں ان کے معانی بھی وہی جانتے ہیں یا خاص اور کامل اولیاءِ کرام۔ اگرچہ بعض علماء نے یہ بھی فرمایا کہ یہ حروف کسی گنتی کے لیے علیٰ طریقہٖ تحدید نازل ہُوئے ہیں۔ ان کے اسی قول سے مذکورہ بالا دلیل اور مطلب واضح اور قوی تر ہے۔

حدیث شریف مع شرح: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج کو میرے رب تعالیٰ نے مجھ سے

چند سوالات کیے تو میں ان کے جوابات نہ دے سکا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا بے کیف و بے مثیل قدرت کا ہاتھ میرے مونڈھے پر رکھا ہم نے ہاتھ کو بے مثیل اور قدرت کا ہاتھ اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ و دیگر اعضاء سے منزہ اور پاک ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا:

فوجدت بردها فاورثني علوم الاولين والاخرين وعلمني علوما شتى فعلم اخذ علي كتمانه اذ علم انه لا يقدر على حمله غيري وعلم خيرني فيه وعلم امرني بتبليغه الى العام والخاص من امتي۔

میں نے اس کی ٹھنڈک محسوس کی اس سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اولین اور آخرین کے علوم کا وارث بنایا ہے اور مختلف علوم بخشے بعض ایسے ہیں جن کا مجھ سے معاہدہ لیا گیا کہ کسی کو نہیں بتانا بعض وہ جن کا مجھ کو اختیار دیا اور بعض وہ جن کے متعلق ہر عام خاص کو بتانے کا حکم ہے۔

(روح البیان ص ۲۰۸ ج ۴ تحت آیت ہذا)

ف: من امتی سے انس وجن و ملائک مراد ہیں۔ کذا فی انسان العیون)

سوال: تلك، اس کا اشارہ بعید کی طرف ہوتا ہے یہاں پر بُعد کیسا۔

جواب: چونکہ مرسل سے مرسل الیہ کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے اسی بُعد کی وجہ سے تلك لایا گیا ہے۔

جواب۲: اس کا اشارہ معہود فی الذہن کی طرف ہے اور ذہن اور محسوس مشاہدہ کے درمیان فاصلہ کی وجہ سے تلك لایا گیا ہے۔

ف: تلكَ مبتدا ہے، اس کی خبر اٰیٰتُ الْکِتٰبِ ہے۔ الکتٰب سے یہاں پر قرآن مجید مراد ہے۔

الْمُبِیْنِ ○ ابان بمعنی بانَ یعنی وضح و ظہر سے مشتق ہے یعنی یہ آیات اس کتاب کی ہیں جن کا معاملہ ظاہر اور واضح ہے اس لیے کہ یہ منجانب اللہ ہیں۔ اور جو شے منجانب اللہ ہو وہ ظاہر اور واضح ہوتی ہے یا یہ بوجہ اعجاز واضح ہیں، یا مبین بمعنی بین و واضح ہے اس لیے کہ اس کے اندر احکام و شرائع کے علاوہ ملک و ملکوت کے اسرار و رموز مضمر ہیں بلکہ دونوں عالم کے اسرار و رموز کے علاوہ بہت بڑی حکمتوں و معارف و قصص کا مجموعہ ہے۔

ف: بحر العلوم میں ہے کہ الکتٰب المبین سے لوحِ محفوظ مراد ہے اور اسے المبین اس لیے کہا گیا کہ اس سے ہی قرآن مجید لکھا گیا اور ماکان و مایکون کے علوم اس سے ظاہر ہیں اور اس پر نگاہ رکھنے والے کاملین اولیاء واضح طور بیان فرماتے ہیں۔

ربط: پہلے کتاب کے ذاتی شرف کو بیان کیا گیا اب اس کے صفاتی کمال کو بیان کیا جاتا ہے۔

کما قال اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ بے شک ہم نے اس کتاب کو نازل فرمایا جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے علاوہ اور بھی متعدد قصص موجود ہیں قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا وہ کتاب یعنی قرآن مجید تمہاری لغت میں ہے۔ "عربیًّا" قرءٰنًا کی صفت ہے

یاد رہے کہ یہ صفت بوجہ نسبت کے ہے۔ یہ اس کی صفت لازمی نہیں اس لیے کہ قرآن مجید نزدل فی العرب سے پہلے کا ہے۔ پھر جب یہ عرب میں نازل ہوا تو اسے عربیاً کہا گیا ہے۔ (کذا فی الکواشی) اور قرآن حال موطئہ ہے یعنی یہ حال عربیا کے لیے توطیہ کے طور آیا ہے اس لیے کہ قرآن مجید فی نفسہٖ کسی کی ہیئت نہیں بیان کرتا بلکہ عربیاً کے ساتھ مل کر ہیئت بیان کر رہا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اسم جامد خود صفت سے موصوف ہونے کا محتاج ہے اور یہاں پر عربیًا سے اسے موصوف کیا گیا اور اس نے صفت کا بھلا کیا کہ اس کے لیے حال بننے کا راستہ گھڑ دیا۔ اگر وہ حال نہ بنتا تو اس کی صفت واقع ہوتی اسی لیے اسے حال موطئہ کہا جاتا ہے۔ (کذا فی شرح الکافیہ للعلامہ جامی)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ تاکہ تم قرآن مجید کے معانی کو سمجھ سکو اور جو اس کے اندر اسرار ہیں ان کا احاطہ کر سکو۔ اور مطلع ہو سکو۔ اگر عربی میں نازل نہ ہوتا تو سمجھنا مشکل تھا اس لیے یہ خالق قوی سے نازل ہوا۔

ف : العقل بمعنی ادراک معنی الکلام۔

سوال : اللہ تعالیٰ کا ہر فعل علت سے پاک ہے اور یہاں، یہ فعل معلل کیوں؟

جواب : یہ علت تشبیہ و استعارہ کے طور پر ہے ورنہ صحیح یہی ہے کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں : فعال اللہ لا تعلل بالاغراض۔

جواب ۲ : لفظ لعل ارادہ کے معنی میں استعارہ مستعمل ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اس ارادہ پر نازل فرمایا ہے تاکہ عرب والے سمجھ سکیں اور جس کی قرآن مجید دعوت دیتا ہے اسے معلوم کر سکیں تاکہ قیامت میں نہ کہیں کہ قرآن مجید ہماری لغت پر نہیں اترا تھا اسی لیے ہم نے سمجھا نہ مانا، یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے کہ قرآن مجید ہماری زبان میں اترتا تو اس پر ایمان لاتے۔ کما قال لو جعلنا قرآناً اعجمیاً لقالوا لولا فصلت آیاتہ۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ الف سے اللہ اور لام سے جبرائیل اور را سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ قرآن مجید وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل فرمایا۔ حروف مقطعات محبوب کے اشارات ہیں جو اس نے اپنے محب کو اس لیے بتائے تاکہ محبوب تک پہنچنے کا راستہ معلوم کرے اس لیے قرآن مجید کو عربیۃ کا لباس پہنایا لعلکم تعقلون تاکہ تم قرآن کے معانی و اسرار و اشارات سمجھ جاؤ اس لیے کہ وہ قرآن مجید تمہاری لغت عربی میں نازل ہوا ہے جیسے ہم نے توراۃ کو لغت عبرانی میں اور انجیل کو لغت سریانی میں نازل کیا تھا تاکہ اس زمانہ کے لوگ اپنے مالک محبوب حقیقی کے ہاں پہنچنے کی راہیں سمجھیں۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام حروف و اصوات و لغات سے منزہ ہے لیکن چونکہ مخلوق کا سمجھنا حروف

واصوات پر موقوف ہے اسی لیے اسے حروف واصوات کا جامہ پہنایا گیا۔

مسئلہ: آیات میں عربی زبان کی شرافت کا ثبوت ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ تمام امم سابقہ ولاحقہ سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمزبان عربی افضل ہیں اس لیے کہ کلامِ الٰہی کے سب سے پہلے وہی مخاطب ہیں۔ اور ان کی شرافت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ دین عربی ہے۔

فضیلتِ عرب: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عربوں سے محبت کرو، اس کی تین وجہیں ہیں:

- میں عربی ہوں، قرآن مجید عربی ہے اور اہلِ جنت کا کلام بھی عربی ہوگا۔
- لواء الحمد قیامت کے دن میرے ہاتھ میں ہوگا اور اس جھنڈے کے قریب تر اہلِ عرب ہوں گے۔
- جب اہلِ عرب[1] کو ذلیل کیا جائے گا اس وقت اسلام کمزور ہو جائے گا۔

حدیث شریف: حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو پیدا فرمایا تو جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ مخلوق کو دو حصوں میں تقسیم کر دو: ایک عرب۔ دوسرے غیر عرب یعنی عجم۔ ان دونوں میں پسندیدہ اہلِ عرب ہیں۔ اس کے بعد اہلِ عرب کو دو حصوں میں منقسم کیا: (۱) اہلِ یمن (۲) مضر۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہل مضر پسندیدہ ہیں، ان کو دو حصوں میں منقسم کیا: (۱) قریش (۲) غیر قریش۔ ان میں قریش کو پسند کیا، ان قریشیوں میں وہ قبیلہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے جس میں مَیں پیدا ہوا ہوں۔ ؎

تازی یثربی لقب مکی ہاشمی نسب
معتکب سرائے وحی امی امتی سرائے

حضرت ابن العربی قدس سرہٗ کے فضائل ومناقب

صاحبِ[2] روح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا: چونکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم عربی ہیں اس لیے

---

[1] اس سے مراد خالص عربی ہیں نہ کہ دوسرے علاقوں کے، جو وہاں جا بسے ہیں۔

[2] یاد رہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت شیخ ابن العربی قدس سرہٗ کے ساتھ ہم اہلسنت کو عقیدت ہے اور آپ کی جملہ تصانیف ہمارے لیے قابلِ قدر ہیں لیکن افسوس کہ مودودی اور غلام خانی دیوبندیوں کے بعض متعصبین علماء شیخ موصوف پر نہ صرف طعن وتشنیع کرتے ہیں بلکہ انہیں گمراہ (ضال ومضل) کہہ دیتے ہیں۔ اگرچہ اشرف علی تھانوی "تنبیہ الطربی" نامی کتاب لکھ کر بعض دیوبندیوں کے منہ بند کیے ہیں لیکن عادت سے مجبور ہو کر بعض بدقسمت شیخ اکبر قدس سرہٗ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کیا نقصان ہے وہ اپنا بیڑا غرق کرتے ہیں۔ وقت ملا تو فقیر اس پر ایک مستقل کتاب لکھے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ فقط ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہٗ

آپ کے وارث اکمل بھی عربی ہیں یعنی حضرت الشیخ الاکبر والمسلک الاذفر والکبریت الاحمر محی الدین بن عربی قدس سرہ الاطہر ہم نے وارثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے کہا ہے کہ وہ خاتم الولایۃ الخاصہ المحمدیہ ہیں بلکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رتبہ کے مظہر اکمل ہیں۔ یہی فضیلت صرف انہی کو حاصل ہے اور حضرات کو یہ مرتبہ حاصل نہیں اگر کسی کو اس مرتبہ سے کچھ نصیب ہُوا ہے تو انہی کے طفیل اسی وجہ سے ہم لوگ ان کے ساتھ گہرا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اگر ان کے منکر کو یہ بات ناپسند ہے تو اپنے غیظ و غضب میں مرجائے۔ (نعوذ باللہ من سوء الاعتقاد)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ ہم آپ کو خبر دیتے اور بیان کرتے ہیں۔ یہ قص امر سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کی پیروی کرے اس لیے کہ جو حدیث شریف کو روایت کرتا ہے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے جسے اس نے پہلے تھوڑا تھوڑا کر کے یاد کیا یا پڑھا ہے اسی طرح قرآن مجید کے پڑھنے کو تلاوت سے تعبیر کرتے ہیں اس لیے کہ قرآن مجید پڑھنے والا یاد کیے ہُوئے آیات کے پیچھے لگتا ہے۔ اَحْسَنَ الْقَصَصِ یہ نقص کا مفعول ہے۔ قصص مصدر بمعنے مقصوص ہے یعنی ہم آپ کو بہترین قصہ بیان کرتے ہیں اس سے آلِ یعقوب کا قصہ مراد ہے۔ احسن القصص کہنے سے ظاہر یہ ہے کہ یہ احسن القصص اسی محاورہ سے ہے جو کہا جاتا ہے: فلان اعلم الناس و افضلھم۔ یہ اس کے لیے بولتے ہیں جو اپنے فن میں افضل و اعلم ہو۔ (کذا فی بحر العلوم)

ازالۂ وہم اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب کے بیانات سے بھی احسن ہے اسے جزوی طور احسن کہا گیا ہے جیسے ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اکبر من اختہا۔ یہاں بھی اسے جزوی طور پر اکبر کہا گیا ہے۔ (کذا فی حواشی سعدی المفتی)

② حضرت محی السنۃ قدس سرہٗ نے فرمایا کہ قصۂ یوسف علیہ السلام کو احسن القصص اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں عبرتوں، حکمتوں اور عجیب نکتوں جو دین و دنیا مثلاً بادشاہوں، غلاموں اور مکر نساء اور صبر علی اذی الاعداء پھر ان سے واگزار کرنا جبکہ اقتدار ہاتھ میں ہوگا کا بیان ہے۔

③ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام تمام بنی اسرائیل سے صورۃً ونسباً احسن تھے اس لیے ان کے قصہ کو اللہ تعالیٰ نے احسن القصص فرمایا ہے کما قال علیہ السلام ان الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام تمام وہ الفاظ جن سے کسی کے محامد بیان کیے جائیں ان سب سے لفظ کرم جامع ہے۔

④ یوسف علیہ السلام باوجود تین انبیاء علیہم السلام کے ابن ہونے کے مندرجہ ذیل فضائل کے جامع ہیں:

۱۔ شرف نبوت

۲۔ حسن صورۃ

۳۔ علم رؤیا

۴۔ ریاست دنیا
۵۔ قحط و تنگی سے رعایا پروری ایسا جامع فضائل و کمالات اور کون۔

⑤ چونکہ بہت بڑی بہترین دعاؤں سے افضل دعا آپ نے بارگاہِ حق میں عرض کردی کہ تا قال توفنی مسلما و الحقنی بالصالحین۔ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے نبی ہیں جنہوں نے موت کے وقت اللہ تعالیٰ کے دیدار کی تمنا کی۔ ؎

غافلاں از موت مہلت خواستند
عاشقاں گفتند نے نے زود باش

ترجمہ: غافل موت سے مہلت مانگتے ہیں بلکہ عشاق تو کہتے ہیں کہ بالکل زود تر ہو۔

⑥ آپ کی احسن تزویج ہوئی اس لیے آپ کے قصہ کو احسن القصص کہا گیا اور اس تزویج کے واقعہ میں عجیب نکات ہیں:

۱۔ فرقت	۲۔ صلہ
۳۔ وصلت	۴۔ قربت
۵۔ تلطیف	۶۔ تعنیف
۷۔ عشق	۸۔ عاشق
۹۔ معشوق	۱۰۔ حسن
۱۱۔ خلاص	۱۲۔ قید
۱۳۔ عبودیت	۱۴۔ عتق
۱۵۔ تعارف	۱۶۔ تناکر
۱۷۔ اقبال	۱۸۔ فرار
۱۹۔ نغمۃ	۲۰۔ جذبہ
۲۱۔ اشارہ	۲۲۔ بشارۃ
۲۳۔ تعبیر	۲۴۔ تفسیر
۲۵۔ تعسیر	۲۶۔ تیسیر وغیرہ

⑦ جو اسرار و رموز اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں درج فرمائے ہیں وہ کسی اور قصہ میں نہیں۔ اس میں لطیفے اور دیگر ایسے معاملات ہیں جن سے روح و جسم کو لذت محسوس ہوتی ہے۔

⑧ صاحبِ روح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اسے احسن القصص کہنے کا موجب سورۂ ہود کے قصے ہیں۔ اس سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مطلوب ہے۔

⑨ خود بھی اس قصہ میں محبت کی باتیں ہیں اور قاعدہ ہے جو شے محبوب ہو اس کے متعلقات بھی محبوب ہوتے ہیں اور جو شے فی نفسہٖ احسن ہوتی اس کی خبریں بھی احسن ہوتی ہیں۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

بس دلکش است قصۂ خوباں وزاں میاں
تو یوسفی و قصہ تو احسن القصص

ترجمہ: محبوبوں کا قصہ بہت خُوب، لیکن اے محبوبِ مدنی صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے یوسف بھی آپ ہیں اور ہمارے لیے احسن القصص بھی آپ کا قصہ۔

ف: حضور علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے درمیان فرق کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ۔

صوفیانہ بیان بعض بزرگ فرماتے ہیں کہ یہی پہلا قصہ ہے جو لفظاً وجیز تر اور معناً جامع ترین ہے، حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا ہے۔ دراصل اس قصہ سے اسرار الولایۃ والخلافۃ و اسرار روحانی وقلب وقویٰ کے رموز کا بیان ہے۔ اسی طرح نفسِ امارہ جو کہ اوّلاً زلیخا کے رنگ میں ظاہر ہُوا، پھر مسلمان ہو کر تزکیہ اور ایسی صفائی حاصل کی کہ مقامِ رضا تک پہنچا حالانکہ اس نے پہلے امارت کا قصد کیا لیکن جب سے روحِ یوسفی کی صحبت نصیب ہُوئی اور اس کے سامنے سر جھکایا تو کامل و اکمل بن گیا۔

صوفیانہ تقریر دربارہ احسن القصص تاویلات نجمیہ میں ہے کہ اس قصے کو احسن القصص کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسے انسان کے احوال سے مناسبت ومشابہت ہے۔ مثلاً انسان کے لیے ضروری ہے کہ رجوع الی اللہ اور وصال الٰہی کے لیے جد وجہد کرے اس لیے کہ روح وقلب وسر ونفس وحواس خمس ظاہرہ وقوائے ستہ باطنہ وبدنیہ سے اس کی ترکیب ہُوئی ہے اور اسے دنیا کے امور میں مبتلا ہونا ہے۔ اس ابتلاء میں کامیابی کے بعد انسان بہت بڑے مراتب وکمالات کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح قصہ ہذا میں یوسف کا اشارہ قلب اور یعقوب کا روح، راحیل کا نفس اور اخوت یوسف کا قویٰ وحواس کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ: قصہ ہذا میں قطع نظر عجائب وغرائب کفار کو مصلون کیا گیا ہے کہ وہ ایسے نااہل ہیں کہ وہ ایسے واقعہ سے کسی قسم کی نصیحت نہ حاصل کر سکے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

چوں کتاب اللہ بیامد ہم براں ۔۔۔ ایں چنیں طعنہ زدند آں کافراں
کہ اساطیر است و افسانہ نژند ۔۔۔ نیست تعمیقی و تحقیقی بلند
ذکر یوسف ذکر زلف و پرچمش ۔۔۔ ذکر یعقوب و زلیخائے غمش

ترجمہ: جب کتابِ الٰہی تشریف لائی تو کافروں پر اس پر بھی طعنہ زنی کی کہ یہ بناوٹی اور پُرانی کہانی ہے نہ اس میں تحقیق بات نہ کوئی گہرائی، صرف اس میں کہانیاں اس قسم کی ہیں کہ یوسف کے ساتھ اس کی زلفیں کیسی تھیں اس پر یعقوب اور زلیخا عاشق ہُوئی۔ وغیرہ

حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ نے کیا خوب فرمایا: ؎

کسے بدیدۂ انکار اگر نگاہ کند — نشان صورت یوسف دہد بنا خوبی
اگر بچشم ارادت نگہ کند در دیو — فرشتہ اش بنماید بچشم کروبی

ترجمہ: اگر نگاہِ انکار سے یوسف کو کوئی دیکھے تو کہے گا یوسف بہت قبیح تھا۔ اگر عقیدت سے کوئی شیطان کو دیکھے تو کہے گا کہ وہ تو نورٌ علیٰ نور ہے۔

بِمَآ اَوْحَیْنَآ نقص کے متعلق ہے اور ما مصدریہ بمعنی باتحاثنا اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اسی قرآن کو آپ کی طرف ہماری وحی بھیجنے کے سبب سے۔ وَاِنْ یہ مخففہ من المثقلہ ہے اور اس کا ضمیر شان ہے كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ اسی قرآن مجید کو بذریعہ وحی بھیجنے سے پہلے تھے آپ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝ غافلین (غیر متوجہ) میں سے۔ غفلۃ کسی شے کا دل میں تصور تک نہ ہونا یعنی وحی کے نزول سے پہلے نہ اس طرف آپ کا خیال تھا اور نہ ہی آپ کے کانوں میں اس قصّے کی آواز پہنچی یہ علت ہے اسی بیان کی کہ آپ کو یہ قصہ بذریعہ وحیٔ[1] معلوم ہے۔

فائدہ رفعت شانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضور علیہ السلام کے اس عدم علم کو غفلت سے تعبیر فرمایا تاکہ محبوب کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لاعلمی کی نسبت نہ ہو (کذا فی الارشاد) افسوس اس قوم پر کہ بہت سے مسائل میں آیات واحادیث پڑھ کر حضور علیہ السلام کو لاعلم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دیوبندیوں وہابیوں کا ردِّ بلیغ لیکن یاد رکھنا کہ اس غفلت سے وہ غفلت مراد نہیں جو ہم عوام (انسانوں) میں متعارف ہے یا عام انسانوں کو لاحق ہوتی ہے یوں کہو کہ اس غفلت کو خدا جانے یا اس کا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے کہ وہ اپنے حبیبِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن الفاظ سے یاد فرمائے اس کی مثال دوسری آیات میں ہے کما قال "ماکنت تدری ماالکتاب ولا الایمان" آپ کو کیا پتہ ہے کہ علمِ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔

---

[1] اٹکل پچُو سے نہیں اس سے اہل کتاب کو یقین دلانا مطلوب ہے کہ آخرالزمان یہی ہیں کہ آپ ہر بات وحی الٰہی سے بتاتے ہیں اپنی طرف سے من گھڑت کوئی بات نہیں بناتے ایسے ہی کفار و مشرکین کو بھی کہ وہ آپ کو ساحر وغیرہ سمجھتے لیکن اس سے وہابیوں دیوبندیوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے یہ لازم نہیں کہ نزول قرآن یعنی سورۃ ہٰذا کے نزول سے پہلے آپ کو علم نہ تھا یہ ان کا وہم گمان ہے۔ تفصیل تفسیر اویسی میں ہے۔

اور فرمایا "وَوَجَدَكَ ضَالًّا" - اور پایا آپ کو ضال (وارفتہ وغیرہ)
اس قسم کی اور آیات (جن کی تفصیل ہم نے تفسیر اویسی میں عرض کر دی ہے) اور اہل عرب کو بھی ایسے الفاظ سے حضور علیہ السلام کی طرف معمولی نقص و عیب کا وہم و گمان تک بھی نہیں گزرتا تھا۔ ہم مسلمانوں پر واجب ہے کہ ہم ایسے مقامات پر ایسے احسن طریق سے الفاظ ادا کریں جن میں ادب کا پہلو نکلے، تحریر و تقریر میں ایسے الفاظ استعمال کریں کہ جن میں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بے ادبی و گستاخی کا شائبہ تک نہ ہو پھر حضور علیہ السلام کے دورِ مبارک کو صدیاں گزر گئیں ان حضرات کے سادہ الفاظ میں بھی ادب و عقیدت کی بُو آتی تھی آج سیکڑوں سال گزارنے پر ادب و عقیدت اُٹھ گئی فلہذا سنبھل کے قدم رکھنا ضروری ہے[1]۔
اے اللہ! ہمیں ان لوگوں سے بنا جنہیں لطیف بیان کرنے کا طریقہ بخشا اور انہیں ہر امر و شان میں ادب کی توفیق بخشی (اِنَّكَ اَنْتَ الْمَنَّان) آمین۔

اِذْ قَالَ يُوسُفُ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم یوسف علیہ السلام کے عرض کے وقت کو یاد کرو۔

تفسیر عالمانہ ف: یوسف عبرانی لفظ ہے۔ اس لیے غیر منصرف ہے۔ (۱) عجمہ (۲) تعریف کی وجہ سے اگر یہ عربی ہوتا تو غیر منصرف نہ ہوتا۔

ف: 'عبرانی' ابراہیم علیہ السلام کی بولی تھی۔ جیسے سُریانی، حضرت آدم علیہ السلام بولتے تھے۔

ف: امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سُریانی 'سُریانہ' کی طرف منسوب ہے۔ 'سُریانہ' وہی علاقہ ہے جہاں طوفان سے پہلے نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم قیام پذیر تھی۔ ان سب کی بولی سُریانی تھی سوائے ایک مرد جرہم نامی کے کہ صرف وہی عربی بولتے تھے۔

اعجوبہ انوار المشارق میں ہے کہ اسف بمعنی غم و حزن اور اسیف بمعنی عبد، غلام۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں معنے یوسف علیہ السلام میں جمع ہوئے۔

لِاَبِيْهِ اپنے والدِ گرامی یعنی یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام۔

ف: جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے اشتقاق کے قائل ہیں اُن کے نزدیک یعقوب علیہ السلام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ اپنے بھائی عیص کے ساتھ اکٹھے پیدا ہوئے لیکن یہ چونکہ ان کے بعد پیدا ہوئے اس لیے ان کا نام یعقوب پڑ گیا۔ بعض نے کہا کہ پیٹ میں ہی دونوں کا جھگڑا ہو گیا کہ یعقوب علیہ السلام نے چاہا کہ وہ پہلے پیدا ہوں لیکن عیص نے روک لیا اور کہا کہ اگر تم پہلے گئے تو میں ماں کے پیٹ میں ایسی حرکت کروں گا جس سے والدہ مر جائے گی۔ یعقوب علیہ السلام کو یہ بات ناگوار گزری لہذا پیچھے ہٹ گئے

---

[1] صاحبِ روح البیان قدس سرہٗ نے اپنے زمانہ کی بات لکھی اور ہمارے تاریک دور کے تقاضے کچھ اور ہیں فلہذا ہمیں مزید احتیاط لازم ہے۔ فقیر اس غفلت کو عدمِ توجہ سے تعبیر کرتا ہے اور منصف مزاج قبول بھی کر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ٹرین میں کسی کہن سال دیوبندی سے گفتگو کی تو اس نے تدبر بسیار کے بعد مان لیا کہ واقعی یہاں یہی معنیٰ موزوں ہے۔ مزید تفصیل تفسیر اویسی میں ہے۔

اور عیص پہلے پیدا ہو گیا اور خود بعد کو تشریف لائے۔ اسی مناسبت سے آپ کو یعقوب کہا گیا۔ اور عیص کو اسی لیے اس نام سے پکارا گیا کہ اس نے نافرمانی کی اور یعقوب علیہ السلام سے لڑ جھگڑ کر پہلے آ گئے۔

ف: عیص کے بدن پر بال بہت زیادہ اور یعقوب علیہ السلام کے بدن پر بال بہت کم تھے۔ عیص والد کو محبوب تر تھا اور یعقوب علیہ السلام والدہ کو۔ عیص شکاری تھا اور یعقوب علیہ السلام بکریاں چرایا کرتے تھے۔

اسحاق علیہ السلام کی مستجاب دُعا

حضرت اسحاق علیہ السلام کو بڑھاپے میں کم نظر آتا تھا۔ ایک دن اپنے محبوب بیٹے عیص کو فرمایا کہ مجھے شکار کا گوشت کھلائیے تیرے لیے وہی دُعا کروں گا جو میرے والد گرامی نے میرے لیے نبوت کی دُعا فرمائی تھی۔

مسئلہ: ہر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ایک خصوصی دُعا مستجاب ہوتی ہے۔ ہر ایک نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا میں مانگ لی لیکن ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے آخرت میں مانگیں گے۔ یعنی شفاعت فرما کر سب کو بہشت پہنچائیں گے۔

والد کی شفقت سے یعقوب علیہ السلام نبی بنے

عیص شکار کرنے کے لیے چلا گیا تو یعقوب علیہ السلام کو والدہ نے فرمایا کہ آپ بکری ذبح کریں اسے بہترین پکا کر والد ماجد کی خدمت میں نہایت ادب اور احترام سے پیش کیجئے لیکن جلدی کیجئے تاکہ عیص پہنچ نہ جائے۔ اگر تیرے سے والد گرامی پوچھیں تو کہہ دینا کہ میں عیص ہوں ممکن ہے کہ حسبِ وعدہ دُعا فرمائیں تو نبوت تمہاری قسمت میں لکھی ہو۔ یعقوب علیہ السلام نے فوراً بکری ذبح کی، بہترین گوشت پکا کر دستر خوان میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ پیش کیا اور عرض کی: اباجی! تناول فرمائیے۔ آپ نے پوچھا: تم کون ہو؟ عرض کی: آپ کا بیٹا عیص ہوں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام نے انہیں ہاتھ پھیرا تو فرمایا: بظاہر تو تم عیص ہو لیکن تمہارے سے یعقوب کی خوشبو آتی ہے۔ (یہ قصہ اسرائیلیات سے معلوم ہوتا ہے ورنہ نبوت بھی دھوکہ سے، اور نبی کو دھوکہ، یہ کیسے۔)

صاحبِ رُوح البیان کا گمان

صاحبِ روح البیان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قصہ یوں ہے کہ خود بی بی یعقوب علیہ السلام کا تیار کردہ گوشت لائی اور عرض کیا کہ یہ گوشت آپ کے صاحبزادے نے بھیجا ہے اسحاق علیہ السلام کا تصور عیص کی طرف تھا، اسی لیے دُعا میں کہا "یا اللہ! جس نے گوشت بھجوایا ہے اس کی اولاد میں انبیاء و سلاطین پیدا فرما۔" اس دُعا سے یعقوب علیہ السلام کو بہرہ وری نصیب ہوئی اگرچہ بہ نسبت پہلے قول کے صاحبِ روح البیان کا یہ قول اچھا ہے۔ لیکن پھر نبی علیہ السلام کی طرف دھوکہ میں مبتلا ہونے کا مطلب نکلتا ہے اور یہ بھی ناموزوں ہے اگرچہ اسے عدمِ التفات سے تعبیر کیا جائے تب بھی بات نہیں بنتی اس لیے آنے والا قول اس کا رد کرتا ہے [1]

---

[1] ہم نے اس وہم کا ازالہ تفسیر اویسی میں کر دیا ہے۔

عیص کی اولادِ کثیرہ اور اسحاق علیہ السلام کی دُعاء

جب عیص شکار کر کے لوٹا تو عرض کی: ابا جی! شکار لے آیا ہوں۔ اس وقت اسحاق علیہ السلام کو حقیقت حال معلوم ہوئی کہ یعقوب علیہ السلام دعا لے گئے تو آپ نے عیص سے فرمایا کہ وہ وقت اب نکل گیا اور تیری دُعا یعقوب علیہ السلام لے گئے۔ اب میں تمہارے لیے دُعا کرتا ہوں کہ تمہاری اولاد مٹی کے ذرات کے برابر ہو گی۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ عیص کی اولاد بہت بڑھی۔ تمام روم انہی کی اولاد ہے۔

یعقوب علیہ السلام کی ہجرت

حضرت اسحاق علیہ السلام کنعان میں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مکہ معظمہ میں مقیم تھے جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی عمر ایک سو اسی سال کو پہنچی اور وقتِ وصال قریب ہُوا تو آپ نے یعقوب علیہ السلام کو علیحدگی میں فرمایا کہ آپ یہاں سے اپنے ماموں کے ہاں شام کے علاقہ کی طرف چلے جاؤ۔ اس لیے کہ جب سے تم نے نبوت کی دُعا کرائی ہے اُس وقت سے عیص کے دل میں ہے کہ وہ آپ کو قتل کر دے گا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرمان سے حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے ماموں لیا بن ناہز کے ہاں شام کے علاقہ کو ہجرت کر گئے اور وہاں ان کے ہاں اقامت پذیر ہو گئے۔

یعقوب علیہ السلام کے عقد نکاح کا قصہ

لیا بن ناہز کی دو لڑکیاں تھیں:

(۱) لایا، یہ بڑی تھی۔ (۲) راحیل، یہ چھوٹی تھی۔

یعقوب علیہ السلام نے ماموں سے ان میں سے ایک کے ساتھ نکاح کی درخواست کی۔ آپ کے ماموں نے فرمایا: آپ کے پاس کچھ مال و دولت ہے؟ آپ نے عرض کیا، نہیں۔ انہوں نے فرمایا، سات سال مہر کے عوض تم میرے ہاں ٹھہرو۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، سات سال خدمت کروں گا۔ لیکن نکاح میں راحیل دینی پڑے گی۔ آپ کے ماموں نے فرمایا: یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے ماموں کی سات سال بکریاں چرائیں۔ مدت ختم ہوئی تو بڑی لڑکی لایا کا نکاح یعقوب علیہ السلام سے کر دیا۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ماموں جان! آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے میں نے راحیل سے عقد کی گزارش کی تھی۔ ماموں نے فرمایا: بڑی لڑکی کو بٹھا کر چھوٹی سے کیسے نکاح کر دوں۔ اگر راحیل کے ساتھ نکاح کا ارادہ ہے تو سات سال اور خدمت کرو۔

مسئلہ: پہلے زمانہ میں دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا جائز تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہ حکم منسوخ ہُوا۔ یعقوب علیہ السلام نے مزید سات سال بکریاں چرائیں تب ان کا دوسرا نکاح راحیل سے ہُوا۔ یعقوب علیہ السلام کے ماموں نے اپنی دونوں صاحبزادیوں کے جہیز میں دو کنیزیں ساتھ دیں تاکہ ان کی صاحبزادیوں کی خدمت کریں۔ ایک کا نام زلفہ اور دوسری کا نام بلہنہ تھا۔ پھر ان دونوں بیبیوں نے یہ دونوں کنیزیں ہبہ کر دیں۔

یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے

یعقوب علیہ السلام کے چھ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی لایا سے پیدا ہوئے

ان کے نام یہ ہیں؛

۱۔ روبیل ۲۔ شمعون ۳۔ یہودا ۴۔ ونی ۵۔ لیجر ۶۔ زیالون

صاحبزادی کا نام دینہ تھا۔

زلفتہ کنیز سے دو صاحبزادے؛

۱۔ دان ۲۔ یفتالی

اور بلہتہ کنیز سے بھی دو صاحبزادے؛

۱۔ جاد ۲۔ آشر پیدا ہوئے۔

اور بی بی راحیل عرصہ تک بانجھ رہیں آخر میں حاملہ ہوئیں جن سے حضرت یوسف علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر اکانوے سال کو پہنچ چکی تھی۔ اس عمر میں آپ کا ارادہ ہوا کہ اپنے والد حضرت اسحاق علیہ السلام کے وطن کو لوٹیں اور اپنے تمام کنبہ کو ہمراہ لے جائیں۔

یوسف علیہ السلام کی چوری

جاتے وقت بی بی لایا نے یوسف علیہ السلام سے فرمایا کہ ہمارے والد کا ایک سونے کا بُت ہے اسے چوری کر کے لے آؤ۔ ہم ساتھ لے چلیں تاکہ اس سے اپنی حوائج و ضروریات پوری کر سکیں۔ یوسف علیہ السلام وہی بُت چوری اٹھا لائے۔ (یہ روایت اسرائیلیات سے ہے نہایت مخدوش ہے یوسف نبی سے چوری؟) معاذ اللہ۔

صاحبِ رُوح البیان کا جواب

صحیح قول یہ ہے کہ وُہ بُت یعقوب علیہ السلام کی نانی کا تھا جسے آپ کے ماموں نے اپنی لڑکی کے جہیز میں دیا تھا جسے وہ ساتھ لے گئے تھے۔ (یوسف علیہ السلام کی چوری کا قصہ غلط ہے)

بنیامین

اس اثناء میں عیص کا حسد یعقوب علیہ السلام کے متعلق ختم ہو چکا تھا۔

؎

کفر ایمان گشت و دیو اسلام یافت
آں طرف کان نور بے اندازہ یافت

ترجمہ: کفر ایمان سے بدل گیا۔ اسلام کا دشمن دل سے نکل چکا تھا جب دیکھا کہ اس طرف سے نور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

جب دونوں بھائی ملے تو معانقہ کیا۔ اسی ہجرت کے سال بی بی راحیل بنیامین سے حاملہ ہوئیں لیکن حضرت بنیامین کے پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئیں، اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام دو سال کے تھے اور یہی یعقوب علیہ السلام کو تمام

بچوں سے محبوب تر تھے۔

یوسف علیہ السلام کا خواب

جب یوسف علیہ السلام سات سال کے ہوئے تو ایک خواب دیکھا کہ دس بہت بڑے ڈنڈے زمین پر دائرہ کی شکل میں مرکوز ہیں ان میں ایک چھوٹا ڈنڈا ہے جو جھپٹ کر ان سب کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور سب پر غالب ہو جاتا ہے۔ یہی خواب والد گرامی کو سنایا تو والد گرامی نے فرمایا: بھائیوں کو مت بتانا۔ اس کے بعد ایک اور خواب جمعہ کی شب کو دیکھا اور وہ شب لیلۃ القدر تھی اس وقت یوسف علیہ السلام بارہ سال کے تھے یا سترہ سال کے۔ وہ خواب یہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے کہ یٰٓاَبَتِ مروی ہے کہ یوسف علیہ السلام اس شب کو والد گرامی کی گود میں آرام فرما رہے تھے کہ دفعۃً چونکے۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بیٹا! کیا ہوا؟ یاابت دراصل یاابی تھا۔ یاء کے عوض میں تاء تانیث لائی گئی ہے کہ یاء اور تاء کو آپس میں نسبت ہے کہ دونوں زاید اور اسماء کے آخر میں آتی ہیں یا اس لیے کہ تاء بعض مواقع پر تفخیم پر دلالت کرتی ہے جیسے علامۃ ونسابۃ چونکہ اب وام میں تفخیم ہے۔ (کذا قال الرضی) یعنی اباجی! میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے، کما قال اِنِّیْ رَاَیْتُ یہ رٔویا مشتق ہے رؤیت سے نہیں یعنی میں نے خواب دیکھا ہے کہ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ایک بلند پہاڑ پر تھا جس کے اردگرد نہریں جاری اور سبز درخت تھے۔

سوال: شمس وچاند کا عطف کوکبًا پر کیوں؟ حالانکہ سورج وچاند بھی ستارے ہیں۔

جواب: باقی ستاروں پر ان کی فضیلت وشرافت کے اظہار کے لیے آئے جیسے جبریل وروح کا عطف ملائکہ حالانکہ وہ الملائکہ میں داخل تھے۔

رَاَیْتُھُمْ یہ جملہ متانفہ اور سوال مقدر کا جواب۔ سوال یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو فرمایا کہ آپ نے ان کو کیسے دیکھا تو اس کے جواب میں فرمایا کہ میں نے انہیں دیکھا۔

ف: کواشی میں ہے کہ رؤیا خواب کو اور رؤیۃ آنکھ سے دیکھنے کو اور رائی قلب میں آئے ہوئے خیالات کو کہتے ہیں۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ ستارے، چاند اور سورج نیچے اتر کر انہیں سجدہ گزار ہوئے۔

مسئلہ: یہ سجدہ تحیۃ کا تھا، عبادت کا سجدہ نہیں تھا۔

ازالۂ وہم: لوگوں نے یہاں سے سمجھا کہ سجدہ تحیۃ آج بھی مشایخ کو جائز ہے اس کے جواب میں حسن نظامی دہلوی نے رسالہ لکھا اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے سجدۂ تعظیم کے ردّ میں رسالہ لکھا ہے۔ فقیر نے اس کا خلاصہ کر کے سورۂ یوسف کے ضمیمہ میں درج کیا ہے۔ صاحبِ روح البیان نے فرمایا کہ لفظ سجود وضع الجبھۃ علی الارض۔ سجدہ زمین پر ماتھا ٹیکنے کو کہتے ہیں علیٰ وجہ التعظیم والاکرام ہو یا علیٰ وجہ العبادۃ ہو اور تواضع وخضوع کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (یہاں آخری معنیٰ مراد ہے)

سوال: ستارے غیر ذوی العقول ہیں ان کے لیے صیغہ ساجدین اور ھم ضمیر ذوی العقول کیوں؟

جواب: چونکہ انہیں ذوی عقول کے وصف سے موصوف کیا گیا ہے اس لیے ان کے لیے صیغہ ذوی العقول اور ضمیر ھم لائی گئی۔

حضور علیہ السلام کا علم غیب اور یہودیوں کی آزمائش

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ اے محبوب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان ستاروں کے نام بتائیے جنہیں یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا حضور علیہ السلام نے (حسبِ عادت) خاموشی اختیار فرمائی تو جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور ستاروں کے نام بتا دیے۔ اس کے بعد حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے فرمایا: اگر میں ان ستاروں کا نام بتا دوں تو کیا تم مسلمان ہو جاؤ گے؟

یہودی نے کہا: ہاں میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ ان ستاروں کے نام یہ ہیں:

۱۔ جریان ۲۔ طارق ۳۔ ذیال ۴۔ قالبس ۵۔ عمودان ۶۔ فلیق ۷۔ مصبح
۸۔ ضروح ۹۔ فرغ ۱۰۔ وثاب ۱۱۔ ذوالکتفین

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان تمام ستاروں اور سورج و چاند نے زمین پر اُتر کر یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ یہودی نے تصدیق کرتے ہوئے قسم کھا کر کہا کہ واقعی یہی ان کے نام ہیں۔

نکتہ: بھائیوں کو ستاروں سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح ستاروں سے روشنی اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے ایسے ہی بھائیوں سے (روشنی اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے) اور والد اور خالہ یعنی بی بی لایا کو سورج اور چاند کی صورت میں دیکھا۔

ف: ہم نے والدہ کے بجائے خالہ بی بی لایا کا اس لیے کہا کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ بی بی راحیل بنیامین کی ولادت کے فوراً بعد فوت ہو گئیں جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کیا۔

مسئلہ: سجدے سے مراد یہ ہے کہ تمام حضرات یُوسف علیہ السلام کی سلطنت میں ان کے تابع حکم ہوں گے جیسا کہ سورۃ یوسف کے آخر میں ہم بیان کریں گے۔ (سجدۂ تحیۃ سے بھی یہی مراد ہے)

نکتہ: سورج و چاند کو ستاروں کے بعد ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام سے ان کی ملاقات دیر سے ہو گی۔

صوفیانہ مفہوم برائے کواکب و سورج اور چاند

صوفیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان گیارہ ستاروں سے حواس خمسہ ظاہرہ یعنی: (۱) سمع (۲) بصر (۳) سُونگھنا (۴) ذوق (چکھنا) (۵) لمس۔ اور باقی چھ قوٰی باطنہ یعنی (۱) قوتِ مفکرہ (۲) مذکرہ (۳) حافظہ (۴) مخیلہ (۵) واہمہ (۶) حسن مشترک مراد ہیں۔ اس لیے کہ حواسِ ظاہرہ اور قوٰی سب کے سب انسان کے قلبی ستارے ہیں اس لیے کہ ان کے معنی کا ادراک کیا جاتا ہے اور یہ اخوت یوسف (قلب) کے بھائی بایں معنیٰ ہیں کہ جونہی یعقوب (روح) نے راحیل (نفس) سے نکاح کیا تو یہ پیدا ہوئے

اس معنیٰ پر یہ ایک باپ کے بیٹے ہیں۔

صوفیانہ تقریر ثانی سورج سے رُوح و چاند سے نفس مراد ہے۔ انسانی کمال کا مقام یہ ہے کہ قلب حکومت کا مقتضا ہے کہ اسے روح و نفس اور حواس و قویٰ سجدہ کریں جیسے ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا یعنی یہ تمام یعنی رُوح و نفس و حواس و قویٰ سب کے سب قلب کے ماتحت اور تابع حکم ہیں یہی انسان کی فتح مطلق ہے جسے سورۂ نصر میں بیان کیا گیا ہے اور ایسے مقام کے وارث کو دنیا کی بقا نصیب نہیں ہوتی یعنی جسے اس مرتبہ کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے وہ دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ف : بفضلہ تعالیٰ ہمارے پیر و مرشد اور شیخ کامل قدس سرہ العزیز اس مرتبہ و مقام کے حامل تھے اور جملہ اولیاء کرام بھی زندگی بھر اس مرتبہ و مقام کے طالب رہتے ہیں اور انہیں کسی مرتبہ و مقام کا اختیار دیا جاتا ہے تو وہ اسی مرتبہ و مقام کو چاہتے ہیں۔

حضرت عارف جامی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

اگر کنند بمن عرض دنیا و عقبیٰ
من آستان تو بر ہر دو جائے بگزینم

ترجمہ : اگر مجھے دنیا و عقبیٰ کے مقامات و مراتب پیش کریں تو مجھے ان کی ضرورت نہیں مجھے تو صرف تیرا آستانہ چاہیے۔

ف : اولیاء کرام حیات کے بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ وصال یار کا سبب موت ہے اور مقام برزخ بہ نسبت مقام دنیا کے وصال کے قریب تر ہے ورنہ ان کی نظروں میں موت و حیات اور دنیا و عقبیٰ تمام برابر ہیں۔

رؤیا کسے کہتے ہیں؟ نیند میں دیکھی ہوئی صورت کا قلب پر مرتسم و منقش ہونا۔ اس اعتبار سے رؤیا از باب علم ہے اور قاعدہ ہے کہ لکل علم معلوم و لکل معلوم حقیقۃ" ہر علم کا معلوم ہوتا ہے اور ہر معلوم کی حقیقۃ ہوتی ہے، اور وہی حقیقت خواب میں نظر آتی ہے۔

علم کسے کہتے ہیں؟ اسی صورت کا قلب میں پہنچ کر منطبع ہونا خواب میں ہو یا بیداری میں، اور علم کا مرکز صرف قلب ہے۔

ف : وجود و مرتبہ کے لحاظ سے عالمِ ارواح عالمِ اجسام سے مقدم ہے اور عالمِ اجسام کو امداد ربانی عالم ارواح کے توسط سے نصیب ہوتی ہے اس لیے اجسام کی تدبیر ارواح کی طرف سپرد ہے لیکن چونکہ ارواح و اجسام میں ذاتی مباینہ ہے اس لیے کہ ارواح بسیط اور اجسام مرکب ہیں اور ان دونوں کو اس لحاظ سے کوئی رابطہ اور مناسبت نہیں۔ حالانکہ ہم ان کو آپس میں مرتبط کرنا چاہتے ہیں تاکہ تاثیر و تاثر کا سلسلہ قایم ہو اور جب تک ان کا ارتباط قایم نہ ہوگا نہ تاثر حاصل ہو سکے گا اور نہ تاثیر، نہ اجسام کو امداد ربانی نصیب ہو سکے گی اور نہ ارواح و اجسام میں کوئی تدبیر کر سکیں گے اسی لیے ہم نے ان کے

اندر ارتباط پیدا کیا۔ ایسے جسم طبعی اور روح انسانی کو جیسے در رہا ہے۔ م طبعی عنصری کی تدبیر اور اس کے اندر علم وعمل کا مادہ پیدا کرے گا لیکن ان کو بھی آپس میں مباینہ ذاتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نفس حیوانی کو بحیثیت برزخ کے پیدا فرمایا تاکہ ان کو آپس میں مناسبت و رابطہ قایم ہو سکے، اس لیے کہ نفس حیوانی ایک قوت معقولہ ہے اور ہے بھی لبسیطہ۔ اس لیے اس معنیٰ پر اسے رُوح سے مناسبت ہوگی اور اس حیثیت سے کہ وہ بالذات قویٰ مختلفہ متکثرہ پر شامل ہے اور جسم کے ہر روئیں میں پھیلنے والی اور اس میں مختلف طور طریق سے متصرف ہے نیز یہ بخار ضبابی قلب صنوبری (جو انسانی ڈھانچے کے بائیں جانب واقع ہے) کے مزاج بھی مناسب ہے اس لیے کہ وہ بھی عناصر سے مرکب ہے اس معنیٰ پر تاثیر و تاثر اور وصول مدد کا حصول کا ارتباط حاصل ہوا۔

ف: اس لمبی چوڑی تقریر کے بعد انسانی نشاۃ ثانیہ میں قوت خالیہ (کہ وہ بھی دونوں عالموں سے متعلق ہے)۔ عالم مثال کے متصل ہے۔

عالمِ مثال یہ دو قسم ہے:
۱۔ مطلق
۲۔ مقید

جمیع آثار دنیوی و اخروی کہ جن کو عرش محیط حاوی ہے وہ مطلق ہے۔

اور مقید دو قسم ہے:

۱۔ مقید بالنوم
۲۔ غیر مقید بالنوم

لیکن اس میں شرط ہے کہ اس میں بھی غلبۃ فتور ما فی الحس ہو۔ (کذا فی الواقعات المشہور للصوفیہ)

ف: حضرات انبیاء علیہم السلام کو وحی سے پہلے اس طرح کے خواب نظر آتے ہیں۔ یعنی انہیں خواب و خیال میں مثالی صورتیں نظر آتی ہیں اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے ملائکہ کرام کو دیکھتے ہیں مثال مطلق میں مقید میں لیکن یہ حالت خواب کی نہیں ہوتی بلکہ بیداری کی ہوتی ہے البتہ ما فی الحس میں فتور (کمی) ضرور ہوتی ہے گویا نزولِ وحی کے وقت اس عالم دنیا سے فارغ ہوتے ہیں لیکن ان کی عقل و تمیز بحال رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ کیونکہ ان کی آنکھیں نیند میں ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتے ہیں اس لیے ان کے بواطن صفات الٰہیہ سے آراستہ و پیراستہ اور اخلاقِ خداوندی سے متخلق اور اوصافِ بشریہ جیسے حرص و عجز، دنیوی آرزو اور ضعیف اور دیگر وہ اوصاف جو قلبی طہارت کے لیے نقصان دہ ہیں) سے پاک ہوتے ہیں بلکہ ہر وہ وصف جو ان کی بلندیٔ درجات اور ارفع کمالات کے منافی ہو اس سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں تو پھر ان میں نیند کس طرح نقص و عیب پیدا کر سکتی ہے کیونکہ نیند ایک عجز، اور ضعف اور آفت ہے

اگر یہ آفت قلب نبوت کے لیے روا رکھی جائے تو پھر تمام آفات آپ کے قلب پر وارد ہو سکتے ہیں اور ایسے واردات وحی الٰہی کے لیے ضرر رساں اور اس سے غفلت کا موجب بنتے ہیں بلکہ بہت زیادہ نقصان پیدا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور ان پر جو واجبات من جانب اللہ عاید ہوتے ہیں ان میں سے کئی واقع ہوگی اور یہ نبوت کی شان کے لایق نہیں۔

ف: اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو خواب کے لیے مقرر فرمایا جو انسان کے قلب پر خواب کی مثالیں قایم فرماتا ہے اور اس فرشتہ کو لوح محفوظ سے آدم علیہ السلام کے حالات سے اطلاع بخشی جاتی ہے تو وہ فرشتہ وہاں سے قصہ لے کر خواب والے کے دل پر مثالی صورت قایم کر کے حالات ظاہر کرتا ہے جب بندہ ہوتا ہے تو اسے خوش کرنے یا ڈرانے دھمکانے کے لیے حکمت الٰہی سے مثالی صورتیں قلب پر وارد کی جاتی ہیں تاکہ خواب دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔

ف: شرح الشرعۃ میں ہے کہ عالم مثال میں لوحِ محفوظ آئینہ کی طرح ہے جس طرح آئینہ میں صورتیں و شکلیں نظر آتی ہیں، پھر اگر دوسرا شیشہ اسی شیشہ کے بالمقابل رکھ کر دونوں شیشوں کے درمیانی حجاب کو ہٹایا جائے تو ایک شیشے کا پورا نقشہ دوسرے شیشے میں نظر آئے گا۔ ایسے ہی انسان کے قلب کو سمجھئے کہ یہ بھی ایک شیشہ ہے یہ علوم کے نقوش اور شہوات کے مقتضیات کو قبول کرتی ہے جس طرح حواسِ ظاہرہ و باطنہ اعمال کا اثر ہوگا اسی طرح کا دل ہوگا گویا اعمال نفس یعنی خواہشات نفسانی دل اور لوحِ محفوظ کے درمیان حجاب ہیں جب تک درمیان سے یہ حجابات نہیں اُٹھیں گے دل کو لوحِ محفوظ کا مطالعہ نصیب نہ ہوگا اور لوحِ محفوظ سے عالمِ ملکوت مراد ہے ہاں رحمتِ الٰہی کی ہوا چل پڑے تو بھی حجابات ہٹ سکتے ہیں نہ صرف پردے ہٹ جائیں گے بلکہ عالمِ ملکوت سے قلب پر ایک نور چمکتا ہے جو قلب کو منور کر دیتا ہے۔ لیکن عالم بیداری میں وہ نور نصیب نہیں ہوتا سوائے اس خوش بخت کے جسے اللہ تعالیٰ خود اپنے فضل و کرم سے وہ نور عطا فرمائے وہ اس سے مستثنیٰ ہے اس لیے کہ عالم بیداری میں انسان عالمِ شہادت میں ہوتا ہے اور عالمِ شہادت میں حواس اس طرف مشغول رہتے ہیں جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں۔ مثلاً آنکھ دیکھنے میں اور کان سننے میں وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے اس کے قلب پر لوحِ محفوظ یعنی عالمِ ملکوت کے واردات پہلے تو آتے ہی نہیں اگر آتے ہیں تو ثابت نہیں رہ سکتے (الا من شاء اللہ) جیسے کہ ہم نے پہلے عرض کر دیا ہے۔ ہاں عالمِ خواب میں حواس ظاہرہ و باطنہ اپنے مشاغل سے فارغ ہو کر سکون پذیر ہوتی ہیں اس لیے قلب ہر طرح کے مشاغل سے فارغ ہو کر آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہو جاتا ہے اور درمیانی حجابات بھی ہٹ جاتے ہیں اس لیے لوحِ محفوظ یعنی عالمِ ملکوت کے واردات فوراً قلب پر پہنچتے ہیں لیکن اتنی مقدار میں جتنی قلب کو صفات نصیب ہوتی ہیں لیکن قلب کو عالمِ شہادت والے خیالات خواب میں نہیں چھوڑتے یہاں تک کہ وہ واردات جو عالم ملکوت (لوح محفوظ) سے قلب پر وارد ہوتے ہیں تو انہیں پہلے خیال اپنے قبضے میں لے لیتا ہے اسی لیے انسان کو بیداری کے بعد خواب کی ان واردات پر خیال کا غلبہ ہوتا ہے اور خیال میں ذہن میں وہی باتیں یاد رہتی ہیں جو خیال کے مناسب ہوتی ہیں اسی لیے ذہن بیداری کے بعد اپنی خیالی باتوں کو یاد رکھتا ہے ملکوتی واردات سے اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۝ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پیارے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے نہ بتانا اس لیے کہ وہ تیرے ساتھ حسد کی بنا پر مکر وفریب کریں گے بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور اس طرح تیرا رب تعالیٰ چُن لے گا اور تمہیں خوابوں کی تعبیر سکھائے گا اور تجھ پر اور یعقوب کے گھر والوں پر اپنی نعمتیں مکمل کرے گا جیسے پہلے تیرے دونوں باپ دادا یعنی ابراہیم و اسحاق علیہم السلام پر اپنی نعمت پوری کی بیشک یوسف علیہ السلام اور اُس کے بھائیوں کے قصہ میں سوال کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ بیشک یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو زیادہ پیارے ہیں اور ہم بہت بڑی جماعت ہیں۔ بیشک ہمارے والد کھلم کھلا اُن کی محبت ہیں ہیں یوسف کو قتل کر دو یا کہیں دور کی زمین میں پھینک آؤ تاکہ تمہارے باپ کا مُنہ صرف تمہاری طرف ہی متوجہ رہے اور اُس کے بعد پھر نیک آدمی ہو جاؤ

تفسیر عالمانہ

خواب تین قسم ہے

① حدیث النفس: اِس کی مثال یہی ہے کہ وہ امور جو انسان کو جاگتے سے پہلے متعلق تھے وہی خواب میں سامنے آجائیں جیسے کاریگر اور کسان تاجر وغیرہ کو خواب میں اپنے متعلقات نظر آئیں یا جیسے عاشق کو معشوق کا نقش و نگار اور اُس کے دُوسرے خیالات خواب میں نظر آتے ہیں وغیرہ۔

② تخویف الشیطان: یعنی شیطان لہو ولعب کے طور انسان کو خواب میں ڈرائے اسی لیے اُسے خواب میں ڈراؤنی باتیں دکھاتا ہے تاکہ انسان بیدار ہوتے ہی محزون و مغموم ہو۔ یا خواب میں احتلام ہو جائے، یہ بھی شیطان کی شرارت ہوتی ہے۔ ان دونوں اقسام کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

③ بشری من اللہ: یہ صحیح اور حقیقی خواب ہوتا ہے اس لیے کہ خواب میں بذریعہ فرشتہ انسان کو لوح محفوظ کی باتیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس کے سوا باقی خوابوں کو "اضغاث احلام" کہا جاتا ہے۔

قَالَ یہ جملہ مستانفہ اور سوال مقدر کا جواب سوال یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو خواب سُنایا تو انہوں نے انہیں کیا جواب دیا؟

جواب: یعقوب علیہ السلام نے فرمایا یٰبُنَیَّ ابن کی تصغیر ہے۔ صغر سنی اور شفقت و محبت سے فرمایا، اے میرے پیارے چھوٹے بیٹے! اس لیے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام بارہ سال کے تھے جیسے پہلے ہم نے بیان کیا ہے دراصل یا بُنَیِّی تھا۔ یائے اضافت کو الف سے تبدیل کیا گیا ہے جیسے غلامی میں یا غلامًا پڑھا جاتا ہے اس لیے الف اور فتح یاء اور کسرہ سے خفیف تر ہیں۔

علمِ یعقوب برائے یوسف علیہما السلام یوسف علیہ السلام کے خواب سے یعقوب علیہ السلام کو علم ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ بہت بڑے مراتب سے نوازے گا۔ اور انہیں حکمت و نبوت عطا ہو گی۔ اپنے آباء کرام کی طرح دارین کی سعادت سے نوازے جائیں گے۔ ان کے ان مراتب و کمالات پر ان کے بھائی حسد کریں گے۔ یوسف علیہ السلام کو ان کے شر سے بچانے کے لیے قبل از وقت وصیت فرمائی، اگرچہ جانتے تھے کہ یوسف علیہ السلام کو مشقتوں، تکالیف اور حُزن و غم میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ لیکن شفقتِ پدری سے چاہا کہ انہیں یہ مراتب بلا مشقت و بغیر تکلیف کے نصیب ہوں۔ اس لیے فرمایا:

لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ اے یوسف علیہ السلام! اپنے خواب کا کُل یا بعض واقعہ بھائیوں کو نہ بتانا۔

ف: بھائیوں سے علاتی بھائی مراد ہیں اور وہ دس تھے۔ اور دینہ کو بھائیوں میں شامل کرنا غلط ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی اگرچہ علاتی اور لایا بی بی کی لڑکی تھی۔ لیکن بھائیوں کے حسد میں شامل ہیں۔ یہ غلطی تفسیر الارشاد کے مصنف کو ہُوئی کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں بھائیوں کے حسد و تکالیف وغیرہ بیان کر کے گیارہ بھائی لکھ کر دینہ کو ان میں شامل کر دیا اور بنیامین اگرچہ ان کے گیارھویں بھائی تھے لیکن وُہ سگے بھائی تھے۔ وہ اس نہی میں داخل نہیں اس لیے کہ ان سے حسد کا صدور کیسا۔ اور نہ ہی خواب میں ان کے سجدے کو دخل تھا۔ لیکن یہ قول غیر صحیح بلکہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ اس لیے کہ دینہ بہن کو کسی نے گیارھوں میں شمار نہیں کیا۔ کذا فی حواشی المفتی۔ اور اس بنیامین کو گیارھوں شمار نہ کرنا اور نہ ہی سجدے میں شامل سمجھنا صحیح ہے کہ قرآن مجید میں گیارہ کا لفظ ہے تو وُہ ان میں داخل نہیں۔

فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اس کا منصوب ہونا۔ اَنْ مقدر کی وجہ سے ہے۔ یعنی تیرے ساتھ مکر و فریب کریں گے۔ یعنی تیری ہلاکت کے اسباب بنائیں گے، جس کا تمہیں علم نہ ہوگا اور نہ ہی تم اُن کے مکر و فریب کو

ملہ دیوبندی وہابی یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے بارے میں لاعلمی ثابت کرتے ہیں۔ ۲ فقیر نے اسکے دلائل لکھے ہیں ضمیمہ دیکھیے۔

دفع کر سکو گے۔ یہی معنیٰ تحذیر کے موافق ہے۔

ف :اس سے معلوم ہوا کہ یعقوب علیہ السلام کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو کرنا ہے ضرور کریں گے انہیں تقدیر ربانی سے ہٹنے کی کیا مجال۔ (یہی ہمارا) موقف ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو آنیوالے واقعات کا علم تھا۔ (لکن الوھابیۃ قوم لا یعقلون)۔

ف : الکید بمعنے الاحتیال للاغتیال یا کسی کو ایسے طریقہ سے نقصان پہنچانا کہ اسے اس کا علم نہ ہو۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ یہ جملہ مستانفہ اور سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے یوسف علیہ السلام نے اپنے والدگرامی سے عرض کی ہوگی کہ میرے بھائیوں سے ایسی شرارت کیسی جبکہ وہ خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے ہیں اس کے جواب میں اُن کے والدگرامی نے فرمایا کہ شیطان انسان سے کھلی عداوت رکھتا ہے اُس نے عداوت کا اظہار کرنا ہے تم اور تیرے بھائی اُس کی شرارت سے کس طرح بچ سکتے ہیں جبکہ اُس نے تیرے دادا آدم و حوا علیہما السلام کو بہشت سے نکالا۔ اسی لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا کہ تم اور تیرے بھائی اُس کی شرارت کا نشانہ بنو اس سے معلوم ہوا کہ خواب کی تاویل یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو بھی معلوم ہوجائے گی۔ وہابیہ دیوبندیہ یعقوب علیہ السلام کے علم کے منکر ہیں۔ صاحب روح البیان یوسف علیہ السلام کے بھائی کے لیے بھی آنے والے امور کا علم ثابت کررہے ہیں۔ کما قال علم انھم یعلمون تاویلھا فقال ما قال[1]۔

تفسیر صوفیانہ عارفین نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے اخوۃ یوسف علیہ السلام کو مکر و فریب سے بری کرکے شیطان کے ذمہ لگا دیا اس لیے کہ انہیں علم تھا کہ (الافعال کلھا من اللہ تعالٰی) لیکن شیطان اس کے اسمِ مُضل کا مظہر ہے۔ اسی بناء پر کید و فریب کو اسی طرف منسوب فرمایا ورنہ حقیقت یہ ہے ہر فعل کا فاعل اللہ تعالٰی ہے؎

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود
تاثیر ز آلت از محالات بود

ترجمہ : ہر فعل کا فاعل اللہ تعالٰی ہے حق کے سوا باقی تمام آلات ہیں اور آلات سے تاثیر محال ہے۔

وَكَذٰلِكَ کاف محلاً منصوب ہے اس لیے کہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی جیسے تجھے چنا اور تمام بھائیوں سے تمہیں برگزیدہ بنایا۔ جیسا کہ تیری شرافت اور بزرگی پر تیرا خواب دلالت کرتا ہے۔ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ تیرا رب تعالٰی تجھے چُن لے گا اور برگزیدہ فرمائے گا اور ایسے مرتبہ سے نوازے گا جو تمام مراتب سے اعلیٰ و افضل ہے۔ یعنی نبوت و رسالت۔ اسی لیے کہ اس خواب کی تعبیر عالمِ شہادت میں ظاہر ہوگی اس لیے کہ عالمِ شہادت کی تمام حقیقی صورتوں کا نقشہ عالمِ مثال میں موجود نہیں

---

[1] شرح کے لیے دیکھیے ضمیمہ۔

اگرچہ ہم اس عالم دنیا کو بھی خواب وخیال سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تحقیق ہم آگے چل کر بیان کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

ے

خیال جملہ جہاں را نبود چشم یقین
بجنب بحر حقیقت سراب می بینم

ترجمہ: چشم یقین کے نور میں یہ تمام جہان خواب وخیال ہے یعنی یہ جہان بحرِ حقیقت کے سامنے سراب کی مانند ہے۔

وَيُعَلِّمُكَ یہ جملہ مستانفہ ہے اسے تشبیہہ سے کوئی تعلق نہیں گویا یہ مبتداء کی جزء ہے اس لیے کہ اجتباء کو اجتباءً سے تشبیہ ہے لیکن تعلیم کو اجتباء سے تشبیہ نہیں اس لیے کہ تعلیم اجتباء کی غیر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اجتباءً سے تشبیہہ ہو اب معنیٰ ہوگا کہ جیسے تمہیں برگزیدہ بنایا ایسے ہی تعلیم سے بھی نوازے گا لیکن معنی درست نہیں اس لیے کہ مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اجتباء وجہ تشبیہہ ہے لیکن یہاں تعلیم وجہ تشبیہہ کس کو بنایا جائے۔ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ یعنی علوم کا انجام کار علم عطا فرمائے گا یا یعنی کہ آپ امور کے انجام کی حقیقت کو معلوم کرلو گے اس لیے کہ جو ذات اپنے بندوں سے جیسے اس قسم کے خواب دکھاتی ہے تو اسے ایسے خوابوں کی تعبیر کے علوم بھی عطا فرماتی ہے کیونکہ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی اجتباء کے لوازم سے ہے تاویل الاحادیث سے خوابوں کی تعبیرات مراد ہیں۔ تاویل کو اس لیے تاویل کہا جاتا ہے کہ احادیث کا انجام اسی کی طرف لوٹتا ہے یعنی تعبیر کرنے والا اگر صحیح تعبیر بتائے تو انجام کار کی حقیقت اسی طرف لوٹے گی۔ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ فرشتے کی طرف سے
۲۔ احادیث النفس
۳۔ احادیث الشیطان

اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

حل لغات: احادیث حدیث کی جمع ہے۔ اسی سے ہے۔ احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم لغت میں حدیث بمعنی جدید اور عرف عامہ میں بمعنے کلام اور محدثین کی اصلاح میں وہ ارشادِ گرامی جو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو۔ گویا اسے قرآن مجید کے مقابلہ میں حدیث کہا گیا ہے کہ وہ قدیم ہے اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حادث اور صحاح میں لکھا ہے کہ حدیث قدیم کی ضد ہے۔ ہر قلیل وکثیر کلام کو حدیث کہا جائے گا۔ اور اسے حدیث اس لیے کہا گیا کہ ہر دوسری بات پہلی بات کے مقابلہ میں حادث ہے۔

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ اے یوسف علیہ السلام! اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی نعمتیں مکمل فرمائے گا۔ علیک کا متعلق یتم یا نعمتہ ہے۔ یعنی آپ کو شاہی اور سلطنت کے ساتھ نبوت عطا فرمائے گا۔ گویا نبوت بادشاہی کا

تمہ ہوگی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے ان عطیات کے لیے تعلیم کو واسطہ کیوں بنایا؟

جواب: تاکہ معلوم ہو کہ دنیا اسباب کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ بخشتا ہے تو بھی واسطہ اور سبب سے۔ (اگرچہ وہ واسطہ وسبب کے بغیر بھی بخشنے پر قادر ہے۔ (یہی ہمارا موقف ہے)

وَعَلَىٰٓ اٰلِ يَعْقُوْبَ۔ علیٰ کا تکرار اس لیے ہے تاکہ آلِ یعقوب۔ علیك کی ضمیر پر عطف ڈالا جاسکے۔ آل دراصل اہل تھا۔ اس فرق کے اظہار کے لیے کہ آل صرف اہلِ شرافت کے لیے مستعمل ہے بخلاف اہل کے کہ وہ عام ہے اس سے یعقوب علیہ السلام کے اہلِ بیت اور اس کے دوسرے متعلقین مراد ہیں۔

ف: یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہدایت کے ستارے ہوں گے اور انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انوار نصیب ہوں گے اور انجام کار انہیں بھی نبوت سے نوازا گیا ان میں بھی بالقوۃ نبوت تھی جو بعد میں بالفعل ظاہر ہوئی تاکہ اتمامِ نعمت کا معنیٰ منطبق ہو۔ لیکن سعدی مفتی مرحوم نے فرمایا کہ اس سے ان کی نبوت کا ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی ان کے ہدایت کے ستاروں اور ان کے انوارِ الٰہی سے نوازے جانے سے نبوت ثابت ہوتی ہے البتہ اتنا ضرور ہوا کہ انجام کار وہ لوگوں کے لیے ہدایت کا سبب ضرور بنے۔ صاحب روح البیان نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے تمام بیٹوں کے لیے ہدایت کے ستارے کا مفہوم تخمینہ سے نہیں بلکہ آپ کو بذریعہ وحی الٰہی معلوم ہوا۔ (یہی ہمارا موقف ہے) صاحبِ روح البیان نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے تمام صاحبزادوں کی نبوت کا مفہوم ان کے ستاروں کی صورتوں میں متصور ہونے سے سمجھا اس لیے کہ "المطلق اذا یطلق یراد بہ الکامل"۔ اس معنے میں فرد کامل نبوت کے سوا اور کوئی معنیٰ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے لیے فرمایا:

"وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا"

یعنی جیسے یہاں ہدایت سے نبوت کا مفہوم لیا گیا ہے، ایسے ہی ابنائے یعقوب علیہ السلام کے متعلق اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ یہ محلاً منصوب علی المصدریہ (مفعول مطلق ہے) دراصل ویتم نعمتہ علیك اتماما کائنا کاتمام نعمتہ الخ یعنی تیرے باپ دادا کو نعمت نبوت ورسالت سے نوازا۔ ایسے ہی تمہیں مِنْ قَبْلُ اسی وقت یا تیرے سے پہلے۔ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ ابویك سے عطف بیان ہے۔

سوال: ابراہیم واسحاق کو اب سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ یہ دونوں یوسف علیہ السلام کے باپ نہیں تھے بلکہ ابراہیم علیہ السلام پردادا اور اسحاق علیہ السلام دادا تھے۔

جواب: تاکہ معلوم ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو آپس میں کمال ارتباط ہوتا ہے۔

ف : جد اصالۃً اب ہوتا ہے اگرچہ درمیان میں کئی واسطے ہوں ۔ مثلاً کہا جاتا ہے ؛ فلان بن فلان الخ

ف : بعض مفسرین نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام پر اتمامِ نعمت سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنا خلیل بنایا اور نارِ نمرود سے بچایا ۔ اور اسمٰعیل کو ذبح نہ ہونے دیا اور اسحاق علیہ السلام پر اتمامِ نعمت سے یہ مراد ہے کہ انہیں یعقوب علیہ السلام عطا فرمایا اور ان کی اولاد کو انبیاء بنایا ۔ اور پھر ہر نعمت نبوت و رسالت کا تتمہ ہوتی ہے ۔ اگرچہ نبوت و رسالت کے سوا اور کتنی ہی بڑی سے بڑی نعمت ہو، تب بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ۔

ف : اگرچہ اس تشبیہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ یعقوب علیہ السلام اپنے آباء کے مراتب و کمالات میں برابر ہوں لیکن بقاعدہ معلومہ کہ مشبہ و مشبہ بہ میں تشبیہ من وجہ ہوتی ہے ۔ اسی بناء پر اس کی برابری کا وہم نہیں ہوگا ۔

تفسیر صوفیانہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اتمامِ نعمت سے مراد یہ ہے کہ یوسف یعنی قلب کو جلوۂ حق نصیب ہوا جس میں ذاتِ حق اپنی شان کے استواء فرماتا ہے کیونکہ قلب ہی اللہ تعالیٰ کا حقیقی عرش ہے ، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ :

لا یسعنی ارضی و لا سمائی و انما یسعنی قلب عبدی المؤمن ۔

مے

در دل مومن بگنجم اے عجب
گر مرا جوئی دراں دلہا طلب

ترجمہ : اے عاشق ! میں مومن کے دل میں ہوتا ہوں ، اگر میری طلب ہے تو اہلِ ایمان کے دل میں تلاش کرو ۔

اسی خصوصیت سے یوسف یعنی قلب کو کمالِ حُسن نصیب ہوا ۔ جب اللہ تعالیٰ کسی خوش قسمت قلب پر خصوصی تجلی فرماتا ہے تو اس کے انوار کا عکس روح کے جمیع متعلقات جیسے حواس و قوٰی وغیرہما پر پڑتا ہے ۔ ان متعلقات کو یعقوب یعنی روح کی آل سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

تفسیر عالمانہ اِنَّ رَبَّكَ ، مذکورہ امور اللہ تعالیٰ کر کے دکھائے گا ۔ اس لیے کہ تیرا رب تعالیٰ عَلِيْمٌ اپنے ہر امر کو جانتا حَكِيْمٌ ہر کام حکمت سے کرتا ہے ۔ اسی لیے انہیں نکرہ لایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ وہ واسع العلم والحکمۃ ہے ۔ یعنی اپنے علم سے ہی اجتباء و اتمامِ نعمت فرماتا ہے ۔ ہر اس خوش بخت کو جو اس کا مستحق ہوتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہ اس کی عین حکمت اور مبنی برصواب ہوتا ہے ۔

تفسیر صوفیانہ قرآن مجید میں کبھی علیم مقدم ہوتا ہے جیسے یہاں پر ، اور کبھی حکیم ۔ اس کے چند وجوہ ہیں ؛
۱ ۔ حکیم کا علیم پر تقدم باعتبار حضرۃ العلم کے ہے اس لیے کہ علم کا ایمان و حقائق علیہ سے متعلق ہونا حکمت کے تابع ہے اور اسی اعتبار سے علم معلوم کے تابع ہے ———— بایں حیثیت کہ علم

بایں حیثیت کہ علم معلوم کو حضرۃ اولیٰ میں متعلق ہوا تو اس اعتبار سے کہ معلوم کو حضرۃ اولیٰ میں جب مرتبہ ملا تو بھی اللہ تعالیٰ سے۔

۲۔ علیم کی تقدیم حکیم پر باعتبار حضرۃ العین کے ہے اس لیے کہ حکمت کی تعیینات اور صور معینہ سے متعلق ہونا علم کے تابع ہے۔ اس اعتبار سے معلوم علم تابع ہے۔ اس لیے کہ حضرۃ اولیٰ میں معلوم علم کو متعلق ہوا ہے اس اعتبار سے کہ علم کو یہ مرتبہ حضرۃ اولیٰ میں اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے۔

اس تقریر سے واضح ہُوا کہ تبوع جس مرتبہ میں ہواسے تقدیم حاصل ہوتی ہے خواہ کسی وجہ سے کسی مقام پر بظاہر متاخر ہو اور تابع کو تاخر ہوگا، خواہ بظاہر کسی مقام پر کسی وجہ سے مقدم ہو۔ اور ظاہر ہے کہ معلومات علم بالذات کے متعلق ہونے کے وقت حضرۃ اولیٰ میں علم سے مقدم ہُوئے اگرچہ مرتبہ ثانیہ میں علم موخر ہیں۔ اور ان معلومات کو اپنے کو مراتب و اوضاع کو اپنے مقامات پر مرتب کرنے کا نام حکمت ہے۔ وہ ترتب جس مرتبہ حضرۃ میں ہو بہ ترتیب وضع جس مرتبہ میں واقع ہو گی الحکیم العلیم اور العلیم الحکیم سے سبب بھی ہوگی استعدادات کلیہ کے اقتضات کے موافق اور بقدر استعدادات قابلیہ جزئیہ جو کہ نشأتِ دنیویہ برزخیہ نشریہ حشریہ نیرانیہ جنانیہ جسمانیہ روحانیہ و دیگر نشأت کی مقدار پر ہوگی۔ یہ تقریر صاحبِ رُوح البیان کے پیر و مرشد قدس سرہٗ کی ہے جسے انہوں نے اپنی بعض تحریرات میں ضبط فرمایا۔

تفسیر عالمانہ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ بخدا یوسف علیہ السلام اور اس کے گیارہ بھائیوں کے قصے ہیں۔ اٰيٰتٌ عظیمۃ الشان علامات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ اور حکمت باہرہ پر دلالت کرتی ہیں۔ لِّلسَّآئِلِيْنَ۝ ہر اس شخص کے لیے جو ان کے قصہ کے متعلق سوال کرتا یا اسے معلوم کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ یعقوب علیہ السلام کے بڑے لڑکوں نے چھوٹے صاحبزادے حضرت یوسف علیہ السلام کو ذلیل و حقیر کرنا چاہا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اسے نبوت و سلطنت سے نوازا اور وہ خود ذلیل و خوار ہُوئے بلکہ اس کے زیرِ حکم اور تابع فرمان ہُوئے۔ اس لیے حسد کا وبال اُلٹا اُن کے گلے کا ہار بنا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی قدرتوں اور حکمتوں میں ایک یہی ہے جو قصۂ یوسف علیہ السلام میں مذکور ہے۔

یوسف علیہ السلام کا راز کھل گیا تفسیر فارسی میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے خواب کو والد گرامی کو سنایا تو والدِ گرامی نے اسے پوشیدہ رکھنے کی وصیت فرمائی تو اسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی عورتیں سُن رہی تھیں۔ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی شام کو گھر لوٹے تو ان کی بیویوں نے خواب کا ماجرا اور والدِ گرامی کی وصیت بیان کر دی۔ اس سے بھائیوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اسی وقت سے مختلف تدبیریں سوچنے لگے۔

ف: یہودا، روبیل، شمعون نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم یوسف کو سجدہ کریں۔ لیکن یہ مشکل ہوگا۔ جب والد گرامی اور والدہ گرامی سجدہ کریں گی تو پھر ہمیں رُسوائی ہوگی کہ ہم سجدہ نہ کریں۔ کیوں نہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے والد سے جُدا کر لیا جائے۔ چنانچہ

اللہ تعالیٰ نے ان کا مشورہ بیان فرمایا کہ اِذْ قَالُوْا پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! یاد کیجئے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ لَیُوْسُفُ یہ لام ابتدائیہ ہے جملہ مضمون کی تحقیق و تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یوسف علیہ السلام اور اُس کے بھائی کے لیے والدگرامی کی محبت ایک امر کی محقق اور ثابت ہے کہ جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ وَ اَخُوْہُ اور اس کا بھائی بنیامین۔

ف: شقیق اُس بھائی کو کہا جاتا ہے ایک باپ ماں سے پیدا ہوں یعنی عینی سگا بھائی۔ کبھی باپ کی جانب کے بھائی کو بھی شقیق کہا جاتا ہے۔

شق بمعنی چیرنا، گویا اس نے اپنے باپ کی پشت کو اپنے بھائی کے ساتھ چیرا۔ اس معنے پر ماں کی جانب کے بھائی کو بھی شقیق کہا جاتا ہے۔ وُہ بھی اِس اعتبار سے کہ گویا اس نے اپنی ماں کے پیٹ کو بھائی کے ساتھ چیرا۔

ف: قاموس میں ہے کہ شقیق بروزن امیر بمعنے بھائی۔ وہ اس لیے کہ گویا وہ اپنے نسب میں ایک دوسرے کا ایک حصہ ہیں۔

نکتہ: قرآن مجید میں یوسف علیہ السلام کی طرح بنیامین کا نام اس لیے نہیں لیا گیا کہ بنیامین سے یعقوب علیہ السلام کی محبت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے تھی کہ وُہ ایک ماں سے پیدا شدہ ہیں۔ اس میں اصل محبت تو یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ فلہذا اس کے قتل کی تدبیر کی جائے یا اسے کسی کنویں میں ڈالا جائے۔ اس وجہ سے وہ بنیامین کے درپے آزار نہ ہوئے۔

اَحَبُّ اِلٰٓی اَبِیْنَا مِنَّا ہمارے والدِگرامی کو بہ نسبت ہمارے وہ زیادہ محبوب ہیں۔ احبّ افعل التفضیل ہے بطریق شاذ مفعول کے معنے میں ہے یعنی احب بمعنے محبوب تر۔

سوال: احب یوسف و اخوہ کی خبر ہے بلحاظ تثنیہ اور خبرِ واحد کیوں؟

جواب: افعل التفضیل کا قاعدہ ہے کہ جب اس کے بعد لفظ من واقع ہو تو ہمیشہ مفرد اور مذکر آئے گا خواہ اس کا متعلق واحد ہو یا تثنیہ یا جمع مذکر ہو یا مونث، اس لیے کہ افعل التفضیل من کے لفظ سے تمام ہوتا ہے اس لیے من سے پہلے اسے نہ تثنیہ لایا جاسکے گا نہ جمع نہ مونث۔ مزید تفصیل فقیر اویسی کی شرح "شرح جامی" میں دیکھیے۔

یعقوب علیہ السلام کا علم برائے یوسف اور ان کے عشق کا امتحان

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام کی شفقت و محبت یوسف علیہ السلام سے اس وقت سے بڑھی جب ان سے خواب سُنا۔ اس سے آپ کو یقین ہوگیا کہ یہ کلی استعداد کے مالک ہیں اور اپنے آباء کے صحیح جانشین یہی بنیں گے بلکہ اپنے تمام بھائیوں کی جملہ استعدادات کے جامع صرف یہی ہیں۔ اسی لیے انہیں ہر وقت سینے سے لگاتے، پیار کرتے بلکہ اپنے سے لمحہ بھر بھی جُدا نہ کرتے اس لیے بھائیوں کے حسد کی آگ اور بھڑکی یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کو جُدا کرنے کے لیے جد و جہد کی۔ بعض عُشّاق فرماتے ہیں کہ دراصل وجہ اور تھی۔ وہ یہ کہ یعقوب

علیہ السلام کے دل میں یوسف علیہ السلام کے عشق کی آگ بھڑکا کران سے خود ہی غائب کر دیا تاکہ ان کے عشق ومحبت کا امتحان ہو، اور یہ غیرت الٰہیہ سے ہُوا کہ ذاتِ حق کے عشق کے ساتھ دُوسرے کا عشق کیوں اور عرفاء جانتے ہیں۔ سلطان المحبۃ اپنے ملک میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں چاہتا۔ اور جملہ جمال وکمال درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور اس عشق ومحبت کی شرکت میں آزمائش وامتحان کے طور حجاب صرف اولاد کی محبت ہوسکتی ہے جیساکہ نوح علیہ السلام کا حال سب کو معلوم ہے کہ انہوں نے خود ہی کفار کے غرق کرنے کی دُعا مانگی توسب کفار غرق ہو گئے۔ لیکن نوح علیہ السلام کو کسی قسم کا خیال نہ ہُوا۔ لیکن جب جگر گوشہ غرق ہونے لگا، صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، اور بے ساختہ ہوکر عرض کی: ان ابنی من اھلی۔

وَنَحْنُ عُصْبَةٌ حالانکہ ہم ایک جماعت اور کاروبار چلانے اور دُکھ درد ہٹانے میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم ہی اپنے والدگرامی کی محبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ دو چھوٹے اور کمزوروں کی محبت کو ہم بڑی طاقت والے دس بھائیوں پر ترجیح دینے کا کیا معنیٰ۔

ف: عصبہ وعصابہ دس یا اس سے زاید مردوں کو کہا جاتا ہے، اس لیے کہ امور دنیہ اتنی گنتی سے مضبوط اور پختہ ہوتے ہیں۔ اور (نفر میں) سے تا پانچ اور (رہط) پانچ تا دس کو کہا جاتا ہے۔

اِنَّ اَبَانَا بیشک ہمارے والدگرامی دو چھوٹے اور کمزوروں کی محبت کو ہم بڑوں اور طاقتوروں کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں یقیناً، لَفِیْ ضَلٰلٍ۔ ضلال دراصل عدواعن القصد کو کہتے ہیں۔ یعنی تعدیل لائق سے ہٹ جانا یعنی وارفتگی اور محبت میں ہیں۔ مُّبِیْنِ ۝ بمعنے ظاہر الحال۔

ف: یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی نگاہ یوسف علیہ السلام کے ظاہر حال پر پڑی لیکن ان کے علمی ومعنوی کمال کو احاطہ نہ کرسکے۔ اگر انہیں حقیقت حال کی طرف توجہ ہوتی تو یقیناً سمجھتے کہ حقیقۃً یوسف علیہ السلام ان سے بڑے تھے۔

مثنوی شریف میں ہے:

عارفے پرسید ازاں پیر کشیش — کہ تو اے خواجہ من ترپاک ریش

گفت من پیش از و زائیدہ ام — بے زریشی بس جہاں را دیدہ ام

گفت برنیشت شد سفید از حال گشت — خوی زدشت تو نگر دیدہ ام وشت

اولیس از تو زاد و از تو بگزرید — تو چنیں خشکی ز سودائے ثرید

تو بداں رنگی کہ اول زادہ — یک قدم زاں بیشتر ننہادہ

ہمچناں دوغی ترش در معدنے

تو نگر دی زد مخلص لدغنے

ف : کواشی میں ہے کہ سائلین سے صالحین تک درمیان میں وقف نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ کلام اخوت یوسف علیہ السلام سے حکایت کے طور وارد ہوا ہے اس لیے کہ اس کلام کے مقدم و موخر کو آپس میں معنوی تعلق ہے، ہاں جہاں سانس ٹوٹ جائے وقف کر سکتا ہے لیکن پڑھتے وقت وہاں سے شروع کرے جہاں سانس توڑا تھا۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو گنہگار ہو گا۔

(کذا فی لبعض شروح الجزری)

ف : لبعض قرآنوں میں مبین اقتلوا یوسف میں مبین کو مجرور مضموم ہر دو طرح پڑھا گیا ہے اور مضموم اقتلوا کے ضمہ کی وجہ سے۔

سوال : حسد اکبر الکبائر (سخت کبیرہ گناہ) ہے۔ پھر اقدام قتل بے گناہ و دیگر کبائر اخوۃ یوسف سے سرزد ہوئے۔ ادھر تم ثابت کرتے ہو کہ اخوۃ یوسف انبیاء تھے اور انبیاء تو گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔

جواب : عصمتِ انبیاء اس وقت ضروری ہے۔ انہیں نبوت حاصل ہو۔ نبوت سے قبل ایسی عصمت شرط نہیں (لیکن یہ جواب کمزور ہے) اگرچہ یہ جواب امام نے دیا۔ شرح عقاید میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے وحی سے قبل و بعد کفر اور عمداً کبیرہ کے ارتکاب سے معصوم ہوتے ہیں۔ اور اسی پر تمام اہل سنّت کا اجماع ہے۔

ابلیس کی شرارت تیسیر میں ہے کہ جب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے متعلق مشورہ کیا تو شیطان بوڑھا پریشان حال بن کر اخوۃ یوسف کے ہاں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا خیال ہے کہ جب وہ بڑا ہو گا تو وہ تمہیں اپنا غلام بنائے گا۔ بھائیوں نے کہا، تو فرمائیے بابا اس کے متعلق کیا کیا جائے۔ شیطان نے کہا، اِقْتُلُوْا یُوْسُفَ یوسف علیہ السلام کو قتل کر دو اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یا اسے ڈال دو ایسی اوپری اور غیر معروف زمین میں جو آبادیوں سے دُور ہو تاکہ اس میں ہلاک ہو یا ایسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں درندے کھا جائیں۔ اَرْضًا کو نکرہ اور مبہم لانے میں یہی حکمت ہے۔ اس معنی پر نکرہ نہیں کہ کسی ایک زمین میں ڈال دو۔ اسی لیے اسے ظروف مبہمہ کی طرح منصوب پڑھا گیا ہے۔

ف : ظروف مبہمہ وہ ہیں جن کی حدود محصورہ نہ ہوں۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ شہر بدر کرنا قتل کے برابر ہے۔ کما قال تعالیٰ ولولا ان کتب اللہ علیھم الجلاء لعذبھم فی الدنیا ہمارے زمانہ کے بادشاہوں کا یہ طریقہ کار ایسے دور علاقوں میں سزا کے طور بھیج دینا جو اپنے گھروں سے

؎ ہمارے زمانہ کے لیڈروں ۱۲

دور اور اپنے بچوں اور عزیز واقارب سے جدا کرنا، اور پھر بلا سبب ان کے قتل کرنے سے کچھ کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اُمت کی اصلاح فرمائے۔

یَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ۔ یخل امر کے جواب کی وجہ سے مجزوم ہے بمعنی (یخلص) یعنے تمہارے والدگرامی کا چہرہ خالص تمہارے لیے ہوگا اور کلی طور پر تمہاری طرف متوجہ رہیں گے اور تمہارے بغیر کسی کی طرف توجہ اور نہ التفات نہ ہوگا اور ان کی محبت صرف تمہارے لیے مخصوص ہوگی۔

ف : وجہ میں والدگرامی کی توجہ کلی مقصود ہے اس لیے کہ جو بھی کسی کی طرف کلی طور متوجہ ہوتا ہے تو چہرہ اسی طرف پھیر لیتا ہے یہ بھی ہے کہ وجہ سے والدگرامی کی ذات مراد لی ہو۔

وَتَكُونُوا اس کا عطف یخل پر ہے اسی لیے مجزوم ہے۔ مِنْ بَعْدِهٖ یوسف علیہ السلام کے بعد یعنی ان کے قتل یا کہیں دُور پھینکنے کے بعد ہو جاؤ۔ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ○ نیک بخت لوگ یعنی ایسے کہ تمہارے والدگرامی تمہارے کردار سے خوشی کا اظہار کریں یا یوسف علیہ السلام کے قتل وغیرہ سے بارگاہِ حق میں توبہ کرنے والے۔

نسخہ روحانی یہ بھی شیطان کی مکاریوں میں ایک ہے کہ مجرموں وگنہگاروں کو گناہ پر ابھارتا ہے اور تلقین کے طور کہتا ہے۔

ع امروز گنہ کنید و فردا توبہ

آج گناہ کرلو کل توبہ کرلو۔

سبق : آج کا کام کل پر مت چھوڑو، اس لیے کہ کل کے عذر کے لیے بھی کل تک کی مہلت چاہیے حالانکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ؎

کار امروز بفردا نگذاری زنہار

کہ چو فردا برسد نوبت کار دگر است

ترجمہ : آج کا کام کل پر مت چھوڑو اس لیے کہ کل آنے گی تو اس کے لیے بھی کام نکل آئے گا۔

ازالۂ وہم بعض حکماء کے مقولہ "یکون المؤمن یعنی التوبة قبل المعصیة" سے بعض غلط فہموں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مومن وہ ہے جو توبہ کو گناہ کرنے کے لیے تیار رکھتا ہے۔ یہ معنیٰ سراسر غلط ہے بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مومن توبہ میں ڈھیل نہیں کرتا۔ اگر خدانخواستہ اس سے خطا یا بھول کر یا نفس کی شرارت سے مغلوب ہو کر گناہ صادر ہو جاتا ہے تو فوراً توبہ کرتا ہے۔ اول الذکر معنیٰ اس لیے غلط ہے کہ یہ عقلمندی نہیں کہ انسان صاف ستھرے کپڑے کو عمداً کیچڑ میں ڈال دے اس کے بعد پانی سے دھونے لگے یا اس نیت سے زہر کھائے کہ تریاق سے ازالہ ہو جائے گا۔ اس بیوقوف کو کون سمجھائے کہ زہر کھاتے ہی موت حملہ کر دے تو پھر۔ یعنی تریاق کھانے سے پہلے ہی موت آجائے ایسے خیالی کام کسی دیوانے سے تو ہو سکتا ہے۔ عقلمند سے ایسے امور کا صدور نہیں ہوتا ایسے ہی توبہ کی اُمید پر گناہ کا ارتکاب بھی پاگل آدمی کا کام ہے۔

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِن كُنتُمْ
فَاعِلِينَ ﴿١٠﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ﴿١١﴾ أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ
وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿١٢﴾ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَن تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ
وَأَنتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ ﴿١٣﴾ قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَّخَاسِرُونَ ﴿١٤﴾ فَلَمَّا
ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا
وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿١٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ
عِندَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿١٧﴾ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ
بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ
مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾ وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا
غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ
مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾

ترجمہ: ان میں ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف علیہ السلام کو قتل نہ کرو بلکہ اسے اندھے کنویں میں ڈال دو اسے کوئی چلتا مسافر آکر لے جائے اگر تمھیں کچھ کرنا ہے کہنے لگے کہ اباجی آپ کو کیا ہوگیا ہے کہ آپ یوسف کے متعلق ہمارے اوپر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اُس کے خیر خواہ ہیں کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے وہ میوے کھائے اور کھیلے اور بیشک ہم اُس کے نگہبان ہیں یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اُسے تمہارا لے جانا مجھے غم میں ڈالے گا اور مجھے خوف ہے کہ اُسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو۔ کہنے لگے کہ اگر اُسے بھیڑیا کھا جائے اور ہم ایک طاقت ور جماعت ہیں جب تو بیشک ہم بڑے خسارے والے ہیں۔ پھر وہ جب یوسف علیہ السلام کو لے گئے اور سب کی یہی رائے طے ہوئی کہ اسے اندھے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے یوسف علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ آپ انھیں اُن کی جملہ کارروائیاں جتلا دیں گے ایسے وقت میں کہ وہ نہ جانتے ہوں گے اور شام کے اندھیرے میں روتے ہوئے والد گرامی کے ہاں حاضر ہوئے، بولے: اباجی! ہم دوڑتے ہوئے دُور جنگل میں نکل گئے اور یُوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تو اُسے بھیڑیا کھا گیا اور آپ تو ہماری بات پر یقین نہ کریں گے اگرچہ ہم سچے ہیں اور یوسف علیہ السلام کے کُرتے پر ایک جھوٹا خون لگا کر لائے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات تمہارے لیے گھڑ لی ہے پس میرے لیے صبر اچھا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے مدد کا خواستگار ہوں اس پر جو تم بیان کرتے ہو اور قافلہ آیا انہوں نے اپنا پانی لانے والا کنویں پر بھیجا تو اُس نے اپنا ڈول کنویں میں ڈالا۔ پانی والے نے کہا

آہا کیسی خوشی کی بات ہے یہ تو ایک حسین لڑکا ہے اور انہوں نے یوسف علیہ السلام کو ایک پونجی بنا کر چھپا لیا، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ کرتے تھے اور یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے کھوٹے داموں گنتی کے روپلوں پر بیچ ڈالا اور اُنھیں اس میں کسی قسم کی رغبت نہ تھی۔

تفسیر عالمانہ قَالَ یہ جملہ مستانفہ ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے سوال یہ ہے اس تجویز کو تمام بھائیوں نے مان لیا یا اس میں کسی نے اختلاف کیا اس کے جواب میں فرمایا کہ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا اس سے یہودا مراد ہے یہی سب سے زیادہ سمجھدار اور صائب الرائے تھا کہ انہوں نے تو یوسف علیہ السلام کے قتل کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن اُس نے موافقت نہ کرتے ہُوئے کہا لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ یوسف علیہ السلام کو قتل نہ کرو اس لیے کہ قتل ایک عظیم جُرم ہے اور پھر بلا سبب اور نہ ہی اسے کہیں دُور پھینکو کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا قتل ہے وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ اسے بجائے دُور کی زمین میں پھینکنے کے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دو۔ غیابت بمعنے قعر، یعنی گڑھا و گہرائی اور کنوئیں کے نیچے کا حصہ جس میں تاریکی ہو اسے الجُب بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وُہ جگہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے اور الجب وُہ کنواں جس کی گہرائی میں مٹی چڑھ جائے تو اسے کھوُدا نہ جائے اس لیے کہ اب اس میں سوائے زمین کے تودوں کے اور کچھ نہیں جب اسے کھودا جائے تو پھر اسے " بئر " کہا جاتا ہے یَلْتَقِطْهُ اسے تلف و ضائع ہونے سے حفاظت کے ارادے پر اُٹھائے گا۔ التقاط بمعنے اخذ شی مشرف علی الضیاع ہلاکت کے منہ سے شے کو لینا۔

بَعْضُ السَّیَّارَةِ۔ سیارہ کی جمع ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے بمعنے سیّاح یعنی سیر و سیاحت کرنیوالے یعنی اُسے اُٹھا لے جائے گا۔ بعض مسافر جو اس جگہ پہنچ کر کسی اور جگہ لے جائے تم اُسے جلا وطن کرنے سے بچ جاؤ گے اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝ اگر تم یہی چاہتے ہو کہ وہ تمہارے والدگرامی سے دُور ہو تو تم میرے مشورہ پر عمل کرو۔ اس طرح سے تم اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں اور ایک عظیم جُرم کے ارتکاب سے بھی بچ جاؤ گے۔

سوال: اپنی رائے کو شک کے ساتھ کیوں ظاہر کیا حالانکہ اُسے تو یقین کے طور کہنا چاہیے تھا۔

جواب: تالیف قلوب کی غرض سے ایسے کہا جاتا ہے تاکہ وُہ اسے تحکم (زبردستی اور زور آوری) پر محمول نہ کریں۔

ف: سعدی مفتی مرحوم نے فرمایا کہ اسی قائل کی تدبیر بہ نسبت دُوسروں کے احسن تھی کہ اس سے ان کا مقصد بھی حل ہو گیا کہ جو مسافر یوسف علیہ السلام کو لے جائے گا تو کہیں دُور لے جائے گا اس سے والدِ گرامی بھی ناراض نہ ہوں گے نہ ہی اُن کی کارروائی سے مطلع ہوں گے۔

سبق: یہی آجکل کے یاروں دوستوں کا حال ہے بالخصوص ہمارے بعض سیاسی لیڈروں کا کہ ان کی باتیں سُنو تو شہد سے میٹھی، لیکن دل زہر اور شر و فساد سے لبریز۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

جامی ابنائے زماں از قول حق صمٌ و بکمٌ — نام ایشاں نیست عند اللہ بجز شر الدواب
در لباس دوستی سازگارند دشمنی — حسب الامکان واجبت از کید ایشاں اجتناب
شکل ایشاں شکل انساں فعلشاں فعل جاع — ہُم ذئاب فی ثیاب او ثیاب فی ذئاب

ترجمہ: جامی ہمارے ہم زماں حق سے گونگے بہرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا شرارتی جانور ہیں دشمن ہیں لیکن بظاہر دوستی کا دم بھرتے ہیں، حسب الامکان ان سے دور رہو۔ اُن کی شکل وصورت تو انسانوں کی ہے لیکن اُن کے کردار درندوں جیسے ہیں۔ یہ انسانی لباس میں بھیڑیے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ حواس وقوائے انسانی کا حال ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام یعنی قلب کو خواہشات کی چھری سے قتل کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ قلب کی موت سے ہی نفسانی خواہشات کے تقاضے اچھی طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ خواہشات کو پورا کرنے سے قلب کی موت واقع ہوتی ہے اسی لیے وہ کوشش کرتے ہیں کہ قلب کو ارض بشریت میں پھینک دیں اس لیے کہ قلب کی موت کے بعد رُوح پورے طور حواس وقوائے نفسانی کی طرف متوجہ ہوتا ہے یعنی اُن کی خواہشات مکمل طور پوری کرتا ہے پھر جانتے ہیں کہ قلب کی موت کے بعد اچھی طرح ناز و نعم کے مزے لوٹیں گے قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ سے قوتِ متفکرہ مراد ہے، وہ کہتی ہے کہ یوسف قلب کو قتل کرنے اور دُور کی زمین پر پھینکنے کی بجائے جسم اور اسفلِ بشریت میں چھپا دو تاکہ اُسے حوادث نفسانیہ کا کوئی ایک اُسے اُٹھا کے لے جائے یعنی اپنی لپیٹ میں لے لے گا اگر تم میری بات مان لو کذا فی التاویلات النجمیہ)

ف: حقیقی حیات قلب کے زندہ رہنے میں ہے اس لیے کہ قلب اللہ تعالیٰ کا گھر اور اُس کے استواءِ مقام عرش ہے۔

ف: حضرت شیخ ابو عبد اللہ بن فضل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس انسان سے تعجب ہے کہ بڑے جنگل اور سخت قسم کے راستے طے کر کے اپنے گھر میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے وہ یوں کیوں نہیں کرتا کہ خواہشاتِ نفسانی اور قوائے حیوانی کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کے گھر یعنی قلب میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا وصال کرلے اس لیے کہ قلب ہی اللہ تعالیٰ کے وصال کا مرکز ہے۔

نسخۂ روحانی: ذکر اللہ وصال الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

ف: حضرت شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی الترمذی الحکیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ذکر اللہ قلب کو تروتازہ بناتا ہے جو ذکرِ الٰہی سے محروم ہو تو اُس قلب پر نفس کی حرارت ونارِ شہوت نفسانی گھیر لیتی ہے اس طرح سے دِل سُست بلکہ خشک ہو جاتی ہے اُس کی سُستی وخشکی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ تمام اعضاء طاعتِ الٰہی سے کتراتے ہیں۔ جب تم اس حال کو پہنچو تو قلب کی اصلاح مشکل ہو جاتی ہے پھر اسے سوائے ختم ہونے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا جیسے درخت جب سُوکھ جاتا ہے تو کسی کام کا نہیں رہتا اسے کاٹ کر ایندھن بنایا جاتا ہے۔ ایسے ہی دل جب اس حالت کو پہنچتا ہے تو پھر سوائے جہنم کے ایندھن بننے کے

اور کسی کام کا نہیں ہوتا۔ (اعاذنا اللہ منہا)

تفسیر عالمانہ قَالُوْا منقول ہے کہ تمام بھائیوں نے یہودا کا مشورہ مان لیا اور یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالنے کی ٹھان کر والد گرامی کے ہاں حاضر ہوئے اور عرض کی: یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی اجازت بخشئے آجکل فصلِ بہار زوروں پر ہے ہم اپنے پیارے بھائی یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے جائیں گے اسے فصلِ بہار کا تماشا دکھائیں گے اس سے ہمارا بھائی خوش ہوگا۔ یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا کہ یوسف علیہ السلام کے ہجر و فراق سے میرا دل گھبراتا ہے اسی لیے اس تکلیف میں مجھے مت پھنساؤ۔ ؎

حریفاں در بہار عیش خنداں

من اندر کنج غم چوں دردمنداں

ترجمہ: میرے حریف عیش بہار میں خوش ہیں لیکن میں دردمندوں کی طرح گوشۂ غم میں ہوں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام سے ناامید ہوکر یار لوگ یوسف علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے اور سبز باغ دکھائے اور جنگل کی چہل پہل اور تماشا عجیب کی لالچ میں پھنسایا۔ ؎

موسم گل دو سہ روز یست غنیمت دانید

کہ دگر نوبت تاراج خزاں خواہد بود

ترجمہ: گل کا موسم دو تین دن ہوتا ہے اسے غنیمت جانو ورنہ خزاں آئے گی تو انہیں بھی ختم کر دے گی۔

یوسف علیہ السلام نے جونہی تماشا کا نام سنا تو آپ کا دل جنگل کی جانب کھچنے لگا اور بھائیوں کے ساتھ مل کر والد گرامی سے جنگل میں جانے کی رخصت چاہی گویا زبانِ حال سے یوں عرض کیا: ؎

زیں تنگنائے خلوتم خاطر بصحرا می کشد

کز بوستاں باد سحر خوش می دہد پیغام را

ترجمہ: گوشۂ تنہائی سے میرا جی جنگل کے لیے چاہتا ہے اس لیے کہ بادِ سحر وہاں سے اچھی خوشبو لاتی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام شش و پنج میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے جب خود یوسف جنگل کو جانے کے لیے تیار ہو گیا ہے اس واقعہ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا یٰٓاَبَانَا اس خطاب سے اپنا تعلق نسب اظہار کرتے ہیں اور گویا یقین دلاتے ہیں کہ بھائی یوسف علیہ السلام کی پوری نگرانی کریں گے والد گرامی کو جو ہمارے متعلق خدشہ ہے اسے دل سے دور فرمائیں جبکہ انہیں یوسف علیہ السلام سے حسد و بغاوت کا اندیشہ تھا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا اے ابا جی! آپ کو یوسف علیہ السلام کو رخصت نہ دینے سے کون سا خطرہ ہے عَلٰى يُوْسُفَ جبکہ ہم یقین سے عرض کرتے ہیں کہ

یوسف علیہ السلام ہمارا بھائی اور آپ ہم سب کے والدِ گرامی ہیں۔

ف: "لَا تَأْمَنَّا" مالک کے فعل مقدر سے حال ہے جیسے کہا جاتا ہے مالک قائمًا کہ در اصل ما تصنعُ قائمًا تھا۔

وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ○ یہ واؤ حالیہ لَا تَأْمَنَّا کے مفعول سے حال ہے اب معنیٰ یہ ہُوا کہ آپ یوسف کے متعلق ہم پر اعتماد کیوں نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اُس کی بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں بلکہ بڑی شفقت سے اُس کے پیش آتے ہیں ہم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اس کی محبت و شفقت میں کمی کرتا ہو۔ خلاصہ یہ کہ ہم سب اُس کے خیر خواہ اور نہایت درجہ کے شفیق و مہربان ہیں۔ أَرْسِلْهُ مَعَنَا اسے کل جنگل کو جانے کے لیے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے۔ غَدًا يَرْتَعْ ہر طرح کے پھل فروٹ کھائیگا۔ ارتع بمعنے الاتساع فی الملاذ۔ وَيَلْعَبْ دوڑ لگائے گا، تیر اندازی کرے گا غرضیکہ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے طریقے سیکھے گا۔

سوال: اگر ان کا یہی مقصد تھا تو اسے لعب سے کیوں تعبیر کیا ہے؟

جواب۱: چونکہ اس کی ظاہری صورت لہو ولعب کی ہوتی ہے اس لیے اسے لعب سے تعبیر کیا ہے۔

جواب۲: اس وقت نبی نہیں تھے اسی لیے اُس وقت ان کے لیے معیوب نہیں تھی۔

جواب۳: لہو ولعب سے ایسے مباحات مراد ہیں جن سے طبع کو سرور و فرحت حاصل ہو جیسے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا، هَلَّا بِكْرًا۔ باکرہ عورت سے نکاح و بیاہ کرنا تھا۔ تُلَاعِبُهَا وَ تُلَاعِبُكَ وہ تیرے ساتھ ہنسی مذاق کرتی تم اس کے ساتھ کرتے۔ اس سے بھی مباح لہو ولعب مراد ہے۔

جواب۴: اس سے وہ لہو ولعب مراد نہیں جو شرعاً ممنوع ہیں بلکہ اس سے مزاح (خوش طبعی) مراد ہے اور وہ گناہ نہیں[1]۔

مزاح کے جواز کی دو دلیلیں

① حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: لا باس بفکاھۃ یخرج بھا الانسان۔ مزاح میں کوئی حرج نہیں جب دوسرے کے لیے ناراضگی کا موجب نہ ہو۔ (روح البیان ج ۴ ص ۲۲۱۔ تحت آیت یرتع ویلعب)

② حکایت: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہُوا اور عرض کی کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ میں نے خواب میں تیری ماں سے جماع کیا (احتلام ہوا)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: اُسے سورج میں کھڑا کر کے سورج کی دھوپ کے ڈنڈے مارو۔

وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ اور ہم اس کی ہر دُکھ اور تکلیف سے نگرانی کریں گے۔ قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي جملہ مستانفہ ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ ان کی یقین دہانی کے بعد یعقوب علیہ السلام نے کیا فرمایا۔ جواب دیا کہ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: میں سخت مغموم و محزون ہوں گا۔ أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ یہ کہ تم اُسے مجھ سے جُدا کر کے لے جاؤ گے کیونکہ مجھے

---

[1] اس کے متعلق فقیر اویسی کا رسالہ "الاضاحیک فی المضاحیک" پڑھیے ۱۲

ترجمہ: یہ بھی حکمِ ربانی وتقدیرِ یزدانی کا کرشمہ ہے کہ کنواں بھی سامنے ہے لیکن تم اس سے بچ نہیں سکتے۔
وَاَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ ۝ اور تم تماشہ اور کھیل میں محو ہو کر یوسف علیہ السلام سے بے خبر ہو۔

ے

ازاں ترسم کزو غافل نشینید
زغفلت صورت حالش نہ بینید

ترجمہ: مجھے خطرہ ہے کہ تم اس سے غافل بیٹھو گے، غفلت سے اسے نہ دیکھو گے۔

ے

دریں دیرینہ دشت محنت انگیز
کُہن گرگے برو دنداں کند تیز

ترجمہ: اُس محنت انگیز پرانے جنگل میں بوڑھا بھیڑیا اُس پر تیز دانت ڈالے گا۔

قَالُوۡا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا بخدا لَئِنۡ اَكَلَهُ الذِّئۡبُ اگر یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ حالانکہ ہم بہت بڑی جماعت اور سب کے سب موٹے تازے ہیکل اور رستم زماں ہیں کہ ہمارا ایک جوان دس شیروں کا تنہا مقابلہ کرسکتا ہے اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ۝ بیشک ہم اُس وقت جبکہ اپنے پیارے بھائی یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے کے سپرد کرنے میں سخت خسارہ والے ہوں گے۔ الخسار سے مشتق ہے بمعنے الہلاک یعنی ذلیل وخوار اور عاجز ہو کر مرنے والے۔

ف: الکواشی میں ہے کہ والد اور بھائی کی بے حرمتی سے تباہ ہونے والے۔

سوال: یعقوب علیہ السلام کے سوال کا جواب تو دیا لیکن دُوسرے کو یوں کیوں چھوڑ دیا۔

جواب: چونکہ یہی سوال اہمیت رکھتا تھا اور سوال اوّل یوسف علیہ السلام کی جُدائی کا تھا وُہ چند لمحات کے لیے تھا اور وہ ظاہر کر چکے کہ تھوڑے عرصہ تک جُدائی برداشت کرلیں پھر اسے جلد واپس لائیں گے۔

ف: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ مخالف کو کوئی ایسی بات نہ بتانی چاہیے جس سے وہ مخالفت کا پہلو اختیار کر سکے جیسے یعقوب علیہ السلام نے اخوۃ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے کے کھانے کا بتایا حالانکہ اس سے قبل انہیں معلوم نہیں تھا کہ بھیڑیا بھی انسان کو کھا جاتا ہے۔ جب یعقوب علیہ السلام نے ان یاکلہ الذئب فرمایا تب انھیں معلوم ہوا۔

حدیث شریف: کبھی انسان مصیبت کا شکار اپنے کلام سے بھی ہو جاتا ہے مثلاً کوئی کہے کہ بخدا میں فلاں نہیں کروں گا تو شیطان اُس کے درپے ہو کر اُس سے وہی کلام کرا لیتا ہے۔

اُس کی جدائی ناگوار ہے اور اس کے بغیر میں بے صبر ہو جاتا ہوں۔

سوال: مضارع پر لام داخل ہو تو اس میں حال کا معنیٰ ہوتا ہے یہاں مستقبل کا معنیٰ ہے اس میں فاعل کا فعل پر تقدم لازم آتا ہے حالانکہ فاعل فعل کے بعد واقع ہوتا ہے۔

جواب: یہاں فعل قصد محذوف ہے۔ دراصل قصد ان تذهبوا الخ تھا اور یعقوب علیہ السلام کا قصد حالی ہے یا اس سے تصور واقع مراد ہے اور علت غایہ میں تصور و توقع فعل کے وقوع سے پہلے ہوتا ہے۔

وَاَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَهُ الذِّئْبُ علاوہ ازیں مجھے خطرہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا جائے۔ اس لیے کہ وہ علاقہ بھیڑیوں کا مرکز تھا۔ اور الذئب کی لام عہد ذہنی کی ہے۔

ف: الحزن یعنی الم القلب بفوت المحبوب یعنی محبوب کے فوت ہونے سے قلب کو درد پہنچنے کو حزن کہا جاتا ہے الخوف یعنی انزعاج النفس لنزول المکروہ مکروہ شے کے نزول سے نفس کے پریشان ہونے کا نام خوف ہے اسی لیے حزن کا ذہاب یوسف کی طرف اسناد ہے کیونکہ یعقوب علیہ السلام یوسف کے لیے دائمی مواصلت و مصاحبت چاہتے تھے اور خوف کا توقعی اکل ذئب کی طرف اسناد ہے۔

یعقوب علیہ السلام کا علمِ غیب برائے یوسف علیہ السلام

مروی ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ گویا ایک پہاڑ پر ہیں اور یوسف علیہ السلام ایک جنگل میں کھڑے ہیں کہ ان پر گیارہ بھیڑیوں نے حملہ کر دیا۔ اسی اثناء میں ان کے درمیان گم ہو گئے اسی لئے اپنے بیٹوں کو یوسف علیہ السلام کے بارے میں اکل ذئب کا خوف دلایا۔

سوال: جب یعقوب علیہ السلام نے خواب میں ایسا واقعہ دیکھا اور تم مدعی ہو کہ یعقوب علیہ السلام علم غیب بعطائے الٰہی رکھتے تھے اور یہ بھی کہتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام تعبیر رؤیا کے ماہر تھے یعنی جس طرح کی تعبیر بتاتے وہ صحیح ہوتی اور اب کی بار خواب بھی خود دیکھا لیکن اس کے باوجود اپنے صاحبزادے یوسف علیہ السلام کو ان کے دشمنوں حاسدوں کے ہاتھ میں دے دیا۔

جواب: ہم جہاں ان کے علم غیب کے قائل ہیں اور تعبیر رؤیا کے یقیناً عالم تھے لیکن یہ بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تقدیر ربانی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ یہاں یعقوب علیہ السلام نے تقدیر ربانی کے سامنے سر جھکا دیا اور عام قاعدہ ہے۔ اذا جاء القضاء عمی البصر۔ جب تقدیر ربانی آتی ہے تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

ع

ایں ہم از تاثیر حکمت و قدر
چاہ می بینی و نتوانی حذر

حدیث شریف : حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سی باتیں میرے خیال میں آتی ہیں کہ میں انھیں بیان کردوں لیکن خطرہ ہوتا ہے کہ اگر کہوں تو ممکن ہے اس میں مبتلا ہوجاؤں۔ (یہ اُمّت کو سبق کے طور فرمایا)

حکایت ابن السکیت لغت کا ایک امام ہے وہ ایک دن متوکل باللہ (خلیفۂ وقت) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ متوکل کے دو بیٹے معتز باللہ و مؤید باللہ آ گئے۔ متوکل باللہ نے ابن السکیت سے پوچھا کہ میرے یہ دو لڑکے تجھے محبوب تر ہیں یا امام حسن و امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ ابن السکیت نے فرمایا : بخدا میرے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا درجہ تیرے اور تیرے دونوں بیٹوں (معتز باللہ و مؤید باللہ) سے افضل ہے۔ متوکل باللہ نے جلیش میں آکر حکم دیا کہ ابن السکیت کی زبان گدّی سے کھینچ لو۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا۔ ابن السکیت اسی صدمہ سے اسی رات فوت ہوگیا۔

اعجوبۂ روزگار ابن السکیت متوکل باللہ کے ان دونوں لڑکوں کے استاد تھے اور اپنی موت سے پہلے اپنے دونوں شاگردوں کو مندرجہ ذیل دو شعر پڑھ کر سناتے تھے : ؎

یصاب الفتی من عثرۃ بلسانہٖ　　　ولیس یصاب المرء من عثرۃ الرجلِ

فعثرتہ فی القول تذہب راسہٖ　　　وعثرۃ فی الرجل تبراء علی مھلِ

ترجمہ : مرد کو زبان کی غلطی سے جتنی سزا ملتی ہے اتنی پاؤں کی خطا سے نہیں اس لیے کہ زبان کی خطاء سے سر اڑ جاتا ہے اور پاؤں کی سزا چندروزہ ہوتی ہے جس سے تندرست ہوسکتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ قلب جب تک روح کی نگرانی میں ہو اُسے حواس و قوائے نفسانی نہیں چھیڑتے جب وہ قلب کو روح سے تمتعات حیوانیہ کا جھانسہ دے کر اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں تو قلب (یوسف) کو رُوح یعقوب سے غائب کرکے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اگرچہ رُوح کو معلوم ہے کہ اگر قلب (یوسف) ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے سخت سے سخت گزند پہنچائیں گے اگرچہ وہ حواس و قوائے نفسانی روح کے سامنے بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں کہ ہم قلب (یوسف) کے بڑے خیرخواہ ہیں اور دشمنوں سے اس کی ہر طرح کی حفاظت اور نگرانی کریں گے۔ لیکن جب وہ قلب (یوسف) کو روح (قلب) سے دُور لے جاتے ہیں تو بھیڑیا (شیطان) اُن سے جھپٹ مار کر اپنے قبضے میں کرکے قلب کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلب کی تباہی و بربادی سے انسان کے تمام اعضاء و اجزاء تباہ و برباد ہوجاتے ہیں اور اگر قلب صحیح و سالم رہے تو تمام اعضاء و اجزاء کو سلامتی نصیب ہوتی ہے۔

سبق : عاقل وہ ہے جو دنیا کے ساتھ لڑکوں کی طرح لہو و لعب میں مشغول نہیں بلکہ اسے فتنہ و فساد اور اس کی جملہ آفات و بلیات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور نفس کی باگ اپنے ہاتھ میں مضبوط رکھتا ہے تاکہ وہ خواہشات کے کنویں میں گر کر تباہ و برباد نہ ہو بلکہ وہ ہر لحظہ خواہشات نفسانی کو جڑ سے اکھاڑنے کے درپے اور ماسوی اللہ کو ترک کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔

؎ وصل میسر نشود جز بقطع　　　قطع نخست از ہمہ ببرید نست

ترجمہ: وصالِ یار ماسوی اللہ کے انقطاع سے نہیں ہو سکے گا۔ انقطاع یہی ہے کہ ماسوی اللہ سے بالکل فارغ ہو جاؤ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفس و شیطان کی باتوں کی طرف کان دھرنے سے بچائے اور سب کو مفارقت اور ذلت و خواری کی تکالیف سے محفوظ فرمائے۔ وہی کریم اور منان ہے۔ (آمین)

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ اس کا متعلق فعل محذوف سے ہے۔ در اصل عبارت فاذن الخ یعنی ان کے بار بار اصرار پر یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو جنگل میں جانے کی اجازت بخشی۔ جب یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی لے گئے تو اس کا جواب فعلوا به الخ محذوف ہے یعنی لے جانے کے بعد خوب اذیتیں اور تکالیف دیں۔

بھائیوں کے ساتھ روانگی کا آغاز

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق جب اُن کے بھائیوں کا اصرار بانکرار اور عہد معاہدہ پر سخت قسم کی پختگی دیکھی اور خود یوسف علیہ السلام کا ارادہ بھی سیر و سیاحت کا ملاحظہ فرمایا تو قضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا کر پیارے بچے کو بھائیوں کے ساتھ جانے کی اجازت بخشی اور حکم فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو نہلائیں اور نئے کپڑے پہنائیں۔

یوسف علیہ السلام کی روانگی کے وقت اعزاز و اکرام

حضرت جبریل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے غسل کے لیے بہشت سے وہی تھال لائے جو ابراہیم علیہ السلام کے لیے فدا ہونے والے دُنبہ کے لیے لائے اور اسی میں ذبح کردہ خون محفوظ کر لیا گیا۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے پیارے یوسف کو کنگھا کرو اور وہی تیل لگاؤ جو جبریل علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کے لیے بہشت سے لائے تھے اور یوسف علیہ السلام کو تیل، سُرمہ لگایا اور نہلایا دُھلایا اور نئے کپڑے پہنائے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام کو بہشتی قمیص کا عطیہ

مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا جا رہا تھا تو آپ کے کپڑے اتار لیے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو بھیجا کہ انھیں ریشمی پوشاک (قمیص) پہناؤ۔ اور جب ابراہیم علیہ السلام ریشمی پوشاک سمیت آگ سے محفوظ رہے تو وہی قمیص آپ نے اسحاق علیہ السلام کو دیا اور یعقوب علیہ السلام نے اس کا تعویذ بنا کر یوسف علیہ السلام کے گلے میں لٹکایا۔

یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کے الوداع پر اظہارِ تاسف

کاشفی نے فرمایا کہ جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے پیارے بیٹے یوسف علیہ السلام کے گلے میں تعویذ لٹکایا تو الوداع کرنے کے لیے اپنے بیٹوں کے ساتھ شجرۃ الوداع (جو کنعان کے دروازہ پر تھا) تک تشریف لائے اور الوداع کہتے ہوئے پیارے بیٹے یوسف علیہ السلام کو گلے لگا کر رونے لگے۔ گویا فرمایا: ؎

نمی خواست جُدائی ز تو اما چہ کنم
دورِ ایام نہ قاعدۂ دلخواست

ترجمہ: آپ کی جدائی کے لیے جی تو نہیں چاہتا لیکن دورِ زمانہ کسی کے دل کی خواہش پر نہیں چلتا۔

ع

تجری الریاح بما لا تشتہی السفن

ترجمہ: کبھی ہوائیں کشتیوں کے خلاف چلتی ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کی: اباجی! یہ رونا کیسا؟

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: بیٹا! آپ کی روانگی سے غم اور درد کی بُو آتی ہے، نہ معلوم آگے کیا ہونے والا ہے بس میری وصیت یاد رکھنا، جہاں رہو ہمیں دعاؤں سے فراموش نہ کرنا ہم آپ کو دعاؤں میں یاد رکھیں گے[1] (اللہ حافظ)

ع

فراموشی نہ شرطِ دوستاں ہست

ترجمہ: فراموشی دوستوں کا شیوہ نہیں۔

لیکن یوسف علیہ السلام کے بھائی نگرانی وحفاظت کے لیے زمین وآسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

بھائیوں کے ظلم وستم کی داستان

حضرت یعقوب علیہ السلام سے رخصت ہو کر چلے تو بھائیوں نے عزت واحترام کے نذرانے پیش کیے اور یعقوب علیہ السلام دُور تک پیارے بچے کو دیکھ کر آنسو بہاتے رہے۔ ؎

ہنوز سرِّ روانم از چشم نا شدہ دور
دل از تصور دوری چو بید لرزانست

ترجمہ: ابھی میرا سرِ رواں آنکھوں سے اگرچہ اوجھل نہیں ہُوا لیکن دل مفارقت کے تصور سے بید کی طرح لرزاں ہے۔

جب برادرانِ یوسف والدِ گرامی سے غائب ہُوئے یعنی کنعان کی طرف روانہ ہُوئے۔ جب والد کی نظروں سے اوجھل ہُوئے تو والد کی تمام وصیتیں بُھلا دیں اور یُوسف علیہ السلام کو کاندھے سے نیچے دے مارا اور کہا: اے جھُوٹے خواب والے! کہاں ہیں وُہ تمہارے ستارے جو تُو نے دیکھے اُن کو بلاتے تجھے آکر چھُڑائیں۔ یہی کہتے اور خُوب ضربیں مارتے

---

[1] یہی علم نہیں تو اور کیا ہے۔ ولکن الوھابیہ قومٌ لا یعقلون۔

جب ان میں کسی ایک سے فریاد کرتا تو وہی دھکے دیتا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ پیٹتا۔ یوسف علیہ السلام الحاح وزاری کرتے ہوئے غائبانہ والدِ گرامی سے عرض گزار ہوئے، اباجی! ان کا حال دیکھیے کیسے آپ سے وعدہ کرکے جلد بھول گئے اور عہد شکنی کر کے تیرے پیارے بیٹے سے گستاخانہ سلوک کر رہے ہیں۔ اس کے بعد یوسف علیہ السلام نے یہوداؔ سے کہا۔ کاشفی نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جب والد سے دُور لے گئے تو کاندھوں سے انہیں اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا، بھوکے پیاسے نازنین یوسف علیہ السلام کو زمین پر گھسیٹا، یہاں تک کہ ان کی جان لبوں پر آ گئی۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو روبیلؔ (بھائی) نے جب زمین پر دے مارا تو پہلے کئی سخت کوڑے مارے، پھر سینہ مبارک پر چڑھ گیا اور گردن مروڑی یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کی گردن ٹوٹنے کو آئی تو پھر یہوداؔ سے فرمایا کہ افسوس تم اپنی آنکھوں سے میرا حال دیکھ رہے ہو تمہیں حبہ بھر بھی رحم نہیں آتا۔ چونکہ یہوداؔ یوسف علیہ السلام سے قدرے شفقت اور نرمی سے پیش آتا تھا اس لیے آپ نے اسے فرمایا تو اس نے دیگر بھائیوں سے کہا کہ تم نے میرے ساتھ یہی معاہدہ کیا تھا کہ یوسف (علیہ السلام) کو قتل نہیں کریں گے، اب اسی معاہدہ کے مطابق قتل کرنے سے باز آجاؤ اور وہی تدبیر کرو جو ہماری متفقہ تجویز تھی کہ یوسف (علیہ السلام) کو کنویں میں ڈالیں گے۔ اس طرح وہ اپنی غلط کارروائی سے باز آئے۔ یہوداؔ نے کہا کہ اسے کنویں میں ڈالو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ اور سب نے اتفاق کیا کہ یوسف (علیہ السلام) کو کنویں کی گہرائی میں ڈالیں۔ اور یہ کنواں یعقوب علیہ السلام کے گھر (جو کنعان میں تھا) سے نو میل دور اردن کے علاقہ میں واقع تھا، اسے شدادؔ نے کھدوایا تھا۔ جب اس نے بلاد اردن کو آباد کیا اُس کا اُوپر کا حصّہ تنگ اور نیچے کا چوڑا تھا۔

ف: کاشفی نے لکھا کہ وہ ستّر گز یا اس سے زائد تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں

حضرت یوسف علیہ السلام کے کپڑے اتروا کر انھیں لٹکایا گیا۔ اس سے پہلے آپ کے ہاتھ باندھے گئے اور رسّی سے باندھ کر کنویں میں ڈالے گئے۔

ف: حضرت یوسف علیہ السلام کا قمیص اس لیے اتارا گیا تاکہ اسے خون آلود کر کے والدِ گرامی کو دکھائیں کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ جب یوسف کنویں میں ڈالے جانے لگے تو بھائیوں سے فرمانے لگے کہ قمیص واپس کر دو تاکہ زندگی کی صورت میں تن ڈھانپ سکوں اور بصورتِ موت کفن بنا سکوں۔ لیکن انہوں نے قمیص دینے سے انکار کر دیا اور کنویں میں گرا دیا۔ کنویں میں پہنچ کر یوسف علیہ السلام ایک گوشہ میں کھڑے ہو کر خوب روئے۔ بھائیوں نے اُوپر سے ندا دی: اے یوسف! کیا حال ہے؟ یوسف علیہ السلام نے سمجھا ممکن ہے رحمت و شفقت سے بلا رہے ہوں۔

آپ نے جواب دیا: ٹھیک ہوں۔ ظالموں نے اوپر سے پتھر پھینکنا چاہا تاکہ وہ پتھر سے مرجائیں لیکن یہودا نے انہیں ایسا کہنے سے روک لیا۔

جبریل علیہ السلام کی مدد جب یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا (جبکہ وہ سدرۃ المنتہیٰ پر تھے) ادرک عبدی۔ میرے بندے کو جلد ہاتھ میں لے لو قبل اس کے کہ وہ کنوئیں کی تہہ میں پہنچیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے فوراً سدرۃ المنتہیٰ سے پرواز فرمائی اور یوسف علیہ السلام ابھی کنوئیں کی تہہ تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ جبریل علیہ السلام نے انھیں اپنے ہاتھوں پر لے لیا اور بآرام ایک پتھر پر بٹھا دیا اور بہشت سے آب وطعام آپ کی خدمت میں پیش کیا اور قمیص ابراہیم علیہ السلام کا جو تعویذ آپ کے بازو پر بندھا ہوا تھا، بازو سے اتار کر یوسف علیہ السلام کو پہنایا۔

ف: حضرت یوسف علیہ السلام کو جب کنوئیں میں ڈالا گیا تو اس وقت آپ کی عمر مبارک بارہ سال کی تھی اور والد گرامی کو اسیؔ سال کے بعد مصر میں ملے۔ بعض روایات میں ہے کہ اُس وقت آپ کی عمر سترہ سال اور بعض روایات میں اٹھارہ سال تھی۔

یوسف علیہ السلام کی کرامت[1] مروی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کنوئیں میں تشریف لے گئے تو موذی سانپوں وغیرہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ گھروں سے مت نکلو تاکہ نبی علیہ السلام ہماری وجہ سے مغموم ومحزون نہ ہوں۔ (سبحان اللہ) موذیوں کو بھی نبیٔ وقت کا ادب ہے۔ لیکن وہ موذیوں سے بھی بدتر ہیں جو امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب سے محروم ہیں۔

گستاخِ نبوت کی سزا مروی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈرانے کے لیے افعی (اژدہا) نے اپنی بِل سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا تو جبریل علیہ السلام نے ایسا دھڑکا دیا کہ قیامت تک افعی اژدہا کی تمام نسل بہرہ ہوگئی۔

دُعائے یوسف علیہ السلام یوسف علیہ السلام جب کنوئیں میں تشریف لے گئے تو آپ نے یہ دُعا پڑھی:

يَا شَاهِدًا غَيْرَ غَائِبٍ وَّيَا قَرِيْبًا غَيْرَ بَعِيْدٍ وَّيَا غَالِبًا غَيْرَ مَغْلُوْبٍ اِجْعَلْ لِّيْ مِنْ اَمْرِيْ فَرَجًا وَّ مُخْرَجًا۔

ترجمہ: اے شاہد ذات تُو غائب نہیں، اے قریب ذات تُو بعید نہیں، اے غالب ذات تو مغلوب نہیں مجھے معاملات میں کشادگی عطا فرما۔

---

[1] وہ خوارق عادات جو انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت ظاہر ہوں اسے اصطلاح شریعت میں کرامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ایک روایت میں یہ کلمات ہیں؛

اِجْعَلْ لِیْ فَرَجًا مِّمَّا اَنَا فِیْہِ۔

میرے اسی معاملہ میں کشادگی عطا فرما۔

چنانچہ اس دعا کی یہ کرامت ہوئی کہ فوراً کنویں سے نکال لیے گئے۔ کواشی نے لکھا کہ کنویں میں تین دن ٹھہرے، یا اُسی وقت نکال لیے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں جبریل علیہ السلام نے مندرجہ ذیل دعا کی؛

دوسری دعا اَللّٰھُمَّ یَا کَاشِفَ کُلِّ کُرْبَۃٍ وَّیَا مُجِیْبَ کُلِّ دَعْوَۃٍ وَّیَا جَابِرَ کُلِّ کَبِیْرٍ وَّیَا مُیَسِّرَ کُلِّ عَسِیْرٍ وَّیَا صَاحِبَ کُلِّ غَرِیْبٍ وَّیَا مُوْنِسَ کُلِّ وَحِیْدٍ وَّ اَنْ تَقْذِفَ حُبَّکَ فِیْ قَلْبِیْ حَتّٰی لَا یَکُوْنَ لِیْ ھَمٌّ وَّ لَا ذِکْرٌ غَیْرَکَ وَ اَنْ تَحْفَظَنِیْ وَ تَرْحَمَنِیْ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

ترجمہ: اے ہر درد کو ٹالنے والے، اے بڑے پر غالب، اے ہر تنگی آسان کرنے والے، اے ہر غیب کے ساتھ، اے تنہا کے مونس، اے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے تیرے سے کشادگی کا سوال ہے اور میرے دل میں اپنی محبت ڈال یہاں تک کہ میرے دل میں کوئی ملال نہ رہے اور تیرے سوا کسی کو یاد نہ کروں اور میری تو ہی حفاظت فرما اور مجھ پر رحم فرما اور تو ارحم الراحمین ہے۔

رشکِ ملائکہ مروی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب کنویں میں ڈالے گئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایسے پیارے طریقے سے ذکر کیا کہ جونہی فرشتوں نے سنا تو کہا کہ اے اللہ! کنویں سے کیسی پیاری آواز آرہی ہے۔ اے اللہ! ہمیں تھوڑی سی مہلت عطا فرما تاکہ ہم اُس آواز کو قریب ہو کر سنیں۔ اللہ نے فرمایا: یہ میرے وہی بندے ہیں جن کے متعلق تم نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا۔ ملائکہ کرام آسمانوں سے نیچے اُتر کر یوسف علیہ السلام سے اُن سے مانوس ہوئے۔

ذکرِ الٰہی کی شان جب ایسے بندگانِ خدا ذکر کرتے ہیں تو فرشتے کہتے ہیں: یا اللہ! ہمیں مہلت دیجئے تاکہ ہم اُن ذکر کرنے والوں کے قریب ہو کر اُن کا ذکر سنیں اللہ تعالیٰ انہیں فرماتا ہے یہ وہی بندے ہیں جن کے متعلق تم نے کہا تھا اتجعل فیھا من یفسد فیھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکرِ الٰہی کو اللہ تعالیٰ نے شرف بخشا ہے کہ اس کے لیے ملائکہ کرام آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ (کذا فی نفائس المجالس)

مثنوی شریف میں ہے: ؎

(۱) ذرہ ذرہ کاندریں ارض و سماست — جنس خود را ہر یکے چوں کہرباست

(۲) ضد را با ضد ایناس از کجا — با امام الناس نسناس از کجا

(۳) ایں قدر گفتیم باقی فکر کن — فکر اگر جامد بود او ذکر کن

(۴) ذکر آرد فکر را در اہتزاز ذکر را خورشید ایں افسردہ ساز

ترجمہ: (۱) آسمان وزمین کا ذرہ ذرہ اپنی ہم جنس سے خوش ہے۔

(۲) لیکن ضد کو دوسری ضد سے اُنس کہاں، لوگوں کے سرداروں کے ساتھ ناس کو موافقت کیسی۔

(۳) یہ مثال کے طور کہا باقی خود سوچیے اگر فکر کی کمی ہے تو ذکرِ الٰہی کیجئے۔

(۴) اس لیے کہ فکر کو ذکر روشن کرتا ہے، یُوں سمجھیے کہ ذکر ایک سورج کی طرح ہے۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْہِ اور ہم نے یوسف علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی تاکہ اپنے مستقبل کی ترقی پر خوش ہوں اور جس دُکھ درد میں اب مبتلا ہُوئے اُس کا ازالہ ہو۔

مسئلہ: محققین کہتے ہیں کہ یہ وحی نبوت و رسالت کی تھی۔

سوال: ابھی زمانۂ نبوت کو پہنچے نہیں تھے پھر قبل از وقت وحی کیسی۔

جواب: اللہ تعالیٰ مختار ہے جیسے چاہے کرے۔ یحیٰی و عیسٰی علیہما السلام کو بھی بچپن میں وحی رسالت و نبوت سے نوازا تو یوسف علیہ السلام کو بھی قبل از وقت وحی نبوت و رسالت سے نوازا۔

ف: بعض اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کو بھی بچپن میں ولایت سے نوازتا ہے، جیسے شیخ سہیل رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کی طرح اور خواص اولیاء (جیسے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ) وغیرہ۔ اس سے ثابت ہُوا کہ نبوت ولایت کے وقت بلوغ کی محتاج نہیں اس لیے کہ بعض انبیاء و اولیاء میں ایسی استعداد بچپن سے ہوتی ہے انہیں چالیس سال کی عمر کی قید سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے اگرچہ اکثر انبیاء علیہم السلام کے لیے یہی قاعدہ ہے کہ انھیں چالیس سال کے بعد نبوت ملی۔

ف: کاشفی نے لکھا کہ یوسف علیہ السلام کے ہاں اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ غم نہ کھایئے آپ کو اس پریشانی سے نکال کر بلندیٔ مراتب بخشوں گا بلکہ ان دشمن بھائیوں کو آپ کے دروازہ پر بھکاری بنا کر لاؤں گا۔

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ البتہ تم اپنے بھائیوں کو یہی واقعہ جو تمہارے ساتھ کر رہے ہیں ایک دن خبر دو گے ایسے وقت میں کہ وہ اسے نہیں جانتے ہوں گے اس لیے کہ اس وقت آپ کا اور ان کا [illegible] اختلاف ہوگا (آپ بادشاہ ہوں گے اور وہ گدا) ایسے وقت میں اُن کے وہم و گمان میں نہ ہوگا کہ تم اُس بہت بڑے مرتبہ کو پہنچو گے۔ بعرصہ دراز سے گزرنے سے صورتوں اور ہیئات جسمانیہ میں فرق آجائے گا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر میں پہنچے تو غلّہ خریدنے والوں سے وہ ممتاز ہو کر آئے۔ یوسف علیہ السلام نے تو انھیں پہچان لیا لیکن وہ ان سے بے خبر تھے۔ یوسف علیہ السلام نے غلّہ دیتے وقت فرمایا: ہر ایک اپنے اپنے برتن لے آئے۔ جب آپ کے بھائیوں کے برتن لائے گئے تو آپ نے بھائیوں کے برتنوں میں سے ایک برتن کو ٹھونکا اور فرمایا: اے مصریو! یہ برتن کہتا ہے کہ میں ان کے بھائی یوسف (علیہ السلام) کا برتن ہوں جس کو انھوں نے کنوئیں میں ڈال کر والدِ گرامی کو کہا کہ یوسف کو

بھیڑیا کھا گیا ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ رُوح جب جسم سے متعلق ہُوا تو اُس سے قلب علوی اور نفس سفلی اور قوائے نفسانی اور حواس پیدا ہُوئے۔ روح قلب کا میلان عالم روحانیہ کی طرف اور نفس و قویٰ وحواس کا میلان عالم حیوانیہ کی طرف ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو طبع کے حوالے کر دے تو رُوح اور قالب پر نفس وجسم غالب ہوجائیں گے۔ یہی اشقیاء کا حال ہے۔ اگر قلب کو قلب کی گہرائی کی تاریکیوں میں وحیِ ربانی سے تائید نصیب ہوتی ہے تو اسے عنایت ازلیہ اپنے دامن میں لے لیتی ہے اس وقت رُوح وقلب کو نفس و بدن پر غلبہ نصیب ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء و اولیاء کا حال ہے کہ ان حضرات کے صبر و تحمل کی برکت سے اللہ تعالیٰ وحی و الہام سے ان کی تائید فرماتا ہے اگرچہ بظاہر وہ جفا و جلال میں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ یعقوب ویوسف علیہما السلام کو غموم شدیدہ و ہموم عظیمہ میں مبتلا کر کے ان کی آزمائش کرنے تاکہ وہ اُس پر صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اور ماسوی اللہ سے اِن کا کلی طور پر انقطاع ہوتاکہ وُہ بہت بڑے مراتب کو پہنچیں جو عالم اسباب میں ایسے مصائب و تکالیف کے بغیر حاصل کرنا مشکل تھا جیساکہ بعض مشائخ کا فرمان ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں مشائخ کا فرمان ہے کہ:

ازالۂ وہم و ہابیہ سبب حبس یوسف فی السجن اثنتی عشرة سنة تكميل ذاته بالخلوة والرياضة الشاقة والمجاهدات مما يتيسر له عند ابيه ومن هذا المقام اغتراب الانبياء والاولياء عن اوطانهم۔

ترجمہ: یوسف علیہ السلام کی بارہ سال کی قید اُن کی تکمیلِ کمالات کے لیے تھی تاکہ وہ کمالات خلوت وریاضت ومجاہدات سے حاصل ہوں جو انھیں والدِ گرامی کے ساتھ رہ کر میسّر نہ ہوتے یہی راز انبیاء و اولیاء کی ہجرت اور دیگر ان کی مشقتوں و تکالیف میں ہے۔

حضرت عارف جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

بصبر کوشی دِلا روز ہجر فائدہ چیست
طبیب شربت تلخ از برائے فائدہ ساخت

ترجمہ: ہجر میں صبر کی کوشش کرنا۔ اس کا فائدہ وہی ہے جو شربت کڑوا طبیب تجویز کرتا ہے۔

ف: بعض لوگوں نے کہا کہ یعقوب علیہ السلام کو صاحبزادے کے فراق میں اس لیے مبتلا کیا گیا کہ ایک دن آپ نے بکری کے سامنے اُس کے بچے کو ذبح کیا تو اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی اس لیے انھیں خون کے بدلے خون اور جُدائی کے بدلے جُدائی میں مبتلا فرمایا تاکہ عوام کو معلوم ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی عزت و عظمت اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بلند و بالا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے:

حسنات الابرار سیئات المقربین۔

نیکوں کی حسنات مقربین کی سیئات ہوتی ہیں۔

ف : یہ بھی منقول ہے کہ آپ سے ایک دن فقیر نے طعام مانگا تو آپ نے اس کے لیے کوئی اہتمام نہ فرمایا تو فقیر مغموم و محزون ہو کر لوٹا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی وجہ سے یعقوب علیہ السلام کو ایسی تکلیف میں مبتلا فرمایا کہ جس سے وہ مغموم و محزون ہوں۔

حضرت اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ روایت محل نظر ہے۔ یعنی قابل اعتماد نہیں اس لیے کہ ایسی کمی انبیاً ازالہ وہم علیہم السلام سے واقع نہیں ہوتی اور نہ اُن کے خلاق کا تقاضا ہے کہ وُہ ایسا کریں۔

ف : حضرت یوسف علیہ السلام جب پیدا ہُوتے تو آپ کے والد گرامی نے آپ کے لیے دُودھ پلانے والی لونڈی خریدی جس کا اپنا دُودھ پینے والا بچہ بھی تھا۔ یعقوب علیہ السلام نے اُس کے بچے کو بیچ ڈالا تا کہ یُوسف علیہ السلام کے دودھ پلانے میں دُودھ پلانے والی کو کمی نہ ہو۔ یعقوب علیہ السلام نے دایہ اور اس کے بیٹے میں جُدائی ڈال دی تو اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے کے درمیان جُدائی فرمائی، وہ بھی اس لیے کہ یعقوب علیہ السلام کے لیے دایہ نے بد دعا کی کہ یا اللہ ! جیسے انہوں نے میرے بچے اور مجھ میں جدائی ڈالی تو بھی اُن کے اور اُن کے بیٹے میں جدائی ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ نے دایہ کی دعا قبول فرمائی اور ایسی جدائی ڈالی کہ جب تک ماں بیٹا نہ ملے، یعقوب و یوسف علیہما السلام کی ملاقات بھی نہ ہو سکی۔

حدیث شریف : ماں باپ کو اولاد کی جدائی سے پریشان نہ کیا جائے۔ اور یہ عموماً قیدی کنیزوں اور غلاموں میں ہوتا ہے۔

(کذا فی الجوہری)

حدیث شریف : جو والدہ اور اس کی اولاد کے درمیان جدائی ڈالتا ہے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اُس کے درمیان جدائی ڈالے گا۔

ف : اگرچہ ایسے واقعات حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کرنا جائز ہے لیکن قضاً و قدر کے آگے ایسا ناممکن بھی نہیں اس لیے کہ قضاء و قدر ایسا کر گزرتی ہے

ف : حضرت الشیخ الاکبر قدس سرہ الاطہر نے فرمایا کہ ۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے پر وکان امر اللہ قدراً مقدوراً کا حکم جاری فرماتا ہے تو عموم الافعال کی حیثیت سے اپنے پیارے اور محبوب بندوں پر بھی جاری فرما دیتا ہے۔ لیکن پھر انھیں نہ صرف ان کے پہلے مرتبہ پر فائز فرماتا ہے بلکہ انھیں کئی گنا زائد بہترین درجات سے نوازتا ہے۔

ف : حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ سے پوچھا گیا کہ کیا ولی اللہ سے بھی گناہ کا صدور ہوتا ہے ؟ آپ نے یہی آیت وکان امر اللہ قدراً مقدوراً پڑھی۔

حضرت حافظ شیرازی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

جائے کہ برق عصیاں بر آدم صفی زد ۔۔۔ مارا چگونہ زیبد دعویٰ بے گناہی

ترجمہ: جب حضرت آدم علیہ السلام پر برقِ عصیاں چمکی تو ہم تم کون لگتے ہو بے گناہی کا دعویٰ کرنے والے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو حضرت یعقوبؑ یا یوسفؑ کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایک دن شیشے میں اپنا چہرہ دیکھ کر دل میں کہا کہ اگر میں غلام ہوتا تو مجھے بیچا جاتا تو میری قیمت کوئی بھی ادا نہ کر سکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں غلام بنایا اور چند ٹکوں میں بکے۔ ایسے واقعات عوام میں بیان نہ کیے جائیں تاکہ ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ جمال و کمال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اگر بندے کی طرف منسوب ہوتا ہے تو وہ مجاز ہے (یہی ہمارا موقف ہے کہ ہم انبیاء واولیاء کے کمالات حق سمجھتے ہیں) اسی لیے بندے پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو ماسوی اللہ سے آزاد رکھے بلکہ اپنے آپ کو جملہ اضافات وقیود سے فارغ کرے اور صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ بنے۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

کسوت خواجگی وخلعت شاہی چہ کند
ہر کرا غاشیۂ بندگیت بر دوش است

ترجمہ: خواجگی وبادشاہی کی پوشاک سے اسے کیا فائدہ، جس کے کاندھے پر بندگی کا دوشالہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ تصفیۂ قلب کا طریقہ نہایت مشکل ہے اُس کے اسباب ادب ومحنت وغیرہ ہیں اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے جیسے کسی اور نبی علیہ السلام کو ایذا نہیں دی گئی۔ یعنی جیسے مجھے تصفیۂ قلب نصیب ہوا ایسے کسی اور نبی علیہ السلام کو نصیب نہیں ہوا۔ یاد رہے کہ ہزاروں کشف وکرامات سے ایک ذرۂ تصفیۂ قلب کا درد اور دکھ تکلیف بہت ہے۔ اس لیے کہ اپنے پیارے بندوں کو ایسے مصائب وتکالیف میں مبتلا کرنا ہے تو صرف اسی لیے کہ اس طرح سے ان بندوں کو قربِ خداوندی اور مراتبِ جلیلہ نصیب ہوتے ہیں جسے وہ عبودیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً عِشَاء ظرف ہے یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی والدگرامی کے ہاں شام کو لوٹے۔

فائدہ: العشاء آخر النہار سے نصف اللیل کو کہا جاتا ہے۔ تفسیر ابو اللیث میں لکھا ہے کہ وہ عصر کے بعد واپس آتے۔ الکواشی میں لکھا ہے کہ دیر سے اسی لیے آتے تاکہ عذر پیش کرنے میں حق بجانب متصور ہوں۔

یَبْكُوْنَ جاؤا کی ضمیر سے حال ہے یعنی دراں حالیکہ وہ روتے تھے۔ التبا کی سے ہے، بمعنی بہ تکلف رونا۔

حکایت: ایک عورت شریح قاضی کے ہاں اپنے شوہر کی شکایت لے گئی۔ جب حال سنایا تو رونے لگی شعبی نے عرض کی، اے ابو امیہ! میں سمجھتا ہوں یہ عورت واقعی مظلوم ہے، جیسا کہ اس کا گریہ بتاتا ہے۔ شریح نے فرمایا کہ برادرانِ یوسف بھی روتے تھے ان کا رونا مظلومیت کا نہیں تھا بلکہ اُن کا رونا ان کے ظالم ہونے کی دلیل تھا۔

مسئلہ: قاضی (حاکم) پر لازم ہے کہ فیصلہ سنتِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والثنا کے مطابق کرے ورنہ بہت سے حالات اصل واقعہ کے خلاف ہوتے ہیں۔ مثنوی شریف ؎

زاریِ مضطر تشنۂ معنویست

زاریِ نزد دروغ آں غولیست

گریۂ اخوان یوسف حیلتست

کہ درونشان پُر ز رشک و علتست

ترجمہ: پریشان کی زاری ظاہراً پُرسوز ہے لیکن اس کی معنوی حالت کچھ اور ہو سکتی ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ بیوقوف جھوٹ سے رو رہا ہو۔ مثلاً اخوۃ یُوسف کا رونا مکر و فریب کا تھا اس لیے کہ ان کے رونے میں ایک قسم کا دھوکہ تھا۔

فائدہ: یعقوب علیہ السلام نے اُن کا رونا دُور سے سُنا تو گھبرا کر باہر تشریف لاتے اور پُوچھا کیوں روتے ہو، بکریوں کو تو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ کہا، اِس سے اور بڑا نقصان ہوا ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: وہ کیا ہے اور میرا یُوسف کہاں ہے؟

قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ عرض کی، ابا جان! ہم دوڑنے یا تیر اندازی میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے لگے۔ استبق الرجلان و تسابقا سے مشتق ہے۔ یہ اُس وقت بولتے ہیں جب دو آدمی دوڑنے میں ایک دوسرے سے غلبہ چاہیں اسی طرح کہا جاتا ہے۔ انتضلا و تناضلا یہ اُس وقت بولتے ہیں جب دو آدمی تیر اندازی میں ایک دوسرے پر غلبہ چاہیں۔ وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ اور ہم نے یُوسف علیہ السلام کو اکیلا چھوڑا، عِنْدَ مَتَاعِنَا اپنے سامان کے ہاں، متاع اُس سامان کو کہا جاتا ہے جس سے نفع اٹھایا جاتے جیسے کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں، اس لیے کہ المتاع بمعنے ماانتفع بہ ہر وُہ شے جس سے نفع اٹھایا جائے دراصل اُس نفع کو متاع کہا جاتا ہے جو حاضر ہو، یہ متعۃ کا اسم ہے جیسے سلام، سلم کا اسم ہے۔ ولما فتحوا متاعھم میں یہی معنیٰ مراد ہے یعنی کھانے کا سامان۔ فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ پس اسے بھیڑیا کھا گیا ہے یعنی ہم دوڑ لگا رہے تھے کہ اسے بھیڑیئے نے فوراً اٹھا لیا ہمیں چھڑانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا اور آپ ہماری بات کا اعتبار بھی نہیں کریں گے وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ اگرچہ ہم اپنے قول میں سچے ہیں۔ الصدق واقع کے مطابق خبر دینا، اور الکذب واقعہ کے خلاف خبر دینا۔ التصدیق زبان سے خبر دینا کہ قائل سچا ہے اور دل سے اس کی بات کی تصدیق کو اسے قبول کرنے کا نام الاذعان ہے، اور التکذیب ہر دونوں کے خلاف کا نام ہے۔ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ یہ بدم سے محلاً منصوب علی الظرفیۃ اور کذب، دم کی صفت ہے

بطور مبالغہ کے مصدر لایا گیا ہے۔ گویا وہ عین کذب کو لاتے، اسی لیے کبھی کذاب کو بمبالغہ کے طور کذب کہتے ہیں، گویا وہ جھوٹ اور فریب کا عین ہے یا مصدر بمعنے مکذوب ہے یعنی۔ اس قمیص میں خون کی بجائے جھوٹ تھا۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ وہ یعقوب علیہ السلام کے ہاں یُوسف علیہ السلام کے کُرتے پر ایک جھُوٹا خون لگا کر لائے۔

فائدہ: حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قرأت میں بِدَمٍ کَدِبٍ (دال معجمہ کے ساتھ) بمعنے کدر و طری (میلا کچیلا اور تر)۔

یعقوب علیہ السلام کے علم غیب کا ثبوت

مروی ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے ایک بکری کا بچّہ ذبح کر کے اُس کا خون یُوسف علیہ السلام کے کُرتے کو لگایا لیکن کُرتہ پھاڑنا بھُول گئے۔ یعقوب علیہ السلام نے جب ان سے سُنا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے تو آپ نے بآوازِ بلند فرمایا:

اَیْنَ الْقَمِیْصُ ؟ میرے پیارے یوسف کا قمیص کہاں ہے!

آپ نے قمیص لے کر آنکھوں سے لگایا اور خوب روتے، یہاں تک کہ قمیص کا خون آپ کے چہرے پر اُتر گیا۔ آپ نے فرمایا کہ بھیڑیا بڑا سمجھدار تھا کہ پیارے یُوسف کو تو کھا گیا لیکن اُس کے قمیص کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

قَالَ یہ سوال مقدر کا جواب ہے، سوال یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے قمیص کو دیکھ کر اپنے بیٹوں سے کیا فرمایا، تو جواب دیا کہ تم جیسے کہہ رہے ہو یہ غلط ہے۔ **بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا** بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تمہارے دلوں نے تمہارے لیے ایک بات گھڑلی ہے سَوَّلَتْ بمعنے زَیَّنَتْ وَ سَهَّلَتْ ہے۔ حضرت ابن عباس سے اسی طرح مروی ہے۔ اَلتَّسْوِیْلُ بمعنے تقدیرُ شئٍ فی الانفس مع الطمع فی اتمامہ، دلوں میں کسی بات کا ایسے طور مقدر ہونا کہ جس سے نفسوں کو خیال ہو کہ وُہ شَے مکمل ہو گئی۔

فائدہ: ازہری نے فرمایا کہ التسویل بمعنے تفصیل ہے اور سوال الاشیاء سے ماخوذ ہے بمعنے کسی کی آرزو کو باطل طریقے سے سنگار کر پیش کرنا۔

اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا۔ اَمْرًا ایسا امر جسے کسی شے سے موصوف نہ کیا جاتے اور نہ ہی وہ کسی طریق سے معلوم ہو سکے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ تمہارے دلوں نے تمہارے لیے کوئی بات گھڑلی ہے جسے تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا۔

فائدہ: یعقوب علیہ السلام نے دو طریقوں سے استدلال فرمایا کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ مکر و فریب اور دغا بازی کی ہے اس لیے وُہ جھُوٹے ہیں:

۱۔ یوسف علیہ السلام کو یقین تھا کہ وہ ان سے شدید حسد رکھتے تھے۔

۲۔ قمیص بھی صحیح سالم ہے۔ اگر یوسف کو بھیڑیا کھاتا تو قمیص کو پہلے پھاڑتا، یا کم از کم قمیص میں بھیڑیئے کے حملے کی

کوئی علامت ہوتی۔ بلْ سَوَّلت الخ، اَکَلَهُ الذِّئْبُ کے رد میں فرمایا۔ اور یہ بَلْ اعراض کے لیے ہے۔ یعنی سابق کلام سے اعراض کر کے لاحق کلام کا علیٰ سبیل التدارک اثبات کیا گیا ہے جیسے ہم کہتے ہیں جاء نا یدٌ بل عمرٌو۔
(کذا فی بحر العلوم)

فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ، اب میرا کام صبر جمیل ہے۔ صبر جمیل اسے کہا جاتا ہے جس میں مخلوق کی طرف کسی قسم کا شکوہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد فرمایا، اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔

کمال خجندی نے فرمایا: ؎

بوصلِ صحبتِ یوسف عزیز من شتاب
جمالِ یار نے مگر بصبرِ جمیل

ترجمہ: یوسف عزیز کی صحبت سے روگردانی کر کے نہ دوڑ۔ جمالِ یار صبر جمیل کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔

صبر کے متعلق عجیب و غریب مسائل حضرت اسماعیل حقی کے پیر و مرشد قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جس صبر میں مخلوق کو شکوہ نہ سنایا جائے وہ جمیل ہے۔ اور جس صبر کا شکوہ مخلوق سے مخفی رکھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا جائے وہ صبر اجمل ہے۔ اس لیے کہ ایسے شکوہ میں عبودیت کا اظہار ہے اس لیے کہ ایسے وقت میں مخلوق سے ظاہراً و باطناً شکوہ کو مخفی رکھ کر اپنے خالق و مالک سے عرض کیا گیا، اور اپنے جملہ امور اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کرنا جمیل اور اسے اپنے شکایات پیش کرنا اجمل ہے۔ حضرت عمر بن الفارض قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

ویحسن اظهار التجلد للقوی
ویقبح غیر العجز عند الاحبه

یعنی صدمات پر جوانمردی اور صبر کا اظہار مطلقاً اچھا نہیں۔ البتہ دشمنوں کے سامنے نہایت موزوں ہے۔ جیسے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے مقابلہ میں غزوات کے دوران اظہار نہیں کرتے تھے ہاں دوستوں کے سامنے اپنے عجز کا اظہار کرنا مناسب ہے ان کے سامنے جوانمردی اور صبر کا دعویٰ قبیح ہے۔

حکایت: حضرت سمنون نے ایک دفعہ اپنی دعا میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: ؎

ولیس لی فی سواک حظٌ
فکیفما شئت فاختبرنی

ترجمہ: مجھے تیرے سوا اور کسی سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے جس طرح چاہو آزما لو۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیشاب کی بندش کی بیماری میں مبتلا فرما دیا۔ اس پر انہوں نے اپنے عجز کا اظہار کیا پھر تو لڑکوں کو اُجرت دے کر

بغداد کے بازار میں اعلان کراتے کہ کھونپے اسے سمنوں تو کذاب ہے۔

ع فقیرم وخستہ بدرگاہت آمدم

فقیر وعاجز تیری درگاہ پر حاضر ہے اور رحم کی درخواست کرتا ہے۔

بعض بزرگوں کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش کو کھلے دل اور ہنستے چہرے سے پورا کرنے کا نام صبر جمیل ہے۔ بعض نے کہا کہ مصیبت کے وقت بارگاہِ حق میں اظہارِ عجز کے ساتھ عرض کرے کہ آپ کی دی ہوئی مصیبت کو ہنستے چہرے سے اٹھا رہا ہوں اور چیں بجبیں نہیں ہوں، بلکہ ویسے ہی ہوں جیسے مصیبت سے پہلے تھا۔ اس لیے موحد حقیقی وہ ہے جو اسباب و وسائل کو کچھ نہ سمجھے اور حقیقی تاثیر اللہ تعالیٰ سے سمجھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ والوں کا شیوہ عفو اور درگزر اور عذر کو قبول کرنا ہے۔ ؎

اقبل معاذیر من یاتیك معتذرًا

ان بر عندك فیما قال او فجرًا

ترجمہ: جو تیرے ہاں معذرت کے طور حاضر ہو اُس کا عذر قبول کر لے، خواہ تیرے ساتھ بھلائی کرے یا بُرائی۔

وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ اور اللہ وہ ہے جس سے مدد مطلوب ہے۔ الاستعان بمعنے انشاء الاستغاثة المستمرہ ہے۔ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ یوسف علیہ السلام کی ان باتوں پر جو تم بیان کر رہے ہو یا تمہارے جھوٹ بولنے پر یا یوسف علیہ السلام کی سلامتی کے ظاہر ہونے سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گویا یعقوب علیہ السلام کو اپنے صاحبزادے یوسف علیہ السلام کو زندہ سلامت اور اُن کے جھوٹ بولنے کا علم تھا۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں یعنی کفار و مشرکین کے لیے فرمایا سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔

اخوۃِ یوسف کی نبوت کی تحقیق قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ اگر اُخوتِ یوسف علیہ السلام کی نبوت کا قول صحیح مان لیا جائے تو ان کا یہ جُرم نبوت سے پہلے کا ہے جو انبیاءُ علیہم السلام کی عصمت کے منافی نہیں اس لیے کہ علم کلام کا مسلّم قاعدہ ہے کہ نبوت سے پہلے ان سے گناہِ کبیرہ کا صدور جائز ہے لیکن وقوع پر بھی کوئی دلیل نہیں اسی لیے قاضی بیضاوی نے اُخوتِ یوسف کی نبوت پر حتمی قول کے بجائے شک ظاہر فرمایا ہے۔ صاحبِ روح البیان قدس سرہ العزیز نے فرمایا: یہی قول حق ہے کہ اخوت یوسف انبیاءُ نہیں تھے اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے علم کلام کا یہ قاعدہ بھی مسلّم ہے کہ وہ قبل نبوت کبائر سے محفوظ اور نبوت کے بعد معصوم ہوتے ہیں بالخصوص وہ امور جو موجبِ نفرت ہوں، حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ امور جو نفرت کا موجب ہوں وہ انبیاء علیہم السلام کی شان کے لائق نہیں۔ یاد رہے کہ یوسف علیہ السلام کے ارادہ بہ زلیخا کو

اس گناہ کی نظیر ہی نہیں پیش کیا جا سکتا جو ان کے بھائیوں سے حسد و کذب و ظلم وغیرہ صرزد ہوتے اس لیے کہ یوسف علیہ السلام کا واقعہ مؤول ہے اور اخوت یوسف کے جرائم قابل تاویل نہیں ہیں۔

اقوالِ یعقوب علیہ السلام پر اعتراضات

سوال: ویتم نعمته علیك وعلیٰ آل یعقوب سے واضح ہوتا ہے کہ اخوتِ یوسف بھی انبیاءؑ تھے ورنہ آلِ یعقوب پر اتمامِ نعمت کا کیا مطلب ہوگا؟

جواب: اس سے اخوتِ یوسف کی نبوت کی تصریح نہیں اس لیے کہ آلِ یعقوب میں اتمامِ نعمت کا یہی معنیٰ ہے کہ اُن کی اولاد میں نبوت کا سلسلہ جاری رہے گا جیسا کہ قرآن مجید میں کلمۂ توحید کے متعلق فرمایا کہ کلمةً باقیة فی عقبیه۔ اس سے یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں توحید کا سلسلہ مسلسل رہا اگرچہ آپ کی اولاد یعنی پوتوں کی بعض نسلوں میں شرک پیدا ہوتے۔

سوال: اگر وہ انبیاءؑ نہ تھے تو یوسف علیہ السلام کو خواب میں ستاروں کی صورتوں میں کیوں نظر آئے؟

جواب: اس سے تو صرف ان کی ہدایت کا ثبوت ملتا ہے اس لیے جب یعقوب علیہ السلام سُورج تھے اور ستارے سورج کی اتباع میں چمکتے ہیں۔ اور ہم اخوتِ یوسف کی ہدایت کے قائل ہیں اس لیے کہ وہ اپنے والد گرامی کی اتباع میں ہدایت کے ستارے تھے اور ہدایت کا ستارہ ضروری نہیں کہ وہ نبی ہو۔ جیسے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہدایت کے ستارے تھے لیکن وہ انبیاء نہیں تھے۔

فائدہ: یوسف علیہ السلام کے بھائی اگر نبی ہوتے تو یعقوب علیہ السلام نے جیسے یوسف علیہ السلام کے جوہرِ نبوت کی وجہ سے ان سے محبت فرمائی اُن میں بھی جوہرِ نبوت ہوتا تو ان سے بھی محبت کرتے۔ یعقوب علیہ السلام کا اُن کے ساتھ محبت نہ کرنا بھی ان کے نبی نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی مثال شیث علیہ السلام کی سی ہے کہ آدم علیہ السلام اُن سے محبت صرف اس لیے کرتے تھے کہ وہ نبی ہونے والے تھے بخلاف شیث علیہ السلام کے دوسرے بھائیوں کے کہ وہ نبی نہ تھے، نہ آدم علیہ السلام کو ان سے محبت تھی۔ یہ تمام تفصیل صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ نے بیان فرمائی ہے۔ یہی صحیح اور مبنی بر صواب ہے۔

تفسیر صُوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ حواس و قوائے نفسانی ہمیشہ تزویر و تلبیس کرتے ہیں اور ان کا کام بھی یہی ہے کہ طمع سازی اور تخیلات فلسفیانہ کے تابع خود بھی ہیں اور دوسروں کو انہی کے تابع رکھنا چاہتے ہیں بلکہ جملہ جھوٹ اور مکر و فریب اور توہمات تسویلات انہی پر ختم ہیں اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے حواس و قوائے انسانی ان کے تابع ہو کر بجائے جھوٹ اور

مکر و فریب وغیرہ کے ان سے صدق اور ہدایت وغیرہ کا صدور ہوتا ہے۔ روح چونکہ نفس کے مکر و فریب سے واقف ہوتی ہے اس لیے کہ وہ نورِ الٰہی سے مؤید ہوتی ہے اسی لیے اسے نفس کی صفات اور حواس کی فطرت اور قواتے نفسانی کی عادت سے پورا علم ہوتا ہے۔ بدیں وجہ روح نفس کے مکر و فریب اور دھوکہ سازیوں کو قبول نہیں کرتی، اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ جملہ امور منجانب اللہ تشریف لاتے ہیں۔ اسی لیے پاکباز ارواح نفس کی شرارتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے صبرِ جمیل سے کام لیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کے قدیم ارادہ کے مطابق سب کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی لیے تسلیم و رضا کے طور پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہتے ہیں: واللہ المستعان علیٰ ما تصفون، یعنی اللہ تعالیٰ قضاء و قدر سے جو کچھ جاری ہو رہا ہے ہمیں اللہ تعالیٰ کی اعانت سے صبرِ جمیل کی توفیق نصیب ہو۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ اور ایک جماعت مدین سے مصر کی طرف سیر کرتی ہوئی آئی تو اسی اندھے کنویں کے قریب اُتری، جس میں یوسف علیہ السلام تشریف فرما تھے اور انہیں کنویں میں پڑے ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ کاشفی نے چار روز لکھے ہیں۔

ف: بحر العلوم میں امام سمرقندی لکھتے ہیں کہ وہ اندھا کنواں آبادیوں سے بہت دُور ایک جنگل میں تھا، صرف بکریوں کے چرواہے اسے جانتے تھے جو بکریوں کو پانی پلانے کے لیے وہاں پہنچ جاتے تھے۔ لیکن یہ مسافرین راستہ بھول کر اس کنویں کے قریب اترے تھے۔ لیکن یہ قول یلتقطہ بعض السیارۃ کے خلاف ہے، اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے وہ کنواں سرِ راہ تھا اور لوگ وہاں سیر و سیاحت کے دوران اُترتے تھے۔

فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ پس مسافروں نے اُس کنویں پر ایک شخص بھیجا جو دورانِ سفر ان کے لیے پانی مہیا کرنے کی خدمت پر مامور تھا، اس کا نام مالک بن دعد الخزاعی تھا۔ قاموس میں ہے کہ دعد بالدال المہملہ ہے۔ مالک نے اپنا ڈول کنویں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام سے وحی کے ذریعے فرمایا کہ اس کے ڈول کو پکڑ لیں، اس لیے کہ یہ ڈول آپ کو کنویں سے نکالنے آ رہا ہے۔

ف: معالم التنزیل میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کنویں سے باہر جانے لگے تو کنویں کی دیواریں یوسف علیہ السلام کے فراق میں روئیں۔

مسئلہ: جمادات میں بھی حیاتِ حقیقیہ ہوتی ہے جسے صرف عارف باللہ اولیا جانتے ہیں وہ ذکر و توحید و تسبیح اور اہلِ حق کی صحبت سے اُنس حاصل کرتی ہیں۔ صحیح حدیث شریف میں ہے کہ جس ستون سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے وقت سہارا لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو وعظ مبارک فرماتے، جب آپ اسے چھوڑ کر نئے منبر پر وعظ فرمانے لگے تو وہ ایسے دھاڑیں مارتا تھا جیسے بنی آدم کسی کی جدائی سے زور زور سے روتے ہیں۔[1]

---

[1] قصہ کی تفصیل فقیر کی تقاریر ریڈیو حصہ اول میں یا شرح مثنوی نوشتہ فقیر اویسی پڑھیے۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

استن حنانہ از ہجر رسول
نالہ می زد ہمچوں ارباب عقول
گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستون
گفت جانم از فراقت گشت خون

ترجمہ: ستون حنانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی میں عقل والوں کی طرح روتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ اس نے عرض کی کہ آپ کی جدائی سے میرا خون ہوگیا۔

فائدہ: جب یوسف علیہ السلام کنویں سے باہر تشریف لائے، حسن وجمال تو خداداد نعمت تھی، اس لیے کہ شطر الحسن دیا جانا آپ کے اوصاف میں ہے۔

اسی لیے دیکھتے ہی مالک نے قَالَ یٰبُشْرٰی کہا مژدہ بہار، کیسی خوشی کی بات ہے! یہ خوشخبری اپنے آپ کو یا دوستوں کو سنائی، اور یا بُشْرٰی کہہ کر گویا اس نے خوشخبری کو پکارا، اللہ تعالیٰ نے اُسے فرمایا یہی تیری خوشی کا وقت ہے، کہ تو نعمت نادرۃ الوجود سے فائز ہوا۔ ایسی عظیم نعمت جو اُسے اندھے کنویں سے ملی تو اُس نے خوشی کے مارے ایسے کہا۔

ف: بعض مفسرین نے فرمایا کہ بشریٰ اُس کے دوسرے ساتھی کا نام تھا جسے اُس نے یوسف علیہ السلام کے نکالنے کے لیے مدد کے لیے پکارا۔ چنانچہ کاشفی نے لکھا کہ مالک نے بُشریٰ ساتھی کو پکارا کہ ڈول میں ایک لڑکا ہے جس کے بوجھ سے میرا ڈول بھاری ہے، آئیے میری مدد کیجئے۔ چنانچہ مالک کے ساتھی بشریٰ نے ہاتھ بٹایا تو یوسف علیہ السلام کنویں سے باہر تشریف لائے۔ ؎

چوں آں ماہ جہاں آرا بر آمد
زبانش بانگ یا بُشریٰ بر آمد
بشارت کز چنیں تاریک جائے
بر آمد بس جہاں افروز ماہے

ترجمہ: جب وہ جہاں آرا محبوب کنویں سے باہر آتے تو مالک نے یا بشریٰ پکارا کیسی خوشی کی بات ہے کہ اندھے کنویں سے جہاں افروز محبوب ملا ہے۔

ف: قاعدہ ہے کہ آب حیات ظلمات میں ہے ایسے ہی علم الٰہی بھی قلب وقالب کی تاریکیوں میں مخفی ہے۔

فائدہ صوفیانہ: تاویلات نجمیہ میں ہے کہ جیسے قلب کو تعلق جذبہ اور تاریکیوں کی نجات سے خوشی ہوتی ہے۔ ایسے جذباتِ الٰہیہ کو قلب کے ساتھ متعلق ہونے سے خوشی ہوتی ہے۔ یُحِبُّہُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ میں یہی راز ہے۔

هٰذَا غُلٰمٌ ط یہ غلام ہے۔

وَاَسَرُّوْہُ اور پانی کھینچنے والے اور اُس کے ساتھیوں نے دُوسرے رفقا سے پونجی بنا کر یوسف علیہ السلام کو اس لیے چھپایا تاکہ دُوسرے رفقا یوسف علیہ السلام کے ساتھ شرکت کا دعویٰ نہ کرسکیں۔ بِضَاعَةً ط ضمیر مفعول سے حال ہے اور بضاعۃ تجارت کے مال کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ تجارت کے بہت سے مال کا ایک حصّہ ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: بضعت منہ ای قطعت للتجارۃ۔

وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۝ اور اللہ تعالیٰ ان کے کردار کو جانتا ہے یعنی اُس سے اُن کے پوشیدہ امور مخفی نہیں ہیں۔

وَشَرَوْہُ اور یوسف علیہ السلام کو پانی کھینچنے والے اور اس کے ساتھیوں نے خرید لیا شراء لغات اضداد سے ہے بمعنے خرید و بمعنے فروخت ہر دو کے لیے مستعمل ہے۔

فائدہ: صاحب رُوح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ انھوں نے یُوسف علیہ السلام کو بکاؤ مال بنایا اس لیے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی حقیقت کو نہیں جانتے تھے یا اللہ تعالیٰ نے انھیں یوسف علیہ السلام سے حقیقت حال پوچھنے کا موقع ہی نہ دیا اور ان پر غفلت طاری کر دی تاکہ اپنی قضاء و قدر کو جاری فرمائے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام سے حال حقیقت پوچھی ہو لیکن سمجھ نہ سکے ہوں کیونکہ وہ یوسف علیہ السلام کی عبرانی بولی نہیں سمجھتے تھے۔

فائدہ: صاحب رُوح البیان نے فرمایا کہ یہاں پر بعض مفسرین نے غلط افسانے بیان کیے ہیں جو نبوت کی شان کے لائق نہیں ہیں۔ اگرچہ ان افسانوں کو جمہور مفسرین نے لکھا ہے لیکن یہ اس لائق نہیں کہ انھیں کسی کھاتے میں شمار کیا جائے اللہ تعالیٰ بھلا کرے مولانا ابوالسعود مفسر رحمۃ اللہ علیہ کا کہ انھوں نے اپنی تفسیر الارشاد میں اس کی پوری توضیح فرما دی ہے۔

بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ کھوٹے پیسے جو کسی قیمت پر نہ چل سکیں۔ کاشفی نے فرمایا کہ بہائے اندک و بے اعتبار۔ بخس بمعنے مبخوس، اس لیے کہ ثمن مصدری معنے سے موصوف نہیں ہوتا اور مبخوس اس لیے تھے کہ وہ بالکل ردی اور کھوٹے تھے یا قیمت کے لحاظ سے بہت کم تھے۔ یہ بخسہٗ حقہ سے ہے بمعنے نقصہ۔ (کذا فی حواشی ابن الشیخ) بعض نے بخس کا معنی حرام منقوص کیا ہے اس لیے کہ یوسف علیہ السلام حُر (آزاد) تھے اور حُر کی بیع کا ثمن شرعًا حرام ہوتا ہے۔ اس تقریر پر بخس کو معنوی لحاظ سے حرام کہا گیا کہ حرام کے مال میں برکت نہیں ہوتی۔ لیکن پہلا معنی و مطلب زیادہ صحیح ہے۔

دَرَاھِمَ یہ ثمن سے بدل ہے یعنی وہ ثمن دنانیر نہیں بلکہ دراہم تھے۔ مَعْدُوْدَةٍ ج گنتی کے ٹکے یعنی اتنے کثیر التعداد نہیں تھے کہ انھیں تول کر لیا گیا تھا بلکہ گنتی کے چند ٹکے تھے۔ اس سے ثمن کی مقدار کی قلت کا بیان مراد ہے جبکہ پہلے خود اسی ثمن کا معمولی ہونا ظاہر کیا گیا اب اس کی مقدار کی قلت کو ظاہر کیا گیا ہے اس لیے کہ اُن کا

قاعدہ تھا کہ چالیس اوقیہ کے اوپر کا مال تول کر اور اس سے کم گن کر لیتے دیتے تھے۔

ف : حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ وہ کُل بیس درہم تھے۔ اور سدی نے فرمایا کہ وہ بائیس درہم تھے۔

حکایت و روایت مروی ہے کہ چند بچوں نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد کی طرف جاتے ہوئے گھیر لیا اور عرض کی، جیسے آپ حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لیے سواری بن جاتے تھے آج آپ ہمارے لیے بھی بن جائیں، تو زہے کرم رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کا دل کب دکھاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ گھر جاؤ جتنا مال پڑا ہے لاکر مجھے ان بچوں سے خرید لو۔ حضرت بلال گھر گئے تو چند اخروٹ لاتے، آپ نے اپنی قیمت کے طور پر بچوں کو دیے اور فرمایا مجھے ان کے بدلے بیچ دو۔ بچوں نے اخروٹ لے لیے۔ اس کے بعد حضور آقائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی یوسف علیہ السلام کو تو پھر بھی چند ٹکوں سے خریدا گیا لیکن میں تو چند اخروٹوں کے بدلے خریدا گیا ہوں[1]۔ (کذا فی روضۃ الاخیار)

وَكَانُوْا اور تھے وہ بیع کرنے والے۔ فِيْهِ یوسف علیہ السلام کے بارے میں مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝ع کم رغبت۔ یہ زہد و زہادۃ سے ہے بمعنے قلۃ الرغبت فی الشئ یعنی وہ ان لوگوں سے تھے جنہیں اپنے مقبوضہ مال کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ اس لیے تو انہوں نے بخسٍ دراھمِ معدودۃ سے بیچا۔

نکتہ : اصل وجہ ہے کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام کو گرے پڑے مال کی طرح حاصل کیا اور لوگ ایسے مال کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے، یا اس کی قدر و قیمت اس لیے کم سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے اس کا کوئی مستحق نکل آئے۔ اس لیے تھوڑی سی قیمت میں جلد تر بیچتے ہیں تاکہ کچھ تو حاصل ہو جائے باوجودیکہ اس شے کے ظاہر میں بہت بڑا حسن و جمال ہو۔

نکتہ : اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ظاہری حُسن و جمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں جب تک اُس کے اندر باطنی حُسن و جمال نہ ہو۔

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور اموال کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے قلوب و اعمال کو دیکھتا ہے یعنی تمہارے اعمال بھی بہتر ہوں اور قلوب بھی، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہیں ظاہری صورتیں اور اموال ہوں یا نہ۔

سبق صوفیانہ یوسف علیہ السلام کی بیع پر تو تعجب کر رہے ہو لیکن تم خود متعجب نہیں ہوتے کہ گندی خواہش نفسانی پر عمل کر کے اپنا قیمتی جوہر ضائع کر دیتے ہو کہ ایسی شہوت رانی سے ذات حق کے مشاہدات سے محرومی حاصل ہوتی۔ اسی لیے سالک پر لازم ہے کہ وہ نفس پر پُورا کنٹرول کرے۔

---

[1] کسرِ نفسی رحم و کرم بچوں کے دل بہلانے والے رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی ہر ادا پہ قربان۔ اویسی غفرلہٗ

حضرت مولانا جامی قدس سرہ السامی نے فرمایا: ؎

ہر آں کہ گنج قناعت بگنج دنیا داد
فروخت یوسف مصری بکمترین ثمنے

ترجمہ: جو قناعت جیسی دولت کو دنیا کے چند ٹکوں سے ضائع کرتا ہے۔ اُسے کہہ دو کہ اُس نے یوسف مصری کو چند ٹکوں سے بیچ ڈالا۔

حکایت حضرت نافع یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے غلام کا واقعہ منقول ہے یہ وہی حضرت نافع ہیں جو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ بزرگ تھے۔ جب اُن کا وقتِ وصال آیا تو فرمایا اِس جگہ کو کھودو۔ جب وہاں سے کھودا گیا تو دس ہزار بیس درہم ایک گھڑے میں بند ملے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے دفن کرنے کے بعد ان کو فقراء میں تقسیم کر دینا۔ عرض کی گئی کہ آپ جیسے شیخ کامل نے اتنی رقم کیوں جمع فرمائی؟ آپ نے فرمایا کہ اس مال پر زکوٰۃ کا شک و گمان نہ کرنا اور میں نے اپنے اہل و عیال کو بھی تنگ نہیں رکھا تھا۔ دراصل ہُوا یُوں کہ جب میرا نفس کسی شئے کے خریدنے کے لیے کہتا تھا تو مَیں اُس کی آرزو کے مطابق اتنی رقم لے کر اس گھڑے میں ڈال دیتا تھا تاکہ ضرورت کے وقت کسی سے مانگنے کی ضرورت نہ ہو۔

اسباق اِس حکایت سے چند اسباق مجاہدات نفس کے لیے حاصل ہوئے:

(۱) حضرت نافع نے مال خزانہ کے طور نہیں بلکہ فقراء پر خرچ کرنے کے لیے جمع فرمایا تھا۔

(۲) نفس کے تقاضوں اور طبیعت کی خواہشات و قوائے نفسانی کے حرکات کو دبایا۔ انہوں نے قلب کے احیاء کے لیے نفس کی بڑی ضرورتوں کو قدموں تلے روندا، اس لیے کہ نفس تمتعات و لذات دنیوی کا خواہشمند ہے اور قلب آخرت کی لذات کی آرزو کرتا ہے۔

آپ نے فانی خواہشات کو چھوڑ کر باقی تمتعات کو ترجیح دی، بلکہ اسی سے مشاہدات ربّانی نصیب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ جب تجلیات ربانی کا شراب طہور نصیب ہوگا تو نفس و قوٰی و حواس بھی حصہ حاصل کریں گے۔ اسی لیے کہا گیا:

وَلِلْاَرْضِ مِنْ کَاسِ الْکِرَامِ نَصِیْبٌ۔

زمین کو کریموں کے کاسوں سے حصہ ملتا ہے یہاں ارض سے نفس اور کرام سے قلب پر انوار تجلیات کے واردات مراد ہیں۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ
وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۫ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ
عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ
وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور مصر کے جس شخص نے یوسف علیہ السلام کو خریدا اُس نے اپنی عورت سے کہا کہ انھیں عزت سے رکھو شاید عنقریب ہمیں ان سے فائدہ پہنچے یا انہیں ہم اپنا بیٹا بنالیں اور اسی طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو اس زمین میں قدرت بخشی اور وہ اس لیے کہ اکثر لوگ نہیں جانتے اور جب یوسف علیہ السلام اپنی قوت کو پہنچے تو انھیں ہم نے حکم اور علم عطا فرمایا اور ہم نیکوں کو ایسا ہی صلہ عطا فرماتے ہیں اور یوسف علیہ السلام جس عورت کے گھر میں تھے اُس نے انھیں لبھایا اور تمام دروازے بند کر دیے اور کہنے لگی کہ جلد آؤ تمہیں کہہ رہی ہوں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ بے شک وہ تو میرا پرورش کرنے والا ہے جس نے مجھے اچھی طرح رکھا بیشک ظالموں کو کوئی فلاح نصیب نہیں ہوتی۔

تفسیر عالمانہ اَلَّذِي اشْتَرٰىهُ سے عزیز مصر مراد ہے۔ یعنی بادشاہ کا وہ وزیر اعظم جو مصر کے تمام خزانوں کا نگران اور سارے لشکر کا چیف کمانڈر جس کا نام قطفیر تھا اسے عزیز کہا جاتا۔

ف: قاموس میں ہے کہ لفظ 'عزیز' مصر کے بادشاہ کا لقب تھا اس لیے کہ اسے اپنی تمام مملکت پر غلبہ حاصل تھا۔ اور یہ لقب اُس بادشاہ کو دیا جاتا جو مصر کے علاوہ اسکندریہ پر بھی قبضہ رکھتا ہو۔

مِنْ مِّصْرَ کا مِنْ بیانیہ ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جس نے کنویں سے نکالنے والے سے خریدا تھا، یہ مصر کا خریدار اس کا غیر ہے۔ (کذا فی الارشاد)

اسی لیے کاشفی نے یہی ترجمہ کیا کہ یوسف علیہ السلام کو ایک اہل مصر نے خریدا تھا، یعنی عزیز مصر نے۔

ف: اُس وقت مصر کا عزیز ریان بن ولید از نسل عمالقہ تھا جو یوسف علیہ السلام پر ایمان لایا اور آپ کی زندگی میں فوت ہوا۔ اس کے فوت ہونے کے بعد مصر کی شاہی قابوس بن مصعب کے سپرد ہوئی اُسے یوسف علیہ السلام نے اسلام کی دعوت دی لیکن اُس نے انکار کر دیا۔

ف : قاموس میں ہے کہ قابوس غیر منصرف ہے اس لیے کہ اس میں دو سبب ہیں : عجمہ و معرفہ ۔ یہ کاؤوس کا معرب ہے۔

ف : یہ وہ قابوس نہیں جس نے خط لکھا تھا : ھذا خط قابوس اُمّ جناح طاؤس ۔ اس لیے کہ وہ ایک بہت بڑا بادشاہ تھا ، وہ ۴۰۳ھ میں فوت ہوا۔ (کذا فی الروضہ)

ف : موسیٰ علیہ السلام کا ہمعصر فرعون یوسف علیہ السلام کے ہمزمان فرعون کی اولاد سے تھا اس تقریر پر وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ میں خطاب اولاد کو ہے لیکن مراد اُن کے آباؤ اجداد ہیں۔

ف : کاشفی نے لکھا کہ جب یوسف علیہ السلام کے قافلے کی آمد ین سے مصر میں مشہور ہوئی تو عزیز کے نوکر چاکر قافلے کے لیے چشم براہ تھے۔ جب قافلہ آیا تو مصری لوگ یوسف علیہ السلام کے حسن وجمال کو دیکھتے ہی فریفتہ وشیفتہ ہو گئے اور عزیز مصر کو جاکر خبر سنائی تو وہ بھی فریفتہ و دیوانہ ہو گیا۔ ع

والاذن تعشق قبل العین احیاناً

ترجمہ : کبھی آنکھوں سے پہلے کان عشق کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ف : مالک سے مصریوں نے یوسف علیہ السلام کی خریداری کے لیے کہا تو مالک نے یوسف علیہ السلام کو آراستہ و پیراستہ کیا اور آپ کو بازارِ مصر میں لے آیا۔ جونہی مصریوں کی نگاہ یوسف علیہ السلام کے چہرۂ جہاں آرا پر پڑی تو سو جان قربان ہونے کو تیار ہو گئے۔ ؎

آراستہ آں یار ببازار بر آمد
فریاد و فغاں از در و دیوار بر آمد

ترجمہ : وہ پیارا محبوب جب آراستہ ہو کر بازار میں تشریف لایا تو مصر کے در و دیوار سے فریاد آئی۔

مالک نے کہا کہ تین دن بولی دی جائے گی، جس کی قیمت زائد ہو گی یوسف علیہ السلام اس کی ملکیت ہوں گے۔ ایسے ہی لحظہ بہ لحظہ یوسف علیہ السلام کی قیمت بڑھتی گئی یہاں تک کہ ہر ایک چاہتا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی ایسی قیمت بتائے کہ اس سے اور کوئی نہ بڑھ سکے۔ ؎

خریداران دیگر لب بہ بستند
پس زانوئے خاموشی نشستند

ترجمہ : تمام خریداروں کی زبان بند ہو گئی اور وہ سارے خاموشی سے بیٹھ گئے۔

بالآخر یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر نے خرید لیا کہ اسے ایک بار مشکِ خالص سے ، ایک دفعہ سونے ، ایک مرتبہ چاندی سے اور ایک بار ریشم سے تولا جائے گا۔ اس وقت یوسف علیہ السلام کے جسم مبارک کا وزن پانچ من تھا۔

حکایت — بُوڑھی خریدار حضرت یوسف علیہ السلام کی قیمت روز بروز بڑھتی جارہی تھی کہ ایک بڑھیا کچے دھاگے لے کر آئی اور چاہتی تھی کہ وہ بھی یوسف علیہ السلام کو خرید لے۔
چنانچہ یوسف علیہ السلام کے اس قصّے کی طرف جامی قدس سرہٗ نے اشارہ فرمایا ؎

بے سرِ عرفان متن تار فکرت
خریدار یوسف مشہور زیں گلا بہ

ترجمہ: معرفت کے بغیر اپنے فکرمت دوڑا۔ ایسی کمزور حالت میں یوسف کا خریدار مت بن۔
اس میں اشارہ ہے کہ معشوق کے لیے ہر عاشق کو اپنی جملہ مقدور کو صرف کر دینا ضروری ہے۔

سبق ف: اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر مبارک سترہ سال تھی پھر جس وقت آپ کو ریان نے اپنا وزیر اعظم بنایا اس وقت آپ کی عمر شریف سینتیس سال تھی۔ اور جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و حکمت سے نوازا تو اس وقت آپ سینتیس سال کے تھے۔ آپؑ کا ایک سو بیس سال کی عمر میں وصال ہوا۔ یہی پہلے پیغمبر ہیں جنہوں نے کاغذ کی ایجاد فرمائی۔

لِامْرَاَتِہٖ یہ لام اشتریٰ کے متعلق نہیں بلکہ قال کے متعلق ہے یعنی اس نے اپنی عورت راعیل بنت رعاییل سے کہا، یا راعیل کے باپ کا نام ہیکاہروان تھا۔ (کذا فی التبیان) اس کا لقب زُلیخا بضم الزاء المعجمہ و فتح اللام تھا۔ (کذا فی عین المعانی) عام مشہور فتح الزاء و کسر اللام ہے۔

اَکْرِمِیْ مَثْوٰىہُ یوسف علیہ السلام کی اقامت گاہ کو کریم، حسین اور پسندیدہ بنا، اب معنیٰ یہ ہوا کہ اس کی خورد و نوش وغیرہا بہتر سے بہتر بنا۔ یعنی یوسف علیہ السلام کی عزت و احترام میں اور خدمت گزاری احسن طریقے سے کیجئے، جیسے سلطان کو المقام العالی کہا جاتا ہے۔ حضرت امام غزالی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ شریف کو جناب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسے حضرت اور مجلس سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: السلام علیٰ حضرۃ العبارکۃ و مجلسہ الشریف۔ اس سے اس کی ذات مراد ہوتی ہے اور اس کے متعلقات بھی بطور اطلا[illegible] اد ہوتے ہیں۔ عَسٰٓی اَنْ یَّنْفَعَنَآ ممکن ہے کہ ہمیں اپنی ضروریات و حوائج وغیرہ میں نفع دے یعنی زمین اور دوسرے کاروبار اور دینی امور کی مصلحتوں میں فائدہ دے۔ اَوْ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں یعنی اسے اپنے بیٹے کے قائم مقام مقرر کرلیں۔ یہ اس عزیز مصر کی فراست تھی کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اس طرح کہا۔

ف: تین شخصوں کو دنیا کا بہت بڑا فراست دان مانا گیا ہے:
۱۔ عزیز مصر کو کہ اس نے یوسف علیہ السلام کا انتخاب کیا۔

۲۔ شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے والدگرامی کو گھریلو کام سرانجام دینے کے لیے منتخب کیا۔

۳۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ انھوں نے اپنے وصال کے بعد امورِ خلافت کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چُنا۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ اور ہم نے یوسف علیہ السلام کو مصر کی زمین میں قدرت دی۔ اس کا حدود اربعہ ایک سو بیس مربع میل تھا۔ ذٰلك کا اشارہ تمکین مصدر کی طرف جو مکّنّا فعل میں ہے۔ اس سے عزیز کے دل میں عزت، واحترام کا خیال ڈالنا یا اس کے گھر میں معزز ہونا مراد ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کا معزز ہونا کسی دوسرے کی طرف سے نہیں تھا بلکہ من جانب اللہ تھا اس معنے پر کاف زائدہ ہوگا اس سے مشارٌ الیہ کی عظمت شان کا اظہار مطلوب ہے اسے کلام عرب وغیرہ میں اس لیے لایا جاتا ہے تاکہ شے کی عظمت شان کا اظہار ہو۔ مثلاً کہا جاتا ہے: مثلك لا يبخل یعنی ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ارضِ مصر بخشی اور ہم نے عزیز مصر کے دل میں یوسف علیہ السلام کی محبت ڈالی اس وجہ سے عزیز کی عورت زلیخا نے معاملات سنگین بنائے لیکن عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرفداری کی۔ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ط اور ہم انھیں خوابوں کی تعبیر بتانے کی توفیق بخشیں گے۔ جیسے بادشاہ اور دو قیدیوں کے خواب کی صحیح تعبیر بتائی۔ چنانچہ انھوں نے خود فرمایا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ یہی خواب کی صحیح تعبیر یوسف علیہ السلام کو مصر کے حصول کا سبب بنی۔

ف: تفسیر ابواللیث میں ہے کہ تاویل الاحادیث سے تعبیر رؤیا اور دیگر مختلف علوم مراد ہیں۔

وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ اور اللہ تعالیٰ اپنے جملہ امور پر غالب ہے یعنی اس کے حکم کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اور نہ ہی اس کے ارادہ اور مشیت کی کوئی مخالفت کر سکتا ہے۔ امرہٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی یوسف علیہ السلام اور ان کے سوا جس طرح چاہے حکم دے وہ کسی شے کے لیے جب چاہتا ہے تو اسے کہتا ہے "ہو جا" تو وہ ہو جاتی ہے۔

وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اس لیے وہ کام جو کر رہے ہوتے ہیں سمجھتے ہیں اس پر ان کا اختیار ہے۔ یہ صرف ان کا وہم و گمان ہے۔ ؎

بود ہر کسے را دگر گونہ راستے
نباشد مگر آنچہ خواہد خدائے

---

[1] اسی محاورہ سے ہم اپنے کسی بزرگ اور استاد و پیر و مرشد اور علماء کرام کو گفتگو اور خطوط وغیرہ میں لفظ حضرت اور جناب وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

ترجمہ: ہر ایک کی اپنی رائے ہوتی ہے لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

حدیث شریف قدسی بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابنِ آدم! تیرا بھی ارادہ اور میرا بھی ارادہ، لیکن ہوگا وہی جو میرا ارادہ ہے۔ اگر تو سرِ تسلیم خم کرے گا تو جس طرح چاہتا ہے وہی عطا فرماؤں گا۔ اگر تو میرے ساتھ جھگڑا کرے گا تو جو کچھ تو چاہتا ہے اس کے بجائے تجھے مشقت میں ڈالوں گا۔ پھر وہی ہوگا جو میں چاہتا ہوں۔

سبق: انسان پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر امر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور وہ امرِ الٰہی کے مقابلہ میں اپنی رائے زنی پر زور نہ دے۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ میں ہے کہ جب قلب (یوسف) کو شریعت مصر کے بازاروں میں لے گئے تو اسے (عزیزِ مصر) شریعت یعنی جادۂ طریقت کے مربّی نے لے لیا تاکہ اسے عالمِ حقیقت کی طرف پہنچائے۔ لِامْرَاَتِہٖ اس سے دُنیا مراد ہے اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ شریعت دنیا سے کہتی ہے کہ قلب کی خدمت گاری میں اس طرح جد وجہد کیجئے جیسے جسم کی صفات میں کوشش کی جاتی ہے اور جن امور کی انھیں ضرورت ہو پورا کیجئے۔ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ ہمیں فائدہ پہنچائے گا یعنی جب صاحبِ شریعت اور دنیا کی بادشاہی کا مالک ہوگا تو ہمارے اندر نبوت کی اکسیر ڈال کر ہماری دُنیا بدل دے گا کہ ہماری شریعت طریقت سے اور دنیا آخرت سے بدل جائے گی اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا اسے شریعت و طریقت اور ترکِ دنیا کمینی کے متعلق اس کی تربیت ہم کریں گے تو اس معنے پر گویا وہ ہمارا بیٹا ہوگا۔ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ٘ اور اس میں اشارہ ہے کہ قلب ارضِ بشریت پر غلبہ پا جاتی ہے اور تاویل الاحادیث کی تعلیم سے علمِ نبوت مراد ہے۔ یعنی جب قلب پورے طور شریعت و طریقت کی تربیت حاصل کر لیتا ہے تو اسے علمِ نبوت سے سرفراز فرمایا جاتا ہے۔

ف: جیسے درخت کا ثمر اس وقت نصیب ہوتا ہے جب درخت کی جڑیں مضبوط ہوں۔ اسی طرح قلب کا حال ہے کہ اس سے علومِ دینیہ اور مشاہداتِ ربانیہ کا ظہور اس وقت ہوگا جب قلب کا درخت ارضِ انسانیہ میں راسخ اور مضبوط ہو۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ کی دو تقریریں ہیں امرہٖ کی ضمیر قلب کی طرف راجع ہے۔ اس تقریر پر معنے یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے قلب پر اپنی محبت و طلب پیدا کرنے پر غالب ہے۔

(۲) قلب انسان پر جذبات عنایۃ کا غلبہ بخشتا ہے تاکہ وہ فنا فی اللہ و بقا باللہ کے صراطِ مستقیم پر چل سکے۔ اسکے بعد قلب کا تصرف اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی طاقت سے اسی کے لیے اور اسی کے ذات میں ہو۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ اکثر لوگوں کو خبر ہی نہیں کہ وہ کس کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور اللہ والوں کو معلوم ہے کہ انسانی تخلیق اس کمال کی استعداد کے لیے ہوئی کہ وہ انانیت نفس سے فانی ہو کر ہویت حق سے بقاء

پاتے۔ اسی لیے وہ ہر وقت اس جد وجہد میں رہتے ہیں کہ ان کی استعداد کو نقصان و خسران نہ ہو۔

ف : آیت میں علم کی مدحت اور جہل کی مذمت ہے۔ علم کی مدحت کا مضمون اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالٰے نے علم کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام پر احسان جتلایا ہے۔ کما قال ولنعلمہٗ من تاویل الاحادیث اور جہالت کی مذمت ولکن اکثر الناس الخ میں ہے۔

ف : علم دو قسم ہے :

۱۔ علمِ شریعت

۲۔ علمِ حقیقت

ہر ایک مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہت بڑی فضیلت کے حامل ہیں۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا علم افضل ہے؟
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : العلم باللہ۔

یعنی معرفتِ حق تمام علوم سے افضل ہے۔

پھر سوال کیا گیا کہ کون سے اعمال سے مراتب بلند ہوتے ہیں؟ آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ العلم باللہ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ ہم آپ سے عمل کا سوال کرتے ہیں آپ علم کا جواب دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہی عمل مفید ہے جو علم سے ہو، اگرچہ تھوڑا ہو[1] اور جہالت میں کتنی ہی عبادت (اعمال صالحہ) کیے جاؤ مفید نہیں۔

فائدہ : معرفتِ حق قلب کی صفائی کے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور آئینۂ قلب کو صاف کر لو۔ معرفتِ حق خود بخود حاصل ہو جائے گی۔ ہمارے مشائخ اور اکابر اولیاء کی توجہ ہمیشہ باطن اور قلوب کی صفائی کی طرف رہی (آج بعض پیر و مولوی زیادہ تر ظاہر اور جسم کے بناؤ سنگار میں لگے رہتے ہیں) حالانکہ ہمارے اکابر، مشائخ، علماء و اولیاء کرام کی ظاہر اور جسم کے بناؤ سنگار کی طرف توجہ بہت کم تھی (بعض پیر و مولوی ایک عذر لنگ پیش کرتے ہیں، اگرچہ وہ بعض حضرات کے لیے واقعی عذر ہے لیکن اکثر کے لیے نفس کا دھوکہ) اس لیے کہ انسان کے ظاہر پر خلق کی نظر پڑتی ہے اور باطن پر خالق کی نظر پڑتی ہے اور باطن پر خالق کی۔ اب آپ خود بتائیے کہ وہ مقام صفائی کے لائق ہے کہ جس پر خالق کی نظر ہے یا جس پر مخلوق کی۔ ؎

کعبہ بنیاد خلیل آزر است　　　دل گزرگاہ جلیل اکبر است

---

[1] وہ جاہل عبادت گزار پیری مریدی کا دم بھرنے والے حضرات توجہ فرمائیں جو علم ظاہری کو کچھ نہیں سمجھتے حالانکہ پیری و مریدی و ولایت حقیقی کے لیے علم ظاہری ازبس ضروری ہے۔

ترجمہ : کعبہ خلیل پیغمبر علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے لیکن دل تو جلیل اکبر کے دیکھنے کی جگہ ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے توفیق کا سوال کرتے ہیں۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ قاموس میں ہے کہ اشد بمعنے قوت ہے۔ یعنی اٹھارہ تا تیس سال انسان کی عمر کو عربی میں اشد کہا جاتا ہے۔ واحد کی بجائے جمع کے صیغے میں اشارہ ہے کہ یہ واحد اور جمع دونوں ایسے صیغے ہیں کہ ان کی کوئی نظیر نہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ ایسی جمع ہے کہ اس کا کوئی واحد کا صیغہ اس کے اپنے لفظوں میں نہیں ہے۔

ف : بعض اہل تفاسیر نے فرمایا کہ انسان کی زندگی کا وہ وقت مراد ہے جس میں قوت واشتداد اور عقل وتمیز کا استحکام اپنے منتہا کو پہنچتا ہے یعنی تیس تا چالیس کے مابین وقوف کا سن۔

انسانی عمر کی تقسیم عقلاً فرماتے ہیں کہ انسان کی عمر کے چار مراتب ہیں :

۱۔ نشو ونما کا دور ــــ اس کا انتہا تیس سال پر ہوتا ہے۔

۲۔ شباب ــــ اسے سن الوقوف بھی کہتے ہیں اس کا انتہا چالیس سال پر ہوتا ہے۔

۳۔ سنِ کہولت (بڑھاپے کا آغاز) ــــ اسے سنِ انحطاط بھی کہا جاتا ہے۔ اسی دوران انسانی ڈھانچے میں تھوڑی تھوڑی کمی واقع ہوتی رہتی ہے جس کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ اس کا انتہاد ساٹھ سال پر ہوتا ہے۔

۴۔ سن شیخوخت ــــ یہ بھی انحطاط کا دور ہے لیکن اسی دوران انسانی ڈھانچہ میں کمی واضح طور ہوتی ہے جس کا احساس ہر خاص وعام کو ہوتا ہے۔ اطباء فرماتے ہیں کہ اس کا منتہیٰ ایک سو بیس سال ہے۔

اشد کا صوفیانہ ترجمہ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ مقام فتوت یعنی خلقی (پیدائشی) ــــ سے تجرد حاصل کر کے فطرۃ اولیٰ کے انتہاء کو پہنچنا۔ یوں کہو کہ فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہونا۔

فائدہ : فتوۃ لغت میں بمعنی سخا وکرم اور صوفیاء کرام یعنی اہلِ حقیقت کی اصطلاح میں نفس کی عادات میں دنیا و آخرت کے تاثرات پیدا کرنا۔

اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا حکم بمعنی علم وعمل کا کمال کہ اس سے مخلوق میں حق وصداقت کا فیصلہ کیا جا سکے۔

صوفیانہ ترجمہ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حکم سے مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نفس پر غلبہ بخشا یہاں تک کہ انھوں نے اپنی شہوت کو ایسا دبا دیا کہ زلیخا کی تمام کارروائی کو بے اثر بنا دیا۔ اور قاعدہ ہے کہ جس کا اپنے نفس پر کنٹرول نہ ہو وہ دوسروں پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔

نکتہ : حضرت امام حضرت حسن (بصری) سے نقل کر کے فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام جب کنویں میں ڈالے گئے تو ان کا ابتدائی دور تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ چالیس سال کی عمر میں وحی بھیجی گئی اسی لیے ان کے لیے واستوٰی فرمایا۔ کما قال ولما بلغ اشدہ واستویٰ۔ اور یوسف علیہ السلام اٹھارہ سال کی عمر میں کنویں میں ڈالے گئے۔ اسی لیے ان کے لیے صرف

وَ عِلْمًا مفسرین نے فرمایا کہ حکما سے حکمت عملیہ اور علما سے حکمت نظریہ مراد ہے۔

ف : اصحاب ریاضات و مجاہدات پہلے حکمت عملیہ سے واصل ہوتے ہیں پھر حکمتِ نظریہ کی طرف ترقی کرتے ہیں اور اصحابِ افکار و انظارِ عقلیہ پہلے حکمت نظریہ سے واصل ہوتے ہیں۔ پھر وہاں سے حکمت عملیہ کی طرف نزول فرماتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے پہلا طریقہ اختیار فرمایا اس لیے کہ انھوں نے تکالیف اور بلاؤں اور محنتوں و مشقتوں پر صبر فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر مکاشفات کے دروازے کھولے۔ حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

مکن زغصہ شکایت کہ در طریق طلب

براحتی نرسید آنکہ زحمتی نکشید

ترجمہ : غصہ کی شکایت مت کرو اس لیے کہ طریقہ طلب کا قانون ہے کہ راحت اسے نصیب ہوتی ہے جو دکھ اٹھاتا ہے۔

اور فرمایا : ؎

چہ جورہا کہ کشیدند بلبلان از دے

بوئی آنکہ ذکر نو بہار آمد

ترجمہ : بلبلوں نے سردیوں کی سختیاں اس لیے جھیلیں تاکہ بہاریں چہچہائیں۔

خلاصہ یہ کہ یوسف علیہ السلام کا طریقہ سالک مجذوب جیسا تھا۔ مجذوب سالک جیسا نہیں تھا۔ اکثر اولیاء و انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ نے پہلا طریقہ جاری رکھا۔

تفسیر صوفیانہ حکماء و علماء فرماتے ہیں کہ آیت میں نفس کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے جو اسے قوتِ عملیہ و نظریہ میں حاصل ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ احسن عبادت جوانی کی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس حکمت سے نوازتا ہے جو دوسروں کو بڑھاپے میں۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ فرمانبردار بندے کے لیے حکمت کے چشمے کھول دیے جاتے ہیں اور اس میں بندے کو بھی تنبیہ ہے کہ عطیۂ الٰہی ضرور نصیب ہوگا اگر دیر باید۔ سالک پر لازم ہے کہ وہ احسانِ الٰہی کا انتظار کرے اس سے ناامیدی نہ کرے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میری اُمت کی افضل عبادت یہ ہے کہ کشادگی کا انتظار کریں۔

ف : نصر نے فرمایا کہ جب یوسف علیہ السلام سنِ شعور کو پہنچے تو آپ نے اوامر و نواہی کی پابندی شروع کی اور اللہ تعالیٰ کے جملہ احکام کی ادائیگی میں استقامت دکھائی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں حکم سے نوازا۔ اور انہوں نے نفس کی مخالفت کی تو انھیں علم کی دولت بخشی گئی۔

ف : بعض بزرگوں کا فرمان ہے کہ:

کمالِ علمی کمالِ عملی سے فضل و اعلیٰ ہے۔ عمل کی کوتاہی کی سزا بہت کم ہے لیکن علم کی کوتاہی پر سخت سزا ہے۔ اسی علم، شرافت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ دعا کیجئے:

رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا۔

اسی لیے بزرگانِ دین نے فرمایا کہ:

آدم علیہ السلام مسجودِ ملائکہ اسی لیے ہوئے کہ انھیں اسما کے علم سے نوازا گیا، اور سلیمان علیہ السلام نے بھی اتنا بڑا ملک اسی لیے پایا کہ آپ منطق الطیر کا علم رکھتے تھے اور یوسف علیہ السلام کو نجات اور عزت نصیب ہوئی تو علم تعبیر کی وجہ سے اس سے معلوم ہوا کہ جب علم کے اس قدر فضائل ہیں تو پھر عالم علم توحید کو نارِ جحیم سے کیوں نہ نجات نصیب ہو اور وہ کیوں نہ دارِ نعیم میں دیدارِ الٰہی سے نوازا جائے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ اور اسی عجیب مثال کی طرح یوسف علیہ السلام کو محسنین جیسی جزا دیں گے۔ محسن وہ ہے جو اپنے عمل میں خلوص رکھے اور جزا کو محسنین سے معلق کرنے میں اشارہ ہے کہ انھیں احسان کی وجہ سے جزا نصیب ہوگی۔ اور تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو حکم و علم سے نوازا صرف اسی لیے کہ وہ اپنے اعمال میں مخلص اور عنفوانِ شباب سے متقی تھے اور احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔

ف : بعض اکابر فرماتے ہیں کہ محسنین سے وہ سالک مراد ہیں جو طلب الٰہی اور ارادہ حق و اجتہاد و ریاضت میں جد و جہد کرکے اپنے نفسوں پر احسان کرتے ہیں جو شخص اپنے آپ کو اہلِ احسان کے زمرہ میں داخل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے احسن جزا سے نوازتا ہے اور اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ کما قال واللہ یحب المحسنین اور جسے اللہ تعالیٰ محبوب بناتا ہے وہ سعادتِ دارین سے نوازا جاتا ہے۔

حدیث شریف : حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو فرماتا ہے کہ تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام اہلِ سماء کو ندا دیتا ہے کہ فلاں بندے سے محبت کرو اس لیے کہ اس بندے سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔ اس وقت تمام اہلِ سماء اس بندے سے محبت کرتے ہیں۔ پھر اس بندے کی مقبولیت زمین والوں کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔

"تاویلات نجمیہ" میں ہے:

تفسیر صوفیانہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ یعنی جب یوسف قلب فیض الوہیت کے قبول کرنے کی استعداد کے کمال کو پہنچا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا تو ہم نے اس پر حکمت الٰہیہ اور علم لدنی کے ڈول بھر بھر کر ڈالے وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اور ایسے ہی ہم اعضا و جوارح انسانی کو جزا دیتے ہیں جب وہ قاعدۂ شریعت و طریقت کے

مطابق عمل کریں یعنی انھیں مقامِ حقیقت تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

ف : اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک کو اعمال کے مطابق جزا ہوتی ہے اس کے دو طریقے ہیں :

۱۔ تمام اعمال کی تکمیل کے بعد جزاء نصیب ہوتی ہے۔

۲۔ عمل کرنے کے اثناء میں لطف و کرم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پھر عمل کے اختتام تک اسے جزا سے نوازا جاتا ہے جیسے یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں بادشاہ اور دو قیدیوں کے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا گیا اگرچہ اس علم اور دوسرے علوم کی تکمیل آزمائش و امتحان کے اختتام تک ہوئی۔

سبق : اسے خوب سمجھ لو کہ یہ ایک بہترین سبق ہے جسے حاصل ہو جاتا ہے اسے دقائق کلام کا کمال نصیب ہو جاتا ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا ۔ المراودۃ بمعنی المطالبۃ ۔ رَادَ یَرُوْدُ سے ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آتے اور جاتے یعنی راد بمعنی جاء و ذهب ہے۔ لیکن اس آنے جانے میں طلب کی شرط ضروری ہے۔

سوال : طلب تو صرف زلیخا کو تھی۔ یہاں مفاعلہ کا باب لایا گیا ہے جو جانبین کی طلب کا تقاضا کرتا ہے۔

جواب : یہاں تجرید کی گئی ہے یعنی طلب جانِ واحد سے تھی اور چونکہ اس کی طلب ایک حسن و جمال والے سے متعلق تھی اور اس میں فاعلیت کا معنیٰ ہے۔ اسی مناسبت سے مفاعلہ کا باب لایا گیا ہے اگرچہ اس طرح کے نظائر کلام عرب ان گنت ہیں۔ ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں، وہ مداواۃ الطبیب ہے۔ دیکھیے یہاں بھی مفاعلہ کا باب ہے۔ لیکن یہاں یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ طبیب مریض کا علاج کرتا ہے اور مریض طبیب کا، بلکہ صرف طبیب کا علاج کرنا مراد ہو سکتا ہے اور چونکہ طبیب کا علاج بیمار کا محتاج ہے۔ جب تک وہ نہ ہو اس کے علاج کا معنیٰ ظہور پذیر نہ ہوگا اور اس کا سبب مریض ہے اس طرح زلیخا کی طلب کو سمجھیے کہ وہ بھی سبب کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتی تھی اور وہ سبب جمال یوسف علیہ السلام ہے۔

سوال : مُرَاوَدَۃ خود متعدی ہے پھر اسے من سے متعدی کرنے کا کیا معنیٰ ؟

جواب : چونکہ مراودۃ یہاں پر مخادعۃ کے معنیٰ کو متضمن ہے اسی لیے اسے من سے متعدی کیا گیا ہے اب معنیٰ یہ ہوا کہ زلیخا نے یوسف علیہ السلام کی ذات سے دھوکا کیا تاکہ اپنا مقصد پورا کر سکے۔ یعنی زلیخا سے وہ فعل سرزد ہوا جو اپنے ساتھی سے ایک دھوکہ باز اس طرح کرتا ہے کہ کام بھی چل جائے اور وہ ساتھی بھی ہاتھ سے نہ نکلے۔ جیسے زلیخا کا ارادہ تھا کہ یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ بُرائی بھی کر لیں اور پھر تا زیست اس کے ساتھ رہیں۔ (کذا فی القاموس)

خلاصہ یہ کہ فعل چونکہ زلیخا سے بہ تکلف سرزد ہوا اسی لیے اسے مفاعلہ سے تعبیر کیا گیا اور پھر چونکہ دھوکہ سازی تھی اس لئے اس کا صلہ من لایا گیا ہے تاکہ واضح ہو کہ اس میں یوسف علیہ السلام کو کسی قسم کا دخل نہ تھا اور یک طرفہ کارروائی صرف زلیخا سے ہی ہوئی۔

سوال : اس میں اسم موصول لانے کی کیا ضرورت ہے ؟

جواب : تاکہ فعل مؤکد ہو اور ثابت ہو کہ یوسف علیہ السلام ایسے متقی اور پاکباز تھے کہ باوجود اس کے کہ وہ پری پیکر، مرقعِ حُسن وجمال زلیخا کے گھر میں تھے پھر بھی برائی سے مجتنب رہے۔

حکایت کسی عورت سے پُوچھا گیا کہ تُو فلاں کے ساتھ بُرائی کی طرف کیوں مائل ہُوئی؛ اب تیرے لیے زندگی بھر ملامت رہے گی۔ اس نے جواب دیا کہ ہر وقت نگاہ سے نگاہ لڑتی رہی اور اس کے ناز کے کرشمے مجھ پر غالب آ گئے۔

کمالِ یُوسف علیہ السلام یعنیٰ یہی مصیبت حضرت یوسف علیہ السلام نے بار بار اٹھائی، لیکن جب بھر بھی متوجہ نہ ہُوئے اور مستزاد یہ کہ آپ زلیخا کے زیرِ فرماں تھے، اس کے مملوک زرخرید تھے اور پرورش کے گوناگوں احسانات سوا۔ جوانی کا زور تھا۔ زلیخا کا حُسن وجمال اپنے کمال کو پہنچا ہُوا تھا اور گھر میں اکیلے، زلیخا کی طرف سے نہ صرف اشارہ وکنایہ بلکہ تصریح، برملا اظہار اور بالاکراہ و بالاجبار۔ لیکن میں قربان جاؤں یوسف علیہ السلام پر، کہ انھوں نے عفت وعصمتِ نبوت پر ذرہ برابر بھی حرف نہ آنے دیا، ارادہ تو کجا خیال و تصور کو بھی قلب میں جھانکنے نہ دیا۔

حکایت ــــــ زلیخا اور اس کا خواب زلیخا عالمِ دنیا میں حُسن وجمال کی ملکہ، یعنی سلطان المغرب طیموس کی شہزادی تھی۔ ایک رات خواب میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ جس کے حسن وجمال کے سامنے اپنے حسن وجمال کو سرنگوں پایا، اس سے نام پُوچھا تو اُس نے بتایا کہ مَیں عزیزِ مصر ہوں۔ بیدار ہوتے ہی دیوانی مستانی بن بیٹھی اور روز بروز نقاہت وکمزوری کا شکار ہوتی چلی گئی۔ لیکن عشق کا حال کسی پر بھی ظاہر نہ کیا۔ ؎

نہاں می داشت رازش در دلِ تنگ
چو کان لعلے و لعل اندر دلِ سنگ

ترجمہ: دل کا راز دل میں ہی پوشیدہ رکھا جیسے لعل کان کے سخت پتھر میں چُھپا ہوتا ہے۔

زلیخا کی ہمجولیوں کو زلیخا کی حالتِ زار سے پریشانی ہُوئی۔ کوئی کہتی اسے نظرِ بد لگی ہے، کوئی کہتی اس پر جادو کا اثر ہے، کوئی کہتی اسے آسیب ہے، کوئی کہتی یہ عشق کی مریضہ ہے۔ ؎

صح عند الناس انی عاشقٌ
غیر ان لم یعرفوا عشقی لمن

ترجمہ: لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں عشق میں مبتلا ہُوں۔ لیکن تا حال ان پر یہ راز نہیں کُھلا کہ میں کس کی

عاشق ہوں۔

تحقیق و تفتیش بسیار کے بعد راز کھلا کہ زلیخا کسی کے عشق میں مبتلا ہے۔ ؎

زلیخا عشق را پوشیدہ مے داشت — بسینہ تخم را پوشیدہ می کاشت

ولے سرسبز دآں ھردم زجائی — ہمی کرد از بروں نشو و نمائی

خوشت از خردان ایں نکتہ گفتن — کہ مشک عشق را نتواں نہفتن

اگر بر مشک کہ در پردہ ملا توی — کند غمازی از صد پردہ اش بوی

ترجمہ: زلیخا عشق کو پوشیدہ رکھتی تھی چھپے چھپے اپنے سینے میں عشق کا بیج ڈالتی تھی۔ لیکن عشق ہر لحظہ ظاہر ہونا چاہتا تھا۔ بزرگوں نے خوب فرمایا ہے کہ عشق و مشک چھپ نہیں سکتے۔ مشک کو سو پردوں میں چھپاؤ تب بھی اس کی خوشبو ظاہر ہو ہی جائے گی۔

زلیخا کا نکاح زلیخا کے رشتہ کے لیے عالم دنیا کے بادشاہوں نے زلیخا کے باپ کی طرف پیغام بھیجا لیکن زلیخا نے کہا کہ میں تو عزیز مصر سے نکاح کروں گی۔ زلیخا کے والد نے جہیز کا بہت زیادہ سامان تیار کیا۔ ان گنت غلام، کنیزیں اور دیگر اسباب کے ساتھ زلیخا کو مصر کی طرف روانہ کیا ادھر عزیز مصر بھی زلیخا کو لینے کے لیے باہر تشریف لایا اور اس کے ساتھ استقبال کرنے والوں کا ایک کثیر مجمع تھا۔ اور بہت بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ آئے۔ زلیخا نے جونہی دور سے دیکھا تو دل میں کہا کہ یہ وہ نہیں جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس حسرت سے خوب روئی اور کہا کہ افسوس مجھے محبوب نہ ملا۔

؎

نہ آنست آنکہ من در خواب دیدم — بجست و جویش ایں محنت کشیدم

خدارا اے فلک بر من بہ بخشائی — برروئے من دراز مہر بکشائی

مسوز از غم من بے دست و پا را — مدہ بر گنج من ایں اژدہا را

ترجمہ: یہ وہ نہیں جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا اور جس کی جستجو کے لیے اتنا دکھ اٹھایا۔ اے فلک! فی سبیل اللہ مجھے بخش دے اور رحم و کرم کا دروازہ مجھ پر کھول دے مجھ جیسی بے دست و پا کو مت جلا، اور میرے خزانہ پر اس اژدہا کو مت بٹھا۔

زلیخا کو مژدۂ بہار جب زلیخا رو رہی تھی تو ہاتف غیب نے کہا: اے زلیخا! غم مت کھائیے اس لیے کہ تیرا محبوب تجھے اسی واسطہ سے ملے گا۔ ؎

زلیخا چوں زغیب ایں مژدہ بشنود

بشکرانہ سر خود بر زمین سود

ترجمہ : زلیخا نے جب غیب سے یہ مژدہ بہار سُنا تو شکرانہ کے لیے سر بسجود ہوئی۔

پھر جب زلیخا کو عزت واحترام سے عزیز کے گھر لائے تو وہ درد والم اور محبوب کی جُدائی سے نڈھال ہو رہی تھی۔

ے

بظاہر باہمہ گفت وشنو داشت
ولے دل جائے دیگر گروہ داشت

زلیخا سے عزیزِ مصر جماع نہ کرسکا

اسی غم والم اور یوسف علیہ السلام کی جدائی پر عرصہ گزر گیا اور عزیزِ مصر بھی زلیخا کے ساتھ وطی نہ کرسکا اس لیے کہ وہ نامرد تھا۔ اسی لیے اسے جماع پر قدرت حاصل نہ تھی۔ ے

بیا جامی کہ ہمت برگماریم
زکنعاں ماہ کنعاں را بر آریم
زلیخا با دلِ اُمید وار است
نظر بر شاہ راہ انتظار است

ترجمہ : آئیے جامی ہمت کرکے کنعان کے چاند کو کنعان سے لائیں۔ زلیخا پُر امید ہے اس کی نگاہ ہر وقت راہ پر ہے۔

یوسف علیہ السلام عزیزِ مصر کے گھر میں

شُد آنچہ شد بالآخر یوسف علیہ السلام بھائیوں کے حسد کا شکار ہوتے اور غلام بن کر بکنے کے لیے مصر میں تشریف لاتے اور انھیں عزیزِ مصر نے خریدا۔ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو کہا یہ تو وہی ہیں جنہیں مَیں نے خواب میں دیکھا تھا۔ ے

بخواہم روئے زیبا وے نمود است
شکیب از جانِ شیدا وے ربود است
دریں کشور از سودائش فتادم
بدیں شہر از تمنائش فتادم

ترجمہ : میں اس کا رُخِ زیبا دیکھنا چاہتی ہُوں اس لیے کہ میری جان سے صبر کم ہے۔ یہاں پر صرف اسی کی وجہ سے آئی ہوں اور اسی کی تمنا میں یہاں پہنچی ہوں۔

جب یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں تشریف لائے تو عشق بھی سامان باندھ کر زلیخا کے ہاں آگیا اور حسن کے لشکر نے زلیخا کے صبر و سکون کا تمام سامان لوٹ لیا اب تنہا عشق تھا جو زلیخا کو گھیرے میں لے چکا تھا۔

۵

زلیخا چوں برویش دیدہ بکشاد	بیک دیدارش افتاد آنچہ افتاد
زحسن و صورت و لطف و شمائل	اسیرش شد بیک دل نے بصد دل
بمعشوقاں چو یوسف کس نبودہ	جمالش از ہمہ خوباں فزودہ
نبود از عاشقاں کس چوں زلیخا	بعشق از جملہ بود افزوں زلیخا
ز طفلی تا بہ پیری عشق ورزید	بشاہی از جملہ بود افزوں زلیخا

ترجمہ: زلیخا نے جب اس کے چہرے کو دیکھا ایک بار اسے معلوم ہو گیا پھر تو اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ زلیخا جیسا کوئی عاشق دنیا میں نہیں۔ عشق میں سب سے بازی لے گئی۔ جوانی سے بڑھاپے تک عشق خریدا شاہی سے فقیری تک اس کا یہی حال رہا۔

جب عشق نے زلیخا پر حملہ کیا اور شوقِ محبوب سے نڈھال ہوئی تو یوسف علیہ السلام سے وہی کیا جو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔

یوسف علیہ السلام کی عبادت میں مشغولیت

مروی ہے کہ یوسف علیہ السلام زلیخا کے محل کے باغ میں عبادت کے لیے چلے جاتے تھے اور دن کو تین حصوں پر تقسیم کیا۔

ایک تہائی نماز کے لیے، ایک حصہ تسبیح و تہلیل اور ذکر و فکر کے لیے، ایک تہائی گریہ میں بسر فرماتے۔

جب یوسف علیہ السلام جوانی کو پہنچے تو زلیخا نے اپنی خواہش نفسانی کا اظہار شروع کر دیا۔ لیکن آپ جونہی اس سے ایسا غلط کلمہ سنتے تو باغ کی طرف عبادت کے لیے چلے جاتے۔ جب زلیخا کی ایک نہ چلی تو پریشان حال ہو گئی اور روز بروز حیرانی بڑھتی گئی اور رنگ بدلنے لگا تو زلیخا کی ہمراز دایہ حاضر ہوئی اسے زلیخا نے اپنا سارا حال سنا دیا۔ دایہ نے مشورہ دیا کہ ایک مکان تیار کیجئے اسے خوب آراستہ و پیراستہ کرو۔ اس سے یوسف علیہ السلام کی صحبت بآسانی میسر آجائے گی۔ زلیخا نے دایہ کے مشورہ سے بہترین مکان تیار کرایا اور ایک دن عزیز مصر کو بلا کر اس کا معاینہ کرایا۔ عزیز مصر نے مکان کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اس کا نام "بیت السرور" رکھو۔ جب عزیز مصر چلا گیا تو زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو

بلایا اور حکم دیا کہ اسے خوب سنگار دو۔ پھر خود آراستہ و پیراستہ ہوئی۔ زلیخا حسن میں یکتا تھی اس کا رنگ سفید تھا اور دو آنکھوں کے درمیان اس کا خال تھا جس سے حُسن خوب نکھرتا تھا اور زلفوں کو یاقوت اور موتیوں سے مزین کیا۔ بہترین پوشاک پہنی اور چمکتے ہُوئے ہار گلے میں ڈالے۔ ؎

بزیور ہا نبودش احتیاجی
ولے افزودزاں خود را رواجی
بخوبی گل بستانہا سمر شد
ولے از عقر شبنم خوبتر شد

ترجمہ: اسے زیورات کی محتاجی نہ تھی۔ زیورات کے بغیر ہی اس کا رواج بڑھا ہوا تھا اس کے حسن کے قصے باغات کے گُل بیان کرتے۔ چہرے پر پسینے نے خوب رنگ دکھایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو لایا گیا: ؎

درآمد ناگہاں از در چو ماہی
عطارد حشمتی خورشید جاہی
وجود از خواص آب و گل دور
جبیں طلعتی نورٌ علیٰ نور

ترجمہ: دروازے پر اچانک چاند کی طرح آئے جس کی حشمت عطارد کی سی تھی اور جاہ و جلال سورج جیسا، جسم آب و گل کی حقیقت سے دُور تھا نورٌ علیٰ نور تھا۔

جب یوسف علیہ السلام بیت السرور میں تشریف لائے تو زلیخا انھیں پہلے کمرے میں لے گئی اور اس کا تالا بند کر کے اپنا مطلب ظاہر کیا۔ لیکن یوسف علیہ السلام نے انکار کر دیا۔ پھر حیلہ کر کے دُوسرے کمرے میں لے گئی، اس کا تالا بند کر دیا اور اپنی خواہش ظاہر کی لیکن یوسف علیہ السلام نہ مانے یہاں تک کہ انھیں ساتویں کمرے میں لے گئی اور ان سب کمروں کے تالے بند کر دیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ اور یوسف علیہ السلام اور اپنے اوپر دروازے بند کر دیے۔ اس کے سات دروازے تھے اس لیے تفعیل کا باب لایا گیا ہے تاکہ تکثیر پر دلالت کرے۔

وَقَالَتْ ھَیْتَ لَکَ ھیت اسم فعل ہے بمعنی اَقْبِلْ و بَادِرْ یعنی جلدی کر۔ میرے ہاں آئیے اس لیے کہ اب میں صرف تیری ہوں - یہ لام بیانیہ ہے۔ فعل محذوف سے متعلق ہے اور وہ اقول ہے۔ یعنی میں تجھے

کہتی ہوں جلد تر آ۔

یوسف علیہ السلام کی نورانیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام ہنستے تو آپ کے دانتوں سے، اور جب بولتے تو آپ کے منہ سے نور چمکتا تھا، اور آپ کے سامنے سب کچھ نظر آتا تھا، کسی کو طاقت نہیں کہ آپ کے حُسن وجمال کو بیان کر سکے۔ زلیخا نے یوسف علیہ السلام سے عرض کیا کہ یہ مکان میں نے صرف آپ کے لیے بنایا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اے زلیخا! میں تو پہلے بھی غم کا ستایا ہُوا ہُوں، میرے بھائیوں نے جو کچھ کیا وہ عذاب تا حال مجھے نہیں بُھولا۔ وُہ ذلت و خواری تا دمِ زیست نہیں بھولے گی اب تو بھی میرے ساتھ وہی کچھ کرنا چاہتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہُوں کہ جس کا تُو نے "بیت السرور" نام رکھا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بیت الاحزان والتبور (ہلاکت کا گھر) ہو اور جہنم کا گڑھا بن جائے۔

مکالمہ یوسف علیہ السلام و زلیخا

حضرت یوسف علیہ السلام سے زلیخا نے کہا: تیری آنکھیں کیسی دلربا ہیں۔
یوسف علیہ السلام نے جواب دیا: سب سے پہلے آنکھیں مٹی میں مٹی ہونگی۔

زلیخا نے کہا: آپ کا چہرہ کتنا حسین وجمیل ہے۔

یوسف علیہ السلام نے جواب دیا: یہ بھی مٹی کی خوراک ہے۔

زلیخا نے کہا: آپ کی آنکھیں کیسی پیاری پیاری ہیں۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ بھی خاک۔

زلیخا نے کہا: ریشمی بستر بچھا ہوا ہے چلئے کام کیجئے۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اگر میں تیرا کام کروں تو بہشت سے محروم ہو جاؤں گا۔

زلیخا نے کہا: میں تیرے عشق میں پگھلتی جا رہی ہُوں تُو بھی مجھے تھوڑا سا تو دیکھ لے تا کہ میرے حُسن وجمال کی قیمت آپ کو معلوم ہو۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تیرے حُسن وجمال کو دیکھنے کا حقدار تیرا اپنا شوہر ہی کافی ہے۔ مجھے تیری طرف دیکھنا بھی حرام ہے۔

زلیخا نے کہا: هَيْتَ لَكَ۔ میرے پاس آؤ۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا: مَعَاذَ اللّٰهِ۔ اللہ بچائے ——— لفظ معاذ ان مصادر سے ہے کہ جو افعال مقدرہ سے منصوب ہوتے ہیں۔ ان کے افعال کا اظہار جائز نہیں، جیسے سبحان اللّٰہ، غفرانك، عونك۔ یہاں اعوذ محذوف ہے یعنی اے زلیخا! تو مجھے جس گناہ اور خیانت کی طرف بُلاتی ہے میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔

اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اس سے یوسف علیہ السلام نے پناہ مانگنے کا سبب بتایا کہ میرا سردار عزیز جس نے مجھے خریدا، اچھی تربیت کرنے والا اور میرے ساتھ نیک سلوک اور میری کرح کی رعایت کرنے والا ہے پھر مروّت کے خلاف ہے کہ میں اس کے حرم میں خیانت کروں۔

ف : یوسف علیہ السلام نے حقوق کا اظہار بہتر طریق سے بیان فرمایا ہے۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ظالم دائرہ فلاح میں داخل ہی نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ کبھی کامیاب ہو سکتے ہیں خواہ دنیا میں کتنا ہی عروج اور ترقی پا جائیں۔

ف : اس سے معلوم ہوا کہ جو احسان فراموشی کرکے محسن کے ساتھ بجائے احسان کے برائی کرے تو وہ بھی ظلم ہے گویا یوسف علیہ السلام نے زبانِ حال سے یوں فرمایا : ؎

زہے خجلت کہ در روز قیامت
کہ افتد بر زن کاراں غرامت
جزائے آں جفا کیشاں نویسند
مرا سر دفتر ایشاں نویسند

ترجمہ : وہ رسوائی جو قیامت میں زانیوں کو اٹھانی پڑے گی اور جب ان کے گناہوں کے دفتر کھلیں گے (اگر خدانخواستہ مجھ سے غلطی ہو گئی تو مجھے سرِ فہرست لکھیں گے)

مسئلہ : آیت سے معلوم ہوا کہ احسان کی پہچان واجب ہے اس لیے کہ یوسف علیہ السلام کو گناہ و ظلم اور زلیخا کے شوہر کا احسان مدِنظر تھا۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

[1] چوں نوبت بہ ہفتم خانہ افتاد
زلیخا را زجان برخواست فریاد
[2] مرا تا کی دریں محنت پسندی
کہ چشم رحمت از رویم بہ بندی
[3] بگفتا مانع من ایں دو چیز است
عتاب داور و قہر عزیز است

ترجمہ : [1] جب ساتویں کمرے میں پہنچے تو زلیخا کی فریاد اٹھی۔ [2] آپ میرے لیے کب تک محنت و مشقت پسند کرتے رہو گے کہ میرے سے رحمت کی نگاہ بند کر رکھی ہے۔ [3] یوسف علیہ السلام نے فرمایا : دو باتیں مانع ہیں عذابِ الٰہی اور عتاب عزیز مصر۔

زلیخا[1] گفت زاں دشمن بیندیش
کہ چوں روز طرب بر نشستہ ام پیش

دہم[2] جامی کہ با جانش ستیزد
ز مستی تا قیامت بر نخیزد

تو[3] میگوئی خدائی من کریم است
ہمیشہ بر گنہگاراں رحیم است

مرا[4] ز گوہر وز رصد خزینہ
دریں خلوت سراپا شد دفینہ

فدا[5] سازم ہمہ بر گناہت
کہ تا باشد ز ایزد عذر خواہت

بگفت[6] آنکس نیم کافتد پسندم
کہ آید میرکس دیگر گزندم

خدائی[7] من کہ نتواں حق گذارش
برشوت کی باتواں آمرزگارش

زلیخا[8] در تقاضا گرم یوسف
ہمی انگیخت اسباب توقف

دلش[9] می خواست در سفتن بالماس
ولے می داشت حکم عصمتش پاس

---

[1] زلیخا نے کہا دشمن سے خوف نہ کیجئے اس لیے کہ جب وہ میرے ساتھ عیش و عشرت کے وقت بیٹھے گا [2] تو اسے ایسا زہر کا پیالہ پلاؤں گی جو اسے قیامت تک نہ اُٹھنے دے گا۔ [3] آپ فرماتے ہیں میرا خدا کریم ہے اور وہ گنہگاروں پر رحیم ہے۔ [4] میرے گوہر و زر کے بے شمار خزانے ہیں جو کہ یہاں خلوت خانے میں مدفون ہیں۔ [5] یہ تمام تیرے گناہ کا فدیہ دُوں گی اور یہی تیرے خدا کے سامنے عذر خواہ بن جائے گا۔ [6] یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے عزیز کو نقصانِ جان پہنچے۔ [7] میرا خدا ایسی رشوت ستانی سے پاک ہے جو تُو نے بیان کی ہے۔ [8] زلیخا تقاضے میں سرگرم یوسف علیہ السلام توقف فرما رہے تھے۔ [9] زلیخا بہت جلد موتی پرونے کو چاہتی تھی لیکن یوسف علیہ السلام کو عصمت حق بچا رہی تھی۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا
الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ قَالَ هِيَ
رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ
وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ ... قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ يُوْسُفُ
اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ۝

ترجمہ: اور بے شک زلیخا نے یوسف علیہ السلام کا ارادہ کیا اور یوسف علیہ السلام بھی زلیخا کا ارادہ کرتے اگر اپنے رب تعالیٰ کا برہان نہ دیکھ لیتے ایسے ہوا تاکہ یوسف علیہ السلام سے برائی اور بے حیائی پھیر دیں بیشک یوسف علیہ السلام برگزیدہ بندوں میں سے ہیں۔ اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑے اور زلیخا نے یوسف علیہ السلام کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور دونوں نے زلیخا کے شوہر کو دروازے پر پایا زلیخا نے کہا نہیں سزا اس شخص کی جو تیری اہلیہ کی طرف زنا کا ارادہ کرے مگر یہ کہ اسے قید کیا جائے یا اسے دردناک عذاب دیا جائے یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ زلیخا نے مجھے ورغلایا کہ میں اپنے آپ کو نہ بچا سکوں اور زلیخا کے اپنے رشتہ داروں میں سے ایک نے گواہی دی کہ اگر یوسف علیہ السلام کا قمیص آگے سے پھٹا ہوا ہے تو زلیخا سچی ہے اور وہ غلط کہہ رہے ہیں اور اگر یوسف علیہ السلام کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو زلیخا جھوٹی اور یوسف علیہ السلام سچے ہیں۔ جب عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کا کرتہ پیچھے سے پھٹا دیکھا تو عزیز نے کہا اے زلیخا یہ تمہاری چالاکیاں ہیں اور بیشک تمہاری چالیں بڑی ہوتی ہیں۔ اے یوسف علیہ السلام آپ اس معاملہ کو خیال میں نہ لائیں۔ اے زلیخا تو اپنی غلطی کی معافی مانگ بیشک تو ہی خطاکاروں میں سے ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ اهتم سے ہے بمعنے عقد القلب علی فعل شیء قبل ان یفعل من خیر او شر (خیر یا شر کے ارتکاب سے پہلے اسی پہ دل پر خیال جمانا یعنی همّ بمعنے قصد ہے۔

سوال: همّ کا اطلاق انبیاء پر نہیں ہوتا یہاں اس کا اطلاق حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے کیسا۔

جواب: یہاں یوسف علیہ السلام کے ساتھ مجامعت و مخالطت مراد ہے اور مجامعت و مخالطت انبیاء نہیں۔ اگرچہ ہیئت کذائیہ انبیاء سے ہے۔ لیکن اس کی حقیقت انبیاء نہیں۔ خلاصہ یہ کہ زلیخا نے جماع کے لیے پختہ ارادہ کر لیا تھا جیسے کہ وہ سمجھتی تھی اب یوسف علیہ السلام میرے قابو میں آ چکے ہیں جیسا کہ مراودة و تغلیق ابواب و دعوات وغیرہ سے ظاہر ہے۔

ف: غالباً زلیخا نے یوسف علیہ السلام کی طرف ہاتھ بڑھایا ہوگا اور گلے لگانے کی کوشش کی ہوگی۔ انہی وجوہ سے حضرت یوسف علیہ السلام جان چھڑانے کے لیے دروازے کی طرف بھاگے۔ اور اس سے قبل سختی سے ایسی برائی سے باز آنے کے لیے یوسف علیہ السلام نے زلیخا کو بہت کچھ فرمایا بلکہ زجر و توبیخ کی اور اسے برائی سے بچنے کے لیے ہر طرح کی افہام و تفہیم سے کام لیا۔ وھم بھا یعنی طبعی تقاضوں کے مطابق ارادہ فرماتے جیسا کہ شباب جوانی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ قصد و ارادہ تکلیف شرعی میں داخل ہی نہیں اس لیے کہ شرعاً وہ قصد حرام ہے جو انسان اپنے اختیار سے کرے۔

مسئلہ: جیسے انبیاء علیہم السلام حرام فاحش ارتکاب سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی قصد اختیاری سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔

سوال: اگر یوسف علیہ السلام ایسے قصد سے معصوم اور پاک تھے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اسے ھمّ سے کیوں تعبیر فرمایا۔

جواب: ہم پہلے کئی بار قانون لکھ چکے ہیں کہ مشاکلت کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ زلیخا کے لیے ھمّ پہلے آیا ہے، اسی مناسبت سے یوسف علیہ السلام کے لیے بھی لفظ ھمّ استعمال کیا گیا ہے۔

سوال: مشاکلت میں بھی تباین تو نہ ہونا چاہیے یہاں تو تباین ہے۔

جواب: اگرچہ تباین بھی ہو تب بھی مشاکلت کا اعتبار ضروری ہے۔

سوال: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے اختیاری قصد نہیں فرمایا تھا۔ اگر منکر عصمت انبیاء علیہم السلام نہ مانے تو ہم کیا جواب دیں۔

جواب: اگر یوسف علیہ السلام اور زلیخا کا قصد ایک جیسا ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ یعنی ھمّا بولا جاتا۔ اس طرح سے کلام مختصر بھی ہوتا اور مقصد بھی پورا ہو جاتا۔ چونکہ ان دونوں کے ارادوں میں تباین تھا اس لیے کلام کی طوالت کے خطرہ کو درمیان میں لائے بغیر زلیخا کے ھمّ کو علیحدہ اور یوسف کے ھمّ کو علیحدہ بیان فرمایا ہے۔

ھمّ بھا کی دوسری تقریر حضرت شیخ افادہ قدس سرہٗ نے فرمایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بہ تقاضائے بشریہ ارادہ کیا۔ لیکن آپ نے تقاضائے بشری کا قلع قمع کر دیا اور بشری تقاضوں کو اپنے قریب بھی نہ بھٹکنے دیا۔

سوال: تقاضائے بشریت کا ہونا نبوت کا نقص ہے۔

جواب: تقاضائے بشریت کا ہونا نقص و عیب نہیں بلکہ اس کا صدور نقص ہے اور تقاضوں کا ہونا اور پھر انھیں پورا نہ کرنا یہ کمال ہے۔ اس لیے کہ باوجودیکہ انسان میں نفس شرارت کرے اور خوش قسمت انسان نفس کو دباوے تو یہ اس کی ترقی اور کمال کا موجب ہے اس سے تو اسے مراتب علیا اور کمالات نصیب ہوتے ہیں۔ اگر نامرد انسان بشری تقاضوں سے باز رہے تو اس کا کیا کمال ہے جبکہ اس میں نفس کی شرارت کا موجب ہی نہیں تو اس کا بچنا کیسا۔

مثنوی شریف میں ہے: ؎

ہین مکن خود را خصی رہبان مشو
زانکہ عفت ہست شہوت را گرو
بے ہوا نہی از ہوا ممکن نبود
ہم غزا با مردگاں نتواں نمود

ترجمہ: اپنے آپ کو خصی اور رہبان نہ بنا اس لیے کہ پاکدامنی شہوت سے بندھی ہوئی ہے۔ خواہشات کے ہونے پر نہی کی گئی ہے اور جنگ بھی جوانمردوں سے ہوتی ہے۔

ف: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: چار مردوں کا قیامت میں کسی قسم کا اعتبار نہ ہوگا:

۱۔ خصی کا زہد
۲۔ لشکری کا تقویٰ
۳۔ عورت کی امامت
۴۔ لڑکے کی عبادت

لیکن اس میں اکثریت کا اعتبار ہے ورنہ ان چاروں میں بہت سے خوش قسمت لوگوں کو بہت بڑا اجر و ثواب نصیب ہوگا۔ (کذا فی الکاصد الحسن)

مسئلہ: حدیث شریف میں ہے کہ ہر نبی علیہ السلام سے کوئی نہ کوئی خلاف اولیٰ کا صدور رہا ہے سوائے یحییٰ علیہ السلام کے۔ لیکن ان سے فواحش کا صدور نہیں ہوتا اس لیے کہ بالاتفاق وہ فواحش سے معصوم ہوتے ہیں۔

مسئلہ: جو شخص انبیاء علیہم السلام کو فواحش جیسے زنا وغیرہ کے عزم سے منسوب کرتا ہے وہ کافر ہے جیسے حشویہ فرقہ کرتا ہے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے لیے ان کا عقیدہ ہے کہ انہوں نے زلیخا کے ساتھ برائی کا ارادہ فرمایا تھا۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کو گالی دینا بالاتفاق کفر ہے۔ (کذا فی القنیہ)

حکایت ایک گستاخ کی

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں ایک واعظ کی مجلس میں حاضر ہوا۔ اس نے کہا کہ خواہش نفسانی سے کوئی نہیں بچ سکا۔ یہاں تک کہ اس بدگستاخ نے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی بھی شامل کر لیا میں نے اسے کہا کہ خدا کا خوف کرو۔ محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسی جرأت نہ کرو۔ اس نے کہا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے:

حبب الی الخ میرے لیے محبوب بنائی گئی ہے دنیا وغیرہ۔

میں نے کہا بندۂ خدا حدیث شریف کو تو تو نے پورے طور سمجھا نہیں اس لیے کہ حُبّب فرمایا ہے اَحْبَبْتُ نہیں فرمایا۔ یعنی

حضور علیہ السلام نے ازخود دنیا وغیرہ سے محبت نہیں فرمائی بلکہ دنیا وغیرہ کی محبت منجانب اللہ تھی اور وہ بھی اُمت کی تعلیم کے لیے۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دنیا نے نقصان نہیں پہنچایا بلکہ دنیا کو حضور علیہ السلام سے فائدہ پہنچا وغیرہ وغیرہ۔ بزرگ فرماتے ہیں اس بدگستاخ واعظ سے مجھے سخت ملال ہوا۔ رات کو خواب میں مجھے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور مجھے فرمایا ملال نہ کیجئے۔ ہم نے اس بدگستاخ کو قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی صبح کو وہی گستاخ نبوت واعظ کہیں جا رہا تھا کہ اسے ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ برہان کے متعلق مندرجہ ذیل اقوال منقول ہیں:

ا۔ وہ حجت باہرہ جو زنا کی قباحت پر دلالت کرتی ہے۔

سوال: یہ تقریر رؤیت کے خلاف ہے کیونکہ رؤیت کا تعلق اعیان سے ہے۔ اور آپ کی مذکورہ تقریر اعیان سے متعلق نہیں۔
جواب: حضرت یوسف علیہ السلام کو وہ دلیل ایسے طور ذہن میں آئی کہ اس سے اتنا یقین ہو گیا کہ گویا اس شے کو آپ نے آنکھوں سے مشاہدہ فرما لیا اور ایسا مرتبہ کہ وہ عین الیقین کے مرتبہ کا تھا۔ ایسے ہی محبوبانِ خدا کو حقائق الاشیاء اپنی صورِ حقیقیہ میں متجلی ہوتی ہیں بلکہ وہ ان ظاہری صورتوں (جو بطور عاریت عالمِ دنیا میں ظاہر ہیں) سے بھی خالی ہو کر اصلی حقیقی صورتوں میں نظر آتی ہیں جیسا کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشہوات۔ جنت کو تکالیف اور دوزخ کو شہوات گھیرے ہوئے ہے۔

اس معنے پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس برہان کی وجہ سے زنا کو اصلی صورت (جو اس کی عالمِ حقیقت میں قبیح ترین ہے) کو دیکھا تھا۔

ف: لَوْلَا کا جواب محذوف ہے جیسا کہ کلام کا سیاق و سباق اس کے محذوف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اگر یوسف علیہ السلام زنا کی قباحت کے متعلق برہان رب کا مشاہدہ نہ فرماتے تو میل جبلی طبعی کے مطابق عمل فرماتے۔ اس لیے کہ میلان طبعی کو جب کوئی شے مانع ہو تو وہ اپنا کام کر گزرتی ہے۔ لیکن چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو برہان کا مشاہدہ ہو گیا تھا اور دائماً رہا۔ اس لیے میلانِ طبعی کی دال نہ گل سکی۔

ف: لَوْلَا سے اس فائدے کا اظہار مطلوب ہے کہ میلان طبعی کے لیے حالات سازگار ہیں۔ یہاں تو عفت ہی عفت اور عصمت ہی عصمت ہے اگرچہ اس کے لیے اسباب خارجیہ بھی بھرپور رہیں اور مقدمات خارجیہ تو میلان طبعی کو وقوع پر مجبور کرنے والے موجود ہیں لیکن میلان طبعی نے مقابلہ سے ہتھیار ڈال دیے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

ف: علمِ معانی کے محققین نے فرمایا کہ لفظ لَوْ بہت سے ایسے مقامات پر من حیث المعنی تو استعمال ہو سکتی ہے لیکن من حیث اللفظ اس کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ ایسے مقامات پر صرف مطلق حکم کو مقید کر سکتی ہے اور بس۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان کاد لیضلنا عن الٰھتنا لولا ان صبرنا علیھا۔

جیسے یہاں فعل کا صدور عدیم الوقوع ہے۔ ایسے ہی حضرت یوسف علیہ السلام سے ھَمّ کا صدور عدیم الوقوع ہے۔

۲۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ برہان سے وہ مکتوب مراد ہے جو یوسف علیہ السلام نے بیت السرور (زلیخا کے مخصوص مکان) میں میں لکھا دیکھا کہ:

ولا تقربوا الزنا ۔ زنا کے قریب مت جاؤ۔

۳۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ آپ کو اس وقت ایک فرشتے نے کہا: اے یوسف علیہ السلام! آپ سفہاء کا کردار ہرگز ادا نہ کرنا ۔ اس لیے کہ آپ کا اسم گرامی تو انبیاء کی فہرست میں لکھا جا چکا ہے۔

۴۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو ورغلایا تو مکان کی اوپر سے چھت پھٹ گئی ۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اپنی انگلی مبارک منہ میں دبائے ہوئے ہیں ۔ جیسے ہم بچوں کو جب کسی فعل سے روکتے ہیں تو انگلی منہ میں دباتے ہیں۔

۵۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام نے کسی آدمی کو دیکھا وہ فرما رہے تھے اے یوسف علیہ السلام دائیں طرف دیکھیے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا اژدہا ہے ۔ اس شخص نے فرمایا: قیامت کے دن ایسا سانپ زانی کے پیٹ میں ہوگا۔

كَذٰلِكَ یہ کاف منصوب المحل ہے اور ذٰلک کا اشارہ اس ارادہ کی طرف ہے جو لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ سے حاصل ہوتا ہے یعنی مثل اس تبصیر و تعریف کے جو ہم نے یوسف علیہ السلام کو برہان دکھایا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ کہ ہم یوسف علیہ السلام کو خیانت سے ہٹائیں وَالْفَحْشَآءَ فحشاء زنا سے ۔ کیونکہ یہ افعال قباحت میں سر فہرست ہیں۔

عصمتِ انبیا علیہم السلام کے دلائل

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے معصوم ہونے کی مضبوط اور واضح دلیل ہے گویا نص ہے اس معنی پر کہ یوسف علیہ السلام کا زلیخا کے متعلق ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے ۔ اگر (معاذ اللہ) ان سے اس قسم کا فعل صادر ہوتا تو کہا جاتا لنصرفہ عن السوء ۔ ہاں بحیثیت میلان طبعی سے ان کا ارادہ ہو بھی جاتا تو بھی کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن چونکہ ان میں عفت و عصمت کے موجبات موجود تھے ۔ اسی لیے ان کا زلیخا کی طرف ارادہ تو بجائے خود تو بھی نہ فرمائی ۔ (کذا فی الارشاد)

۲۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ یعنی یوسف علیہ السلام خالص ان پاکباز بندوں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ صرف اپنی عبادت و اطاعت کے لیے پیدا فرمایا ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ایسے بندوں سے ایسے امور صادر ہونے ہی نہیں دیتا جو مذموم ہوں۔

۳۔ اس سے ثابت ہوا کہ شیطان کو یوسف علیہ السلام کے گمراہ کرنے پر چارہ نہیں تھا جیسا کہ اس کا اپنا اعتراف ہے فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ مجھے تیری عزت کی قسم میں سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔

ف: ۴۔ بحر العلوم میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی برات اور ان کی مدح و ثنا فرمائی ہے کہ وہ

محسنین اور عبادہ المخلصین میں سے تھے تو پھر ہم کون لگتے ہیں کہ ہم ان کی عفت میں عصمت میں شک کریں بلکہ ہمارے اُوپر واجب ہے کہ ہم یوسف علیہ السلام کو پاک دامن اور معصوم مانیں۔ اور یقین رکھیں کہ خطا و گناہ سے ان کا دامن پاک تھا۔

۵۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے، اس غرض سے نہیں کہ ان کی شان میں تنقیص ہو بلکہ اس غرض سے کہ عام بندوں کو پند و نصیحت نصیب ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اس لیے کہ وُہ ایسا کریم ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام کی توبہ منظور فرما لیتا ہے تو عام بندوں کی توبہ بھی ضرور منظور فرمائے گا، کیوں کہ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے ہر فعل کو عوام کے لیے حجت بنایا ہے۔ دُوسرے اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندے ہیں اسی لیے اس کا پیغام لے کر عوام کو غلطیوں اور خطاؤں سے روکنے کے لیے اس دنیا میں تشریف لائے۔ لیکن وُہ خود چند ایسے امور کے مرتکب ہوئے جن سے اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سخت تر ہونی لازمی تھی لیکن وہ کریم ان کی توبہ پر بھی راضی ہو گیا تو ہم بندوں سے تو بطریق اولیٰ توبہ کرنے پر راضی ہو جائے گا کہ ہم تو ویسے بھی خطاؤں اور گناہوں کے خوگر ہیں۔

جن لوگوں نے یہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام کو خطا و گناہ میں ملوث مانا وہ سخت غلطی کا شکار ہوئے ہیں اور ان کے **ازالہ وہم** یہاں دلیل بھی کوئی نہیں۔ اور ہم انھیں کہتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر یوسف علیہ السلام سے خطا سرزد ہوئی تو قرآن مجید میں ان کی توبہ کا ذکر کیوں نہیں حالانکہ بعض دُوسرے انبیاء علیہم السلام یوسف علیہ السلام سے بہت کم درجہ کے خلاف اولیٰ سرزد ہوئے تو قرآن مجید میں ان کی توبہ و استغفار کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً آدم، نوح، داؤد، ابراہیم و سلیمان علیٰ نبینا و علیہم السلام۔

تفسیر صوفیانہ (و راودته) یعنی یوسف (قلب) کو زلیخا (دنیا) نے ورغلایا (التی هو) جبکہ یوسف (قلب) فی بیتها (زلیخا) (دنیا) کے گھر (دنیا) میں رہتے تھے عن نفسه یعنی جب زلیخا (دنیا) نے یوسف (روح) کو دیکھا کہ اس کے نفس کا جسد کے ساتھ تعلق ہے اور نفس تو حظوظ دنیویہ کا رسیا ہے اور ہے بھی خود دنیوی، اسی لیے زلیخا (دنیا) نے اپنی طرف بلایا تاکہ وہ اس سے محظوظ ہو۔ اس سے واضح ہُوا کہ یوسف علیہ السلام (قلب) کتنا ہی روحانیت کی اونچی منزلیں طے کر جائے اور مقامِ حقیقت میں پہنچ کر صفاتِ انانیت کو خالی کر کے بحر صفات ہویت میں مستغرق ہو جائے تب بھی زلیخا (دنیا) کے تصرفات سے نہیں بچ سکتا جب تک وہ (قلب) اس کے گھر (جسد) میں ہے اس لیے کہ جسد قلب کا دنیوی گھر ہے۔ وغلقت الابواب اس سے ارکانِ شریعت مراد ہیں۔ یعنی جب دُنیا قلب کے سامنے شہوات و حظوظ لذات دنیویہ کا دروازہ کھول دیتی ہے تو پہلے اس سے شریعت کے دروازے بند کر دیتی ہے کیونکہ الٰہی دروازوں سے رحمت و ہدایت کے انوار اور الطاف و عنایت ربانی کے نفحات داخل ہوتے ہیں۔ وقالت اور دُنیا نے کہا هيت لك میری طرف آجا اور حق سے منہ پھیر لے۔ قال اس قلب فانی فی اللہ اور باقی باللہ نے جواب دیا (معاذ اللہ) ماسوا اللہ سے میری پناہ انه ربی بیشک اس ذاتِ حق نے اپنی ربوبیت کے الطاف کے دُودھ سے میری تربیت فرمائی ہے احسن مثوای اس نے عالم حقیقت میں میری بہتر سے بہتر منزل تیار فرمائی ہے فلهذا مجھ سے مُنہ پھیر سکتا ہے انه لا یفلح الظالمون یعنی دنیا کی طرف متوجہ اور حق سے رُوگرداں ہوتے ہیں وہ کبھی فلاح

نہیں پا سکتے ولقد ھمت بہ اور جب دنیا نے دیکھا کہ قلب میں حوائج انسانیہ ضروری ہیں تو اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی دھمّ بہا اور قلب بھی اپنے نفس کردہ دنیا (اور اس کی لذات کا عاشق ہے کیونکہ اپنی حوائج و ضروریات کے تصورات میں گھر جاتا لَّو لَا ان راٰ برھان ربہ اگر وہ قلب اپنے رب تعالیٰ کا برہان نہ دیکھتا۔ یہاں پر برہان سے مراد وہ نورِ قناعت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے سچے اور نیک بندوں کے دل میں ڈالتا ہے۔ کذالک لنصرف عنہ اس طرح قلب سے ہم اپنی نظرِ عنایت سے پھیرتے ہیں السوء حرص علی الدنیا والفحشاء تعرف حب الدنیا کو انہ بیشک قلب کامل من عباد نا صرف اپنے بندوں سے دنیا اور خواہشات کے بندوں سے نہیں۔ المخلصین وہ خالص بندے جو ماسوی اللہ سے فارغ ہیں یعنی وجود مجازی سے فنا پا کر وجود حقیقی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

ف قلب کا کمال اسی میں ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت میں محو ہو کر ماسوا اللہ سے آزاد اور اپنے وجود مجازی اوصاف سے فانی اور اپنے رب تعالیٰ کے اوصاف سے بقا پائے۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

حکایت حضرت علی بن الحسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ زلیخا کے گھر میں ایک بت تھا جب برائی کا خیال کیا تو اس پر کپڑا ڈال دیا۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ کیا کیا ہے، اور تو نے اس پر کپڑا کیوں ڈالا ہے؟ زلیخا نے کہا کہ یہ میرا معبود ہے اس سے حیا کرتی ہوں جبکہ میں ایک برائی کا ارتکاب کرنے والی ہوں۔ ؎

درون پردہ کردم جایگاہش
کہ تا نبود بسوئے من نگاہش
زمن آئین بے دینی نبیند
دریں کارم کہ می بینی نبیند

یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تو اس بت سے حیا کر رہی ہے جو دیکھتا سنتا ہے اور نہ کچھ سمجھتا ہے اور میں اس سے حیا نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور میری صورت کو سنوارا۔

تفسیر عالمانہ ربط: جب یوسف علیہ السلام نے برہان دیکھا تو زلیخا کے کمرے خاص سے دروازے کی طرف دوڑے اور زلیخا بھی آپ کے پیچھے دوڑی (کذا فی التبیان)

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ یہاں حرف جر محذوف ہے۔ در اصل تسابقا الی الباب تھا یعنی دونوں یوسف و زلیخا اس دروازے کی طرف دوڑے جو دارسے باہر کو جانے کے لیے تھا۔ اس لیے یہاں واحد الباب فرمایا ورنہ پہلے جمع کا صیغہ تھا۔

ف یوسف علیہ السلام زلیخا کی گرفت سے بچنے کے لیے بھاگے اور زلیخا یوسف علیہ السلام کو پکڑنے اور دروازے کو بند کرنے کے لیے دوڑی۔

وَقَدَّتْ قَمِيصَهٗ مِنْ دُبُرٍ اور زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے قمیص کو پیچھے سے کھینچا تو قمیص لمبائی میں دو حصہ

ہوگئی۔

ف : القد کسی شے کو طول میں پھاڑنا اور الشق شے کو عرض میں چیرنا۔

وَاَلْفَیَا اور پایا یعنی سامنا کیا سَیِّدَھَا زلیخا کے شوہر کا۔ یعنی قطفیر سے ملاقات ہوگئی۔ چونکہ زلیخا اپنے شوہر کو سیدی کہہ کر پکارتی تھی اسی لیے سیدھا کہا۔

سوال : سیدھما کیوں نہیں کہا گیا حالانکہ وُہ یوسف علیہ السلام کا بھی تو سردار تھا۔

جواب : اگرچہ یوسف علیہ السلام بظاہر عبدیت طور پہ لیکن تھے تو درحقیقت آزاد، اور آزاد کسی کی ملک نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے قطفیر یوسف علیہ السلام کا شرعًا مالک نہیں تھا۔ اسی لیے سیدھما نہیں فرمایا۔

لَدَا الْبَابِ دروازے کے نزدیک۔ اس دروازے سے اسی دار کا پھاٹک مراد ہے۔ جو گھر سے باہر نکلنے کے مقام پہ ہوتا ہے۔ اس وقت قطفیر گھر میں داخل ہو رہا تھا یا زلیخا کے چچازاد یمینی نامی کے ساتھ محوِ گفت گو تھا۔

یُوسف علیہ السلام کی کرامت

حضرت کعب سے مروی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام زلیخا سے بچ کر دوڑے تو جس دروازے کے تالے کو اشارہ فرماتے تو فوراً کھل کر نیچے گر جاتا۔ چنانچہ جامی قدس سرہٗ نے فرمایا :

چو[1] کش اندر دویدن کام تیزش
کشاد از ھر دری راہ گریزش
بھر[2] در کامدی چی در کشائی
پریدی قفل جائی پرہ جائی
زلیخا[3] چوں بدید آں از عقب جست
بوئے دو آخریں درگاہ بپیوست
پئی[4] باز آمدن دامن کشیدش
زسوئے پشت پیراھن دریدش

---

[1] جب راہِ فرار کو آسودگی سمجھی تو ہر دروازے سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا۔

[2] جس دروازے سے یوسف علیہ السلام تشریف لاتے تو تالے خود کھل جاتے۔

[3] زلیخا یہ حال دیکھ کر پیچھے بھاگی تو اسے مکان کے آخری دروازے پر پا لیا۔

[4] اسے پیچھے لوٹانے کے لیے اس کا دامن کھینچا پیچھے کی جانب سے۔ یوسف علیہ السلام کا قمیص پھٹ گیا۔

بروںؔ رفت از کفہ آں زخم رسیدہ

بساں غنچہ پیراہن دریدہ

بروںؔ آمد پیش آمد عزیزش

گروہی از خواص خانہ نیزش

قَالَتْ یہ سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام وزلیخا عزیز مصر سے ملے تو کیا گفتگو ہوئی۔ جواب ملا کہ زلیخا نے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہوئے کہا مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا۔ مَا نافیہ ہے اور سوء سے زنا مراد ہے۔ یعنی تیری اہلیہ سے زنا کا ارادہ کرنے والے کی نہیں سزا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○ قید یا دردناک عذاب۔ مثلاً کوڑے مارنا وغیرہ۔ یا ما استفہامیہ ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ کیا ایسے شخص کی اس کے سوا اور کوئی سزا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

مَنْ فِي الدَّارِ اِلَّا زَيْدٌ۔

عزیزِ مصر نے کہا: میری اہلیہ سے کسی نے زنا کا ارادہ کیا ہے! زلیخا نے کہا کہ میں سو رہی تھی تو اسی عبرانی غلام (یوسف علیہ السلام) نے مجھ سے پردہ ہٹا کر مجھے زنا کے لیے ورغلایا۔ ے

چوںؔ دزد آں بر سر بالینم آمد

بقصد خرمن نسرینم آمد

خیالؔش آنکہ من از وے نہ آگاہ

بحرمِ گلستانم آورد راہ

باذنؔ باغباں ناگشتہ محتاج

برد تا سنبل و گل را بتاراج

عزیزِ مصر نے سُن کر یوسف علیہ السلام سے کہا کہ تُو نے مجھے یہی صلہ دیا جبکہ میں نے تیری پرورش کی اور تُو نے مجھے عالمِ دُنیا

۱؎ بالآخر یوسف علیہ السلام مغموم ہو کر مکان سے باہر نکلے جیسے غنچہ مرجھایا ہوا ہو۔

۲؎ آپ کو سب سے پہلے عزیزِ مصر ملا جو اپنے چند مخصوص لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

۳؎ وہ چوروں کی طرح میرے سرہانے آیا اور میری عزت کے خرمن کو لوٹنا چاہتا تھا۔

۴؎ اسے خیال تھا کہ میں اس سے بے خبر ہوں جبکہ اس نے میرے باغ حرم میں قدم رکھا۔

۵؎ اس نے باغبان کی اجازت بھی نہیں چاہی وہ سنبل و گل کو لوٹ کر لے جانا چاہتا تھا۔

میں رُسوا کیا۔ اب تُو خود ہی بتا دے کہ تجھے کیسی سزا دی جائے۔

نمی شاید دریں دیر پُر آفات
جز احسان اہل احسان را مکافات
زکوئے حقگذاری رخت بستی
نمک خوردی نمکدانرا شکستی

ترجمہ: اس پُر آفات دَیر میں صرف یہی بدلہ ملتا ہے کہ احسان کرو تو نقصان اٹھاؤ ادائیگی حق کے کُوچے سے سامان اٹھا کر چلے گئے ہو نمک کھا کر نمک دان کو توڑ دیا۔

سوال پیدا ہُوا کہ حضرت یُوسف علیہ السلام نے عزیزِ مصر کو کیا جواب دیا۔ ملاحظہ ہو۔

قَالَ یوسف علیہ السلام نے اپنی براُت اور پاکدامنی کا اظہار فرماتے ہوئے فرمایا هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي زلیخا نے مجھے زنا کے لیے مجبور کیا اور میں تو زنا کا ارتکاب کجا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

زلیخا ھر چہ میگوید دروغست
دروغ او چراغ بے فروغست
زن از پہلوئے چپ شد آفریدہ
کیں از چپ راستی ہرگز ندیدہ

یُوسف علیہ السّلام کی کرامت اور شیر خوار بچے کی گواہی

عزیزِ مصر نے کہا کہ میں آپ کی بات بغیر دلیل کے کیسے مانوں۔ ایک روایت میں ہے کہ زلیخا دھر ادھر اپنی براُت کے لیے نہ صرف بولتی تھی بلکہ آہ و فغاں اور گریہ زاری کرتی تھی۔ زلیخا کے کہنے پر عزیزِ مصر نے حضرت یُوسف علیہ السلام کو قید خانے میں بھیج دیا۔ اس وقت یُوسف علیہ السلام نے دُعا مانگی کہ یا اللہ! میری براُت کے لیے کوئی سبب بنا۔ زلیخا کے ماموں کا تین چار ماہ کا شیر خوار بچہ گہوارے میں تھا۔ آپ کی دُعا مستجاب ہُوئی۔ حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور اس کو گہوارہ سے اٹھا کر فرمایا کہ یُوسف علیہ السّلام کی براُت کی گواہی دے۔ چنانچہ وہ شیر خوار بچہ گہوارے سے اُٹھ کر چلا آیا اور عزیزِ مصر کے آگے کھڑا ہو گیا۔ سہ

فغاں زد کای عزیز آہستہ تر باش
زتعجیل عقوبت بر حذر باش

سزاوار عقوبت نیست یوسف[1]
بلطف و مرحمت اولیست یوسف

عزیز از گفتن کودک عجب ماند[2]
سخن با او بقانون ادب راند

کہ ای ناشستہ لب ز آلائش شیر[3]
خدایت کرد تلقین حسن تقریر

بگو روشن کہ این آتش کہ افروخت[4]
کزانم پردهٔ عز و شرف سوخت

کما قال تعالیٰ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا زلیخا کے اہل یعنی ماموں زاد شیرخوار بچے نے گواہی دی۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے ایسے بچے سے گواہی کیوں دلوائی جو زلیخا کے اپنے رشتہ داروں سے تھا۔

جواب: تاکہ زلیخا پر مکمل طور حجت قائم ہو اور یوسف علیہ السلام کی برأت کے اظہار میں ایسا یقین ہو کہ پھر کسی کو وہم و گمان نہ رہے اور نہ صرف اسی تہمت سے بری الذمہ ہوں بلکہ رہتی دنیا تک ایک مثال قایم ہو جائے۔

ف: الارشاد میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کے لیے بچے شیرخوار اور خود زلیخا کے گھر سے گواہی دلوائی گئی تاکہ کسی کو وہم نہ ہو کہ یہ بچہ سحر زدہ ہے۔ جب کہ گھر والوں کو یقین تھا کہ یہ بچہ جو کچھ بول رہا ہے حق بول رہا ہے۔

فہرست ان حضرات کی جو زمانۂ شیرخوارگی یا اس سے پہلے بولے

گہوارے میں مندرجہ ذیل حضرات نے گفتگو کی،

(۱) یہی گواہی دینے والا بچہ جس نے یوسف علیہ السلام کی برأت کا اظہار کیا۔

(۲) ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقتِ ولادت یہ کلام پڑھا، اللہ اکبر کبیراً والحمد للہ کثیراً وسبحان اللہ بکرةً و اصیلا۔ (اللہ بڑا اور بہت بڑا ہے اس کی صبح و شام تسبیح ہے)۔

(۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام، آپ کا مفصل بیان سورۂ مریم میں آئے گا۔

---

[1] یوسف علیہ السلام سزا کے لائق نہیں بلکہ وہ لطف اور رحمت کا مستحق ہے۔

[2] عزیز بچے کی گفتگو سے متعجب ہوا کر بچہ ہو کر قانون کے دائرے میں کیسے بول رہا ہے۔

[3] کہا اے بچہ! تو تو ابھی شیرخوار ہے لیکن کیسی اچھی بات کہہ رہا ہے۔

[4] واضح کر دے کہ میرے گھر کو کس نے آگ لگائی ہے۔

④ بی بی مریم یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ۔

⑤ یحییٰ علیہ السلام

⑥ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام۔ جب آپ کی ولادت مبارکہ ہوئی تو فوراً کھڑے ہو کر پڑھا، لا الٰه الا اللّٰه وحدهٗ لاشریك له له الحمد له الملك وله الحمد الحمد لله الذی هدانا لهٰذا۔ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کا ملک اور اسی کے لیے حمد ہے اور اس کا بڑا احسان ہے کہ اس نے حق کی ہدایت بخشی۔

⑦ نوح علیہ السلام بھی بعد ولادت بولے تھے جبکہ آپ کی ولادت غار میں ہوئی تو ماں گھبرائیں کہ نہ معلوم میرے ساتھ اور میرے بچے کے ساتھ کیا ہوگا۔ اور نوح علیہ السلام کو غار میں چھوڑ کر روانہ ہوئیں اور روتے ہوئے کہا: وانوحاہ۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا: امی! میرے لیے مت گھبرایئے اور امی خوف نہ کیجئے جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہی میری حفاظت فرمائے گا۔

⑧ موسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ مبارکہ ہوئی تو اُٹھ بیٹھے اور فرمایا: امی! فرعون سے خوف نہ کر، میرا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

⑨ یوسف علیہ السلام ماں کے پیٹ کے اندر بولے کہ انا المفقود من المغیب عن وجه ابی زمانا طویلا فاخبرت اُمهٗ والدهٗ بذالك فقال لها اكتمی امرك۔ (روح البیان ج ۴ ص ۱۴۲ مطبوع قدیم) (ترجمہ: میں گم شدہ اور والد سے عرصہ تک غائب رہوں گا۔ اس کی خبر والدہ یعقوب علیہ السلام کو دی انہوں نے فرمایا اسے پوشیدہ رکھئے)

⑩ ایک ولی اللہ نے اپنی والدہ کو پیٹ کے اندر سے چھینک کا جواب دیا جسے حاضرین نے سُنا۔

⑪ ایک لڑکا جس نے ایک عورت کی پاکدامنی کی گواہی دی جبکہ اس پر زنا کی تہمت لگائی گئی۔

⑫ کھائی والوں کے واقعات میں چھوٹے بچے کا بولنا[1]

⑬ فرعون کی لڑکی کی دایہ کا لڑکا۔ واقعہ یوں ہوا جسے ابن الجوزی نے کہا کہ بنت فرعون کی دایہ سنگار کرانے والی (عورت) جب مسلمان ہو گئی تو فرعون کی لڑکی نے والد کو کہہ دیا کہ دایہ مسلمان ہو گئی ہے۔ فرعون نے حکم دیا کہ اسے اور اس کی تمام اولاد کو ایسے گڑھے میں ڈال دو جب تانبے کی بھٹی تیار ہو گئی تو ان سب کو باری باری آگ میں ڈالا گیا۔ آخر میں ایک شیر خوار بچے کی باری آئی تو ماں سے کہا: امی! صبر کیجئے تُو حق پر ہے۔

⑭ مبارک الیمامہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ایک شخص مکہ معظمہ میں حاضر ہوا تو اس نے ایک معجزہ دیکھا۔ وہ یہ کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مرد نو مولود بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر لایا۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے سے فرمایا میں کون ہوں. لڑکے نے فوراً کہا: انت رسول اللّٰه۔ (آپ اللہ تعالیٰ کے (سچے) رسول ہیں) آپ نے

---

[1] تفصیل فقیر کی صدائے نوی شرح مثنوی معنوی میں دیکھیے۔

فرمایا صداقت بارك الله ویک ۔ (تو نے سچ کہا اللہ تعالیٰ تجھے برکت دے)، اس کے بعد وہ بچہ کبھی نہ بولا ۔ ہم نے اس کا نام مبارک الیمامہ رکھا ۔ یہ واقعہ حجۃ الوداع میں واقع ہوا۔

⑮ صاحب جریج الراہب ۔ اس کا قصہ یُوں ہُوا کہ جریج ایک عبادت گاہ میں مصروفِ عبادت رہتے تھے ۔ بنی اسرائیل کی ایک نوجوان لڑکی آپ کو زنا پر مجبور کرتی تھی ۔ ایک دفعہ اُس نے بہت مجبور کیا لیکن آپ مصروف بہ عبادت رہے اور اس کی کوئی بات نہ مانی ۔ پھر اس نے ایک چرواہے سے زنا کروایا جو اس نوجوان لڑکی کے گھر کی بکریاں چراتا تھا ۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا اس لڑکی نے مشہور کر دیا کہ یہ اُس جریج کا نطفہ ہے ۔ لوگوں نے جریج کو مارا اور اُس کی عبادت گاہ کو بھی توڑ ڈالا ۔ جریج نے دوگانہ پڑھ کر اس شیر خوار بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا تجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے تجھے پیدا فرمایا ۔ سچ بتا تیرا باپ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسے بولنے کی طاقت بخشی ۔ وُہ بولا کہ میرا باپ فلاں چرواہا ہے ۔ لوگوں نے جریج سے معافی چاہی اور اُس کی عبادت گاہ بھی تیار کر دی ۔

⑯ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی نے فرمایا کہ میری چھوٹی بچی جس کی عمر ایک سال تھی اُس کا نام زینب تھا ۔ میں نے اس سے پُوچھا کہ ایک شخص نے ہمارے پڑوس میں اپنی عورت سے جماع کیا لیکن اسے انزال نہ ہُوا، کیا اس پر غسل واجب ہے؟ بچی شیر خوار نے جواب دیا، ہاں اس پر غسل واجب ہے ۔ اس سے لوگوں کو تعجب ہُوا ۔ پھر میں حج کو چلا گیا ۔ ایک سال مکہ معظمہ میں گزارا ۔ دوسرے سال حج کے لیے اپنی زوجہ کو بلایا ۔ میری شیر خوار لڑکی بھی ساتھ آئی ۔ جب میں آگے بڑھ کر اپنی زوجہ کو قافلے سے لینے گیا ۔ میری زوجہ اونٹ پر سوار تھی ۔ ابھی میری زوجہ مجھے دیکھنے نہ پائی تھی کہ میری بیٹی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور کہا، ابا جان تشریف لا رہے ہیں ۔ ماں کی گود سے اُچھل کر میرے ہاتھوں میں آگئی ۔ (کذا فی انسان العیون)

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ جملہ شرطیہ اور قول محذوف کا مقولہ اور سوال کا جواب ہے ۔ سوال یہ ہے کہ بچے شیر خوار کی گواہی کا مضمون کیا تھا ۔ جواب ملا کہ شیر خوار بچے نے کہا کہ اگر یوسف علیہ السلام کا قمیص مبارک آگے سے پھٹا ہو ۔ اس جملہ میں ماضی بمعنے مستقبل اور کانَ فعل ناقصہ کو جمع کیا گیا ہے ۔ قُدَّ اگرچہ فعل ماضی ہے لیکن اِنْ شرطیہ کی وجہ سے بمعنے مستقبل ہے ۔

سوال ؛ گواہی میں شرط نہیں ہوتی بلکہ اس میں گواہ ایک کے حق کو دُوسرے پر ثبوت کی خبر دیتا ہے ۔ گواہی کو مشروط طریقہ سے ادا نہیں کرتا ۔ اگر ایسا کرے تو اسے گواہی نہیں سمجھا جاتا ۔

جواب ؛ یہ جملہ اگرچہ شرطیہ ہے لیکن ایسے مضبوط طریقہ سے لایا گیا ہے کہ اس سے حضرت یُوسف علیہ السلام کی صداقت اور زلیخا کا بطلان یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے ۔

فَصَدَقَتْ تو زلیخا اپنے دعوے میں سچی ہے وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ اور وُہ یوسف علیہ السلام غلطی پر ۔ اس لیے کہ اس صورت میں ثابت ہوگا کہ یُوسف علیہ السلام اس کے پاس گئے (معاذ اللہ) اور بُرائی کا کہا تو یُوسف علیہ السلام کے قمیص کو آگے سے زلیخا نے پھاڑ ڈالا ہوگا یا یوسف علیہ السلام (معاذ اللہ) زلیخا کے پیچھے دوڑے ہوں گے تاکہ اسے اپنے

قابو میں لائیں۔ لیکن زلیخا نے انکار کیا ہوگا اور اسے اپنے سے ہٹایا ہوگا تو اس کے قمیص کا اگلا حصہ پھٹ گیا ہوگا۔ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ اور اگر ان کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے فَكَذَبَتْ تو زلیخا اپنے دعوے میں جھوٹی ہے وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ اور یوسف علیہ السلام سچے ہیں۔ کیونکہ بیّن ثبوت ہوگا کہ یوسف علیہ السلام زلیخا سے پیچھا چھڑا کر دوڑے ہونگے تو زلیخا نے اس کے پیچھے سے قمیص کھینچا تو قمیص پھٹ گیا ہوگا۔ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ پس جب عزیز نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا قُدَّ مِنْ دُبُرٍ تو وہ پیچھے سے ہٹا ہوا ہے تو یقین کیا یوسف علیہ السلام بے قصور اور اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے:

عزیز از طفل چوں کوشش ایں سخن کرد
رواں تفتیش حال پیرہن کرد

چو دید از پس دریدہ پیرہن را
ملامت کرد آں مکارہ زن را

ترجمہ: جب عزیزِ مصر نے بچے کی بات سُنی تو یوسف علیہ السلام کے پیراہن کو دیکھا کہ وہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو اس نے اپنی مکارہ عورت کو ملامت کی۔

قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ط عزیز نے اپنی عورت سے کہا کہ اس واقعہ میں جو تیرا اور یوسف کے درمیان جھگڑا ہوا سارا تیرا مکر و فریب ہے اور تم عورتوں کے فریب اور حیلے عموماً ایسے ہوتے ہیں۔ اس سے زلیخا کی سخت رُسوائی ہوئی۔

نکتہ: جمع کے صیغے میں اشارہ ہے کہ عورتوں کی فطرت ہے کہ وہ مکر و فریب کرتی ہیں (الا ما شاء اللہ) اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ○ بیشک تمہارے مکر و فریب بہت بڑے ہیں۔ اور ایسے بڑے کہ جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور ایسے گہرے کہ قلب فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ مردوں سے مکر و فریب واقع نہیں ہوتا بلکہ ان میں بھی ہوتا ہے مگر کبھی اور کسی سے اور عورتوں میں بہت زیادہ اور اکثر سے۔

ف: بعض علماء فرماتے ہیں کہ میں شیطان کے فتنوں سے اتنا خوف نہیں کرتا جتنا عورتوں کے فتنوں سے مجھے خطرہ ہوتا ہے اس لیے کہ شیطان کے فتنے کو اللہ تعالیٰ نے ضعیف کہا۔ کما قال تعالیٰ:

ان کید الشیطان کان ضعیفا۔

اور عورتوں کے مکر کو عظیم کہا۔ کما قال:

ان کیدکن عظیم۔ ے

ز کید زن دل مرداں دو نیمست
زنان را کیدہا بس عظیمست

عزیز آنرا کند کید زناں خوار

بکید زن بود دانا گرفتار

زمکر زن کسے عاجز مبادا

زن مکارہ خود ہرگز مبادا

ترجمہ: عورتوں کے مکر سے مردوں کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں اس لیے کہ ان کے مکر بہت بڑے ہوتے ہیں۔ بہت بڑے معزز لوگ عورتوں کے مکر سے ذلیل وخوار ہوتے ہیں انہی کے مکر میں بڑے سمجھدار گرفتار ہوتے ہیں معاذ اللہ کرے عورتوں کے مکر سے کوئی عاجز نہ ہو بلکہ خدا کرے عورت مکارہ نہ ہو۔

یُوْسُفُ عزیز مصر نے کہا اے یوسف علیہ السلام اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اس معاملہ سے درگزر فرمائیے اور کسی اس کے متعلق نہ بتانا بلکہ جہاں تک ہو سکے اس بات کو چھپانا تاکہ اگر یہ بات عام پھیل گئی تو مجھے سخت شرمساری ہوگی۔

ع

قدم از رائے غمازی بدر نہ

کہ باشد پردہ پوش از پردہ در بہ

ترجمہ: اس معاملہ کے متعلق کسی بتانے سے بچنا بہتر ہے اس لیے کہ پردہ پوش پردہ در سے بہتر ہوتا ہے۔

وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْبِكِ اے زلیخا! تیرے سے جو غلطی ہوئی اور وہ الزام تیرے اوپر ثابت ہوگیا اس کے لیے استغفار کیجئے۔ اِنَّكِ كُنْتِ اس لیے کہ تو اسی غلطی کی وجہ سے ہوگئی ہے مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ○ منجملہ ان لوگوں سے جو عمداً خطا اور گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: خطیٔ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی عمداً گناہ کرے۔

سوال: الخاطِئِین مذکر کا صیغہ ہے۔ زلیخا کو اس میں کیسے شامل کیا گیا۔

جواب: مذکر کا صیغہ تغلیب الذکور علی الاناث کے قبیل سے ہے۔

حدیث شریف ہر ابنِ آدم خطا کار ہے۔ بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہوں۔

ف: عزیز مصر باحوصلہ انسان تھا اسی لیے اپنی اہلیہ سے مواخذہ شدید کی بجائے دو لفظوں پر اکتفا کیا۔

عزیز ایں گفت و بیروں شد ز خانہ

بکوشش خوبی سر شد در زمانہ

تحمل دلکش است اما نہ چندیں

نکو خوئی خوشست اما نہ چندیں

چو مرد از زن بخوشش خوئی کند بار
زخوشش خوئی ببد روئی کند کار
مکن با کار زن چنداں صبوری
کہ افتد رخنہ در سد غیوری

ترجمہ :- عزیز یہ کہہ کر گھر سے باہر نکلا اور یہ داستان ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔
حوصلہ اچھا ہے لیکن یہاں تو الٹا نقصان ہے ایسے ہی کسی پر احسان کرنا بہتر ہے لیکن یہاں مضر ہے ۔
عورت کے ساتھ خوش خوئی حد سے زائد ہو تو وہ سرکش ہو جاتی ہے۔
عورت کے غلط معاملہ میں صبر اچھا نہیں اس لیے کہ اس سے غیرت کا جنازہ اُٹھ جائے گا۔
بعض نے کہا وہ بے غیرت انسان تھا۔ مروی ہے کہ عزیز نے قسم کھائی کہ چالیس دن تک اپنی عورت زلیخا کے ہاں نہیں جائیگا۔ اور یوسف علیہ السلام کی خدمت اپنے ذمہ لگائی۔ اسی طرح کئی روز زلیخا یوسف علیہ السلام کی زیارت سے محروم رہی۔ ؎

دریغ[۱] آں صید کز دامم برون رفت
دریغ آں شہد کامم برون رفت
عزیمت[۲] کرد روزے عنکبوتی
کہ بہر خود کند تحصیل قوتی
بجائی[۳] دید شہبازی نشستہ
ز قید دست شاہان باز رستہ
بگرد[۴] او تنیدن کرد آغاز
کہ بندد بال و پرش را ز پرواز
زمانی[۵] کار در پیکار او کرد
لعاب خود ہمہ در کار او کرد

---

[۱] افسوس میرے ہاتھ سے شکار نکل گیا افسوس وہ شہد میرے حلق سے خارج ہو گئی۔
[۲] ایک دن مکڑی کا ارادہ ہوا کہ وہ اپنی روزی کمائے ۔
[۳] ایک شہباز کو کسی نے بیٹھے دیکھا کہ وہ بادشاہ کی قید سے آزاد بیٹھا تھا۔
[۴] اس کے گرد تانا تننا شروع کیا تاکہ اسے اڑنے سے روکے۔
[۵] کافی دیر تک محنت کی اپنی تمام قوت اس پر صرف کر دی۔

چوں[1] آں شہباز کرد از دی کنارہ
نماند غیر تاری چند پارہ

منم[2] آں عنکبوت زار و رنجور
فتادہ از مراد خویشتن دور

رگ[3] جانم گستہ ہمچو تارش
نگشتہ مرغ اُمید شکارش

گستہ[4] تارم از ہر کار و باری
بدستم نیست جز بگستہ تاری

تفسیر صوفیانہ جب یوسف (قلب) نے برہان رب یعنی نور عنایت (جس کا انجام قناعت) کو دیکھا تو زلیخا (دنیا) اور زینت وشہوات کے دھوکہ سے بچ کر بھاگا تو زلیخا (دنیا) اس کے پیچھے دوڑی اِسْتَبَقَا الْبَاب اور دونوں موت کے دروازے کی طرف دوڑے۔ موت دنیا و آخرت کا دروازہ ہے اور تمام لوگ اسی دروازے کے اندر رہتے ہیں جو بھی اس دروازے سے نکلا فوراً دارِ آخرت میں داخل ہوگیا۔ اس لیے جو مرتا ہے اس کے لیے قیامت قائم ہوجاتی ہے۔ یہاں پر زلیخا (دنیا) اپنے شہوات سے یوسف (قلب) کے بشریت کی قمیص کے دامن کو پکڑا جبکہ ابھی یوسف (قلب) موت حقیقی کے دروازے سے نہیں نکلے تھے وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ تو زلیخا (دنیا) نے یوسف (قلب) کے بشریت کا کُرتہ پھاڑ ڈالا مِنْ دُبُرٍ پیچھے سے۔ پھر جب یُوسف (قلب) بشریت کی موت کے دروازے اور صفاتِ حیوانیہ سے نکلے تو اس کے پیچھے زلیخا (دنیا) بھی پہنچی وَاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَاب تو پایا ایسے ولی اللہ کو جس نے یوسف (قلب) کی تربیت کی اور وہی حضرات زلیخا (دنیا) کے زوج بھی ہیں۔ اور اولیاء اللہ کو دنیا کا زوج اس لیے کہا گیا ہے کہ دنیا و آخرت کے سردار اور حقیقی رجال بھی حضرات ہیں دنیا میں اسی طرح تصرف کرسکتے ہیں جیسے شوہر اپنی عورت پر تصرف کا حق رکھتا ہے قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءً اور کہا زلیخا (دنیا) نے کہ نہیں بڑا اس قلب کی جو دنیا میں بڑے تصرف کرتا ہے یعنی خلاف شریعت اور طبیعت کے موافق کردار ادا کرتا ہے اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ مگر یہ کہ اسے صفاتِ ذمیمہ نفسانیہ کا قیدی بنایا جائے

---

[1] جب شہباز وہاں سے اڑا تو اس کا سارا تانا بانا برباد ہوگیا۔

[2] میرا حال بھی اسی مکڑی جیسا ہے کہ مَیں اپنے مقصد سے دُور ہوں۔

[3] میری جان کی رگ ٹوٹ گئی ہے اور شکار بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

[4] تمام کاروبار سے بھی فارغ ہوگئی ہوں اور چند ٹوٹی ہوئی تاروں کے سوا ہاتھ کچھ نہ آیا۔

اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ یا اسے بُعد و فراق کے سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے قَالَ یُوْسُفُ (قلب) نے کہا یاد رہے کہ دُنیا قلب کی عداوت اس وقت ظاہر کرتی ہے جب دُنیا قلب کی بشریت کا کُرتہ پھاڑ لیتی ہے اور وہ قلب صفات بشریہ سے فارغ ہو کر موت کے دروازے نکل جاتا ہے هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ اسی نے مجھے اپنی طرف ورغلایا ہے کیونکہ یہی میری خدمت پر مامور تھی جیسا کہ مروی ہے کہ :

یَا دُنْیَا اُخْدُمِیْ مَنْ خَدَمَنِیْ ۔ (اے دنیا جو میرے دین کی خدمت کرتا ہے تو اس کی خدمت کرنا)

اور میں اس سے بھاگ کر یہاں پہنچا ہوں جیسے مجھے حکم ہے کہ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو)

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اور زلیخا کے اہل سے کسی ایک نے گواہی دی یعنی ان دونوں کے مابین کسی حاکم نے فیصلہ فرمایا۔ اس سے مراد عقل عزیزی (طبعی) ہے یہاں پر عقل مجرد مراد نہیں ہو سکتا اس لیے کہ عقل عزیزی دنیوی ہے اور عقل مجرد اُخروی اور یہ فیصلہ دنیوی ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ عقل عزیزی نے فیصلہ فرمایا یا اس لیے کہ عقل عزیزی زلیخا (دنیا) کے اہل سے ہے اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ اگر یوسف (قلب) بشریت کا کُرتہ آگے سے پھٹا ہے تو اس نے ثابت ہوگا کہ یوسف (قلب) خواہشات نفسانی اور حرص کا تابع ہو کر صراطِ مستقیم یعنی عصمت سے محروم ہو گیا کہ اس کا آگے سے کُرتہ پھٹ گیا۔ فَصَدَقَتْ تو زلیخا (دنیا) سچی ہے کہ یوسف (قلب) اس کے پیچھے پڑ گیا ہوگا۔ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ اور یوسف (قلب) جھوٹا ہے وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ اگر یوسف (قلب) کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو زلیخا (دنیا) جھوٹ بولتی ہے کہ یوسف (قلب) اس کے پیچھے پڑ گیا ہے وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ اور یوسف (قلب) سچا ہے کہ واقعی زلیخا (دنیا) نے اسے ورغلایا ہے اور وہی اس کے پیچھے دوڑی ہے اور وہ اس سے جان چھڑانے کے لیے بھاگا ہے۔ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ جب دیکھا تو یوسف (قلب) کا کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا تو حاکم عقل عزیزی کے فیصلہ سے واضح ہو گیا زلیخا (دنیا) نے بشریت کے قمیص کے واسطہ سے یُوسف (قلب) پر حملہ کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

قَالَ اِنَّهٗ کہا عزیزِ مصر یعنی ولی اللہ نے کہ یوسف (قلب) کے بشریت کے کُرتے کو پکڑنا مِنْ كَيْدِكُنَّ اے دنیا تیرا اور تیرے شہوات کا مکر ہے اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ○ تمہارا بہت بڑا یعنی عظیم مکر ہے کیونکہ ایسے امرِ عظیم میں مکر و فریب کرنا تمہارا کام ہے کہ تم قلب سلیم پر وصول الی اللہ العظیم کا ڈاکہ ڈالتی ہے۔ یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اے قلب تم دنیا سے روگردانی کرو اس لیے کہ کسی کا بکثرت ذکر اس کی محبت میں گرفتار کرتا ہے اور دُنیا کی محبت تو ہر برائی کی جڑ ہے وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اے دنیا تُو بھی اپنی غلطی سے باز آجا اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ○ اس نے تو اپنی زینت اور شہوات کے ساتھ قلب سے وصول الی اللہ کے راستے کاٹتی ہے اور تو ہی بڑی خطا کار ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کو راہِ حق سے ہٹاتی ہے اور اچھے بھلے بندوں کو گمراہ کر لیتی ہے۔

(کذا فی التاویلات النجمیہ)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ٘ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ ۝

ترجمہ: اور شہر کی بعض عورتوں نے کہا کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان (غلام) کا دل لبھاتی ہے فریفتہ ہوگیا ہے بیشک اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے ہم تو یقیناً اسے صریح وارفتگی میں پاتی ہیں۔ جب زلیخا نے ان کا چرچا سنا تو ان عورتوں کو اپنے ہاں دعوت بھجوا دی اور ان کے لیے مسندیں تیار کیں اور ان میں سے ہر ایک کو چھری دے دی اور یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آپ ان کے سامنے تشریف لائیں۔ جب عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کی بڑائی کا اعتراف کیا اور اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہنے لگیں اللہ تعالیٰ کو پاکی لائق ہے۔ یہ یوسف تو بشر ہی نہیں۔ یہ تو نہیں مگر کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

تفسیر عالمانہ

وَقَالَ نِسْوَةٌ اور عورتوں کی جماعت نے کہا۔

مفسرین نے کہا کہ وہ عورتیں پانچ تھیں:

- ○ خباز کی عورت
- ○ ساقی کی عورت
- ○ صاحب الدواب کی عورت
- ○ صاحب السجن کی عورت
- ○ حاجب کی عورت

ف: نسوة اسم مفرد ہے۔ اس کا اطلاق جمع مونث پر ہوتا ہے اور اس کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فعل میں تاء تانیث نہیں۔ اور رضی صاحب نے لکھا کہ نسوةٌ جمع ہے کیونکہ اس کا وزن فعلةٌ ہے اور فعلةٌ جمع کا وزن ہوتا ہے اور نساء اس کا تقدیری مفرد ہے جیسے غلمةٌ غلام کی جمع ہے۔ یہ اسم جمع ہے۔

ف: اگرچہ عزیز مصر نے اپنی صوابدید سے واقعہ کو دبا لیا لیکن عشق کب چھپا رہتا ہے بالآخر زلیخا کے عشق کا چرچا عام ہوگیا۔

زلیخا را بشگفت آں گل زار
جہانے شد بلعنش بلبل آواز

ترجمہ: جب زلیخا کے عشق کا باغ کھلا تو جہان میں طعن وتشنیع عام ہوگئی۔

ف: اس سے زنانِ مصر کو موقع مل گیا اور زلیخا کی داستان کو خوب اچھالا۔ ویسے قانون ہے کہ عشق میں سلامتی کہاں۔ یہاں تو ملامت ہی ملامت ہوتی ہے۔

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

ترجمہ: مجھے حسن کی شہرت کا اس وقت علم ہوا جبکہ زلیخا عشق میں مبتلا ہوئی تو چھپ نہ سکی۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

نسازد عشق را کنج سلامت
خوشا رسوائی و کوئے ملامت
غم عشق از ملامت تازہ گردد
وزیں غوغا بلند آوازہ گردد

فِى الْمَدِيْنَةِ یہ قال کا ظرف ہے۔ یعنی عورتوں نے مصر میں بات پھیلادی۔ یا یہ نسوۃ کی صفت ہے۔ کاشفی نے لکھا کہ عورتیں جہاں بیٹھتیں یہی گفتگو شروع کردیتیں۔ چنانچہ ان کے مضمون کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا گیا کہ امرأۃ العزیز۔ لغتِ عرب میں عزیز بادشاہ کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں اس سے قطفیر مراد ہے جو ریّان کا وزیر تھا اور امرأت سے زلیخا مراد ہے۔

سوال: زلیخا کے نام کو صراحۃً کیوں نہیں کہا گیا؟

جواب: ۱۔ عادت ہے کہ بادشاہ و وزراء و امراء اور ان جیسی معزز شخصیتوں کی عورتوں کے اسماء کے بجائے انھیں اپنے شوہروں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

۲۔ سعدی مفتی نے کہا کہ اس سے زلیخا کی تشنیع میں مبالغہ مطلوب ہے اس لیے کہ جب بہت بڑی شخصیت کی طرف برائی کی نسبت خبر دی جائے تو لوگ ایسی خبر کو دلچسپی سے سنتے ہیں۔

تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ اپنے غلام سے جماع کا مطالبہ کرتی اور اس کے ساتھ طرح طرح کے حیلے بہانے کرکے اسے جماع پر مجبور کرتی ہے۔ الفتیٰ نوجوان کو کہا جاتا ہے۔ اور اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو بادشاہوں کی خدمت میں رہتا ہو، نوجوان ہو یا بوڑھا۔ یہاں پر وہ نوجوان مراد ہے جو بادشاہوں کی خدمت میں رہتا ہو۔

حدیث شریف تمہارے لیے لائق نہیں کہ کہو کہ فلاں میرا عبد اور فلاں میری لونڈی ہے تم سب اللہ تعالیٰ کے عبد اور تمہاری عورتیں اللہ تعالیٰ کی کنیزیں ہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ فلاں میرا غلام یا زرخرید لونڈی ہے۔

مسئلہ : ابن الملک نے فرمایا کہ حضور سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ناگوار گزرا کہ سردار اپنے غلام کو کہے کہ یہ میرا عبد ہے اس لیے کہ اس میں تکبر کی بُو آتی ہے اور اس لیے کہ تمام اللہ کے عبد ہیں اور یہ کراہت بھی اس لیے ہے کہ بطورِ تکبر کے کہا جائے اور دُوسرے کی تحقیر مطلوب ہو۔ اگر یہ خیال نہ ہو تو جائز ہے اس لیے عبد کا اطلاق بندوں کی غلامی کے لیے قرآن مجید میں ہے ۔ کما قال تعالیٰ :

والصالحین من عبادکم و امائکم ۔

(اسی معنی پر ہم عبدالنبی ، عبدالرسول ، غلام نبی ، غلام رسول وغیرہ کے جواز کے قائل ہیں جو ایسے اسماء کو شرک کہتے ہیں وُہ اپنے نظریہ پر نظرثانی کریں)

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ط زلیخا کے دل کے غلاف کو بوجہ محبت کے یُوسف نے چیرا ہے ۔ یعنی یوسف علیہ السلام کی محبت زلیخا کے دل میں سما چکی ہے ۔ جیسے ہم جسمانی بیماری کے بدلتے ہوئے حال بیان کرتے ہیں ۔ ایسے ہی زنانِ مصر نے زلیخا کے دل کے بولتے حال آپس میں بیان کرتی تھیں یہ دُوسری خبر اور حبًّا منقول از فاعلیت تمیز ہے ۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ زلیخا کے دل کے غلاف کو یُوسف علیہ السلام کی محبت نے چیر کر اس کے دل کے اندرونی حصّے (جسے فؤاد کہا جاتا ہے) میں جاگزیں ہوئی ہے ۔

ف : شغاف قلب کے حجاب کو کہا جاتا ہے اور اسے قد شعف (بالعین المہملہ) سے بھی پڑھا گیا ہے ۔ اہلِ عرب کہتے ہیں :

شعفہ الحب یعنی احرق قلبہٗ ۔ (کذا فی الصحاح)

عشق محبت کی تحقیق المحبۃ یعنی اَلْمَیْلُ اِلیٰ اَمْرٍ جَمِیْلٍ اچھے شے کی طرف دل کا جھکاؤ ۔ اگر یہ حد سے زائد ہو تو اسے عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ پھر اس میں اور افراط ہو تو اسے سکر اور ہیجان کہا جاتا ہے ۔

مسئلہ : عشق میں افراط ہو کہ اسے ضرر و نقصان کی تمیز نہ ہو تو شرعًا وہ معذور ہے اسے کسی قسم کی ملامت نہیں کی جا سکتی ، اس لیے کہ یہ ایک آفت سماوی ہے جیسے جنون اور دیگر امراض کے مریض بوقتِ مرض معذور ہوتے ہیں ایسے عشق میں مبتلا ہونے والا[1] ۔

محبت کا آغاز از ایزد تعالیٰ ہم اہلسنت بحمدہٖ تعالیٰ عشق و محبت الٰہی و مصطفوی کی بہت بڑی تعریف (تحریرًا و تقریرًا و عملًا) کرتے ہیں ۔ مخالفین اسے خلافِ اسلام نہ معلوم کیا کیا کہتے ہیں ۔ صاحبِ روح البیان قدس سرہٗ نے اس کی تحقیق فرمائی کہ :

والمحبۃ اصل الایجاد وسببہ کما قال تعالیٰ   اور محبت اصل ایجاد کا اصل اور سبب ہے ۔ جیسے کہ

---

[1] لیکن اس سے وہ عشق مراد ہے جو قدرتی طور پر کسی سے بلا اختیار پیدا ہو جائے ورنہ دنیا میں بے شمار عشقباز پھرتے ہیں جن کا عشق نفس کی حولت اور شہوت کی شرارت کی وجہ سے ہوتا ہے حقیقی و مجازی عشق کی تحقیق فقیر کے رسالہ "العنق فی العشق" میں دیکھیے ۔ افسوس کہ مخالفیِ اہلسنت سرے سے اس حدیث شریف کے وجود کے منکر ہیں ۔

کنت کنزاً مخفیا فاحببت ان اعرف ۔ (ج ۴ ص ۲۴۵) — اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں مخفی خزانہ تھا پس مجھے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں۔

لفظ عشق کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں

ہمارے بعض جاہل سُنّی اللہ تعالیٰ پر لفظ عشق کا اطلاق کرتے ہیں۔ انھیں فقیر اویسی غفرلہٗ روکتا ہے لیکن بعض صاحبان نہیں مانتے ۔ لاریب وہ فقیر کی نہ مانیں امام قاشانی اور صاحبِ رُوح البیان قدس سرہما کی تو مانیں۔ وہ لکھتے ہیں :

العشق اخص لانہ محبۃ مفرطۃ و لذالك لا یطلق علی اللہ تعالیٰ لانتفاء الافراط عن صفاتہ ۔ — عشق و محبت سے خاص ہے اس لیے کہ زائد محبت کو عشق کہا جاتا ہے اور اس کا اطلاق اللہ تعالےٰ پر ناجائز ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں افراط نہیں۔

اولیاءِ کرام کا عشق جہنم کی آگ سے بڑا ہے

ہم اہلسنت اولیاء کرام کی شان کو نرالی شان کے ساتھ بیان کرتے ہیں جسے مخالفین اہلسنت غلو سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ غلو وُہ ہے جو حقیقت سے کوسوں دُور ہو اور جو حقیقت کے عین مطابق ہو وُہ شے کی مدح ہے اور حقیقت کا انکار کرنا زندقہ (بے دینی) ہے۔ یہ فیصلہ ناظرین خود فرمائیں کہ حق پر ہم اہلسنّت ہیں یا مخالفین ۔ مثلاً جہنم کی آگ کی گرمی کتنی تیز ہے اسے ہم نے اس وقت تک دیکھا نہیں سنا ہے اور وہ شنوائی قریب معائنہ اور مشاہدہ کے ہے جسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہنم کی گرمی اور جلن سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں لیکن اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ولی اللہ کے عشق کا سوز جہنم سے بڑھ کر ہے ۔ چنانچہ صاحبِ رُوح البیان نے فرمایا کہ :

قال الجنید قالت النار یا رب لو لم اطعك ھل کنت تعذبنی بشیٔ ھو اشد منی قال نعم کنت اسلط علیك ناری الکبری قالت وھل نار اعظم منی قال نعم نار محبتی اسکنھا قلوب اولیائی المومنین ۔ (کذا فی القریب) — حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے منقول فرمایا ہے کہ دوزخ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ اگر میں آپ کی اطاعت نہ کرتی تو میرے لیے سزا کون سی ہوتی ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری سزا وہ آگ ہے جو تیرے سے سخت تر ہے جہنم نے کہا کہ وہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری محبت کی آگ جسے میں نے اپنے اولیا کے دلوں میں ٹھہرایا ہے۔

ف : یحییٰ بن معاذ نے فرمایا کہ اگر مجھے عذاب کے خزانوں کا مالک بنایا جائے تو میں عاشق کو عذاب نہ دُوں گا اس لیے کہ وہ اس بیماری میں اضطراراً مبتلا ہو کر برائی سے بھی بچ گیا اور اپنا عشق کسی پر ظاہر نہ کیا اور وُہ اسی حالت میں مرگیا تو وُہ شہید ہے ۔
حضرت حافظ صاحبؒ نے فرمایا : ؎

عاشق شوار نہ روزے کار جہاں سر آید
ناخواندہ نقش مقصود از کارگاہ ہستی

ترجمہ: اے عاشق غم نہ کھائیے، ایک دن یہ ختم ہوں گے اور تیرا مطلوب تجھے نصیب ہوگا۔

ازالۂ وہم وہابیہ آجکل زلیخا پر خوب حملے ہو رہے ہیں کہ وہ معاذ اللہ زناکار تھی وغیرہ۔ فقیر نے ایسے اوہام کے جوابات لکھے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ زلیخا عشق مجازی کی برکت سے عشق حقیقی سے سرشار ہوئی چنانچہ صاحب روح البیان نے لکھا ہے:

وعشق زلیخا وان کان عشقاً مجازیاً لکن لما تحققها بہ حقیقتاً وصدقاً وجذبہا الی المقصود وآل الامر من المجازی الی الحقیقت لانہ قنطرتہا۔ (ج ۴، ص ۲۴۵)

زلیخا کا عشق اگرچہ مجازی تھا لیکن سچا اور مبنی بر حقیقت تھا۔ اسی لیے اسے مقصود حاصل ہوگیا اور مجاز سے اسے حقیقت نصیب ہوئی اس لیے کہ مجاز حقیقت کے لیے بمنزلہ پل کے ہے۔

حضرت شیخ فرید الدین منطق الطیر میں لکھتے ہیں:

ہر کہ او در عشق صادق آمدہ است
بر سرش معشوق عاشق آمدہ ست
عمر یصدقے عشق پیش آید ترا
عاشقت معشوق خویش آید ترا

ترجمہ: جو بھی عشق میں سچا ہوتا ہے تو خود معشوق عاشق کے ہاں حاضر ہوتا ہے۔ اگر تو عشق میں سچا ہے تو تیرا معشوق تیرا عاشق ہوگا۔

اِنَّا لَنَرٰىهَا بے شک ہم اسے یوسف علیہ السلام کے ورغلانے اور اس کے عشق و محبت میں مبتلا ہونے سے یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ فِیْ ضَلٰلٍ رشد و صواب کے طریق سے بعید اور بہت بڑی خطا میں ہے مُّبِیْنٍ ۝ اس کی گمراہی ایسی واضح ہے کہ کسی سے مخفی نہیں اور ایسی ظاہر ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔

سوال: انہا لفی ضلٰل مبین کیوں نہ کہا۔ اتنی لمبی عبارت کیوں؟

جواب: وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ اسے ہم ظن اور تخمینہ سے نہیں بلکہ حق الیقین اور مشاہدہ و معائنہ کے طور کہہ رہی ہیں اور انھیں یہ بھی ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ یہ بیوقوفی زلیخا نے کی ہے ہم ایسی غلطی سے کوسوں دور ہیں۔

ملامت گر عورتوں کو سزا جن عورتوں نے زلیخا کو یوسف علیہ السلام کے بارے میں ملامت کی تھی وہ سب کی سب عشق مجازی میں مبتلا ہوئیں۔ انھیں صرف اسی لیے سزا دی گئی کہ انہوں نے زلیخا کی مجبوری کو دیکھے بغیر طعن و تشنیع کی اور قاعدہ ہے کہ جو کسی دوسرے کو کسی غلطی پر عار دلاتا ہے تو وہ خود مرنے سے پہلے اسی خرابی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔

ف : عشق میں کامیابی کی ایک علامت یہی ہے کہ وُہ ملامت گروں کی ملامت اور طعن وتشنیع کا نشانہ بن جائے۔

ولی اللہ کی ایک نشانی بعض اولیاؑ اللہ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں جب اللہ تعالیٰ اپنی محبت عشق سے خاص کر لیتا ہے تو وہ لوگوں کی نگاہوں میں مبغوض ہو جاتا ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی غیرت کی علامت ہے کہ وہ غیروں کی محبت کو اپنی محبت کے ساتھ شریک نہیں ہونے دیتا۔ اسی لیے جمہور اولیاکرام کے متعلق عوام میں مذموم باتیں مشہور ہو جاتی ہیں حالانکہ وُہ چوٹی کے ولی ہوتے ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ مخلوق سے فائق وممتاز بناتے ہُوئے ایسے کرتا ہے جیسے مشک کو خون سے ممتاز کر لیتا ہے کہ اگرچہ ان دونوں کی شکل وصورت ایک ہوتی ہے لیکن خوشبو خون سے اُونچا مرتبہ رکھتی ہے اور خُون سے ممتاز بھی ہے وُہ پلید ہے اور مشک پاک۔ اسی طرح مخصوص اولیاکرام اپنی حالت جمعیہ کمالیہ کے لحاظ سے عام انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں اس لیے کہ عوام انسان تفرقہ ونقصان کا شکار اور اولیاؑ کاملین تفرقہ ونقصان سے پاک ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے عوام اپنے جیسے عوام سے خوش ہوتے ہیں انھیں اولیاؑ سے کیا تعلق۔ کیونکہ قاعدہ ہے۔ الجنس الی الجنس یمیل اسے پُورے طور سمجھو[1]

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ جب زلیخا نے ان کی طعن وتشنیع اور چرچا سُنا کہتی پھرتی ہیں کہ عزیز کی بیوی اپنے کنعانی غلام پر عاشق ہوگئی ہے اور یہ زلیخا کے لیے دُکھ کی بات تھی اور ان کی اذیت دینے کو مکر سے اس لیے تعبیر کیا کہ وہ عورتیں زلیخا سے پوشیدہ ہوکر چرچے کرتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ اس کا علم زلیخا کو نہیں ہوگا۔ اگرچہ عوام میں اظہر من الشمس ہوگیا اور عام طور خوشامدی اور چاپلوسی انسانوں کی یہی عادت ہے **أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ** انھیں دعوت کے لیے بُلا بھیجا دعوت دے کر بظاہر زلیخا نے عورتوں کا اعزاز واکرام کا بہانہ بنایا اور درحقیقت ان کے ساتھ ان کے دھوکہ کا جواب دیا کہ یوسف علیہ السّلام کا جواب دیا کہ یوسف علیہ السلام کا جلوہ دیکھ کر ایک طرف زلیخا کو عشق میں معذور سمجھیں گی دُوسری طرف وُہ خود یُوسف علیہ السّلام کے عشق میں مبتلا ہوجائیں گی۔

ف : زلیخا نے چالیس عورتوں کو دعوت دی۔ پانچ عورتیں خصوصیت سے وُہ تھیں جن کے متعلق ہم نے ابتدا میں تصریح کی ہے۔

وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ اور تیار کر کے حاضر کیا **مُتَّكَأً** وہ ریشمی تکیے وغیرہ جو طعام کھلاتے وقت معزز مہمانوں کے لیے طعام سے پہلے رکھے جاتے ہیں جیسا کہ امراء کی عادات سے ہے اسی لیے اسلام میں بائیں ہاتھ سے اور تکیہ لگا کر کھانے سے منع کیا گیا ہے۔

ف : بعض قرأت میں مُتّکا پڑھا گیا ہے سیب اور وُہ طعام جو انڈوں اور گوشت سے تیار کیا جاتا ہے اسے مُتّکا کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ معرب ہے جسے عوام بزماورد کہتے ہیں۔[2] (کذا فی القاموس)

وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ مہمان خانہُ خاص میں بیٹھنے کے بعد ہر ایک عورت کو زلیخا نے پکڑا دی **سِكِّينًا**

---

[1] ورنہ وہابی دیوبندی بن جاؤ گے۔ [2] عربی میں اسے زماورد بالضم کہتے ہیں۔

چھری۔ تاکہ سامنے رکھے ہوئے طعام اور میوے اس سے کاٹیں اس سے قبل زلیخا ان کے سامنے دسترخوان بچھوائے جن پر پکا ہوا گوشت اور میوہ جات رکھ دیے گئے۔ اس سے زلیخا کا ارادہ تھا کہ جونہی یوسف علیہ السلام کا جلوہ دیکھیں گی تو چھری ہاتھ سے کرے گی تو اپنے ہاتھ ڈالیں گی اس لیے کہ قاعدہ ہے کہ سہارا لگا کر بیٹھنے والا جونہی ایسی کیفیت دیکھتا ہے تو ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے۔ مروی ہے کہ زلیخا نے ان عورتوں کے لیے بے نظیر کھانے پینے کی ایسی اشیاء تیار کیں کہ انھوں نے کبھی دیکھی نہ سنی تھیں۔ ؎

روان ھمہ سو کنیزان و غلامان
بخدمت ہمچو طاؤساں خراماں
پری رویان مصری حلقہ بستہ
بمسند ہای زرکش خوش نشستہ
چوں خوان برداشتند از پیش آناں
زلیخا شکرگویاں مدح خواناں
نہاد از طبع حیلت ساز پرفن
ترنج و کزلکی بر دست ہر زن

ترجمہ: ہر طرف غلام اور کنیزیں رواں دواں تھیں اور خدمت کے لیے مور کی طرح چلتی تھیں۔ مصر کی محبوب عورتیں حلقہ باندھ کر مسند سنہری پر خوش بیٹھی تھیں جب ان کے آگے کھانے چنے گئے زلیخا ان کی مدح و تعریف کر رہی تھی حیلہ اور مکر و فریب سے طعام کے ساتھ ہر عورت کے ہاتھ میں چھری دے دی۔

وَقَالَتِ جب وہ چھریاں لے کر کھانے کی اشیاء اور میوہ جات کو کاٹنے میں مشغول ہوئیں تو زلیخا نے یوسف علیہ السلام سے عرض کیا اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ان کے سامنے تشریف لائیں۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

بپاے خود زلیخا سوے او شد
دران کاشانہ ہم زانوے او شد
بزارے گفت کاے نور دو دیدہ
تناے دل محنت رسیدہ
فتادم در زبان مردم از تو
شدم رسوا میاں مردم از تو

گرفتم آنکہ در چشم تو خوارم
بنزدیک تو بس بے اعتبارم
مدہ زیں خواری و بے اعتباری
زخاتونان مصرم شرم ساری
شد از افسون آں افسونگر گرم
دل یوسف بہ بیرون آمدم نرم
پئی تزیین او چوں باد برخاست
چو سرو از حلہ سبزش بیاراست
فرود آویخت گیسوے معنبر
بہ پیش حلہ اش چوں عنبر تر
میانش را کہ با مو ہمسری کرد
ز زریں منطقہ زیور گری کرد
بسر تاج مرصع از جواھر
زہر جوھر ہزارش لطف ظاہر
بپا نعلینے از لعل و گہر پر
بر و بستہ دواں رشتۂ

ترجمہ: زلیخا کے کہنے پر عورتوں کی طرف روانہ ہوکر کاشانہ میں تشریف لے گئے۔ زلیخا نے عجز و نیاز سے عرض کی اے آنکھوں کے نور آپ کی تمنا اور عشق میرے دل میں بہت ہے لوگوں میں تیری وجہ سے مطعون ہوں بلکہ رسوا ہوں۔ میں نے مانا کہ میں تیری نظروں میں خوار بلکہ بے اعتبار ہوں لیکن اس خواری و بے اعتباری سے مجھے مصری عورتوں کے سامنے مزید رسوا اور شرمسار مت کرو۔ اس کی افسوں بھری باتوں کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کا دل نرم پڑ گیا۔ یوسف علیہ السلام کو سنگارنے کے لیے زلیخا ہوا کی طرح تیز چلی اور بہترین پوشاک لے آئی اور آپ کے زلف عنبریں کو سنوارا اور بہترین پوشاک پہنائی آپ کی کمر تو بال کی طرح باریک تھی اسی لیے کمر پر سنہری بند باندھا سر پر جوہر و موتی کا جڑاؤ تاج رکھا اور اس کے تاج سے ہزاروں الطاف ظاہر ہوتے تھے جوتا مبارک لعل و گہر سے پر تھا اس پر موتیوں سے پر تسمہ باندھا۔

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اس کا عطف جملہ فعلیہ مقدرہ پر ہے یعنی یوسف علیہ السلام زلیخا کی عرضداشت کے مطابق عورتوں کے ہاں

تشریف لانے تو جب عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا ؎

زخلوت خانہ آں گنج نہفتہ
بروں آمد چو گلزار شگفتہ

ترجمہ: خلوت خانہ وہ جس کا خزانہ مخفی تشریف لایا ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے باغ میں گلاب کا پھول۔

دیکھتے ہی بیساختہ اَکۡبَرۡنَہٗ یوسف علیہ السلام کی عظمت و بڑائی بیان کی۔ اور آپ کا حسن و جمال دیکھ کر بیہوش ہوگئیں اس لیے کہ آپ کے حسن و جمال نے انھیں بیخود کر دیا جیسے چودھویں کے چاند سے ستارے ماند پڑجاتے ہیں ایسے ہی ان کے حسن و جمال یوسفی حسن و جمال کے سامنے ماند پڑ گئے۔ اس پر مزید بحث آگے آئے گی۔

ف: بعض لغات کے لحاظ سے اکبرنَ بمعنی حِضنَ۔ یعنی یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی ان کے رحموں سے شہوت کے غلبے خون جاری ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت پر جب شہوت سخت حملہ کرتی ہے تو حیض جاری ہوجاتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے اکبرت المرأة۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب عورت سے حیض کا خون جاری ہو۔ وہ اس لیے کہ حیض کے جاری ہونے سے عورت کبر (سنِ بلوغ) کو پہنچتی ہے یا اکبرن بمعنی ان کے رحموں سے یوسف علیہ السلام کے عشق و محبت سے منی خارج ہوئی۔ (کذا فی الکواشی)

مسئلہ: الشرعۃ میں ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: عورت کے بہترین اخلاق سے سمجھا جاتا ہے کہ جب اپنے شوہر کو دیکھے تو اس کے عشق سے اس سے منی خارج ہو اور اپنے شوہر کی فرماں بردار ہو۔

وَقَطَّعۡنَ اَیۡدِیَہُنَّ اور عورتوں نے یوسف علیہ السلام کی صورت کو دیکھ کر بیخود ہوکر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اس لئے کہ جب وہ اپنے اختیار میں نہ رہیں تو لازماً چھری ہاتھ سے گری تو اسی سے ان کے ہاتھ کٹ گئے۔ (کذا فی التبیان)

اور حضرت وہب نے فرمایا کہ اس وقت کئی عورتیں مرگئیں۔

حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

چو ہر یک را دراں دیدار دیدن
تمنا شد ترنج خود بریدن
ندانستہ ترنج از دست خود باز
زدست خود بریدن آغاز

ترجمہ: جب ہر ایک کو یوسف علیہ السلام کے دیدار کی تمنا تھی تو ہر ایک نے سیب کاٹنا شروع کیا انھیں پتا نہیں تھا کہ کیا ہوگا۔ اسی لیے سیب کاٹنے کی بجائے ہاتھ کاٹ ڈالے۔

یکے از تیغ انگشتاں قلم کرد
بدل حرف وفائے او رقم کرد

یکے بر ساخت از کف صفحۂ سیم
کشیدش جدول از سرخی چو تقویم
بہر جدول روانہ سیلی از خون
ز حد خود نہادہ پائے بیروں
گروہ زاں زناں کف بریدہ
زعقل و صبر و ہوش و دل رمیدہ
ز تیغ عشق یوسف جاں نبردند
ازاں مجلس زفتہ جاں سپردند
گروہے از خرد بیگانہ گشتند
ز عشق آں پری دیوانہ گشتند
گروہے آمدند آخر بخود باز
دلے با درد و سوز عشق دمساز
جمالِ یُوسف آمد خمی از مے
بقدر خود نصیب ہر کس از وے

ترجمہ: کسی نے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ دل پر وفا (محبت وعشق) کا حرف لکھا۔ خون کی نہریں جاری ہوگئیں یوسف علیہ السلام کی محبت سے اپنے وجود سے بے خبر ہوگئیں۔ بعض عورتوں نے تو ہاتھ کاٹ ڈالے عقل و ہوش اور دل سے فارغ ہوئیں۔ یُوسف علیہ السلام کے عشق سے جان ختم کرڈالی۔ اسی مجلس میں فوت ہوئیں۔ بعض عورتیں یوسف علیہ السلام کے عشق سے دیوانی اور پاگل ہوگئیں۔ بعض عورتیں بے ہوشی سے ہوش میں آئیں لیکن وہ بھی درد وسوز اور عشق میں غرق تھیں۔ یُوسف کا جمال شراب کا ایک گھڑا تھا ہر ایک نے وہاں سے اپنا حصہ لیا۔

و قطعن ایدیھن اور مدہوشی سے ہاتھ کاٹ ڈالے کیونکہ مدہوش کو خبر نہیں ہوتی کہ وُہ کیا کر رہا ہے۔

نکتہ ، زلیخا مدہوش نہ ہُوئی اس لیے کہ وہ یُوسف علیہ السلام کی کامل عاشق تھی اور کامل عشاق مقام تمکین[۱] میں ہوتے ہیں اور اور دُوسری عورتیں مبتدیہ جیسے سلوک میں منتہی و مبتدی کا فرق اہلِ سلوک کو معلوم ہے ایسے ہی یہاں سمجھئے۔

---

[۱] تمکین وتکوین کی اصطلاح فقیر کی شرح مثنوی میں دیکھیے۔

ف : قاشانی نے فرمایا چونکہ یُوسف علیہ السلام عورتوں پر اچانک جلوہ گر ہوئے اسی لیے ان کے ہاتھ کٹ گئے کیونکہ انھیں حیرت نے گھیر لیا تھا اور شاہد جمال نے جب حملہ کیا تو وُہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں۔

ع

غابت صفات القاطعات اکفہا

فی شاھد ھو فی البریہ ابدع

ترجمہ : ہاتھ کاٹنے والی عورتیں اپنی صفات سے بے خبر ہُوئیں شاہد محبوب جب ان کے ہاں نرالی شان سے ظاہر ہُوا اور چونکہ زلیخا یوسف علیہ السلام کے عشق میں انتہا کو پہنچی ہُوئی تھی اسی لیے وہ اپنے ہوش و حواس پر قائم رہی اس لیے کہ شاہد محبوب کا تصور اس کے قلب پر پہلے سے جاگزین تھا۔

ف : حقائق سلمی میں ہے کہ مدعیانِ نبوت کو اللہ تعالیٰ اسی طرح ملامت کرتا ہے کہ جب ایک مخلوق کے حسن سے دُوسری مخلوق کو دنیوی درد و آلام کی خبر نہیں رہی تھی تو تم تب حقیقی حُسن کی محبت کے مدعی ہو تو پھر دنیوی درد و آلام سے کیوں افسوس کا اظہار کرتے ہو تمہیں بھی ایسی محویت ہونی چاہیے کہ دُنیا کا کوئی درد و الم محسوس نہ ہو۔

ع

گر با تو دمی دست در آغوش توان کرد

بیداد تو سہلست فراموش توان کرد

ف : حکم عطائیہ کی شرح میں ہے کہ یہ حزن و الم جو مقصود و پُورا نہ ہونے پر واقع ہوتا ہے وہ صرف اسی لیے کہ انہیں معائنہ محبوب سے محرومی کی وجہ سے ہوتا ہے ورنہ جب انہیں محبوب کے جمال کا معائنہ نصیب ہو جاتا ہے تو پھر تمام درد و آلام محسوس تک نہیں ہوتا جیسے مصر کی عورتوں کا حال سب کو معلوم ہے باوجودیکہ ہاتھ کاٹے جا رہے ہیں خون سے لت پت ہیں لیکن محسوس تک نہیں ہُوا۔

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ اور کہا اللہ تعالیٰ کے لیے پاکی ہے کہ وُہ ایسی حسین و جمیل مخلوق پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہے۔

حَاشَ در اصل حاشا تھا۔ تخفیفاً الف حذف کر دیا گیا ہے اور لِلّٰهِ کی لام جارہ تنزیہ و براءۃ کا فائدہ دیتی ہے جب بات استثناء میں واقع ہو۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تنزیہ و براءۃ۔ اس معنیٰ پر لام مبراء و منزہ کے بیان کے لیے ہوگی جیسے سقیا لک۔

سوال : تمہیں کیسے معلوم ہُوا کہ یہ حَاشَ بھی تنزیہ (مصدر) ہے۔

جواب : ابو السماک کی قرأت میں صراحۃً حاشا للہ ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ دُوسروں کی قرأت میں یہ لفظ مصدر نہیں لیکن مصدر کا معنیٰ دیتا ہے۔

مَا هٰذَا بَشَرًا یہ ہمارے جیسا آدمی نہیں، اس لیے کہ آدمیوں میں ایسا حسن و جمال کہاں۔ اِنْ نافیہ بمعنی مَا نافیہ کے ہے هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ نہیں ہے مگر یہ اپنے رب تعالیٰ کا معزز و مکرم فرشتہ۔

(کذافی التفسیر ابی اللیث) یہ قصرِ القلب کے باب سے ہے اس لیے کہ اس میں سامعین کے حکم کا قلب کیا گیا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ یوسف علیہ السلام فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے لیکن عورتوں نے باوجودیکہ ان کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یوسف علیہ السلام انسان ہیں لیکن یہاں پر ان ھذا الا ملک کریم کہہ کر حکم کا قلب کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام ملکیت (فرشتہ ہونے) میں مقصور کر دیا وہ صرف اس لیے کہ تمام ذہنوں میں یہ خیال راسخ ہے کہ فرشتے سے بڑھ کر اور کوئی شے حسین نہیں۔ جیسے ذہنوں کو یقین ہو چکا ہے کہ شیطان سے قبیح ترین اور کوئی شے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو حسن و جمال میں یکتا ہو اسے فرشتے کے ساتھ اور جو قباحت میں بے مثل ہو اسے شیطان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہاں پر بھی عورتوں کا مقصد یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کی یکتائی بیان کرنا مطلوب ہے۔ ؎

چوں دیدندش کہ جز والا گہر نیست

برآمد بانگ کیں ہذا بشر نیست

نہ چوں آدم ز آب و گل سرشت

ز بالا آمدہ قدسی فرشتست

ترجمہ: جب انھوں نے دیکھا کہ اس جیسا بے نظیر گوہر اور کوئی نہیں تو بے ساختہ کہا کہ یہ بشر نہیں۔ یہ آدمیوں کی طرح پیدا شدہ نہیں بلکہ یہ کوئی عالم بالا قدسی فرشتہ ہے۔

ف: بعض مشائخ کرام نے فرمایا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ منجملہ مہربانیوں کے ایک ہے کہ اس نے ملائکہ کرام کو ہمارے سے اوجھل رکھا ورنہ ہم انھیں دیکھ کر بیہوش ہو جاتے یا آنکھوں سے محروم ہو جاتے اس لیے کہ ان کی آنکھیں ان کے جلووں کی تاب نہیں رکھتیں۔

ف: اسی وجہ سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے وحی میں رؤیا سے نوازا گیا کیونکہ قوائے بشریہ میں رویت ملک کی طاقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل نبوت میں آپ نے جونہی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اصلی صورت میں دیکھا تو غشی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد پھر وہ اکثر و بیشتر بشری لباس میں حاضری دیتے۔ (کذافی انسان العیون)

یوسف علیہ السلام کی نورانیت

مروی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام گلی کوچوں سے گزر فرماتے تو آپ کے چہرۂ اقدس سے سورج کی طرف نور چمکتا ہوا نظر آتا تھا اور آپ کی شکل کو حضرت آدم کے ساتھ مشابہت تھی آپ کی والدہ راحیل اور دادی بی بی سارہ رضی اللہ عنہما دونوں نہایت حسین و جمیل تھیں۔

؎

چہ گویم کان چہ حسن و دلبری بود

کہ بیروں از حد حور و پری بود

مقدس نوری از قید چہ و چوں

سر از جلباب چوں آوردہ بیروں

چوں آں بیچوں دریں چوں کرد آرام

پئے روپوش کرد و یوسفش نام

زلیخائی کہ رشک حور عین بود

بمغرب پردہ عصمت نشیں بود

ز خورشید رخش نا دیدہ تابی

گرفتار جمالش شد بخوابی

ترجمہ: میں کیا کہوں کہ وُہ کیسا حسن اور محبوبی تھی وہ تو حور و پری کے حسن سے زائد حسن والے چہ و چون کی قید سے ان کا حسن پاک. جب اس حسن نے اطلاق سے باہر قدم رکھا جب اس بے چون نے اس ملک میں آرام فرمایا تو اپنے آپ کو چھپانے کے لیے اپنا یوسف رکھا یا زلیخا بھی اگر حور عین کو رشک دینے والی تھی ملک مغرب میں عصمت نشین تھی لیکن وُہ یُوسف علیہ السلام پہ اَن دیکھے عاشق ہو گئی اور خواب میں ان کے حُسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی۔

یُوسف علیہ السّلام کا حسن وجمال

کاشفی نے تفسیر الفارسی میں لکھا ہے کہ صاحبِ وسیط نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ہاں جبرئیل علیہ السلام حاضر ہُوئے اور عرض کی اللہ تعالیٰ نے آپ پہ سلام بھیج کر فرمایا کہ اے محبوب! یوسف علیہ السلام کا نور کرسی سے اور آپ کا نور عرش معلٰی سے پیدا فرمایا ہے لیکن آپ سے حسین ترین اور کوئی نہیں۔ اگرچہ یُوسف علیہ السّلام میں حُسن و جمال تھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کمال عطا ہُوا۔ حضرت یُوسف علیہ السلام کے حسن سے ہاتھ کٹ گئے لیکن کمال محمدی علیٰ صاحبہ السلام سے زُنّار کٹ گئے۔ ؎

از حسن روئے یوسف دست بریدہ سہلست

در پائے دلبر من سرہا بریدہ باشد

ترجمہ: یُوسف علیہ السلام کے چہرے کو دیکھ کر عورتوں نے ہاتھ کاٹے یہ کوئی بڑا کمال نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ میرے محبوب کے پاؤں پر لوگوں نے سر کٹا دیے[1]۔

---

[1] اعلیٰحضرت بریلوی قدس سرہٗ نے اسی مضمون کو خوب نبھایا ہے۔ ؎

حسن یوسف پہ کٹیں انگشتِ زنانِ مصر — تیرے نام پہ کٹاتے ہیں سر مردانِ عرب

حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کے متعلق فرمایا: ؎

لوائم زلیخا لو رأین جبینہٖ
لاثرن فی القطع القلوب علی الید

ترجمہ: زلیخا کی ملامت گر عورتیں اگر میرے محبوب کی صرف پیشانی دیکھ لیتیں تو ہاتھ کے بجائے قلوب قربان کر دیتیں۔

؎

زنانِ مصر بہنگام جلوۂ یوسف
ز روئے بیخودی از دست خویش ببریدند
مقرراست کہ دل پارہ پارہ می کردند
اگر جمال تو اے نور دیدہ میدیدند

ترجمہ: مصر کی عورتوں نے جلوۂ یوسف کے وقت بیہوشی میں اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر تمہارا (اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) حسن دیکھتے تو دل ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔

حدیث شریف حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی علیہ السلام خوب صورت اور خوش آواز ہوتا ہے۔ اور میں تمام انبیاء علیہم السلام سے حُسن و آواز میں اعلیٰ واکمل ہوں۔

ف: صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہر نبی علیہ السلام کو ایک دُوسرے سے کسی نہ کسی وجہ سے فضیلت ضرور ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یُوسف علیہ السلام کو ظاہری جسم کے لحاظ سے حسین ماننا پڑتا ہے لیکن ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حسین ترین مانیں گے لیکن ظاہری بُشرہ کو حُسن کہا جاتا ہے اور ظاہری بشرہ حضور یوسف علیہ السلام کا سفید تھا اور ہمارے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بُشرہ مبارک گندم گُوں تھا لیکن مائل بہ ملاحت، اور اس ملاحت کے بالمقابل ہزاروں یوسف کا حُسن ماند تھا۔ حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

آں چُردہ کہ شیرینیٔ عالم با اوست
چشم میگون لبِ خنداں رخِ خرم با اوست

ترجمہ: وہ محبوب کہ تمام جہانوں کی شیرینی اسی کی بدولت ہے چشم میگوں لب خنداں رُخ خرم کا کیا کہنا۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

دبیرِ صنع نوشت گرد عارض تو
بمشکناب کہ الحسن والملاحۃ لك

ترجمہ: صناعِ ازل نے تیرے چہرے کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اسی میں حُسن ہے اور ملاحت بھی۔

ف : اس سے معلوم ہُوا کہ حسن اور شے ہے اور ملاحت چیزے دیگر۔ لیکن اس کے باوجود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاحۃ کا حُسن یُوسف علیہ السلام کے حُسن سے افضل و اعلیٰ اور اکمل و مکمل تھا۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے : ؎

زخوبی تو بہر جا حکایتے گفتند

حدیث یوسف مصری فسانہ باشد

ترجمہ : آپ کے حسن کا قصہ جہاں ہوتا ہے وہاں پر یُوسف مصری کی بات ایک افسانے کی حیثیت رکھتی ہے۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا حُسن و جمال

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ہاں حضرت جبرئیل حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا میں اگر آج بھی یوسف علیہ السلام کو دیکھنا ہو تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیا جائے اس لیے کہ وُہ یُوسف علیہ السلام کی شکل و صورت کے مشابہ ہیں۔

۲۔ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرا شوہر نامدار تیرے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور تیرے والد (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہم شکل ہیں۔

ف : بی بی رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی حُسن و جمال میں مشہور زمانہ تھیں اسی لیے عورتیں شادیوں میں سہرا پڑھتیں تو کہتیں : ؎

احسن شئیٍ یریٰ انسان

رقیۃ و بعلھا عثمان

ترجمہ : اگر حسین ترین انسان دیکھنے ہوں تو حضرت رقیہ اور ان کے شوہر حضرت عثمان کو دیکھ لو۔

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ماجدہ

بی بی روحان (بضم الراء و فتحہا) یعنی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ماجدہ کے بارے میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جو شخص دنیا میں حور عین کو دیکھنا چاہے تو حضرت عائشہ کی والدہ ماجدہ کو دیکھ لے۔

ف : حدیث شریف میں جیسے بی بی روحان رضی اللہ عنہا کے حسن و جمال کا علم ہُوا وہاں اُن کا بہشتی ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

تفسیرِ صوفیانہ

وَقَالَ نِسْوَةٌ صفاتِ بشریہ نفسانیہ یعنی صفات بہیمیہ و سبعیہ و شیطانیہ نے کہا فِی الْمَدِیْنَةِ جسم انسانی میں امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ دُنیا تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ مطالبہ کرتی ہے اپنے غلام سے۔ یعنی قلب کی تکمیل ہو کر صاف و شفاف اور بشریت کے گرد و غبار سے پاک ہو کر نظرِ الٰہی کے لائق ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے جلوۂ خاص سے نوازتا ہے تو وہ جلال و جمال سے منور ہو جاتا ہے۔ پھر ہر شے اسی کی محتاج یہاں تک کہ خود دُنیا اس کے آگے سجدہ ریز ہوتی ہے قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا دنیا قلب کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے اس لیے کہ جب دنیا قلب پر جمالِ الٰہی کے

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِىْ لُمْتُنَّنِىْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ
يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ○ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَىَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِىْٓ
اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّىْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ فَاسْتَجَابَ لَهٗ
رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ
لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ○

ترجمہ : زلیخا نے کہا یہ وہی ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی رہیں بیشک میں نے اس کا جی لبھانا چاہا تو اس نے اپنے آپ کو بچا لیا اور جو میں اسے کہتی ہوں اگر نہ کرے گا تو قید کیا جائے گا اور ہو گا ذلت خواروں سے ۔ یوسف علیہ السلام نے عرض کی اے رب تعالیٰ مجھے قید پسند ہے اس کام سے کہ جس کی طرف مجھے یہ بلاتی ہیں اور اگر تو مجھ سے ان کا فریب نہ پھیرے گا تو میں ان کی طرف مائل ہوں گا اور نادانوں سے ہو جاؤں گا ۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی دعا قبول کر لی تو ان سے ان عورتوں کا فریب پھیر دیا بیشک وہی ہے سمیع وعلیم ہے ۔ نشانیوں کے دیکھنے کے بعد انہوں نے طے کیا کہ یوسف علیہ السلام کو ایک مدت تک قید میں ڈالا جائے ۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) آثار دیکھتی ہے تو اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ لیکن صفات بشریہ نفسانیہ کو قلب کے جمال سے آگاہی نہیں ہوتی ۔ اسی لیے وہ دنیا پر قلب کی محبت پر طعن وتشنیع کرتے ہوئے کہتی ہیں اِنَّا لَنَرٰىهَا فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ کہ بیشک دُنیا کو کھلم کھلا قلب کے عشق میں مبتلا پاتی ہے فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ جب زلیخا یعنی دُنیا صفات بشریہ نفسانیہ کی ملامت سنتی ہے تو اَرْسَلَتْ صفات بشریہ نفسانیہ کو عجیب وغریب اور بہترین قسم کے کھانوں کی دعوت بھیجتی ہے وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ذکر الٰہی کی چھری پکڑا دیتی ہے وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ اور زلیخا (دنیا) یوسف (قلب) سے کہتی ہے ۔ اے قلب صفاتِ بشریہ پر واردات الٰہیہ ظاہر کر دے فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ جب صفاتِ بشریہ قلب کو جلال وجمالِ الٰہیہ سے آراستہ دیکھتی ہیں تو اَكْبَرْنَهٗ تو قلب کے جمال وجلال کی بڑائی بیان کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ یہ بشری جمال نہیں وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ پھر صفاتِ بشریہ ذکر الٰہی کی چھری سے ماسوی اللہ سے اپنے آپ کو منقطع کر دیتی ہے وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اور کہتی ہیں کہ سبحان اللہ یہ جمال بشری نہیں اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ○ نہیں ہے یہ جمال مگر ذاتِ حق کا یہ معنی اس قرأت کے مطابق ہے جس میں لام کو مکسور پڑھا گیا ہے ۔

تفسیر عالمانہ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ كُنَّ نسوۃ کی وجہ سے ہے اور ذا کا اشارہ یوسف علیہ السلام کی طرف ہے ۔

سوال : حضرت یوسف علیہ السلام تو سامنے موجود تھے ان کے لیے ھذا موزوں تھا اور ذالکن بعید کے لیے آتا ہے اور وہ یہاں کیسے
جواب : تاکہ یوسف علیہ السلام کے حسن کی رفعت منزلت پر دلالت ہو اسم اشارہ مبتدا اور اسم موصول یعنی الذی لمتننی فیہ
اس کی خبر ہے یعنی یہ وہی ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی ہو. اب تم خود بتاؤ کہ یہ کون ہے اور تم اس کے متعلق اب کیا تصور
کرتی ہو۔

کاشفی نے لکھا کہ زلیخا انہیں یہ بتانا چاہتی ہے کہ دیکھ لو اور بتاؤ کہ میں یوسف علیہ السلام کے عشق میں مبتلا ہو کر حق بجانب ہوں
یا نہ۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ؎

ملامت کن مرا چندانکہ خواہی
کہ نتوان شستن از زنگی سیاہی

ترجمہ : اے ملامت گر! تو مجھ سے کیا چاہتا ہے یہ عشق زائل نہ ہو گا جیسے زنگی سے سیاہی زائل نہیں
ہو سکتی۔

حکایت شیخ سعدی قدس سرہٗ اپنی گلستان میں ایک حکایت لکھتے ہیں کہ عرب کے کسی بادشاہ نے سُنا کہ مجنوں لیلیٰ کے
عشق میں ایسا وارفتہ ہو گیا ہے کہ لیلیٰ کے عشق میں شب و روز بیابان نوردی کرتا ہے بادشاہ نے حکم دیا کہ مجنوں کو
لاؤ۔ جب مجنوں آیا تو بادشاہ نے ملامت کی کہ تو نے انسانوں میں کون سی خرابی دیکھی ہے کہ حیوانوں کی طرح صحرا نوردی کرتا ہے اور
خود تو بہترین انسان تھا اب تمام عیش و عشرت ترک کر کے جانوروں کی طرح آوارہ پھر رہا ہے۔ مجنوں نے رو کر کہا : ؎

ورب صدیق لامنی فی ودادھا
الم یرھا یوما فیوضح لی عذری

ترجمہ : بہت دوست لیلیٰ کی محبت میں مجھے ملامت کرتے ہیں کاش وہ کبھی اسے دیکھ لیتے تو میرا عُذر ان کے
سامنے کھل کر آجاتا۔

؎

کاش کانانکہ عیب من جستند
رویت آں دستاں بدیدندے
تا بجائے ترنج در نظرت
بیخبر دستہا بریدندے

ترجمہ : کاش عیب جوئی کرنے والے میرے محبوب کو ایک دفعہ دیکھ لیتے تو اسے دیکھ کر ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو
زلیخا کی ملامت گر عورتوں کا ہوا کہ انہوں نے سیب کے بجائے ہاتھ کاٹ ڈالے۔

اس کے بعد مجھے معذور سمجھ کر میری حقیقی محبت کی گواہی دیتے پھرتے۔ پھر میں انھیں زلیخا کا مقولہ سُناتا: فذٰلکن الذی لمتننی فیہ ۔ قصیدہ بردہ شریف میں ہے: ؎

یا لائمی فی الہوی العذری معذرۃ

منی الیک ولو انصفت لم تلم

ترجمہ: اے عشق عذری میں ملامت کرنے والے مجھے معذور رکھ، اگر تو انصاف کرتا تو مجھے ملامت نہ کرتا۔

شرح بیت مذکور

حل لغات: الھوی العذری سے عشق صادق مراد ہے کیونکہ ان کا عشق صادق ہوتا تھا، بوالہوسانہ نہیں تھا جیسا کہ آئندہ چند واقعات میں آپ دیکھیں گے کہ وہ کیسے راست باز اور سچے عاشق ہوتے تھے۔ العذری بنو عذرہ کی طرف منسوب ہے۔ عذرہ (بضم العین وسکون الذال المعجمہ) یمن کا قبیلہ ہے جس کے لوگ عشق میں مشہور ہیں اور عشق کے مرض میں اکثر جوانی میں مرجاتے ہیں۔

حکایت

اس قبیلے کے ایک شخص سے پُوچھا گیا کہ تم عشق کی مہلک وادی میں قدم کیوں رکھتے اور پھر قدم رکھتے ہی جلد تر ہلاکت کے گھاٹ کیوں اترتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ہمارے قلوب رقیق اور ہماری عورتیں غضب ہوتی ہیں۔

حکایت

اصمعی نے کہا کہ میں اثنائے سفر میں قبیلہ عذرہ کے ایک جھونپڑے میں چند روز مقیم ہوا۔ اس گھر کی پری پیکر حسن وجمال میں یکتا ایک نوخیز لڑکی رہتی تھی۔ ایک دن سیر وسیاحت کی غرض سے اس جھونپڑے سے میں باہر آگیا اس جھونپڑے سے کچھ دُور ایک نوجوان کو دیکھا کہ ضعف ونقاہت میں ہلال سے کمزور تھا اور مندرجہ ذیل اشعار پڑھتا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ؎

فلا عنك لی صبر و لا نیك حیلہ

و لا منك لی بد ولا منك مھرب

فلوكان لی قلبان عشت بواحد

وافردت قلبا فی ھواك یعذب

ولی الف باب قد عرفت طریقہ

ولكن بلا قلب الی این اذھب

ترجمہ: تیرے سوا مجھے کوئی صبر نہیں اور تجھے ملاقات کا موقعہ نہیں نہ تیرے سوا گزار سکتا ہُوں اور نہ تو کہیں بھاگ سکتی ہے کاش میرے دو دل ہوتے ایک سے زندگی بسر کرتا اور دوسرے سے تیری محبت کے عذاب اٹھاتا میرے ہاں ہزاروں دروازے ہیں کہ جہاں چاہُوں جا سکتا ہُوں لیکن قلب تیرے پاس ہے اس کے سوا بتائیے کہاں جاؤں۔

اصمعی کہتے ہیں میں نے اس قبیلے کے کسی فرد سے پُوچھا کہ یہ نوجوان کون اور کس کی محبت میں مبتلا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ شخص اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے جس گھر کے آپ مہمان ہیں اور وہ لڑکی اس نوجوان کی چچازادہ ہے باوجود ایںہمہ انہوں نے دس سال ایک دُوسرے کو نہیں دیکھا۔

اصمعی فرماتے ہیں کہ میں نے واپس جا کر لڑکی کو نوجوان کا حال سُنایا اور کہا مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگوں کا طریقہ ہے کہ مہمان کی بات کو نہیں ٹھکراتے اور بدل وجان اس کی عزت و احترام کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اب میرا حکم مانو کہ تو اس نوجوان کو اپنے دیدار سے سرشار فرما۔ لڑکی نے کہا کہ مجھے تو کوئی انکار نہیں لیکن وہ اس کی تاب نہ لاسکے گا۔ بہتر ہے کہ آپ اس معاملہ میں خاموشی اختیار فرمایئے۔ میں نے سمجھا کہ لڑکی خواہ مخواہ گریزاں ہے میں نے اصرار کیا اور کہا کہ تجھے دو قدم اٹھانے میں کیا حرج ہے؛ اس سے میرا جی خوش ہو جائے گا کہ واقعی آپ لوگوں نے مہمان کی قدر کی۔ اس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ عاشق کا کام بن جائے گا۔ لڑکی نے کہا کہ آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں لیکن مجھے اپنے عزاد کے حال پر رحم آتا ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی مرجائے گا۔ میں نے لڑکی کو مجبور کیا۔ اس نے کہا تم چلو، میں آتی۔

اصمعی فرماتے ہیں میں نے عاشقِ زار کو مژدۂ بہار سنایا کہ دلشاد باد ابھی تیری محبوبہ تجھے اپنا جلوہ دکھانے کو آرہی ہے ابھی ہم یہی گفتگو کر رہے تھے کہ لڑکی نے دُور سے اپنا دامن پھیلایا تاکہ عاشق کے ہاں تشریف لائے۔ اس کے دامن پھیلانے سے گرد و غبار اٹھی۔ جب نوجوان نے محبوبہ کی صرف گرد و غبار دیکھی تو آہ کھینچی اور غش کھا کر زمین پر گرا اور بیہوش ہو گیا۔ اس کی محبوبہ لوٹ گئی اور میں بھی اس کے گھر چلا گیا۔ لڑکی نے مجھے زجر و توبیخ کی اور یہ شعر پڑھا: ؎

آنچہ امروز یافت او ز تو یافت

وانچہ دید او رہگذار تو دید

ترجمہ: آج اس نے جو کچھ پایا تمہارے طفیل پایا اور اسے صرف رہگذر کی گرد دیکھنی نصیب ہوئی اور بس۔

پھر لڑکی نے مجھ سے فرمایا کہ جو بیچارہ ہمارے دامن کی گرد و غبار کی تاب نہیں لا سکتا وہ ہمارے دیدار کی تاب کس طرح لا سکتا ہے۔

ربط: جب زلیخا نے زنانِ مصر پر حجت قائم کر دی اور اپنا معقول عذر پیش کر دیا اور الٹا انہیں بھی اپنے محبوب کے عشق میں مبتلا کر دیا تو اب اس کے لیے روا ہو گیا کہ ان سے اپنا راز ظاہر کرے اور ظاہر ہے کہ عشاق ایک دُوسرے سے اپنا راز ظاہر کرتے رہتے ہیں کیونکہ اب نہ انہیں کسی سے عار و شرم اور نہ کسی ملامت گر کی ملامت کا خطرہ اور نہ کسی سے خوف کہ ہمیں اس عشق سے طعن و تشنیع ہوگی۔ اسی لیے کہا:

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ اے زنانِ مصر جیسا کہ تم نے سُنا اور پھر تم بھی کہتی رہیں کہ میں یوسف علیہ السلام کو مجبور کیا کہ وہ میرا کام کرے فَاسْتَعْصَمَ ط لیکن اس نے آپ کو بچا لیا اور میرے کام نہ آسکا۔ یعنی اس نے اپنے رب تعالیٰ سے عصمت چاہی اور برائی سے بچنے کی ہر امکانی کوشش کی اور برائی سے بچ گیا۔ ہم نے یہ مطلب اس لیے بیان کیا ہے کہ

اہل عرب استعصام کا اطلاق ایسے مقام پر کرتے ہیں جہاں کسی کو کسی فعل سے پورا تحفظ حاصل ہو۔ گویا وُہ عین عصمت بن جاتا ہے اور ایسا شخص عصمت کی انتہائی حد کو پہنچے۔

ف : اس جملہ میں واضح ثبوت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے ایسا کوئی فعل سرزد نہ ہُوا جس سے آپ کی عصمت پر دھبہ آتا ہو۔ اس جملہ سے وھم بہا الخ کی پُوری تائید ہوتی ہے کہ آپ نے زلیخا کے ساتھ برائی کا معمولی طور پر ارادہ وخیال ظاہر نہ فرمایا بلکہ خود ارادہ کرنے والی تصدیق کر رہی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جو اس وقت طریقہ اختیار فرمایا تھا وہ ارادہ وخیال کے سراسر منافی تھا۔

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ یہاں پر حرف جارہ محذوف کر کے فعل کو مفعول کی طرف براہِ راست فاعل بنایا گیا ہے یہ عبارت دراصل ما امر بہ تھی ہٗ ضمیر کا مرجع اسم موصول یعنی لفظ ما ہے۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ اگر میرے حکم کے موافق عمل نہیں کرے گا تو لَيُسْجَنَنَّ بانون ثقیلہ یہ صیغہ مجہول تو قید کیا جائے گا۔

سوال : صیغہ مجہول سے کیوں ؟

جواب : بادشاہوں اور بڑے آدمیوں کو جب کسی پر غصہ آتا ہے تو اس طرح کا کلام بولتے ہیں۔

وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ○ با نون خفیہ۔ اور اسے الف کے ساتھ لکھنا مصحف عثمانی کے رسم الخط کی وجہ سے ہے۔ ایسے ہی دُوسرے مقام پر لنسفعًا آیا ہے۔

قاعدہ : فن صرف کا قاعدہ ہے کہ بحالت وقف نون خفیفہ الف سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نون خفیفہ کو تنوین سے مشابہت ہے اور تنوین (منصوب) بحالتِ وقف الف سے تبدیل ہوتا ہے۔

من الصّٰغرین بمعنی الاذلاء فی السجن۔ یہ صغر (بالکسر) سے ہے اور صغیر از باب شرف۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ ذلیل وخوار لوگوں سے۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

اگر تہد بکام من دگر پائے
ازیں پس گنج زنداں سازش جائے
نگردد مرغ وحشی جز بداں رام
کہ گیرد در قفس یک چند آرام

حضرت یوسف علیہ السلام کو عورتوں کی وعیدیں اور جھڑکیاں سنائی گئیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ یہ واقعہ اب سب پر عیاں ہو چکا ہے اور وہ عورتیں اس کوشش میں ہیں کہ یوسف علیہ السلام ان کے تقاضوں کو پُورا فرمائیں۔

بدو گفتند ای عمر گرامی
دریدہ پیرہن در نیک نامی

دریں بستاں کہ گل با خار جفت است
گل بے خار چو تو کم شگفت است

زلیخا خاک شد در راہت ای پاک
ہمی کش گہی گہی دامن برین خاک

ترجمہ: انہیں کہا اے وُہ محبوب جس کا نیک نامی میں پیراہن پھٹا اس باغ دنیا میں کہ جہاں گل اور خار جمع ہُوئے ہیں لیکن تو وہ گل ہے جہاں خار نہیں۔ زلیخا تیرے راہ میں خاک اور عاجز ہوئی گا ہے گاہے اس کے دامن پر کچھ چھڑک لیا کرو۔ ۔

۱۔ حذر کن زانکہ چوں مضطر شود دوست
بخواری دوست را از سر کشد پوست

۲۔ چو از سر بگزرد سیل خطر مند
نہد ما در بزیر پاے فرزند

۳۔ دہد ہر لحظہ تہدیدت بزنداں
کہ ہست آرامگاہ ناپسنداں

۴۔ کجا شاید چنیں محنت سرائی
کہ باشد جاے چوں تو دلربائی

۵۔ خدا را بر وجود خود بخشائی
بروی او دری از مہر بکشائی

۶۔ وگر باشد ترا از وی ملالی
کہ چندانش نمی بینی جمالی

۷۔ چو زو ایمن شوی دمساز ما باش
نہانی ہمدم و ہمراز ما باش

۸۔ کہ ما ہر یک بخوبی بی نظیریم
سپہر حسن را ماہ منیریم

۹۔ چو بخشایم بہاے شکر خا
ز خجلت لب فرو بندد زلیخا

۱۰۔ چنیں شیریں و شکر خا کہ مائیم
زلیخا را چہ قدر آنجا کہ مائیم

۱۱۔ چوں یوسف گوش کرد افسوں کز ایشاں
پی کام زلیخا یادریشاں

۱۲۔ گزشتند از رہ دین و خرد نیز
نہ تنہا بہر دی از بہر خود نیز

ترجمہ : ۱۔ خوف کیجئے کہ جب کوئی عاشق محبوب سے پریشان ہوتا ہے تو اپنی خواری سے بچنے کے لیے اس کا سر قلم کرنے سے نہیں چُوکتا۔

۲۔ جب سیلاب سر سے اُوپر کو ہوتا ہے تو ماں بھی اپنے بچے کو اپنے پاؤں تلے رکھ دیتی ہے۔

۳۔ تجھے ایسے قید خانے میں (زلیخا) ڈال دے گی جہاں نہایت ہی ذلیل لوگوں کا بسیرا ہے۔

۴۔ ایسی دُکھ بھری جگہ میں آپ جیسے محبوب کو رہنا نہایت نامناسب ہے۔

۵۔ اے یُوسف فی سبیل اللہ اپنے حال پر رحم کرو اور اسے بھی اپنی مہربانی سے محروم نہ رکھ۔

۶۔ اگر کسی وجہ سے تجھے اس سے نفرت ہے کہ تم اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔

۷۔ تو ہم حاضر ہیں ہمارے ساتھ موافقت کر کھلم کھلا نہ سہی پوشیدہ طور ہی ہمارے ساتھ وابستگی اختیار فرمالے۔

۸۔ ہم بھی ہر ایک حُسن و جمال میں بے نظیر ہے بلکہ حسن کے سُورج اور مہر منیر ہیں۔

۹۔ جب ہم لب شکر خا کھولتی ہیں تو مارے شرم کے زلیخا کے لب بند ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ جیسا کہ شیریں شکر خا ہم ہیں زلیخا کی کیا مجال جہاں ہم ہوں۔

۱۱۔ جب یُوسف علیہ السلام نے ان کی سحر انگیز باتیں سنیں کہ وہ زلیخا کی مدد میں کیا کہہ رہی ہیں۔

۱۲۔ وہ دین اور عقل کے راہ سے نکل گئیں نہ صرف زلیخا کے لیے بلکہ اپنے لیے بھی برائی پر آمادہ ہوگئیں۔

قَالَ رب تعالیٰ سے یُوسف علیہ السلام نے دُعا مانگی رَبِّ السِّجْنُ اے میرے رب تعالیٰ جس قید خانہ میں ڈالنے کی زنانِ مصر مجھے دھمکیاں دیتی ہیں اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ میرے لیے وہ محبوب تر ہے اس غلط کاری سے کہ

جس کی طرف وُہ مجھے بلاتی ہیں اس لیے کہ ان کی دعوت تیری نافرمانی کا موجب ہے اور قید خانہ ہیں جا کر تیری نافرمانی سے بچ جاؤں گا۔ اسی میں میری کامیابی ہے۔ ؎

عجب درمانده ام در کار ایشاں
مرا زنداں به دیدار ایشاں
بر از صد سال در زنداں نشینم
که یکدم طلعت ایناں به
بنام محرم نظر دلرا کند کور
ز دولت خانه قرب افگند دور

ف : حضرت یُوسف علیہ السلام کی اس دعا سے ملائکہ آسمانی روئے اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے اور عرض کی اللہ تعالٰی آپ کو سلام بھیج کر فرماتا ہے، کہ صبر کیجیے اس لیے کہ صبر کشادگی کی کنجی ہے اور اس میں انجام بخیر ہوتا ہے۔

نکتہ : دعوت کی نسبت جمیع زنان مصر کی طرف اس لیے کہ سب عورتیں یوسف علیہ السلام کو زلیخا کی موافقت کے لیے پند و نصیحت کرتیں اور جیل کا ڈر سناتیں یا اس لیے کہ سب عورتیں برائی کی خواہشمند تھیں۔

ف : بعض حکماء نے فرمایا کہ اگر یُوسف علیہ السلام رب السجن کے بجائے رب العافیۃ کہتے تو اللہ تعالٰی انھیں عافیت عطا فرماتا لیکن چونکہ یوسف علیہ السلام نے اپنے نکلنے کی ظاہری تدبیر اسی میں سمجھی اسی لیے قید کی دُعا مانگی اور کبھی انسان کو منہ مانگی مصیبت ملتی ہے کیونکہ: ان البلاء موکل بالمنطق۔ بولنے سے ہی بلا گھیر لیتی ہے۔

حدیث شریف حضرت معاذ سے مروی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو دعا مانگتے سنا وہ کہہ رہا تھا: اے اللہ! مجھے صبر کی توفیق دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اپنے لیے تکلیف مانگ رہا ہے تجھے چاہیے کہ اللہ تعالٰی سے عافیت کا سوال کر۔

حکایت شیخ سعدی قدس سرہٗ اپنی گلستاں میں لکھتے ہیں کہ مَیں نے ایک نیک بخت کو دریا کے کنارے دیکھا کہ اس پر شیر کے حملے سے سخت زخم ہے جو کسی دوا سے درست نہیں ہوتے تھے اور وہ مدت دراز تک اس میں مبتلا رہا لیکن ہر وقت شکر بجالاتا اس سے پُوچھا گیا کہ آپ شکر کیوں کرتے ہیں۔ اس نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی کا شکر کرتا ہُوں کہ مصیبت میں گرفتار ہوں کسی گناہ میں تو مبتلا نہیں ہُوں۔ دیکھیے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا: رب السجن احب الیّ ؎

گرمی آزار بکشتن دہد آں یار عزیز
تا نگوئی که دراں دم غم جانم باشد

گویم از بندۂ مسکین چہ گنہ صادر شد
کو دل آزردہ شد از من غم آنم باشد

ترجمہ: اگر میرا محبوب میرے مارنے کا حکم فرمائے تو مجھے اس وقت اپنی جان کا خطرہ نہ ہوگا بلکہ میں عرض کروں گا کہ مجھ سے کون سی غلطی ہوئی کہ میرے محبوب کے دل پر میرے متعلق بوجھ ہے مجھے اپنے محبوب کے اسی بوجھ کا غم ہوگا۔

وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اور اگر تو مجھ سے انکا مکر و فریب دُور نہ فرمائے گا اور اپنی پناہ میں نہ لے گا اَصْبُ اِلَیْهِنَّ تو میں ان کے حسبِ ارادہ ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔ یعنی میرا میلان اختیاری اور قصداً ہوگا۔ الصبوہ بمعنے المیل الی الھویٰ۔ اسی سے الصبا مشتق ہے اس لیے کہ نفوس اس کو چاہتے ہیں کیونکہ اسی کی ہوا نہایت خوش اور روح کو بھانے والی ہوتی ہے۔

ف: حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی گھبراہٹ کا اظہار اللہ تعالیٰ کے حضور میں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے اس طریقہ سے معروف ہے کہ وہ ہمیشہ حصولِ خیرات اور نجات از شرور کی استدعا صرف حق تعالیٰ سے کرتے ہیں کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ خیر و شر اسی کے قبضہ میں ہے اور عورتوں کے مکر کو پھیرنے کی استدعا میں مبالغہ کرنا بھی اسی قبیل سے ہے کہ ان کا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی مشکلکشا[1] نہیں۔ یہ ایسے ہے جیسے فریادی کہتا ہے: ادرکنی والا ھلکت۔ اسی سے حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد صرف اتنا تھا کہ انھیں عصمت و عفت نصیب ہو کیونکہ نفس کا تو فطری تقاضا تھا کہ زنانِ مصر کی خواہشات کے مطابق عمل کر لیا جائے۔

وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ اور میں ہو جاؤں گا منجملہ ان لوگوں کے جو علم کے ہوتے اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔ اور قاعدہ ہے کہ جو عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے تو ایسا عالم اور جاہل برابر ہیں۔ یا الجاھلین بمعنی السفہاء ہے۔ یعنی میں زنانِ مصر کے تقاضوں کو پورا کروں تو بیوقوفوں میں شمار ہوں گا اس لیے کہ دانا ایسے قبیح امور کا ارتکاب نہیں کرتا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کا ارتکاب جہالت و سفاہت ہے اور جو زنا کرتا ہے وہ یقین رکھے کہ اس کا نام سفہاء اور کاذبین میں درج ہو گیا۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور ان کی دعا کا مضمون والا تصرف عنی الخ میں بیان ہو چکا ہے اس لیے کہ یوسف علیہ السلام کی استدعا یہی تھی کہ عورتوں کے مکر و فریب سے بچ جائیں

---

[1] اور ہم بھی مشکلکشا صرف اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام خود وسیلہ ہیں اسی لیے وہ کسے وسیلہ بنائیں اور ہمارا وسیلہ انبیاء و اولیاء ہیں۔ فافہم ولا تکن من الوہابیین۔

اگرچہ جیل میں جانا پڑے۔

قواعد ۱۔ باب استجابۃ دُعا کی طرف متعدی بنفسہٖ بھی ہوتا ہے جیسے استجاب اللہ تعالیٰ دُعاءَہ۔
۲۔داعی کی طرف متعدی باللام ہوتا ہے۔لیکن جب داعی کی طرف متعدی ہو تو اس وقت لفظ دعا کو محذوف کیا جاتا ہے۔لیکن اس وقت دعا کا محذوف ہونا قاعدہ کلیہ نہیں اکثریہ ہیں یعنی استجاب لہٗ دعاءہٗ نہیں کہا جائیگا۔
(کذا فی بحر العلوم)

فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ط اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السّلام کی دُعا مستجاب فرمایا کہ زنانِ مصر کا مکرو فریب یوسف علیہ السلام سے پھیرا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو عفت وعصمت پر ثابت قدم رکھا یہاں تک کہ قید کی مشقت و محنت کو سر پر اُٹھا لیا نہایت صبر وسکون سے جیل خانہ میں عرصۂ دراز بسر فرمایا حالانکہ معاذ اللہ اگر معصیت کا ارتکاب ہو جاتا تو عیش وعشرت نعمت ولذت سے وقت پاس ہوتا لیکن آپ نے لذت ونعمت پر مشقت ومحنت کو پسند فرمایا اور معصیت سے بچ کر عصمت کا دامن پکڑا۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ بیشک اللہ تعالیٰ عاجزی کرنے والوں کی سننے والا ہے اور ان کے احوال اور مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔

حکایت حضرت شیخ ابوبکر دقاق قدس سرہٗ نے فرمایا میں مکہ معظمہ میں بیس سال تک رہا۔اسی اثناء میں مجھے نفس نے دُودھ کی خواہش پر مجبور کیا یہاں تک میں نفس سے مغلوب ہو کر عُسفان کی طرف روانہ ہوا۔

ف: عُسفان بروزن عُثمان مکہ معظمہ سے دو مرحلے دُور تھا۔عُسفان کے ایک قبیلہ کے ہاں مہمان ٹھہرا وہاں میری نگاہ ایک نوجوان لڑکی سے لڑ گئی لیکن اس کے عشق کو دل میں چُھپایا۔مگر اس نیک بخت لڑکی نے فرمایا اگر تم اپنی محبت میں سچے ہو تو دُودھ کا خیال دل سے ہٹا دو۔میں نے اس کی طعن وتشنیع سُن کر مکہ معظمہ کی راہ لی۔اور ایک دن کعبہ مکرمہ کا طواف کر رہا تھا اسی اثناء میں مجھے نیند آ گئی۔میں نے خواب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زیارت کی اور عرض کی یا حضرت! اللہ تعالیٰ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے کہ آپ زلیخا کے حملوں سے بچ گئے۔یوسف علیہ السلام نے مجھے فرمایا کہ تمہیں مبارک ہو اور تیری آنکھیں ٹھنڈی ہوں کہ تو عُسفان کی عورت سے بچ گیا۔اس کے بعد یوسف علیہ السلام نے پڑھا ولمن خاف مقام ربہ جنتٰن۔اس کے بعد یہ شعر پڑھے ؎

وانت اذا ارسلت طرفك رائدًا
لقلبك يومًا اتبعتك المناظر
رأيت الذى لا كلّهٗ انت قادرٌ
عليه ولا عن بعضه انت صابرٌ

ترجمہ: جب تم اپنی آنکھ کو آوارہ چھوڑ دو گے تو کسی ایک دن تیرا دل کسی منظر میں پھنس جائے گا تو اسے

دیکھا اگرچہ تو اس کے کل پر قادر تھا لیکن تُو نے صبر سے کام لیا۔

ف: مشائخ فرماتے ہیں کہ نفس کی شرارتوں سے نفس کے ذریعہ بچنا نہایت مشکل ہے۔ ہاں نفس کی شرارتوں سے اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے نہ صرف ممکن بلکہ اس کی توفیق و تائید سے کامیابی یقینی ہے۔ حضرت الشیخ ابو ترابی نخشبی قدس سرہٗ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے اللہ تعالیٰ کو تلاش کرتا ہے لیکن خود ذات حق سے ہٹ کر دوسرے مشاغل میں مشغول ہے تو وہ غضب الٰہی میں ایسا پھنسے گا کہ اسے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

تفسیر صُوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ قلب جب نفس کی خواہشات اور دُنیوی مشاغل کے تابع نہیں ہوتا اور نہ ہی دواعی بشر کے پھندوں میں پھنستا ہے تو وہ شرع کی قید میں آجاتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی عصمت اپنے دامنِ کرم میں لے لیتی ہے۔ اگر کسی کا قلب کسی نبی علیہ السلام کے قلب کے کمالات کے مطابق بن جائے لیکن طبع نفسانی کے مطابق عمل کرے تو اسے اللہ تعالیٰ نہ دنیا کے مکر و فریب سے بچائے گا نہ دواعی بشریت کی آفات سے اسے محفوظ کریگا بلکہ ایسا آدمی نفس کا کھلونا بنا رہے گا۔ اس لیے کہ وساوس شیطانی کا کام ہے کہ وہ انسان کو شیطان کے تابع بنائیں۔ ایسے لوگوں کے نفوس ظلوم وجہول ہوتے ہیں۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

حضرت حافظ قدس سرہٗ نے فرمایا:

دام سخت است مگر لطف خدا یار شود

ورنہ آدم نبرد صرفہ ز شیطان رجیم

ترجمہ: مکر و فریب کا پھندا سخت ہے بس اللہ تعالیٰ کے لطف کی مدد چاہیے ورنہ شیطان رجیم کی شرارت سے آدم علیہ السلام بھی اپنا سامان نہ بچا سکے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے اعداء ظاہری و باطنی پر غلبہ کی توفیق کا سوال کرتے ہیں کیونکہ اس کے سوا ہمارا اور کوئی مددگار نہیں۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ پھر عزیز مصر اور اس کے وہ ساتھی جو یوسف علیہ السلام کے متعلق تفتیش حال میں لگے ہوئے تھے ان کو ظاہر ہوگیا۔

ف: لفظ ثم سے پتا چلتا ہے کہ ان کے یوسف علیہ السلام کے بارے میں آراء مختلف تھے۔

مِّنۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ بعد اس کے کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام کی براءت اور پاکدامنی کے شواہد پر دلائل قوی دیکھے۔ مثلاً شیر خوار بچے کی گواہی اور قمیص کا پھٹنا وغیرہ وغیرہ۔ لَيَسْجُنُنَّهٗ در انحالیکہ وہ کہتے تھے کہ یوسف علیہ السلام کو قید کیا جائے۔ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ مقررہ وقت تک حتّٰی جارہ بمعنی الیٰ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اس وقت تک قید کیا جائے جب تک کہ لوگوں کے ذہنوں سے اس واقعہ کا تصور ختم ہو جائے۔

ف : یہ عزیز اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا ورنہ زلیخا تو یہ چاہتی تھی کہ وہ قید میں اتنی مدت تک رہیں کہ وہ قید کی تکالیف برداشت نہ کرنے کے باعث زلیخا کے تقاضوں کو پورا کرنے پر مجبور ہو جائیں اور عوام کو یقین ہو کہ واقعی یہ (یوسف) مجرم تھا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام پانچ یا سات سال قید میں رہے۔ آنے والے مضمون "بضع سنین" میں ہم وضاحت کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ف : ابن الشیخ نے فرمایا کہ آیت میں قید کی تعیین کا ذکر صراحۃً نہیں زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہت بڑی مدت تک قید خانے میں رہے جیسا کہ آیت وادکر بعد امۃ الخ سے معلوم ہوا۔

ف : حین ظرف زمان وقت غیر معین کے لیے ہے یعنی قصیر اور طویل ہر دو کے لیے بلا تخصیص استعمال ہوتا ہے۔ یہ اہل لغت کی تحقیق ہے۔ لیکن فقہا نے اسے معین فرمایا ہے وہ اس طرح کہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ لا احکم فلانا احینا او زمانا۔ اس سے کوئی مدت اس کی نیت میں نہیں تو اس کا حکم نصف سال (چھ ماہ) تک ہوگا۔ اگر نیت خاص مدت کی ہے تو نیت کے مطابق عمل ہو۔

ف : آیت میں کچھ مضمون محذوف ہے۔ چنانچہ یہ آیت در اصل یوں چاہیے تھی کہ ولما تغیر رائهم فی حقه در ادا جسه ۔ چونکہ و دخل معه السجن الخ اس محذوف مضمون پر دلالت کرتا ہے اسی لیے اس کا محذوف ہونا مقصد کے منافی نہیں۔

ف : زلیخا نے دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کی برأت اور میری شرارت کا تمام صغار و کبار کو یقین ہو گیا ہے تو دوسری تجویز بنائی اور عزیز مصر کو کہا کہ اس عبرانی غلام کی وجہ سے ہمیں بہت سخت رسوائی ہوئی ہے اس لیے اگر اسے قید نہ کیا گیا تو تا زیست یہ سیاہ داغ دھل نہ سکے گا۔ ؎

دریں قول اند۔ مرد و زن موافق
کہ من برے بجانم گشتہ عاشق

ترجمہ : اسی قول پر تمام عورت و مرد متفق ہیں کہ میں یوسف علیہ السلام پر بدل و جان
عاشق ہو گئی ہوں۔

چنانچہ اس جال بچھانے کی تمہید یہی باندھی کہ جونہی یوسف علیہ السلام نے اپنی برأت میں اعلان کیا ہے کہ هی راودتنی عن نفسی ۔ اس کا خواص و عوام پر گہرا اثر ہوا ہے اب میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے مقابلے میں اپنی برأت کا کوئی طریقہ سمجھ آتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیجنے سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ افواہ اور عام چرچا بند ہو جائے گا اور بات ذہنوں سے محو ہو جائے گی۔ چونکہ عزیز مصر زلیخا کا مطیع اور فرماں بردار تھا اس نے اپنے ارادوں کی باگ ڈور زلیخا کے ہاتھ میں دے رکھی تھی اس لیے جیسے اس نے کہا ویسے مان لیا۔ اور

یوسف علیہ السلام کے بارے میں جتنی واضح دلائل و براہین دیکھیں تمام بھول گیا اور زلیخا کے کہنے کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کو زنداں کی خواری کا نشان بنایا اور زلیخا کو اپنے دعویٰ (کہ یوسفؑ کو قید میں جانا پڑے گا) میں سچا کر دکھایا۔

ف : کاشفی نے لکھا کہ زنانِ مصر نے زلیخا کو کہا کہ دو سہ روز حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل خانے میں بھیج دیجئے۔ جب جیل کی سختی دیکھیں گے اور ناز و نعم کی گھڑیاں یاد آئیں گی تو ممکن ہے وہ تمہارے قابو میں آجائے۔ چنانچہ زلیخا نے زنانِ مصر کا یہ مشورہ قبول کر کے بطور تو بہ چند روز کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیجا۔

ے

چو کورہ ساز زنداں را برو گرم
بود زاں کورہ گردد آہنش نرم
چو گردد گرم ز آتش طبع فولاد
ازو چیزے تواند ساخت استاد
نہ گرمی زم اگر نتواندش کرد
چہ حاصل زانکہ کو بد آہن سرد
زلیخا را چو زاں جادو زباناں
شد از زنداں امید وصل جاناں
برائے راحت خود رنج او خواست
دراں ویران امید گنج او خواست
چو نبود عشق عاشق را کمالے
نہ بند جز مراد خود خیالے
طفیل خویش خواہد یار خود را
بکام خویش خواہد کار خود را
بوئے یک گل از بستانِ معشوق
زند صد خار غم بر جانِ معشوق

سے جیل خانے اور ان کی تفصیل منقول ہے کہ غدیرِ مصر کے تین قید خانے تھے :

○ سجن العذاب

○ سجن القتل

○ سجن العافیۃ۔

سجن العذاب، ایک تہہ خانہ تھا جس میں سانپ اور بچھو وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اور اس قدر تاریک کہ جس کے اندر جانے کے بعد دن اور رات کا پتا نہ چلتا تھا۔

سجن القتل، وہ بھی زمین کے اندر چالیس گز نیچے تھا۔ بادشاہ جب کسی پر سخت ناراض ہوتا تو حکم ہوتا کہ اسے اسی جیل خانے میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ جب ڈالا جاتا تو قیدی تہ تک پہنچتے ہی مرجاتا۔

سجن العافیۃ، وہ بادشاہ کے محل کے بالکل قریب تھا جب بادشاہ کو اپنے خواص لوگوں پر ناراضگی ہوتی تو انھیں اسی قید خانے میں بھیج دیتا۔ یہ زمین پر چند مکانات تھے۔

یوسف علیہ السلام کی جیل خانے کی طرف روانگی

زلیخا نے جب یوسف علیہ السلام کو قید خانہ (سجن العافیۃ) میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو پہلے جیل خانہ کے افسر کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کے لیے ایک علیحدہ مکان تعمیر کرایا جائے۔ جب مکان تیار ہو گیا تو زلیخا نے پھر یوسف علیہ السلام کو ڈرایا دھمکایا کہ اگر آپ ہماری بات نہیں مانتے تو جیسے آپ نے ہمیں تنگ کیا ہم آپ کو تنگ کریں گے اور جیسے آج آپ ہماری کوئی بات نہیں مان رہے ایسے ہی آپ کو جیل میں بھیجنے کے بعد آپ کی کوئی بات نہیں مانی جائے گی اور پھر آپ کو ایسے ظالموں کے ہاتھ میں دوں گی جو آپ کو سخت ترین عذاب دیں گے۔ اور یہ تمام قیمتی پوشاکیں اور ریشمی بستر سے تمام چھین لوں گی اور ٹاٹ پہناؤں گی۔ قید خانے میں نہ چارپائی دوں گی نہ بستر۔ پھر لباس بھی ایسا ہوگا کہ تمہارے جسم کو آرام و راحت پہنچانے کے بجائے سخت ترین دکھ پہنچائے گا اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ لباس تمہارے جسم کو چھلنی کر دے گا۔ یہ کہہ کر یوسف علیہ السلام سے تمام قیمتی پوشاک اتروا کر ٹاٹ پہنا دیے اور پاؤں میں مجرموں کی طرح بیڑیاں ڈال دیں۔ حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

زآہن بند بر سیمش نہادند

بگردن طوق تسلیمش نہادند

بسان عیسی اش بر خر نشاندند

بہر کوئی ز مصراں خر براندند

منادی زن منادی بر کشیدہ

کہ ہر سرکش غلام شوخ دیدہ

کہ گیرد شیوہ بیحرمتی پیش

نہد پا در خراش خواجۂ خویش

بود لائق کہ ہچو نا پسنداں

بدیں خواری برندش سوئے زنداں

ولے خلقے زھر سو در تماشا

ہمی گفتند حاشا ثم حاشا

کزیں روے نکو بدکاری آید

وزیں دلدار دل آزاری آید

فرشتت ایں بصد پاکی سرشتہ

نیاید کار شیطان از فرشتہ

یُوسف علیہ السلام قید خانے میں

جونہی حضرت یُوسف علیہ السلام جیل خانے میں پہنچے تو سرنگوں ہو کر جیل خانے کے اندر داخل ہوئے اور داخل ہوتے ہی پڑھا بسم اللہ۔ یہ کہہ کر زمین پر بیٹھ گئے لیکن آپ کو دیکھتے ہی تمام قیدی زیارت کے لیے آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے بیٹھتے ہی رونا شروع کر دیا اتنے میں جبرئیل علیہ السلام حاضر ہو گئے اور رونے کا سبب پُوچھا اور عرض کی آپ نے جیل خانہ خود مانگا تھا اب رونے کا کیا مطلب۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رونا قید کے خوف سے نہیں بلکہ میں اس لیے روتا ہُوں کہ قید خانے میں میرے بیٹھنے کی جگہ تو ہے لیکن نماز کی جگہ نہیں ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی کہ آپ کو جیل خانے میں عام اجازت ہے جہاں چاہیں پڑھ لیا کریں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر جیل خانے کے اندر باہر کی چالیس گز زمین پاک فرما دی ہے اسی لیے یوسف علیہ السلام نے نماز کی ایک جگہ متعین کر لی صرف جمعہ کی رات قید خانے کے دروازے پر نماز ادا کرتے تھے۔ حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا ؎

چوں آں دل زندہ در زنداں در آمد

بجسم مردہ گوے جان بر آمد

دراں محنت سرا افتاد جوشی

بر آمد زاں گرفتاراں خروشی

بشادی شد بدل اندوہ ایشاں

کم از کاہے غم چوں ایشاں

بہر جا یار گلرخسار گردد

اگر گلخن بود گلزار گردد

مروی ہے کہ حضرت یُوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھ کے تمام قیدیوں کے لیے دُعا مانگی :

حکایت اللهم اعطف علیهم الاخیار و لا تخف عنهم الاخبار - اے اللہ ! ان پر نیک لوگوں کی نظرِ عنایت مبذول فرما اور انھیں غلط خبروں کے خطرے سے محفوظ فرما۔ یوسف علیہ السلام کی دُعا کی برکت یہ ہُوئی کہ اس دور کے تمام لوگوں سے یہی جیل خانے والے اخبار کے لحاظ سے زیادہ عالم تھے۔ ؎

چوں در زنداں گرفت از جنبش آرام

بزندانیاں زلیخا داد پیغام

کزیں پس فحنتش مپسند بر دل

ز گردن غل ز پایش بند بگسل

تن سمینش از پشمین مفرسای

بزرکش حملہ سروش بیارای

بشو از فرق او گرد نژندی

ز تاج حشمتش دہ سر بلندی

یکے خانہ برائے او جدا کن

جدا از دیگراں آنجاش جا کن

زمینش را ز سندس فرش انداز

ز استبرق بساط دلکش انداز

دراں خانہ چو منزل ساخت یوسف

بساط بندگی انداخت یُوسف

رخ آورد آنچناں کش بود عادت

دراں منزل بمحراب عبادت

چو مرداں در مقام صبر بنشست

بشکرانہ کہ از کید زنان است

نیفتد در جہاں کس را بلائے

کہ ناید زاں بلا بوئے عطائے

اسیر کز بلا باشد ہراساں

کند بوئے عطا و دشوارش آساں

ف : زلیخا یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج کر خود نارِ فراق اور اشتیاقِ یوسفی کی آگ سے جلنے لگی۔ ؎

چو قدر نعمت دیدار نشناخت

بداغ دوری از دیدار بگداخت

ترجمہ : جب زلیخا دیدار کی نعمت کی قدر نہ پہچان سکی داغ دوری کی وجہ سے دیدار کرنے کے لیے بھی گل گئی۔

اس کے برعکس خود زلیخا کا گھر اس کے لیے یوسف علیہ السلام کے بغیر جیل خانہ بن گیا۔ ؎

بہ تنگ آمد دراں زنداں دل او

یکے صد شد ز ہجراں مشکل او

چہ آسائش دراں گلزار ماند

کزاں گلرخت بندد خار ماند

ز دل خونیں رقم بر رو ہمی زد

بحرت دست بر زانو ہمی زد

کہ ایں کارے کہ من کردم کرد است

چنیں دہرے کہ من خوردم کہ خورد است

دریں محنت سر ایک عشق پیشہ

نزد چوں من بپاے خویش تیشہ

بلکہ اب اس کا یہ حال ہوگیا کہ کبھی کبھی یوسف علیہ السلام کے فراق میں اپنے محل پر چڑھ کر یوسف علیہ السلام کے جیل خانے میں چھلانگ لگانے کے لیے آمادہ ہو جاتی۔ کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ زہر کھا کر مر جائے لیکن دایہ اس کی ہمراز تھی اس لیے وہ اسے تسلی دے کر روک لیتی اور صبر کا سبق دیتی۔ ؎

ز من بشنو کہ بستم پیرایں کار

شکیبائی بود تدبیر ایں کار

بصبر اندر صدف باراں شود در
بصبر از لعل و گوہر کاں شود پر

لیکن طویل مدت تک کیسے صبر کرسکتی تھی بالآخر ایک شب دایہ کو لے کر یوسف علیہ السلام کی ملاقات کے لیے جیل خانے میں پہنچ گئی اور دور سے ہی یوسف علیہ السلام کے دیدار پُر انوار سے سرشار ہو کر واپس چلی گئی۔

ے

بدیدش بر سر سجادہ از دور
چو خورشید درخشاں غرقۂ نور
گہی چوں شمع بر پا ایستادہ
ز رخ زندانیاں را نور دادہ
گہی خم کردہ قامت چوں مہ نو
فگندہ بر بساط از چہر پرتو
گہی سر بر زمیں از عذر تقصیر
چو شاخ تازہ گل از باد شبگیر
گہی طرح تواضع در فگندہ
نشستہ چوں بنفشہ سرفگندہ

لیکن ہر روز گھر کے بالاخانہ کی کھڑکی سے دور سے ہی جیل خانے کو دیر تک تکتی رہتی۔ ے

نبودی ہیچ گہ خالی ازیں کار
گہی دیوار دیدی گاہ دیدار
ز نعمتہا خوش ہر لحظہ چیزے
نہادے بر کف محرم کنیزے
فرستادی بزنداں سوئے یوسف
کہ تا دیدی بحالش روئے یوسف
گشتت از سال خود روئے مزاجش
بزخم نشتر افتاد احتیاجش

(باقی بر صفحہ ۴۱۴)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ
اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ
الْمُحْسِنِيْنَ ۝ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا
مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝
يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ
فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝ وَقَالَ
لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ
فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ۝

ترجمہ : اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ بادشاہ کے دو غلام بھی قید خانے میں داخل ہوئے ان میں ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں سر پر روٹیاں اٹھا کر لے جا رہا ہوں ان سے پرندے کھا رہے ہیں ہمیں اس کی تعبیر بتائیے بے شک ہم آپ کو نیک سمجھتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارا طعام تمہارے ہاں ابھی نہیں آنے پائے گا کہ میں تمہیں خواب کی تعبیر بتا دوں گا یہ ان علوم سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے اور بیشک میں نے ان لوگوں کا دین ترک کر رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق، یعقوب علیہم السلام کا دین اختیار کیا ہوا ہے اور ہمیں لائق نہیں کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی شئے کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ہم پر اور لوگوں پر بھی، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اے قید خانہ کے دوساتھیو! بتاؤ منتفرق رب بہتر ہیں یا ایک معبود جو سب پر غالب ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی ہیں جنھیں تم نے اور تمہارے آباؤ نے گھڑ لیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی سند نازل نہیں فرمائی۔ نہیں حکم مگر اللہ تعالیٰ کا اسی کا فرمان ہے کہ سوائے اس کے اور کسی کی عبادت

نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اے قید خانہ کے دو ساتھیو! تم میں سے ایک بدستور اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا سُولی دیا جائے گا اور اس کے سر کو پرندے کھائیں گے جس کے متعلق تم دونوں پوچھتے تھے اس کا فیصلہ ہوگا اور جس کے متعلق رہائی کا گمان تھا اسے یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے آقا کے ہاں میرا ذکر کرنا۔ پھر شیطان نے اسے اپنے آقا کے ہاں یوسف علیہ السلام کا ذکر بھلا دیا تو یوسف علیہ السلام اور کئی برس جیل خانے میں رہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۱۲)

زخوبش بر زمین در دیدہ کس.
نیامد غیر یوسف یوسف و بس
بلک استاد سبک دست
بلوح خاک نقش این حرف را بست
چناں از دوست پر بودش رگ و پوست
کہ بیروں نامدش از پوست جز دوست
خوش آنکس کو رہائی یابد از خویش
نسیم آشنائے یابد از خویش
نہ بوئے باشدش از خود نہ رنگی
نہ صلحی باشدش با کس نہ جنگی
نیارد خویشتن را در شماری
نگیرد پیش غیر از عشق کاری

تفسیر عالمانہ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ط اور داخل ہوئے یوسف علیہ السلام قید خانہ میں اتفاقی بات ہوئی کہ یوسف علیہ السلام جس جیل خانہ میں داخل کیے گئے اسی وقت بادشاہِ مصر یعنی ریّان بن ولید کے دو غلام بھی اُسی جیل خانہ میں قیدی ہو کر آئے ایک کا نام ابرو ہا یا یونا تھا اور دوسرے کا نام غالب با فلب۔ پہلا بادشاہ کے لیے پانی لاتا تھا اور دُوسرا کھانا تیار کرتا تھا۔

حکایت دُو قیدیوں کی مروی ہے کہ مصر کے کچھ لوگوں نے بادشاہ کے ان دُو غلاموں کو بہت بڑا مال دینے کی لالچ دی کہ کسی صورت میں بادشاہ کو زہر دیا جائے۔ پانی

والے۔ نے پانی میں اور کھانے والے نے کھانے میں زہر دینے کا عہد کرلیا۔ کھانا پکانے والے نے تو کھانے میں زہر ملا دیا لیکن پانی والے نے پانی میں زہر نہ ملایا۔ جب بادشاہ کے سامنے کھانا اور پانی لایا گیا تو کھانا بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو پانی والے نے کہا بادشاہ سلامت کھانے میں زہر ہے۔ کھانے والے نے کہا بادشاہ سلامت پانی میں بھی زہر ہے۔ بادشاہ نے پانی والے سے کہا کہ اس پانی کو تم خود پیو۔ چنانچہ پانی والا بلا تامل پی گیا۔ اب کھانے والے کو کہا گیا کہ کھانا تم خود کھاؤ۔ لیکن اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ تجربۃً وہ کھانا کسی جانور کو کھلایا گیا تو وہ جانور فوراً مرگیا۔ اس حال کی تفتیش تک حکم فرمایا کہ ان دونوں کو جیل میں بھیج دیا جائے اتفاقاً وہ بھی اسی وقت جیل میں آئے جس وقت یوسف علیہ السلام جیل میں تشریف لائے تھے۔ قَالَ اَحَدُهُمَا یہ سوال مقدر کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ قید خانہ میں پہنچ کر ان دو قیدیوں نے یوسف علیہ السلام کو کیا کہا جواب ملا کہ ان میں سے ایک نے کہا (اس سے پانی والا مراد ہے) اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں ایک باغ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوں اس درخت کی تین ٹہنیاں ہیں۔ ان تینوں پر انگور کے تین تین گچھے ہیں میں نے انھیں توڑ لیا پھر دیکھتا ہوں کہ گویا بادشاہ کا پیالہ میرے ہاتھ میں ہے میں اسی میں ان انگور کے گچھوں کو نچوڑ رہا ہوں اور انگور کا نچوڑ پیالے میں لے کر بادشاہ کو پیش کیا تو بادشاہ وہی انگور کا نچوڑ پی گیا وَقَالَ الۡاٰخَرُ دوسرے یعنی روٹی والے نے کہا کہ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ گویا میں شاہی مطبخ میں ہوں اَحۡمِلُ فَوۡقَ رَاۡسِیۡ خُبۡزًا اور اپنے سر پر روٹیاں اٹھا رہا ہوں فَوۡقَ بمعنی علی ہے جیسے فاضربوا فوق الاعناق میں فوق بمعنی علی ہے۔ (کذا فی التبیان) اس کے بعد روٹیوں کی صفت بتائی کہ تَاۡكُلُ الطَّیۡرُ مِنۡهُ ؕ اس سر پر رکھی ہوئی روٹیوں کو پرندے کھا رہے ہیں گویا اس نے اپنے سر پر تین چیزوں کا ذکر کیا:

۱۔ روٹیاں
۲۔ قسم قسم کے طعام
۳۔ اوپر والے حصے پر رکھی ہوئی ٹوکری سے پرندے کھا رہے ہیں۔

نبی کا بے ادب ہمیشہ مار کھاتا ہے

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا واقعی انہوں نے خواب دیکھا یا بناوٹی بات تھی۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام قید خانہ میں تشریف لائے تو اپنے ساتھیوں کو فرمایا کہ میں خواب کی تعبیر جانتا ہوں۔ اس کے بعد جس نے نجاست پائی اس نے واقعی خواب دیکھ کر خواب کی تعبیر پوچھی۔ لیکن دوسرے نے جھوٹا خواب بنایا تاکہ یوسف علیہ السلام کے خواب کا دعویٰ معلوم کر سکیں اس جھوٹے کو سولی کی سزا ملی۔

چنانچہ آگے آتا ہے نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِیۡلِهٖ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر اور انجام کار بتائیے دراصل عبارت کل واحد منہما نبئنا تھی جمع متکلم کی ضمیر حکایت میں ہے وہ اس لیے کہ انھوں نے یک وقت یوسف علیہ السلام

کو خطاب نہیں بلکہ باری باری عرض کیا تھا ۔ اِنَّا نَرٰىكَ بیشک ہم آپ کو دیکھتے ہیں اسی لیے رؤیت بالیقین اور رویۃ بالقلب ہر دو مراد ہو سکتی ہوں ۔ (کذا فی بحر العلوم) مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ نیک لوگوں سے یعنی ان لوگوں سے جو خواب کی اچھی تعبیر بتاتے ہیں ۔ یہ اس لیے کہا کہ انہوں نے دوسرے قیدیوں سے سُنا تھا کہ بزرگ (یوسف علیہ السلام) خواب کی صحیح تعبیر بتاتے ہیں اور جس طرح فرماتے ہیں ویسے ہی ہوتا ہے یا ان لوگوں سے ہیں کہ اہل سجن سے احسان و مروّت سے پیش آتے ہیں ہم چونکہ آپ کی قید کے ساتھی ہیں اگر تمہیں کوئی قدرت حاصل ہے تو ہمیں اس غم و الم سے بچائیے ۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

۱ چو زندان بر گرفتاراں زنداں
شد از دیدار یوسف باغ خنداں

۲ ہمہ از مقدم او شاد گشتند
ز بند درد و رنج آزاد گشتند

۳ بگردن غلشاں شد طوق اقبال
بپا زنجیر شاں فرخندہ خلخال

۴ اگر زندانئ بیمار گشتی
اسیر محنت و تیمار گشتی

۵ کمر بستے پئے بیمار داریش
خلاصی دادے از تیمار داریش

۶ اگر جابر گرفتاری شدی تنگ
سوئے تدبیر کارش کردی آہنگ

۷ کشادہ رو شدی او را دوا جوئے
ز تنگی در کشاد آوردیش روئے

۸ و گر بر مفلسی عشرت شد تلخ
ز ناداری نمودہ غرہ اش سلخ

۹ ز زرداراں کلید زر گرفتے
ز عیش قفل تنگی بر گرفتے

۱۰ دگر خوابی بدبدی تنگ بختی
بگرداب بلا افتادہ رختی

۱۱ شنیدی از لبش تعبیر آں خواب
بخشکی آمدی رختش ز گرداب

ترجمہ : ۱۔ قیدخانہ یوسف علیہ السلام کے تشریف لانے سے باغ بن گیا۔
۲۔ تمام لوگ قید سے چھوٹنے بلکہ درد و رنج بھول گئے اور شاداں و فرحاں تھے۔
۳۔ ان کے گلے کا طوق گویا بخت کا طوق تھا اور ان کے پاؤں کی بیڑیاں پازیب متصور رہتے۔
۴۔ اگر کوئی بیمار ہوجاتا تو یوسف علیہ السلام فوراً اس کی تیمار داری کے لیے پہنچ جاتے۔
۵۔ جب تک بیمار تندرست نہ ہوجاتا اس کی خدمت گزاری میں لگے رہتے۔
۶۔ اگر کوئی ظالم کسی قیدی کو ستاتا تو اس کی کارروائی کرتے۔
۷۔ کشادہ قلبی سے ہر دکھ درد والے کے دکھ درد ٹالتے۔
۸۔ اگر کسی مفلس کو تنگی پیش آتی تو اس کی خوشحالی کا بندوبست فرماتے۔
۹۔ دولت مند سے مال و دولت لے کر تنگ دست کی تنگدستی دور فرماتے۔
۱۰۔ اگر کوئی برا خواب دیکھتا تو اس کی تعبیر ایسے طریقے سے کرتے جس سے وہ خوش ہو جاتا۔
۱۱۔ خواب والا خواب کی تعبیر سنتا تو اس کے تمام دکھ درد دور ہو جاتے۔

ف : حضرت یوسف علیہ السلام کی عادت کریمہ تھی کہ جو لوگ جیل میں عرصۂ دراز کے قیدی تھے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرماتے خوش رہو صبر کرو صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ؎

صبوری مایۂ امیدت بر آرد
صبوری دولت جاویدت آرد

ترجمہ : صبر امید بر لاتی ہے صبر دائمی دولت لاتی ہے۔

یوسف علیہ السلام کے جیلخانہ کے لوگوں پر احسانات

حضرت یوسف علیہ السلام کو قیدی کہتے تھے کہ حضرت آپ کو اللہ تعالیٰ برکات سے مالا مال فرمائے آپ کے حسن و جمال اور آپ کے خلق و مروّت کا کمال بے مثال ہے آپ کی وجہ سے ہمیں جیل میں آرام اور سکون نصیب ہوا یہ تو فرمایئے کہ آپ کون ہیں آپ نے فرمایا میں یوسف ابن صفی اللہ یعقوب بن ذبیح اللہ[1] اسحاق بن خلیل اللہ ابراہیم علیہم السلام قیدخانہ کے افسر نے کہا اگر آپ کی رہائی میرے بس میں

---

[1] ایک روایت میں اسحاق علیہ السلام کو ذبیح اللہ کہا گیا ہے۔

ہوتی تو میں آپ کو قید سے رہائی بخشتا البتہ اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ جیل کے جس کمرے میں آرام و سکون سے رہ سکتے ہیں میری طرف سے اجازت ہے۔

اعجوبہ محبت یوسف علیہ السلام

مروی ہے کہ جیل کے دو شاہی جیلیوں نے یوسف علیہ السلام سے کہا ہمیں آپ سے محبت اور پیار ہو گیا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ مجھے محبت سے معاف رکھیے کیونکہ جس نے بھی مجھ سے محبت کی اس سے مجھے کسی مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا۔ سب سے پہلے میرے ساتھ میری پھوپھی نے پیار کیا تو اس سے مجھے مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا۔ پھر والدگرامی نے مجھ سے پیار کیا تو اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہوں۔

نکتہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے مصائب و تکالیف میں مبتلا ہونے میں کئی حکمتیں تھیں:

۱۔ غلام بنے تاکہ بعد کو غلاموں کے آقا بنیں تو غلاموں پر رحم فرمائیں۔

۲۔ قیدی بنے تاکہ بعد کو شاہی تخت پر بیٹھ کر قیدیوں پر شفقت کریں۔

۳۔ بھائیوں کے حسد اور ان کے درد و الم کا نشانہ بنے تاکہ نبوت سنبھالنے پر ہر قریب و بعید اور امیر و غریب پر لطف و کرم فرمائیں۔

انبیا علیہم السلام کی شان

حدیث شریف میں ہے کہ کسی غلام کو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا جائے گا تو اس سے سوال ہو گا کہ تُو نے عبادتِ حق میں کیوں کوتاہی کی؟ غلام عرض کرے گا: یا اللہ! تُو نے مجھے آقاؤں کے قبضے میں دے دیا تھا۔ نہ ان کی خدمات سے فرصت ملی نہ میں عبادت کر سکا۔ اللہ تعالیٰ یوسف علیہ السلام کو بلائے گا پھر اس غلام سے پوچھے گا کہ یوسف علیہ السلام نے آقاؤں کی زیادہ سختی برداشت کی یا تو نے۔ وہ عرض کرے گا: یوسف علیہ السلام نے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: باوجود ان تمام سختیوں کے یوسف (علیہ السلام) نے میری عبادت میں ذرہ بھر کمی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد دولت مند کو حاضر کیا جائے گا اس سے سوال ہو گا کہ تُو نے عبادتِ حق میں کیوں کوتاہی کی؟ عرض کرے گا: کثرتِ اموال و اسباب کی مشغولیت سے وقت نہ ملا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت سلیمان علیہ السلام حاضر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس دولت مند سے فرمائے گا تو زیادہ دولتمند تھا یا سلیمان (علیہ السلام)؟ وہ عرض کرے گا: سلیمان علیہ السلام مجھ سے زیادہ غنی تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا انہوں نے زندگی بھر میری عبادت میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد ایک مریض حاضر ہو گا اس سے بھی وہی سوال ہو گا۔ وہ عرض کرے گا نہ بیماری نے چھوڑا نہ میں عبادت کر سکا۔ اللہ تعالیٰ حضرت ایوب علیہ السلام کو بلائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس مریض سے سوال کرے گا کہ ایوب علیہ السلام کی بیماری زیادہ تھی یا تیری! وہ عرض کرے گا ایوب علیہ السلام کی بیماری مجھ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ایوب علیہ السلام نے بیماری میں بھی میری عبادت میں کوئی کسر

نہ چھوڑی تھی۔ اس کے بعد ایک ایسے بندے کو لایا جائے گا جو رحمتِ الٰہی سے بالکل مایوس ہو کر مرا ہو گا اس سے سوال ہو گا کہ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کیوں ناامید ہو گیا تھا، وہ عرض کرے گا گناہوں کی حیا ہی اس قدر زیادہ تھی کہ اس کا دھلنا مشکل نظر آتا تھا اس پر فرعون کو حاضر کیا جائے۔ اس مایوس سے سوال ہو گا کہ تیرے گناہ زیادہ تھے یا فرعون کے۔ وہ عرض کرے گا فرعون کے گناہ مجھ سے زیادہ تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا باوجودیکہ فرعون گناہوں سے بھرپور تھا لیکن غرق ہوتے وقت بھی رحمت سے ناامید نہ ہوا کہ اس وقت بھی کلمۂ توحید اس کی زبان سے جاری تھا جبکہ اس کی جان نکل رہی تھی[1]

ف : یوسف علیہ السلام مصیبت زدہ لوگوں کے لیے اور سلیمان علیہ السلام ملوک و اغنیا کے لیے اور ایوب علیہ السلام بیماروں اور فرعون ناامیدوں کے لیے عبرت ہیں۔

ازالہ وہم اس سے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ ہم فرعون کی مدح کر رہے ہیں (معاذ اللہ) بلکہ اس سے ہمارا مقصد ظاہری حال پر ناامیدی کے متعلق ہے ورنہ باتفاق علماء کرام فرعون کافر اور جہنمی ہے۔ جیسا کہ سورۂ یونس میں تحقیق گزری ہے۔

مسئلہ : حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام کے مصائب و تکالیف کو عقوبات سمجھنا کسی تنگ اور بے ایمان کا تصور ہو گا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے منجانب اللہ تحائف و ہدایا ہوتے ہیں۔

حدیث شریف جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس پر مصائب و بلیات کی بارش برساتا ہے۔

ے

اذا احب اللّٰہ عبداً ابتلاہ
فان صبر اجتباہ فان رضی اصطفاہ

ترجمہ : جب اللہ تعالیٰ بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے تو اسے برگزیدہ بناتا ہے اگر راضی برضا ہو تو اسے چن لیتا ہے۔

ے

جامیا دل بغم و درد نہ اندر رہ عشق
کہ نشد مرد رہ آنکس کہ نہ این درد کشید

ترجمہ : اے جامی! عشق میں درد و غم کچھ نہیں اس لیے کہ جو درد و غم میں مبتلا نہیں ہوتا وہ مرد راہ ہو ہی نہیں سکتا۔

---

[1] یہ صرف موازنہ کے لیے ہوگا ورنہ فرعون بالاتفاق مردود و ملعون جہنمی ہے چنانچہ تحقیق گزری۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ جب یوسف (قلب) شریعت کے قیدخانہ میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ دو نفس کے خدام بھی داخل ہوئے ایک پانی پلانے والا یعنی نفس دوسرا روٹی کھلانے والا یعنی بدن۔ اور یہ دونوں بادشاہ روح کے غلام ہیں۔ نفس پانی پلانے والا ہے یعنی نفس روح کو وہ چیزیں پیش کرتا ہے جو روح کے پینے کے لائق ہیں کیونکہ روح علوی اخروی ہے وہ بدن تصرف نہیں کر سکتا جب تک اسے نفس اس کے لائق پانی نہ پلائے اور بدن روح کا کھانا تیار کرتا ہے یعنی اس کے لیے وہ اعمال تیار کرتا ہے جو روح کی غذا کے لائق ہیں۔ اور ظاہر ہے روح اس وقت تک زندہ ہے جب تک روحانی غذا ملتی رہتی ہے۔ جسمانی غذا کے بغیر جسم کا زندہ ہونا ممکن نہیں اور نفس و بدن کو شریعت کی قید میں اس لیے دیا گیا ہے کہ ان دونوں پر تہمت لگائی کہ طعام والے نے بادشاہ (روح) کے طعام میں اور پانی والے نے پانی میں زہر ملا دی ہے اور وہ ہر دو بادشاہ (روح) کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں یعنی یہ دونوں روح کو خواہشات و معصیات کی زہر کھلانا چاہتے ہیں جب تک نفس و بدن شریعت کی قید میں محبوس رہتے ہیں بادشاہ (روح) ان کے شر سے امن و قرار و سکون اور چین میں رہتا ہے۔ یاد رہے کہ نفس و بدن دنیوی ہیں اور تمام اہلِ دنیا خوابِ غفلت میں ہیں جب مریں گے تو بیدار ہوں گے جتنا ہم دنیا میں عمل کر رہے ہیں یہ ایسے ہے جیسے خواب میں کوئی عمل کیا جاتا ہے جب ہم مریں گے تو ان دنیاوی اعمال کی تعبیریں (انجام) آخرت میں کھل کر ہمارے سامنے آجائیں گی اور یوسف (قلب) اہلِ دنیا کے تمام خوابوں کے اعمال کی تعبیریں (انجام) جانتا ہے وہ محسنین سے ہے یعنی منجملہ ان حضرات سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت حضورِ قلب اور مشاہدہ و معائنہ کے ساتھ کرتے ہیں اور عبادت کے وقت ان کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور عبادت سے سرور اور ہشاش بشاش ہوتے ہیں ان کے لیے جو حکم بھی اللہ تعالیٰ صادر فرماتا ہے نزول سے پہلے عالمِ غیب سے باخبر ہوتے ہیں۔ قوتِ خیالی عبور کرتے وقت اسے ایک ایسی خیالی پوشاک پہنائی جاتی ہے جو وقت کے عین مطابق ہے خواب دیکھنے والا اگرچہ اپنی قوتِ خیالیہ سے خواب کی تعبیر سے خود باخبر ہوتا ہے لیکن پھر تعبیر کرنے والے کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ وہ اس کے خواب کی تعبیر کی وہ ترجمانی کرے جو عالمِ غیب میں اس کے لیے حکم واقعی ہے یہی وجہ ہے کہ خواب کی تعبیر بتانے والا (ولی یا نبی) خواب کی تعبیریں وہی فرماتا ہے جو حضرت حق سے خواب کی شکل میں خواب والے کے سامنے آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ نیک خواب نبوت کا ایک جزو ہے اس لیے کہ خواب وحی ربانی کی فرع ہے اور خواب بھی اللہ تعالیٰ سے بندے کے قلب پر وارد ہوتا ہے اور خواب کی سچی تعبیر بھی نبوت کا ایک جزو ہے کیونکہ تعبیر الرؤیا علم لدنی ہے لہٰذا وہ اپنے بندوں میں اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سکھاتا ہے۔

تفسیر عالمانہ قَالَ یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ زندان کے ساتھیوں کو تعبیر خواب سے پہلے توحید کا درس دیں کیونکہ ان کے لیے یہی اولیٰ تھا کہ وہ توحید کے عاشق ہو جائیں اسی لیے آپ نے سب سے پہلے انہیں ایمان کی باتیں بتائیں اور راہِ ہدایت سکھایا اور آپ نے ان کے قلوب کو دولتِ توحید سے سنگارنا چاہا جیسے

انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کی عادت مبارکہ ہے کہ وہ ہر وقت خلقِ خدا کی ہدایت وارشاد اور ان پر ہر وقت اور لطف وکرم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں پہلے ایک معجزہ عنایت فرمایا تاکہ انھیں ایمان و توحید قبول کرنے میں تامل نہ ہو۔ (اور معجزہ بھی کیسا جو دورِ حاضرہ کے وہابی دیوبندی نظریات کو جلا کر راکھ کر دے)

علمِ غیب ایک معجزہ ہے دورِ حاضرہ میں وہابیہ اور دیوبندیہ اور ان کے ہمنوا فرقوں کا عقیدہ ہے کہ غیب جاننا خاصۂ خدا ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ واقعی علم غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے لیکن یہ ان خواص سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو عطا بھی نہ کرے۔ ہم اہلسنّت کا عقیدہ ہے کہ وہ علم غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے جسے ذاتی کہا جاتا ہے اور اپنے فضل وکرم سے انبیاء و اولیاء علیہم السلام کو غیب کا علم عنایت فرماتا ہے اسے ہم علم غیب عطائی سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ انبیاء علیہم السلام کا معجزہ اور اولیاء کرام کی کرامت ہے۔ ہم بحمدہٖ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات اور اولیاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے کرامات کے قائل ہیں لیکن وہابیہ دیوبندیہ زبان سے اقرار اور ویسے انکار منجملہ ان کے ایک یہی مسئلہ علمِ غیب بھی ہے جسے صاحبِ رُوح البیان نے صرف دو لفظوں میں فیصلہ فرما دیا:

نقدم ماھو معجزۃ من الاخبار بالغیب لیدل علی صدقہ فی الدعوۃ والتعبیر۔ (ج ۴ ۔ص ۲۵۹)	اسے مقدم فرمایا جو معجزۂ اخبار الغیب ہے تاکہ یُوسف علیہ السلام کی صداقت دعوت اور تعبیر پر دلالت کرے۔

ف: اس سے معلوم ہُوا کہ وہابیہ دیوبندیہ انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے علم غیب کا انکار کرکے درحقیقت ان کے معجزات و کرامات کا انکار کر رہے ہیں۔ اور معجزات و کرامات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے قبضہ و اختیار میں ہوتے ہیں یا نہ۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جسے فقیر اویسی غفرلہٗ نے "مختارِ کل" کتاب میں تفصیل لکھی ہے۔

لَا یَاْتِیْکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ طعام جو تمہارے ہاں پہنچایا جاتا ہے اور تم اسے حسب عادت روزانہ یہاں پر کھاتے ہو اس کے آنے سے پہلے اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ یہ استثنا مفرغ ہے دراصل عبارت یوں ہے: لا یاتیکما طعام فی حال من الاحوال الاحال ما نباتکما الخ یعنی طعام آنے سے پہلے ہیں تمہیں طعام کی حقیقت سے باخبر کر دوں گا۔ یعنی بتاؤں گا کہ طعام کی مقدار کتنی ہے اور اس کی کیفیت یعنی رنگ اور ذائقہ کیا ہے اسی طرح باقی تین۔

سوال: طعام کی خبر پر تاویل کا اطلاق کیوں۔

جواب: استعارہ کے طور اس پر تاویل کا اطلاق فرمایا ہے۔ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح خواب کی باتیں مبہم اور دیکھنے

---

[1] ماسوائے عربی عبارت کے باقی تمام مضمون فقیر اویسی غفرلہٗ کا ہے۔ ۱۲

والے کے سامنے عموماً نامعلوم ہوتی ہے ایسے ہی قیدیوں کے لیے وہ طعام جو آنے والا تھا انھیں اس کی حقیقت و مقدار مبہم اور غیر معلوم تھی۔ اسی مناسبت سے طعام کی قبل از وقت خبر کو تاویل سے تعبیر فرمایا۔

قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَکُمَا تمہارے ہاں پہنچنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے ہی غیب کی خبریں قبل از وقت بتاتے تھے۔ کما قال تعالیٰ:

و انبئکم بما تاکلون وما تدخرون	میں تمہیں اس طعام کی خبر دوں جسے تم کھاتے
فی بیوتکم۔	اور جسے تم اپنے گھروں میں ذخیرہ بنا کر رکھتے ہو۔

مثنوی شریف میں ہے:

۱ ایں طبیباں بدن دانشورند
بر سقام تو ز تو واقف‌ترند

۲ تا ز قارورہ ہمی بینند حال
کہ ندانی تو ازاں رو اعتدال

۳ ہم ز نبض و ہم ز رنگ و ہم ز دم
بو برند از تو بہر گونہ سقم

۴ پس طبیباں الٰہی در جہاں
چوں ندانند از تو بے گفت دہاں

۵ ہم ز نبضت ہم ز چشمت ہم ز رنگ
صد سقم بینند در تو بے درنگ

۶ ایں طبیباں نو آموزند خود
کہ بدیں آیا نشاں حاجت بود

۷ کاملاں از دور نامت بشنوند
تا بقعر تار و پودت در روند

۸ بلکہ پیش از زادن تو سالہا
دیدہ باشندت ترا با حالہا

ترجمہ: ۱۔ دیکھیے بدن کے طبیب کیسے دانا ہیں کہ تیری بیماریوں کو تجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔
۲۔ تیرے پیشاب کو دیکھ کر تیرا مرض بتاتے ہیں حالانکہ تجھے اس سے ذرہ برابر بھی خبر نہیں۔

۳۔ اسی طرح نبض اور رنگ اور سانس کھینچنے سے تیرا تمام حال بتاتے ہیں کہ تو فلاں مرض میں مبتلا ہے۔
۴۔ اسی طرح طبیبانِ الٰہی (انبیاء و اولیاء) کو جہان کی خبر کیوں نہ ہو۔
۵۔ تیری نبض اور آنکھ اور سانس سے تیری ہزاروں بیماریاں جانتے ہیں۔
۶۔ یہ بھی نو آموز طبیبوں (ولیوں) کا معاملہ ہے کہ نشانیوں سے کچھ بتاتے ہیں۔
۷۔ کامل تو نام سنتے ہی تمام حالات سُنا دیتے ہیں۔
۸۔ بلکہ وُہ تیری پیدائش سے سالوں پہلے تجھے دیکھ کر تیرے حالات بتا دیتے ہیں[۱]۔

ذٰلِكُمَا اے میرے قید کے ساتھیو! یہ تعبیر اور مغیبات کی اخبار مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ان امور میں سے ہیں جو مجھے میرے رب تعالیٰ نے بذریعہ وحی و الہام جتلایا ہے۔ ایسا علم نہ کہانت سے حاصل ہو سکتا ہے نہ نجوم دانی سے۔ دراصل بات یُوں ہُوئی کہ یوسف علیہ السلام نے ان دو قیدیوں کو ان کے طعام پہنچنے سے پہلے فرمایا کہ تمھارا کھانا فلاں فلاں شے اور اس طرح کے رنگ کا فلاں وقت میں پہنچ رہا ہے اور تم اتنی مقدار میں کھانا کھاؤ گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے فرماتے ویسے ہوتا زنداں کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ جادوگروں اور کاہنوں کا کام ہے آپ کاہن ہیں نہ جادوگر۔ بلکہ مجھے یہ علم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔

ف: حضرت یُوسف علیہ السلام سے جو کچھ ان لوگوں نے معلوم کیا وہ ان کے علوم بحرِ بے کنار کا ایک حصہ تھا۔ اسی لیے مِمَّا علمنی ربی الخ فرمایا ہے۔

اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ گویا آپ سے سائلین نے پُوچھا کہ آپ کو اتنے عجیب علوم کیونکر حاصل ہوئے۔ اس کے جواب میں فرمایا مجھے یہ علوم اس لیے عطا کیے گئے ہیں کہ میں نے قوم کی ملت کو چھوڑا ہے اس سے مصری یا کوئی اور ہر وہ قوم مراد ہے جسے قرآن نے خود بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے۔ یہاں پر ترکِ ملت سے مراد یہ ہے کہ سرے سے حضرت یُوسف علیہ السلام نے ان کی ملت کو مانا ہی نہیں تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ حضرت یُوسف علیہ السلام پہلے اُن کی ملت کو مانتے تھے لیکن بعد کو چھوڑ دیا اور عدم امتناع کو ترک سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ زنداں کے ساتھیوں کو سمجھانے کا یہی طریقہ موثر تر تھا۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ اور وہ آخرت اور اس کی جزا کا انکار کرنے والے ہیں۔

سوال: صرف ان کے لیے آخرت کے انکار کی تخصیص کا کیا معنیٰ، حالانکہ ہر کافر آخرت کا منکر ہوتا ہے۔

جواب: وُہ اس لیے کہ وہ کفر میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔

---

[۱] جیسے ابو الحسن خرقانی کے لیے بایزید نے بتایا تھا۔

عقیدہ : اس سے ثابت ہُوا کہ افعالِ الٰہی بندوں کی مصلحتوں سے معلل ہیں جیسا کہ حنفیہ کا مذہب ہے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ صالح امر کی بجائے اصلح پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ پہ واجب نہیں۔ اور جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بمصالح العباد معلل نہیں تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت پھر ان کے لیے اظہار معجزات کی کیا ضرورت تھی جبکہ اظہار معجزات سے ان کی نبوت کی تصدیق مطلوب تھی اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل بھی علت وغرض سے خالی مانا جائے تو اس کے جملہ افعال کو عبث ماننا پڑے گا اور وہ اس کی رفعتِ شان کے منافی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی اغراض ہوتی ہیں معاذ اللہ بلکہ اغراض بھی بندوں کے مراد ہیں۔

تفسیر صوفیانہ تاویلات نجمیہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ جب سے میں نے غیروں کی ملت کو خیر باد کہا اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے علم عطا فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ جب سے میں نے غیروں کی ملت کو خیر باد کہا اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے علم عطا فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ جب قلب تحت نفس و ہوٰی و طبیعت کو ترک کرتی ہے۔ اور ان کی ملت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے کیونکہ نفس خود ربوبیت کا دعوٰی کرتا ہے جیسے فرعون نے اسے ظاہر کیا۔ کما قال تعالیٰ انا ربکم الاعلیٰ۔ اور ہوٰی الوہیت کی مدعی ہے کما قال اللہ افرأیت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ۔ اور طبیعت کو شریعت سے ضد ہے۔

تفسیر عالمانہ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ط اور میں نے اپنے آباء و اجداد کی ملت کی تابعداری کی ہے جس کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام۔

ف : یوسف علیہ السلام نے نسب کی شرافت اس لیے بیان فرمائی تاکہ انہیں معلوم ہو کہ وہ ان حضرات کے خاندان سے ہیں اس طرح سے اہلِ زنداں ان کی بات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ان تینوں حضرات کی بزرگی اور شرافت اہلِ دنیا سب جانتے تھے۔ جب اہلِ زنداں کو یقین ہُوا کہ حضرت خاندانِ نبوت سے ہیں تو سب نے آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا اور آپ کے فرمان کو بدل و جان قبول کیا۔

مسئلہ : اس سے معلوم ہوا کہ جہاں میں اہلِ علم اپنے علم کا اظہار اس ارادہ سے کریں تاکہ لوگ اس سے استفادہ و استفاضہ کریں تو جائز ہے۔ یہ اس وقت ہے جب وہ لوگ اس کے علم و فضل سے ناآشنا ہوں اس کا بھی یہ ارادہ ہو کہ اظہارِ علم سے اُن کا دینی و اُخروی فائدہ ہوگا ورنہ ناجائز ہے۔

حدیث شریف اللہ تعالیٰ اہلِ علم سے بھی علم کے متعلق قیامت میں سوال کرے گا جیسے اہلِ مال سے مال کے متعلق سوال فرمائے گا۔

ف : ترک ملۃ کفر کی تقدیم اور اتباعِ ملت آباء کی تاخیر اسی لیے ہے کہ تخلیہ بالخاء المعجمۃ تحلیہ (بالمھملۃ) سے مقدم ہوا کرتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ آیت سے معلوم ہوا کہ اتباعِ مشائخ میں کمالات حصول کے لیے کامیابی ہوتی ہے بلکہ جملہ مرادات الٰہی انکی اتباع سے نصیب ہوتے ہیں۔ نیز اشارہ ہے کہ ابراہیم سے سِر اور اسحاق سے خفاء اور یعقوب سے روح اور ان کی ملت سے توحید و معرفت مراد ہے۔

تفسیر عالمانہ مَا كَانَ لَنَآ ہم انبیاء علیہم السلام کے بالکل نامناسب ہے چہ جائیکہ اس کا وقوع ہمارے سے ہو کیونکہ ہمارے نفوس میں وہ قوت ہوتی ہے جو دُوسروں کے نصیب کہاں۔ اور ہمارے علوم بحر بیکراں ہیں ان کا کنارہ کسی کو معلوم نہیں اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک ٹھہرائیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں نہ انسانوں میں نہ جنوں میں چہ جائیکہ جاہلوں کی طرح جمادات میں چند ڈھیلوں کو اس کا شریک مانا جائے کہ جو نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان ذٰلِكَ یہ اشارہ توحید کی طرف ہے اگرچہ توحید کی تصریح سابق مضمون میں نہیں لیکن ماکان لنا الخ سے دلالۃً معلوم ہوتی ہے مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا یعنی توحید ایک فضل الٰہی ہے جو صرف ہمیں نصیب ہوتی ہے اور توحید کا علم ہمیں وحی کے ذریعہ عطا ہوا وَعَلَى النَّاسِ اور دُوسرے ان لوگوں کو توحید سے نواز اگیا جو ہمارے واسطہ و وسیلہ سے فضلِ الٰہی کے مستحق ہوئے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لیکن اکثر وہ لوگ جن کی طرف رُسل کرام تشریف لاتے ہیں لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ شکر کی بجائے رُوگردانی کرتے ہیں اور ان کے ارشادات پر عمل نہیں کرتے۔

مسئلہ: انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان اعلیٰ وسیلہ ہوتے ہیں فلہٰذا ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے تاکہ اپنی عبودیت کا پورا حق ادا کریں اور حکمتِ ایزدی کے تقاضے کو سمجھیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ یہ اضافت بمعنے فی ہے۔

ربط: حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے اپنے دینِ قویم کے فضائل و کمالات بیان فرمائے اب ساتھیوں کو قوم کے معبودوں کے بطلان میں ایسے نرم و لطیف طریقے سے استدلال فرماتے ہیں جس سے انھیں بآسانی سمجھ آسکے کہ واقعی غیر اللہ کی پرستش بالکل غلط اور مذموم ہے۔ چنانچہ فرمایا: اے میرے زنداں کے ساتھیو!

نکتہ: حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسی جگہ پر انھیں پیارے خطاب سے نوازا کہ جہاں محبت و مودت کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ آپ نے ان سے پیار کیا تاکہ ان پر نصیحت کا گہرا اثر ہو۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ یہ استفہام انکاری ہے کیا یہ متفرق معبود کہ کوئی سونے کا ہے کوئی چاندی کا، کوئی لوہے کا ہے کوئی پتھر کا اور کوئی لکڑی کا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا۔ (کذا فی التبیان)

خَيْرٌ تمہارے لیے بہتر ہیں اَمِ اللّٰهُ یا اللہ تعالیٰ معبود بالحق الْوَاحِدُ منفرد بالالوہیۃ الْقَهَّارُ ۝ جو سب پر غالب ہے اور اس پر کسی کو غلبہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس کی وحدت کا کثرت پر غلبہ ہے

اور خواہشات نفسانی اور شیطان اگرچہ ان کے ماننے والوں کے گمان پر ان کے لیے اچھے ہیں لیکن درحقیقت وہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک شر محض ہیں اس لیے کہ وہ اعلیٰ مطالب اور اشرف المقاصد کی طلب کے راستہ سے انسانوں کو بہکاتے ہیں مَا تَعْبُدُوْنَ یہ خطاب ان دو ساتھیوں کے ساتھ ان کی تمام برادری کو ہے مِنْ دُوْنِهٖٓ اللہ تعالیٰ کے ماسوا جتنی چیزوں کو تم نہیں پوجتے اِلَّآ اَسْمَآءً مگر صرف اسماء کو کہ جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں اس لیے کہ جن کے تم نے نام مقرر کر رکھے ہیں ان کی خارج میں کوئی حقیقت نہیں اور نہ ان کا کوئی وجود ہے اسی لیے تمہاری پرستش صرف اسماء کے لیے ہوگی سَمَّیْتُمُوْهَا تم نے ان کے نام مقرر کر رکھے ہیں اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ تم اور تمہارے آباء نے یہ تمہاری جہالت اور گمراہی ہے مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا جن کی تم پرستش کرتے ہو اور تم نے ان کے نام مقرر کیے ہوئے ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ کوئی دلیل جو ان کی پرستش کی صحت پر دلالت کرے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ نہیں امر عبادت کا مگر اللہ تعالیٰ کے لیے، کیونکہ عبادت کا مستحق بالذات صرف وہی ہے کیونکہ وہ واجب بالذات اور کل کائنات کا اور جملہ امور کا مالک ہے اَمَرَ یہ سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ اس مالک کائنات کا حکم کیا ہے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کے لیے حکم فرمایا ہے کہ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا کہ کسی کی عبادت نہ کرو اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ سوائے اسی ذات کے کہ جس کی عبادت کے استحقاق کے لیے بے شمار دلائل موجود ہیں ذٰلِكَ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے الدِّیْنُ الْقَیِّمُ دین ثابت یا مستقیم یعنی دین اسلام وہ ہے جس میں کسی قسم کا ٹیڑھا پن نہیں اور تم نے تا حال ثابت اور غیر ثابت اور ٹیڑھے اور مستقیم کی تمیز نہیں کی صرف دین اسلام اس لیے مستقیم ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کے لیے فرمایا:

ان الدین عند اللہ الاسلام۔

کیونکہ باعتبار اصول کے دین اسلام تمام ادیان حقہ کو حاوی ہے۔ اگرچہ دوسرے ادیان حقہ فروع میں اسلام سے مختلف ہیں اور ادیان حقہ بوجہ شرائع اور احکام کے مختلف ہیں اس لیے کہ اُمتیں مختلف ہوئیں تو ان کے احکام بھی ان کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ لیکن اکثر لوگ اپنی جہالت میں منہمک ہونے کی وجہ سے نہیں جانتے۔

قاعدہ مسئلہ وحدۃ الوجود یہ جملہ کائنات ظل ہے اور جلد زائل ہو جائے گا۔ عاقل وہ ہے جو سایہ کو چھوڑ کر سایہ خالق کا متلاشی ہوتا ہے اور اس کی تلاش کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کے دین کے احکام کی پابندی کرے اور سب سے بڑا اصل و ضابطہ عبادت کا یہ ہے کہ شرک جلی و خفی سے اجتناب کرے۔ اسے اخلاص سے تعبیر کرتے ہیں اور اخلاص بندے کو مولا ملا دیتا ہے۔

ف: بعض مشائخ کا فرمان ہے کہ ایمان و طاعت کوئی فائدہ نہیں دیتے جب تک بندے کو صرف حق کی طلب نصیب

نہ ہو اگر ایمان و طاعت رغبت یعنی ثواب کے حصول یا عذاب کے خوف سے ہو تو وُہ ایسے ایمان و طاعت سے کوئی فائدہ نہیں۔

ولیہ کاملہ کا قصہ ایک ولیہ کاملہ نے بعض عبادت گزار لوگوں سے پُوچھا کہ سخاوت کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے راستہ پر مال لٹانا۔ اس بی بی نے فرمایا کہ یہ سخاوت تو عوام اہل دُنیا کی ہے میرا مطلب یہ ہے کہ خواص کی سخاوت کس طرح ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ تمام طاقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صرف کر دینا۔ بی بی نے کہا اس سے بھی ثواب کے حصول کی امید ہوتی ہوگی۔ انہوں نے کہا ہاں امید ثواب کی ہوتی ہے۔ بی بی نے کہا کہ تم بحکم رب تعالیٰ (مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا) ایک نیکی کر کے دس نیکیاں لیتے ہو۔ انہوں نے کہا ایسا ہوتا ہے۔ بی بی نے فرمایا پھر عبادت نہ ہوئی تجارت ہوئی۔ انہوں نے کہا پھر آپ ہی فرمائیں کہ سخاوت کسے کہتے ہیں۔ بی بی نے فرمایا بندہ عبادت سے نہ جنت کا خواہاں ہو اور نہ دوزخ سے ڈرے بلکہ صرف رضائے الٰہی مطلوب ہو اور بس۔ اور ایسی عبادت تجرید و تفرید کے بغیر ناممکن ہے ایسی عبادت سے بندہ کو حقیقت الوجود کا وصول بلکہ حق کا وصال نصیب ہوتا ہے جب اس مرتبہ کو پہنچتا ہے تو پھر ہر تقدیر سے پہلے خود خدا پُوچھتا ہے کہ اے میرے بندے! بتا تیری رضا کیا ہے۔ اس مقام پر جب پہنچتا ہے تو تمام عالم اس کے قبضے میں دیا جاتا ہے پھر اس کا ہر حکم حکم الٰہی اور اس کا ہر علم علم حق ہوتا ہے اسی لیے وہ ہر تصرف کا مالک اور ہر غیب کی خبر باذن اللہ دیتا ہے جیسے یوسف علیہ السلام کا حال تھا (یہی ہم اہلسنّت کا مذہب ہے جسے مصنف روح البیان صدیوں پہلے بتا گئے۔ لیکن وہابیہ دیوبندیہ کے نزدیک ایسا عقیدہ رکھنا شرک اور کفر ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں مذہب حق وہی ہے جو اسلاف کا ہے۔ (ولکن الوھابیۃ قوم لا یعقلون)

حکایت غیب دانی حضرت ابوبکر کتانی فرماتے ہیں مجھے خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں مسجد صنعا میں گیا۔ لوگ حضرت عبدالرزاق محدث صاحبِ مسند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حدیث شریف کا درس لے رہے تھے۔ میں نے مسجد کے ایک گوشے میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ مراقبہ میں بیٹھا ہے جسے حدیث شریف سننے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میں نے اسے کہا تم عبدالرزاق محدث سے حدیث کیوں نہیں سُنتے۔ اس نے جواب دیا کہ میں رزاق کا کلام سُن رہا ہوں۔ تم مجھے عبدالرزاق کی بات کا کہتے ہو۔ میں نے اسے کہا اگر تم اس دعوٰی میں سچے ہو تو بتایئے میں کون ہوں؟ اس نے فرمایا: آپ خضر علیہ السلام ہیں۔

سبق: اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں جو فانی زندگی سے باقی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ہستی کو وجود حقانی میں فنا کر دے ایسے لوگ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے عبادت کرتے ہیں انھیں کونین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اسی لیے ان کے لیے اکوان کی صورتیں اور حقائق کے معانی منکشف ہو جاتے ہیں۔

حکایت قدوۃ العارفین حضرت عبداللہ قرشی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک سال مصر میں سخت قحط سالی ہوئی۔ میں حاضر ہوا۔ ارادہ ہُوا کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگوں تاکہ قحط سالی دُور ہو مجھے غیب سے ندا آئی کہ یہ

دعا مانگو ۔ میں یہ سُن کر حضرت خلیل اللہ علیٰ نبینا علیہ السلام کی زیارت نصیب ہُوئی ۔ میں نے عرض کیا حضرت خلیل علیہ السلام کے مزار کی زیارت کیلئے ملک شام کے ملک میں چلا گیا ۔ مزار شریف کے قریب ہوا تو مجھے حضرت خلیل علیہ السلام کی زیارت نصیب ہُوئی میں نے عرض کیا حضرت آج میں آپ کا مہمان ہوں میری مہمانی یہی میری ایک عرض بارگاہ حق سے قبول کرا دیجئے وہ یہ کہ مصر سے قحط سے دُور ہو حضرت خلیل علیہ السلام نے مصریوں کے لیے دُعا فرمائی تو قحط دُور ہُوا۔

آجکل وہابی دیوبندی اہل مزارات کے تصرفات کو شرک سمجھتے ہیں حالانکہ اسلاف تصرف کے منکر کو جاہل ردّ و ہابیہ سمجھتے ہیں ۔ (کما) قال الامام الیافعی قول الشیخ تلقانی الخلیل حق لا ینکرہ الا جاھل بمعرفۃ مایرد علیھم من الاحوال التی یشاھدون فیھا ملکوت السمٰوٰت ۔ (روح البیان ج ۴ ص ۲۶۲)

ترجمہ: "امام یافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیخ کا فرمان (مجھے خلیل پیغمبر علیہ السلام کی ملاقات ہوئی) حق ہے اس کا انکار وہی جاہل کرے گا جسے انبیاء و اولیاء کے احوال سے بے خبری ہے ورنہ اہلِ علم تو مانتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء ملکوت السمٰوٰت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔"

ف : تمام انبیاء علیہم السلام ایمان و اخلاص العبادۃ کے لیے مامور ہوئے اور ایمان کمزور بھی ہوجاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے :

جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللہ ۔ اپنے ایمان کی تجدید لا الٰہ الا اللہ سے کرو۔

یاد رہے کہ ایمان کا کمزور ہونا محبت کے زوال سے ہوتا ہے اسی لیے اس کی تجدید کلمۂ توحید سے ضروری ہے اور کلمۂ توحید نفی و اثبات سے مرکب ہے ماسوی اللہ کی نفی اور اثبات سے اصلی مقصود کا اثبات کیا جائے گا اس طرح سے سالک کمال شہود کو پہنچتا ہے اس کا حصول نور یقین اور صحبت اولیاء کاملین سے ہوگا کم از کم ان کی وعظ کی مجالس کی حاضری اور یا ان سے عقیدت و محبت سے وابستگی ضروری ہے ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں اولیاء اللہ کی مجالس ظاہری حاضری اور ان سے معنوی مناسبت نصیب فرمائے اس لیے کہ وُہی عطا کرتا یا بخشتا اور معانی و حقائق سے فیضیاب فرماتا ہے ۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ یہ اضافت بمعنی فی ہے جیسا کہ گزرا ہے یعنی اے میرے قید کے ساتھیو !

اَمَّآ اَحَدُكُمَا بہرحال تمہارا ایک ۔ اس سے بادشاہ کو پانی پلانے والا مراد ہے صراحۃً اس کا نام مذکور نہیں اس لیے کہ تعبیر کے اظہار پر خود بخود معلوم ہوجائے گا کہ یہاں وہی مراد ہے کہ جس کے خواب کی تعبیر بتائی جارہی ہے۔

فَيَسْقِي پس پلائے گا رَبَّهٗ اپنے سردار کو خَمْرًا شراب ؛ جیسے پہلے پلاتا تھا ۔ مروی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اُس سے خواب کی کیفیت پُوچھی تو اس نے کہا کہ خواب میں میرا بادشاہ میرے ساتھ خوش تھا اور اس کا حُسن سلوک اور کرم نوازی محسوس ہوتی تھی اور میں بھی اس کے سامنے اپنے حال میں تھا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ، بہت خُوب اور بہتر خواب ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ساتھ بادشاہ کو پہلے کی طرح مہربانی اور لطف و کرم ہوگا بلکہ اسی سے زائد مہربانی اور عزت و احترام نصیب ہوگا صرف تین دن باقی ہیں اس کے بعد تجھے بادشاہ جیل سے نکال کر اپنے پاس بلا کر پہلے کی طرح خدمت میں مقرر فرمائے گا اس طرح سے تیری عزت پہلے سے بھی زیادہ ہوگی وَ اَمَّا الْاٰخَرُ اور دُوسرا یعنی روٹی والا فَیُصْلَبُ اسے سُولی چڑھایا جائے گا فَتَاْکُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ تو اس کے سر کو پرندے کھائیں گے۔ مروی ہے کہ جب روٹی والے نے اپنا خواب سنایا تھا تو یوسف علیہ السلام نے اسے فرمایا تیرا خواب بہت بُرا ہے تو تیسرے دن قید خانے سے نکالا جائے گا اور تیرے لیے حکم ہوگا کہ اسے سُولی پر لٹکایا جائے جب تو سُولی پر لٹکایا جائے گا تو تیرے سر کو پرندے کھائیں گے۔ کواشی میں لکھا ہے کہ سر کو پرندے کھانے سے ہی تیسرے روز قید خانے سے نکلنے کی تعبیر نکالی گئی قُضِیَ الْاَمْرُ امر الٰہی پُورا ہو گیا اور جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے وُہ ہو کر رہے گا۔

سوال: الامرُ کی طرف قُضِیَ کا اسناد ہے حالانکہ یہ تو ان کے احوال میں سے ایک حال ہے یعنی ایک کا نجات پانا اور دُوسرے کا تباہ و برباد ہونا۔

جواب: اس لیے کہ امر ان کے احوال کی حقیقت کا عین ہے۔

ف: حضرت یوسف علیہ السلام عالمِ مثال میں ان دونوں کے خوابوں کی مثالی صورت سامنے آگئی تھی۔

الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ۝ وُہ خواب جس کے متعلق تم مجھ سے تعبیر پُوچھا کرتے تھے۔

تیرے مُنہ سے جو بات نکلی وُہ ہو کر رہی

مروی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتائی تو دونوں نے کہا ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارے خواب سچے ہیں یا جھوٹے۔ لیکن میرے منہ سے جو بات نکلی ہے وُہ ہو کر رہے گی۔

سوال: انکار تو صرف شراب پلانے والے نے کیا تھا حضرت یوسف علیہ السلام نے دونوں کو اپنے حکم میں شامل کر لیا۔

جواب: چونکہ ساتھی نے انکار کیا تو اس کے انکار میں دُوسرے کو بھی حکم میں شامل کر لیا ہے۔

ف: جس طرح یُوسف علیہ السلام نے شراب والے کو فرمایا ویسے ہی ہُوا کہ بادشاہ نے حکم فرمایا کہ شراب والے کو قید خانے سے میرے پاس لاؤ۔ جب اسے بادشاہ کے ہاں لایا گیا تو بادشاہ نے اسے خلعت سے نوازا اور بہت بڑے انعام و اکرام بخشے کیونکہ بادشاہ کو یقین ہو گیا تھا کہ شراب والا بالکل بے گناہ ہے بلکہ شاہی امور میں دیانت دار ہے اور روٹی والے کو قید خانہ سے نکال کر حکم فرمایا کہ اس کے کپڑے اتارو اور خُوب کوڑے مارو یہاں تک کہ وُہ مر جائے اس لیے کہ وہ بادشاہ کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ بدباطن ہے روٹی والے کو مارنے کے بعد حکم فرمایا کہ اسے شارع عام پر سُولی لٹکا دو۔ چنانچہ جب اُسے سُولی لٹکایا گیا تو کالے سیاہ پرندے آئے تو پہلے اس کے سر کو کھایا بعد میں دیگر اعضاء کو۔

ف: مجرم کو سُولی پر چڑھانے کی سزا سب سے پہلے اسی بادشاہ مصر نے دی پھر مُوسیٰ علیہ السلام کے ہمزمان فرعون نے

کما قال اللہ تعالیٰ:

وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ۔

گستاخِ مصطفیٰ کی سزا

مروی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ بدر سے واپس ہوئے تو عرق الظبیہ سے گزرے (عرق الظبیہ ایک بڑا سایہ دار درخت ہے جس کے سایہ کے نیچے گرمیوں میں بیٹھتے تھے) حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے قیدی عقبہ بن ابی معیط کو سُولی پر لٹکانے کا حکم فرمایا۔ یہ اسلام میں پہلا کافر ہے جو سُولی پر لٹکایا گیا۔ یہ بدبخت حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ معظمہ میں بہتان تراشتا تھا اور اس نے ایک دفعہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر تھوکا تھا۔

ف: مجرم کی سزاؤں میں سُولی پر لٹکایا جانا سخت ترین سزا ہے اس لیے کہ سُولی پر لٹکانے سے رُوح بدن میں پھنس جاتا ہے جس کا نکلنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: حاکمِ وقت کسی بھی مجرم کو سُولی پر لٹکا سکتا ہے جب کہ اس کا جرم شدید ہو اور اس کی سزا اسی طرح موزوں ہے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔

تفسیر صوفیانہ

نفس رُوح کو کبھی شہوات و لذاتِ نفسانیہ کی شراب پلاتا ہے اور کبھی اسی سے گندے معاملات کا ارتکاب کراتا ہے۔

ف: مجاہدات کشف و کرامات اور مشاہداتِ ربانی کی شراب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نفس بادشاہ کی روح کی ہمیشہ خدمت کرتا ہے اسی لیے ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور بدن کو موت کی رسی سے سُولی پر لٹکایا جاتا ہے تو روح کے معاونین پرندے اس کے سرے ام الدماغ میں جمع شدہ خیالاتِ فاسدہ کو ختم کر دیتے ہیں۔

ف: موت انسان کے لیے سخت ترین شے ہے مرنے کے بعد انسان سے ہر شے ختم ہو جاتی ہے سوائے تین چیزوں کے۔ یاد رہے کہ قلب کی صفائی اور طہارت یعنی دنیا کی گرد و غبار سے قلب کا پاک و صاف ہو جانا اور ایسی طہارت معرفتِ الٰہی کے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور معرفتِ الٰہی ذکر و فکر کے دوام سے حاصل ہوتی ہے اور خیر الاذکار توحید ہے۔

حدیث شریف

ذکرِ الٰہی ایمان کی علامت ہے اور منافقت سے براءت اور شیطان سے حفاظت اور جہنم سے نجات کا موجب ہے۔

حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

دلت آئینۂ خدا نما ست

روے آئینۂ تو تیرہ چرا ست

صیقلے داری صیقلے مے زن

باشد آئینۂ ات شود روشن

میقل آں اگر نہ آگاہ

نیست جز لا الٰہ الا اللہ

ترجمہ: تیرا قلب خدا نما آئینہ ہے۔ پھر تیرا آئینہ زنگ آلود کیوں ہے۔ مصقلہ تیرے پاس ہے۔ دل کے زنگ کو اسی مصقلہ سے صاف کر۔ اگر تجھے اس مصقلہ کا علم نہیں تو میں بتاؤں وہ مصقلہ ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَ اور یوسف علیہ السلام نے فرمایا لِلَّذِیْ ظَنَّ اسے جس کے متعلق یوسف علیہ السلام کو یقین تھا اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا کہ ان دونوں میں وہ نجات پانے والا ہے۔ یعنی بادشاہ کا ساقی۔

ف: یہاں پر ظن بمعنے وثوق وعلم ہے اس لیے کہ ظن لغات اضداد سے ہے۔ اس میں گمان اور علم دونوں کا معنے پایا جاتا ہے لیکن یہاں پر یقین تھا کیونکہ آپ کا علم تعبیر وحی ایزدی سے تھا جیسا کہ قضی الامر نے واضح ہوتا ہے کیونکہ اگر یوسف علیہ السلام کی تعبیر عامیانہ ہوتی تو آپ اسے قضی الامر سے تعبیر نہ فرماتے اس لیے کہ قضا کا اطلاق الزام الجازم و الحکم القاطع پر ہوتا ہے اسے ظنی تعبیر کہنا جہالت ہے۔

اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ مجھے اپنے بادشاہ کے ہاں یاد کرنا اور اسے کہنا کہ قید خانہ میں ایک نوجوان ظلم کے طور محبوس ہے اور اس کی قید کو طویل عرصہ گزر رہا ہے اُمید ہے جب تم اسے میرا ماجرا سناؤ گے تو اسے میرے حال پر رحم آئے گا تو جیل سے مجھے بلوائے گا۔ س

بگو ہست اندران زندان غریبے

ز عدل شاہِ دوراں بے نصیبے

چنین اش بے گنہ مپسند رنجور

کہ ہست ایں از طریق معدلت دور

ترجمہ: اسے کہنا کہ قید خانے میں ایک مسافر ہے جو بادشاہ زمانے کے عدل سے بے نصیب ہے ایسے بے گناہ پر اتنی بڑی تکلیف نہ پہنچاؤ اس لیے کہ آپ کے عدل سے یہ بات کوسوں دُور ہے۔

ف: جب ساقی کو بادشاہ کا قرب نصیب ہوا تو جاہ و منزلت کے نشہ اور خمار کی وجہ سے اسے قید اور قیدیوں کی تمام باتیں بھول گئیں۔

فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ اس ساقی کو شیطان نے بھلا دیا۔ یعنی شیطان نے اسے معاملات میں ایسا مشغول رکھا کہ اسے یوسف علیہ السلام یاد نہ رہے چونکہ شیطان کا وسوسہ ساقی کے بھولنے کا سبب بنا اسی لیے اس کی طرف فعل کا اسناد ہے ورنہ درحقیقت انساء (بھلانا) اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس معنے پر فاء سببیہ ہے وہ اس لیے کہ

یوسف علیہ السلام کی وصیت غیر اللہ سے استعانت کو متضمن تھی اسی لیے اسے بھلا یا گیا ذِکْرَ رَبِّہٖ بادشاہ کے ہاں یوسف علیہ السلام کا ذکر۔

سوال: یوسف علیہ السلام کو ساقی کا رب (آقا) کیسے۔

جواب: معمولی مناسبت کے پیش نظر یوسف علیہ السلام کو ساقی کا رب (آقا) کہا گیا (فقیر اویسی غفرلہٗ کہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام چونکہ زنداں میں اس کے راہ ہدایت کے سبب بنے اور ہادی نبی علیہ السلام و پیرومرشد اپنے امتیوں اور مریدین کے آقا ہوتے ہیں۔

مزید توضیح برائے سوال یہ عبارت دراصل ذکرہ لربہ ہونی چاہیے تھی یعنی مصدر مفعول بہ کی طرف مضاف ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ مصدر ہمیشہ فاعل یا مفعول صریح کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ لیکن یہاں مفعول غیر صریح کی طرف مضاف ہوا صرف ادنیٰ ملابست کی وجہ سے حضرت جامی قدس سرہٗ نے فرمایا: ؎

چناں رفت آں وصیت از خیالش
کہ بر خاطر نیامد چند سالش
نہال وعدہ اش مایوسی آورد
بزنداں بلا محبوسی آورد
بلٰی آں را کہ ایزد برگزیند
بصدر عز معشوقی نشیند
رہ اسباب درویشی بہ بندد
رہین این و آنش کم پسندد
نخواہد دست او در دامان کس
اسیر دام خویشش خواہد و بس

ترجمہ: اس کے ذہن سے یوسف علیہ السلام ایسا محو ہوا کہ چند سال تک اسے یوسف علیہ السلام یاد بھی نہ رہے۔

لہ ہم بھی غیر اللہ کی استعانت کو شرک کہتے ہیں لیکن اگر استعانت بمعنے وسیلہ ہو تو وہ عین اسلام ہے لیکن یوسف علیہ السلام کے لیے خلاف اولیٰ تھا اس لیے کہ ادنیٰ اعلیٰ سے وسیلہ پکڑیں تو حرج نہیں لیکن اعلیٰ ادنیٰ سے استعانت حاصل کریں تو معیوب ہے بالخصوص اس ہستی کے لیے جس کا کام بلا وسیلہ ہوتا ہو۔ ۱۲ اویسی غفرلہٗ

۲۔ وعدہ کی خوشی کے بعد مایوسی چھا گئی۔ قید خانہ میں چند سال پھر محبوس رہے۔

۳۔ ہاں جسے اللہ تعالیٰ چنتا ہے تو اسے صد اعزاز سے مرتبۂ محبوبی میں بٹھاتا ہے۔

۴۔ اسباب درویشی کے باندھ کر این و آں کے تصورات سے فارغ ہو جاتا ہے۔

۵۔ وُہ اپنے دامن سے کسی کا ہاتھ لگنا پسند نہیں کرتا وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں ہی مستغرق رہے۔

ف: القصص میں ہے کہ زلیخا نے عزیز سے کہا کہ یوسف علیہ السلام کو قید خانے سے نکالا جائے لیکن ان سب کو عرصہ دراز تک یاد نہ رہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل سے یوسف علیہ السلام کا خیال اٹھا لیا۔

فَلَبِثَ اسی بھلانے یا ساقی کو کہنے کی وجہ سے ٹھہرے رہے فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ○ اس کا منصوب ہونا علی الظرفیۃ ہے اس سے پانچ سال کے بعد پانچ سال اور مراد ہیں۔

حدیث شریف مروی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اخی یُوسف علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے کہ انہوں نے اگر اذکرنی عند ربک نہ کہا ہوتا تو وہ جیل میں پانچ سال کے بعد سات سال نہ رہتے۔

بارہ[۱۲] عدد کے نکات ۱۔ یوسف علیہ السلام اذکرنی عند ربک کے اعداد حروف ابجد کے مطابق بارہ سال جیل میں رہے اس لیے کہ قید خانہ میں دو ساتھیوں کے ساتھ پانچ سال گزارے۔ جب انہوں نے خواب دیکھا تو وہ جیل سے چلے گئے۔ ساقی کو اذکرنی عند ربک فرمایا تو اس کے بعد سات سال جیل میں رہے۔

۲۔ بارہ کے عدد میں ائمہ اثنا عشرہ[۱] کی طرح بڑی تاثیر ہے۔

۳۔ جیسے بارہ بروج میں عجیب تاثیر ہے۔

۴۔ ایسے ہی ان بارہ بروج پر بارہ[۱۲] فرشتے مقرر ہیں عالم دنیا کے ائمہ اور تمام عالم انہی بارہ فرشتوں کے ماتحت ہیں۔

۵۔ انہی بارہ کے عدد کی تاثیر کی وجہ سے حدیث شریف میں فرمایا گیا:

اثنا عشر الفاً من یغلب عن قلۃ۔ (بارہ ہزار لشکر ہو تو کوئی طاقت ان کو مغلوب نہیں کر سکتی۔

مسئلہ: اسی لیے حکم ہے کہ بارہ ہزار لشکرِ اسلام کو کسی طاقت کے سامنے سرنگوں نہ ہونا چاہیے۔

۶۔ لا الٰہ الا اللہ کے بارہ حروف۔

۷۔ محمد رسول اللہ کے بھی بارہ حروف ہیں۔

---

[۱] اس سے شیعہ والے ائمہ مراد نہیں بلکہ یہ وہ بارہ ائمہ ہیں جنھیں ہم نے بحث امامت ردّ شیعہ میں لکھا ہے۔

۸۔ ان کے ہر حرف کے بارہ ہزار دروازے ہیں۔ اس معنیٰ پر توحید کے بارہ ہزار ابواب ہیں۔

۹۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بارہ سال قید خانے میں ٹھہرانے میں بھی یہی حکمت تھی کہ آپ کے لیے اہل السمٰوٰت و الارض کے جملہ کمالات کی تکمیل ہو۔

۱۰۔ عدد مذکور میں یوسف علیہ السلام مع آپ کے برادران کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ بارہ کے عدد میں جمیعت کمالیہ کی قوت ہے۔

سوال: تم اہلسنت کہتے ہو کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں لیکن یہاں تو فانساہ الشیطٰن سے یوسف علیہ السلام کی عصمت کے خلاف معاملہ ہوگیا۔

جواب ۱: یہ اعتراض اس وقت وارد ہوتا جب ہٗ کا مرجع یوسف علیہ السلام ہوں یہاں تو اس کا مرجع بادشاہ کا ساقی ہے جیسے ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔

۲۔ اگرچہ یوسف علیہ السلام کو مرجع ماننے کا احتمال ہے لیکن عصمت کے مسئلہ میں ظنیات کو دخل نہیں ہوتا وہاں قطعیات کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ اگر مان لیا جائے کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کے دل سے ذکرِ الٰہی بھلایا تاکہ آپ غیر اللہ سے استعانت حاصل کریں تو بھی یہ اغواء و اضلال از شیطان میں اسے داخل نہیں کیا جا سکتا تاکہ عصمت کے منافی ہو بلکہ زیادہ سے زیادہ اسے ترک اولیٰ و افضل کے باب سے کہا جا سکتا ہے اور وہ عصمت کے منافی نہیں جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا۔

سوال: خلاف اولیٰ و افضل کا حربہ تم اہلسنت خوب استعمال کرتے ہو لیکن تمہارا یہ حربہ نہایت کمزور ہے اس لیے کہ خلاف اولیٰ افضل پر اللہ تعالیٰ کا عتاب کیوں حالانکہ خلافِ اولیٰ و افضل پر عتاب نہیں ہوتا۔

جواب: یہ انبیاء علیہم السلام کے اعلیٰ مراتب اکمل اور کمالات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے خلافِ اولیٰ بھی نہیں دیکھنا چاہتا اس میں اس کی حکمت ہوتی ہے اسی لیے جب ان سے یہ سرزد ہوتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ آگاہ فرما دیتا ہے ورنہ ہم ہزاروں کبائر میں گرفتار ہوں تو بھی ہمیں عتاب نہیں ہوتا قیامت میں ثابت ہوگا کہ عوام کے بڑے بڑے کبائر پر سخت سے سخت عتاب ان کی دوری کی علامت ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خلاف اولیٰ کو محبوبانہ عتاب ان کے قرب و نزدیک کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو محبوبانہ عتاب بھی اسی لیے ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو کر غیر اور وہ بھی اپنے ایک امتی اور مرید سے کیوں استعانت کی اگرچہ فی نفسہٖ استعانت محمود ہے لیکن وہ عوام کے لیے اور خواص کے لیے بایں معنیٰ مذموم ہے کہ جب ان کا کام اللہ تعالیٰ بلا واسطہ غیر خود کرتا ہے تو پھر یوسف علیہ السلام نے غیر سے استعانت کیوں کی[1] (کذا فی الکواشی)

---

[1] مزید تشریح مسئلہ استعانت میں دیکھیے۔

سوال : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور سرور عالم کو ایک شب نیند نہ آئی آپ اپنے نگران سے گفتگو فرماتے رہے یہاں تک کہ حضرت سعد آئے تو پھر آپ کو نیند آئی یہاں تک کہ میں نے خراٹے سُنے۔

جواب : یہ استعانت کے طور نہیں بلکہ آپ اس سے مانوس ہونے کی بنا پر گفتگو کرتے رہے۔ اور حضرت سعد کا تشریف لانا حضور علیہ السلام کے لیے سہارے کا سبب نہیں تھا بلکہ اس میں ایک اور وجہ تھی تفصیل ہم نے "الاستمداد" میں بیان کی ہے۔ (کذا فی حواشی المفتی سعدی)

حکایت مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام قید خانے میں یوسف علیہ السلام کے ہاں تشریف لائے یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا اور فرمایا کہ اے ڈرانے والوں کے بھائی! آپ نے مجھ میں کون سی خطا پائی کہ مجھے خطاکاروں کے زمرہ میں داخل کیا۔ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ میری کیا مجال! مجھے تو آپ کے صدقے اور آپ کے اجداد انبیاء علیہم السلام کے صدقے عزت ملی ہے میں تو سفیر محض ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے آپ کو پہنچاتا ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام بھیجے ہیں اور فرمایا کہ آپ کو خیال بھی نہ آیا کہ آپ نے غیر سے استعانت کی۔ مجھے اپنی ذات کی قسم ہے میں آپ کو سات سال اور قید خانہ میں ٹھہراؤں گا۔ یوسف علیہ السلام نے پوچھا یہ بات جیسے ہوئی لیکن یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ میرے اوپر راضی ہے یا ناراض۔ مجھے قید میں رہنے کا غم نہیں اس کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یوسف علیہ السلام پر واجب تھا کہ وہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتدا کرتے کہ غیر سے مدد نہ چاہتے۔

حکایت مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا جارہا تھا تو جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی : هل لك حاجة۔ (میرے لیے کوئی خدمت)

ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا : اما الیك فلا۔ اگرچہ ضرورت تو ہے لیکن تیرے کہنے کی نہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا : فسل ربك۔ تو اپنے رب تعالیٰ سے عرض کیجئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا : حسبی سوالی علمه۔ جب میرے حال کو وہ جانتا ہے تو پھر میں کیوں کہوں۔

ف[1] : اس واقعہ کو لے کر وہابی دیوبندی کہتے ہیں کہ وسیلہ پکڑنا حرام۔ ان غریبوں کو سوچنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام اعلیٰ ہو کر ادنیٰ سے کیسے وسیلہ پکڑیں۔ غور سے دیکھیے کہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا جارہا تھا کہ وہ توکل کے میدان میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں یہاں وسیلہ وغیرہ کا کوئی سروکار نہیں۔ اگر وہابیہ دیوبندیہ کا استدلال صحیح مان لیا جائے تو پھر خدا تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی حرام ہو۔ (معاذ اللہ) اس لیے کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے سے بھی انکار کیا۔ جبکہ انہیں جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی : فسل ربك۔ تو آپ نے فرمایا : حسبی سوالی

---

[1] یہ فقیر اویسی غفرلہ کا اضافہ ہے۔ ۱۲

اِلَیْہِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰہِلِیْنَ ۔

حکایت حضرت مالک بن دینار سے منقول ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے ساقی سے فرمایا کہ اپنے بادشاہ کو میرا بھولا فسانہ سنانا تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام سے فرمایا کہ تو میرے سوا دوسرے کو کفیل بنا رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے عرض کی یا اللہ! میرے دل کو کثرت احزان اور مصائب نے گھیر لیا ہے ایسا کلمہ آئندہ نہیں کہوں گا۔

حکایت حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ پڑھ کر خوب روتے کہ ہم دن میں کئی بار غیر سے اپنی مشکلات پیش کرتے ہیں نہ معلوم ہمارا کیا حال ہوگا۔ حضرت کمال خجندی نے فرمایا ہے

کیست در خور کہ رسد دوست بفریادرسش
آنکہ فریاد ز جور و ستم او نکند
پارسا پشت فراغت نہد بر محراب
گر کند تکیہ چرا بر کرم او نکند

ترجمہ: وہ کون ہے جو دوست کے ہاں اس کی یاد کے بغیر پہنچے پھر اس کے جور و ستم سے فریاد بھی کرتا ہو پارسا جو سوائے اس کے کسی کے دروازے پر سر نہیں جھکاتا تو پھر وہ اس کے حال پر کیوں نہ رحم فرمائے۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ یوسف (قلب) صفاتِ بشریہ کی جیل میں نفس سے کہتی ہے کہ اذکرنی عند ربک ۔ اپنے آقا (روح) کے ہاں مجھے یاد کرنا اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائے سلوک میں قلب نفس کو اچھے معاملات کی رہبری کرتی ہے تاکہ ان معاملات پر عمل کرنے سے روح کو تقویت نصیب ہو بلکہ قلب بارہا نفس کو اس خمر سے پیداشدہ غفلت سے بیدار کرتی ہے معاملات روحانیہ کے ذریعہ قلب صفات بشریہ کی قید سے فلاح کی جد و جہد کرتی ہے اور اس میں الطاف سے بھی استمداد کرتی ہے اور شیطان کوشش کرتا ہے کہ نفس سے دل کے الہامات مٹا کر رکھ دے تاکہ روح کے سامنے اس کے معاملات بیان نہ کرے۔

دوسری تقریر شیطان نے قلب کو ذکر الٰہی سے بھلا دیا یعنی اس سے ذکر الٰہی بھولا تو اس نے نفس کو کہا کہ روح کے سامنے میرا تذکرہ کرنا اگر قلب بجائے نفس کو کہنے کے اللہ تعالیٰ کو کہتا تو اچھا ہوتا اور وہ چند سال صفاتِ بشریہ جو کہ بمنزلہ سات سالوں کے ہیں کی قید میں نہ رہتا اور وہ صفات یہ ہیں:

۱۔ حرص ۲۔ بخل ۳۔ شہوت ۴۔ حسد ۵۔ عداوت ۶۔ غضب
۷۔ کبر (کذا فی التاویلات النجمیہ)

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ
خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۝
قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ۝ وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا
وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝

ترجمہ: اور بادشاہ نے کہا کہ میں نے خواب میں سات موٹی گائیں دیکھیں جنھیں سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیں اور دُوسری سات سُوکھی۔ اے میرے درباریو! اگر تم خواب کی تعبیر دے سکتے ہو تو میری اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔ وہ بولے کہ یہ پریشان خوابیں ہیں اور ہم خواب کی تعبیر کے عالم نہیں اور وُہ بولا جوان دونوں قیدیوں میں سے رہا ہُوا تھا اور اسے ایک مدّت کے بعد یاد آیا۔ میں تمہیں اس کی تعبیر کی خبر لاؤں گا آپ مجھے (جیل خانے) تک جانے کے لیے اجازت دیجئے۔

تفسیر عالمانہ وَقَالَ الْمَلِكُ اس سے ریان بن ولید مراد ہے یعنی بادشاہ نے کہا اِنِّیْۤ اَرٰى میں خواب میں دیکھتا ہُوں سَبْعَ بَقَرٰتٍ سات گائیں سِمَانٍ سمینہ کی جمع اور بقراتٍ کی صفت ہے۔ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ کھاتی ہیں انھیں اور سات کمزور گائیں عجافٌ عجفاً کی جمع ہے قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی جمع عجف آئے اس لیے کہ افعل وفعلاء کی جمع فعال نہیں آتی لیکن اسے اپنی نقیض یعنی سمان پر محمول کیا گیا ہے اور العجف بمعنے الھزال دُبلا خستہ ہونا الاعجف بمعنے الاھزل۔

ف: مروی ہے کہ یُوسف علیہ السلام کا جیل سے نکلنے کا وقت قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا سبب بنایا کہ جس کا کسی کو خیال تک نہ تھا۔ ؎

۱ بسا قفلہا کہ ناپیدا کلید ست
برو راہ کشائش ناپدید ست

۲ زناگہ دست صنعی درمیان نے
بنقش ہیچ صانع را گمان نی

۳ بدید آید زغیب آں را کشادے
ودیعت در کشادش ہر مرادے

۴ چوں یوسف دل ز حیلتہائے خود کند
برید از رشتۂ تدبیر پیوند

۵ بجز ایزد نماند او را پناہے
کہ باشد در نوائب تکیہ گاہے

۶ ز پندار خودی و بخردی رست
گرفتش فیض فضلے ایزدی دست

ترجمہ: ۱۔ بہت سے ایسے تالے ہوتے ہیں جن کی چابیاں ناپید ہوتی ہیں کہ ان کے دروازوں کا کھلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ کہیں سے اس کے متعلق امید نہیں ہوتی نہ ہی کسی سے کھلنے کا گمان ہوتا ہے۔

۳۔ اس کے کھلنے کے لیے غیب سے کوئی سبب نکل آتا ہے اس میں ہر امید کی کشائش امانت رکھی ہوئی ہے۔

۴۔ جب یوسف علیہ السلام کا دل تمام اسباب سے فارغ ہو چکا اور تمام تدابیر کے تاگے توڑ بیٹھے۔

۵۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی پناہ نظر نہ آئی کہ انھیں مشکلات میں کام دے۔

۶۔ اپنی عقل کے تمام چارے ختم کر بیٹھے کہ فضل ربانی نے آپ کی دستگیری فرمائی۔

ف: مروی ہے کہ بادشاہ یعنی ریان بن ولید ہر سال دریائے نیل پر ایک جشن مناتا تھا جس میں اس کی تمام رعایا جمع ہوتی انھیں اسی روز بہترین طعام اور لذیذ کھانے کھلاتا اور بہترین اور اعلیٰ شراب پلاتا تھا اور خود ایک تخت پر بیٹھ کر ان سب کا نظارہ کرتا تھا ایک جمعہ کی رات خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں خشک نہر یا دریا سے نکلیں تو ان کے پیچھے سات گائیں جو نہایت کمزور اور دُبلی خستہ حال تھیں ان کے پیچھے آئیں اور موٹی گائیوں کو نگل گئیں اور ان کے پیٹ میں ایسی چھپ گئیں کہ ان کے ہونے کا معمولی شُبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

وَسَبْعَ اور میں دیکھتا ہوں سات **سُنْبُلٰتٍ** سنبلہ کی جمع ہے بمعنے بالیں **خُضْرٍ** خضراء کی جمع اور سنبلٰت کی صفت ہے یعنی سات سبز اور تازہ خوشے کہ جن کے دانے کھلے اور پک کر ظاہر ہو چکے ہوں **وَّاُخَرَ** اور سات دیگر **یٰبِسٰتٍ** خشک اور سُوکھے ہُوئے جو کاٹنے کے لائق ہوں سُوکھے سبز خوشوں کو لپٹے اور ان پر غالب ہو گئے چونکہ وہاں بقرٰتٍ میں تفصیل ذکر فرمائی ہے اسی لیے یہاں اجمال سے کام لیا گیا ہے۔

ف: بادشاہ نے جب خواب دیکھا تو جاگنے پر پریشان ہُوا کہ ناقص کامل پر کیوں غالب ہو گیا فطرت انسانی سے مجبور ہو گیا کہ اس خواب میں شر و فساد ضرور ہو گا اسے اپنے لیے اور ملکت کے متعلق خدشات پیدا ہو گئے اس لیے طبیعت نے مجبور کیا

کہ اس کی تحقیق کی جائے اسی لیے اپنے تمام اعیان مملکت و ارکان سلطنت کو جمع کر کے کہا:

یٰاَیُّھَا الْمَلَاُ یہ برگزیدہ جماعت علماء و حکماء کو خطاب ہے یا جادوگروں اور منجمین وغیرہم کو۔ اب معنٰے یہ ہو گا کہ جادوگر اور خواب کی تعبیر دینے والو اور قوم کے سردارو! اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ مجھے میرے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اور اس کا صحیح حل تلاش کرو کہ اس کا انجام بکار کیا ہو گا۔ یعنی مجھے اس کا صحیح جواب دو۔ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ۝ اگر تم خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہو۔ یعنی تمہیں اس کے انجام کا اگر دائمی علم حاصل ہے تو بتاؤ۔

ف: بادشاہ نے جو خیالی صورتیں خواب میں دیکھی تھیں اب چاہتا ہے کہ ان کی مثالی صورتیں جو آفاق و انفس میں موجود ہیں وہ واقع میں خارجی موجود ہوں اور ہیں انھیں سمجھ جاؤں۔

ف: جس صورۃ کو دیکھے اس سے دوسری طرف متجاوز ہونے کو تعبیر و عبارت کہا جاتا ہے اور عبرت الرؤیا بمعنے اثبت یعنی میں نے اس کی تعبیر بیان کی للرؤیا کی لام بیانیہ اور سوال کا جواب ہے۔

سوال یہ ہے جب بادشاہ نے کہا ان کنتم تعبرون تو سائل نے سوال کیا کہ ہم کیا بیان کریں تو بادشاہ نے کہا للرؤیا۔ کتب نحو میں اس لام کا ذکر نہیں ہے۔

ف: خواب تعبیر کا طالب ہے اس لیے کہ خیالی صورتیں عالم محسوسات میں ظاہر ہونا چاہتی ہیں۔

سوال: ابراہیم علیہ السلام نے جب صاحبزادے کی خواب میں ذبح کی کیفیت دیکھی تو انھیں چاہیے تھا کہ وہ اس کی کوئی تعبیر تلاش کرتے لیکن انہوں نے اس کے بجائے خود صاحبزادے کو ذبح کرنے کی ٹھان لی یہ تو خواب کی تعبیر کے خلاف ہے۔

جواب ۱: دراصل انہوں نے عزیمت پر عمل کیا اور تعبیرات میں رخصت پر عمل کیا جاتا ہے اور شرع میں اصل عزیمت پر عمل کرنا ہے۔

۲۔ اگر آپ تعبیر کو دوسرے معنیٰ میں لیتے تو لوگوں کو ان کی اور ان کے صاحبزادے کی تسلیم و رضا کا کمال کیسے معلوم ہوتا۔

سچا خواب اور حدیث شریف کی تصدیق

امام تقی ابن مخلد صاحب المسند فی الحدیث نے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے انھیں دودھ پلایا ہے۔ امام صاحب نے جاگتے ہی فوراً قے کر دی اور قے سے واقعی دودھ نکلا۔ اس سے امام موصوف اس حدیث شریف کی تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے واقعی مجھے دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آ سکتا۔

ف: صاحب روح البیان نے فرمایا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کی کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور دودھ پلانے کی کوئی تعبیر ڈھونڈنے کے بجائے اس نے دودھ مبارک نکال کر بہت سے بڑے علوم سے محروم ہو گیا۔ اس لیے

کہ حضور علیہ السلام کا دُودھ پلانا علوم کثیرہ پر دلالت کرتا ہے۔

نکتہ: دُودھ کو علم سے اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے کہ جس طرح حیوان، انسان پیدا ہوتے ہی پہلے دُودھ پیتا ہے تو زندگی پاتا ہے ایسے ہی علم سے انسان کا قلب زندہ ہوتا ہے۔

خواب میں نبی علیہ السلام کی زیارت کے قواعد

۱۔ جو شخص حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی صورتِ مبارکہ میں دیکھتا ہے جس صورت پر آپ کا وصال ہوا اس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو اس صورت مبارکہ میں جو حکم فرمائیں اور جس امر سے روکیں اور جس بات کی خبر دیں وہ سب حق ہیں اس میں کسی قسم کے تغیر و تاویل کی ضرورت نہیں یُوں سمجھے کہ دُنیا میں یعنی ظاہری حیات میں آپ سے احکامِ شرعیہ حاصل کیے جاتے تھے۔ اسی طرح اگر یہ شخص اس وقت ہوتا تو ایسے ہی احکام پاتا۔

۲۔ اگر اس حکم میں کچھ اجمال ہو تو پھر وُہ خواب قابلِ تغیر و تبدیل و تاویل ہوگا۔

۳۔ خواب میں اگر حضور علیہ السلام کسی کو کوئی شے عطا فرمائیں تو اس کی تعبیر کی جائے گی۔ (جیسے دُودھ کو علم سے تعبیر کیا گیا)

۴۔ اگر حضور علیہ السلام کی زیارت ایسی صورت میں ہو جو ظاہر زندگی کے خلاف ہو تو اس میں اوّلاً تو اس کی کوئی تعبیر نہیں، اگر کی جائے تو دیکھنے والے کے قصور اور کمی پر محمول کیا جائے[1]

حکایت بعض مشائخ نے حضور علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے حضور علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کو طمانچہ مارا، جاگے تو گھبرائے کہ کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور کہاں میں، اور پھر طمانچہ مارنا۔ تعبیر پوچھنے کے لیے کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خواب سنایا تو اس بزرگ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام پر کسی کا تصرف کیسا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضور علیہ السلام کے احکام کے متعلق کوئی کمی ہوگی اور طمانچہ سے مراد یہ ہے کہ تجھ سے کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوگیا ہے۔ وہ بزرگ حیران ہوگیا اور تعبیر سنانے والا خود بھی۔ اس لیے کہ خواب دیکھنے والا ایسا نہیں تھا کہ جس سے کبیرہ گناہ کے ارتکاب کا وہم ہو سکے۔ خواب کی تعبیر سن کر پریشانی کے عالم میں گھر واپس آیا۔ بزرگ کی اہلیہ نے اسے محزون و مغموم دیکھ کر حال پُوچھا تو بزرگ نے فرمایا کہ ایسا خواب میں نے دیکھا ہے اور اس طرح اس کی تعبیر مجھے بتائی گئی ہے۔ آپ کی اہلیہ نے متعجب ہو کر عرض کیا، گھبرایئے نہیں میری غلطی ہے اور اس سے میں خود بھی توبہ کرتی ہوں اور آپ کو بھی توبہ کی عرض کرتی ہوں۔ واقعہ دراصل یُوں ہے کہ آپ نے ایک دفعہ قسم کھائی تھی کہ اگر میری زوجہ میرے فلاں دوست کے گھر چلی گئی تو اسے طلاق ہے ایک دن میں آپ کے اس دوست کے گھر سے گزر رہی تھی

---

[1] دیوبندیوں وہابیوں نے خوابوں کے ذریعے حضور علیہ السلام کی سخت توہین اور گستاخیاں کی ہیں تفصیل فقیر کی کتاب "التحقیق الکامل" میں دیکھئے۔

تو وہ مجھے عاجزی وزاری سے گھر لے گیا اگرچہ میں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے عجز و نیاز کی وجہ سے جانا پڑا۔ آپ کی قسم کی وجہ سے میں آپ پر حرام ہوگئی لیکن مارے شرم کے آپ کو بتا نہ سکی اور اتنی مدت حرام کاری ہوتی رہی۔ نیک بخت انسان یہ سنتے ہی تائب ہونے اور بار بار استغفار کی اور آہ وزاری کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ اس کے بعد اس کی عورت نے عدت گزاری پھر از سرِ نو نکاح ہوا۔

قواعد برائے زیارت باری تعالیٰ ۱۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی ایسی صورت میں زیارت کی جو شرعی دلیل کے مطابق نہیں تو اسے خواب والے کے کسی نقصان پر محمول کیا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو شرع کے موافق ہو۔

۲۔ اگر ایسی صورت نظر آئے جو اللہ تعالیٰ کے شان کے لائق نہ ہو۔ جیسے باری تعالیٰ کے وہ اسماء جن کا شرعاً اللہ تعالیٰ پر اطلاق جائز نہیں تو ہم بھی ان اسماء کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں کریں گے ایسے شرع کے غیر موافق خواب کو اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ دیکھنے والے کو یا اس کے کسی مکان کی طرف نقص کو منسوب کریں گے یا دونوں کی کمی متصور ہوگی۔

حکایت بلادِ عرب میں کسی نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس کے گھر میں تشریف لایا ہے اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ بھی نہ کی بلکہ اسے ایک تھپڑ مارا۔ جاگا تو اس خواب سے سخت پریشان ہوا اور خواب کی کیفیت حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ کو سنائی تو شیخ نے پوچھا خواب کس جگہ دیکھی۔ اس نے کہا اپنے گھر میں، اور وہ میرا اپنا ذاتی زر خرید ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ جس جگہ تیرا گھر ہے وہ زمین مغصوبہ ہے وہ زمین شرع کے کسی حق سے چھین کر بیچی گئی ہے تو نے اس کی تحقیق کیے بغیر خریدی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے زمین کی تحقیق و تفتیش شروع کر دی تو معلوم ہوا کہ وہ زمین مسجد پر وقف شدہ تھی۔ کسی نے ناجائز قبضہ کر کے بیچی ہے۔ صاحبِ مکان نے توبہ و استغفار کی۔

ف : شیخ اکبر نے یہ تعبیر اس لیے بتائی کہ وہ شخص نیک آدمی تھا اس میں کسی قسم کا شرعی نقص نہیں تھا اسی لیے اسے مکان کے نقص پر محمول فرمایا جو پورے طور پر صحیح اترا۔

۳۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تجلی کو نور کی صورت میں دیکھا جائے مثلاً سورج وغیرہ۔ اسی طرح سبز یا سفید نور دیکھنا اور تمام نورانی کوائف یہ سب صورتیں حق کی طرف منسوب ہوں گی کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کو نوری صورت میں آخرت میں دیکھا جائیگا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی زیارت بھی ہر ایک کی استعداد کے مطابق ہوگی۔

سبق : انسان کو زیارت حق سے اپنے مراتب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ورنہ بہت سے بڑے سمجھداروں کے ایسی زیارت سے ایمان تباہ ہو جاتے ہیں۔

حدیث شریف قیامت میں اللہ تعالیٰ بندوں کے سامنے معمولی صورت میں جلوہ گر ہوگا تو بندے عرض کریں گے یہ صورت اللہ تعالیٰ کی نہیں ہوسکتی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صورت کمال و عظمت کے ساتھ نظمہ

آئے گی تو اسے دیکھ کر تمام لوگ سجدے میں گر جائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ خواب میں اللہ تعالیٰ کے جلوے معمولی صورت میں اور کبھی اعلیٰ صورت میں نظر آتے ہیں اسی لیے نقص کے وقت کی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے صاحبِ رؤیا یا اس کے مکان کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے کیونکہ خواب ایک عالم کی مثال ہے اس کی تعبیر اسی کے موافق ہونی چاہیے۔ اسی لیے بادشاہ نے کہا: اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۔

قَالُوْٓا یہ جملہ مستانفہ بیانیہ اور سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جماعت نے بادشاہ سے کیا کہا تو اس کے جواب میں فرمایا کہ جماعت نے کہا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بادشاہ سلامت آپ کا خواب پریشان خواب ہے۔ یعنی محض جھوٹی باتوں کی ملاوٹ اور خیالی معاملہ یا وسوسہ شیطانی ہے کیونکہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے:

۱۔ منجانب اللہ

۲۔ شیطان کا ڈرانا

۳۔ نفس کے خیالات (جیسا کہ حدیث شریف)

ف: اضغاث ضغث بالکسر یعنی گھاس کا ایک مٹھا جس میں خشک و تر کے چند تنکے ہوں۔ اور اصطلاح میں وہ خواب جس میں خیالی اور جھوٹی باتیں مل جائیں۔ اور احلام، حلم بضم اللام و سکونہا۔ جھوٹے خواب کہ جن کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

حدیث شریف حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خواب دو ہیں:

۱۔ منجانب اللہ

۲۔ منجانب الشیطان

اور اضغاث کی احلام کی طرف اضافت لجین الماء کے قبیل سے ہے۔ (کذا فی حواشی سعد المفتی)

سوال: بادشاہ کا خواب تو ایک تھا لیکن اسے اضغاث جمع کے ساتھ کیوں بیان کیا گیا ہے۔

جواب۱: اس کے بطلان کے مبالغہ کی وجہ سے اس لیے کہ جیسے لفظ جمع ذوات کی کثرت پر دلالت کرتا ہے ایسے صفات بھی کثرت پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں:

"فلان یرکب الخیل" حالانکہ وہ صرف ایک گھوڑے کی سواری کرتا ہے۔

جواب۲: چونکہ خواب مختلف اشیاء مثلاً سبع سمان و سبع عجاف اور سنابل سبع خضر و یابسات کو متضمن ہے اسی لیے جمع کا صیغہ لایا گیا۔

نکتہ: قرآن پاک کی بلاغت پر غور کیجئے کہ اضغاث سنابل کے مقابل لایا گیا ہے۔ جیسے سنابل میں بکھراؤ ہوتا ہے ایسے ہی اضغاث میں۔

وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ اور جن خوابوں کی اصل کوئی نہ ہو بِعٰلِمِيْنَ ○ ہم نہیں جانتے یعنی بادشاہ سلامت! یہ سمجھئے کہ ہم تعبیرات کو نہیں جانتے بلکہ جب خواب کی حقیقت ہی کوئی نہیں تو پھر تعبیر کا کیا معنیٰ! اس لیے کہ تعبیر تو سچے خوابوں کی ہوتی ہے۔

ف: اس کا یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے قصور علم کا اعتراف کیا کہ تعبیرات کا علم نہیں رکھتے۔ اب معنیٰ یہ ہُوا کہ یہ خواب مختلف اشیاء سے ملی ہوئی ہے اور مختلف خیالات کو حقائق عقلیہ روحانیہ کی طرف منتقل ہونا آسان کام نہیں اور ہم علم تعبیر میں اتنا بڑا علم نہیں رکھتے کہ جس سے ہم اس جیسے دقیق خواب کی تعبیر بیان کر سکیں۔ چنانچہ بادشاہ کا کہنا ان کنتم للرؤیا تعبرون بھی اسی تقریر کی تائید کرتا ہے اس لیے کہ اگر بادشاہ کو ان پر شک نہ ہوتا تو قطعی طور کہتا اسے معلق بالشرط نہ کہتا۔

جواب ۳: مان لیا کہ ان میں بعض متبحر فی علوم التعبیر ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر سے ان کو جواب سے اندھا اور عاجز کر دیا تاکہ یہی خواب یوسف علیہ السلام کے قید خانے سے نجات پانے کا سبب بن جائے اور آپ کا کمال ان سب کو معلوم ہو۔

وَقَالَ الَّذِىْ نَجَا مِنْهُمَا یوسف علیہ السلام کے قید کے ساتھیوں میں سے جس نے نجات پائی تھی یعنی شراب والے نے کہا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اور اس نے یاد کیا عرصہ کے بعد وہ قول جو اسے یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ ادّکر دراصل اذتکر تھا افتعال تا دال ہُوئی پھر ذال کو دال میں مدغم کیا گیا۔[1] اُمَّةٍ وہ طویل مدت جو اجتماع ایام کثیرہ سے حاصل ہو۔ اس سے سات سال مراد ہیں جیسے لفظ امۃ جمع عظیم کے اجتماع سے حاصل ہوتی ہے ایسے ہی ایام وساعات کے اجتماع سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ جملہ الذی سے حال ہے۔

ف: کاشفی نے لکھا ہے کہ بادشاہ ریان اپنی جماعت علما و حکما وغیرہ کا جواب سُن کر متحیر ہُوا اور فکر میں پڑ گیا کہ اب اس مسئلہ کا حل کون کرے گا جب تک مجھے اس کی تعبیر معلوم نہ ہو گی میں پریشان ہوں گا۔ گویا کہتا تھا:

یارب ایں خواب مرا تعبیر چیست

(یا اللہ! میرے اس پریشان خواب کی تعبیر کیا ہو گی)

بادشاہ کے ساقی نے دیکھا کہ بادشاہ خواب کی وجہ سے پریشان ہے تو اسے یوسف علیہ السلام یاد آ گئے اور اپنا نقشہ سامنے آ گیا کہ وہی تو خواب کی تعبیر بتاتے تھے اسی لیے بادشاہ کو عرض کرں۔ چنانچہ باادب ہو کر بادشاہ کے سامنے بیٹھ گیا اور عرض کی: اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ میں تمہیں خواب کی تعبیر بتاؤں گا۔

---

[1] تفصیل فقیر کی شرح "ابواب الصرف" میں دیکھیے۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَ
سَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ۝
قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا
تَأْكُلُونَ ۝ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا
قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ۝ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ
يَعْصِرُونَ ۝ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ
فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ۝ قَالَ مَا
خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ
قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ
الصَّادِقِينَ ۝ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ۝

ترجمہ : اے یوسف اے صدیق ہمیں تعبیر دیجیے کہ سات موٹی گائیں ہیں جنھیں سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیں ہیں اور دیگر سات خشک بالیں ہیں۔ شاید میں لوگوں کے ہاں واپس لوٹ جاؤں، شاید انھیں بھی معلوم ہو جائے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تم سات سال لگاتار کھیتی کرو گے جو کاٹو اسے اس کی بال میں رہنے دو مگر تھوڑا سا کہ جتنا کھا سکو پھر اس کے بعد سات سال ایسے سخت آئیں گے جو تمہارے جمع کردہ تمام اناج کو کھا جائیں گے مگر تھوڑا سا جسے تم بچا رکھو گے پھر ان کے بعد ایک ایسا برس آئے گا جس میں لوگوں کو بارش دی جائے گی اور وہ اس میں رس نچوڑیں گے اور بادشاہ نے کہا یوسف علیہ السلام کو میرے ہاں لے آؤ جب ان کے ہاں قاصد حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا اپنے بادشاہ کے ہاں واپس جا کر اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے بیشک میرا رب تعالیٰ ان کے مکروفریب کو خوب جانتا ہے۔ بادشہ نے کہا تمہارا کیا معاملہ ہے جبکہ تم نے یوسف علیہ السلام کو ورغلایا۔ عورتیں بولیں اللہ تعالیٰ کے لیے پاکی ہے ہم نے یوسف علیہ السلام میں کوئی برائی نہیں پائی۔ عزیز کی عورت نے کہا کہ اب تو حق واضح ہو گیا میں نے ہی یوسف علیہ السلام کو ورغلایا تھا اور وہ بے شک سچے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میں نے اس لیے کیا تاکہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے غائبانہ اس کی خیانت نہیں کی اور (تاکہ معلوم ہو) کہ اللہ تعالیٰ دغابازوں کا مکر چلنے نہیں دیتا۔

(تفسیر اگلے صفحہ پر)

(بقیہ تفسیر صفحہ ۴۴۳)

سوال : جماعت کو خطاب کیوں کیا حالانکہ خواب توصرف بادشاہ نے دیکھا تھا۔

جواب : بادشاہ کو تعظیماً جمع کا صیغہ کہا۔

فَاَرْسِلُوْنِ ○ پس مجھے قید خانے میں بھیجئے وہاں آلِ یعقوب سے ایک دانا اور تعبیر بتانے والا مردِ خدا ہے۔ ان کا اسمِ گرامی یوسف علیہ السلام ہے وہ تعبیرِ خواب کے بڑے ماہر ہیں انہوں نے ہمیں بھی خوابوں کی تعبیر بتائی تھی۔

ے

بود بیدار در تعبیر ہر خواب
دلش از غوص ایں دریا گہریاب
اگر گوئی برو بکشایم ایں راز
وزو تعبیر خوابت آورم باز
بگفتا اذن خواہی چیست از من
چہ بہتر کور را از چشم روشن
مرا چشم خرد ایں لحظہ کور ست
کہ از دانستن ایں راز دور ست

ترجمہ : وہ ہر خواب کی تعبیر بتانے کے ماہر تھے ان کا دل ایسے دریا سے موتی حاصل کرنے کا غواص تھا اگر اجازت ہو تو انھیں اس کا راز ظاہر کروں اور ان سے اس کی تعبیر پوچھ آؤں۔ بادشاہ نے کہا اس کی اجازت کی کیا ضرورت ہے اندھے کو تو روشن آنکھ چاہیے۔

(تفسیر صفحہ ۴۴۴)

تفسیر عالمانہ

ربط : بادشاہ نے یہ خبر سُن کر اپنے غلام شراب پلانے والے کو قید خانے میں بھیج دیا تاکہ یوسف علیہ السلام کو لائے۔ جب وُہ غلام حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تو سب سے پہلے اپنی کوتاہی کی معافی مانگی۔ پھر کہا یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اے سچے یُوسف (علیہ السلام)! ۔ صدق میں مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس صیغے کے استعمال کا مقصد یہی تھا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کے حالات دیکھے اور آپ کی تعبیر بتانے کو بارہا آزمایا آپ جو بات بتاتے ہیں سچی ہوتی ہے۔ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ یعنی ہمیں اس خواب کی تعبیر بتایئے کہ جسے بادشاہ نے دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں انھیں سات دُبلی اور پتلی گائیں کھا گئی ہیں ایسے ہی سات سبز بالوں کو دُوسری سات بالیں نگل گئی ہیں۔

سوال: اَفْتِنَا میں جمع کی ضمیر کیوں، حالانکہ خواب تو صرف بادشاہ نے دیکھا تھا اور پھر پوچھنے والا بھی ایک تھا۔
جواب: اگرچہ پوچھنے والا ایک تھا لیکن یہ عام عادت ہے کہ معمولی مناسبت سے دُوسرے لوگ اپنا نام ساتھ گنا دیتے ہیں بالخصوص جب وُہ مناسبت والا ذی شان واحترام ہو اور چونکہ وہ سفیر محض تھا اس لیے خواب کے وہی الفاظ بیان کیے جیسے بادشاہ کے مُنہ سے نکلے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کے الفاظ میں اضافہ وکمی نہ کرکے سفارت کا حق ادا کیا۔
لَعَلِّیٓ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ تاکہ جواب لے کر میں بادشاہ اور اس کے ارکانِ دولت کی طرف لوٹوں لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ تاکہ وہ آپ کی برکت سے کچھ خواب کی تعبیر معلوم کرسکیں قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ج یہ سوال مقدر کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے کیا فرمایا؟ تو جواب ملا کہ یُوسف علیہ السلام نے فرمایا سات سال مسلسل کھیتی باڑی کریں۔ دَاَبًا، دَاَبَ فِي الْعَمَلِ سے ہے بمعنی جَدَّ فِيهِ وَتَعَبَ (اس کام میں اس نے جدّوجہد اور سبقت کی ہے) اور اس کا منصوب ہونا تزرعون کے فاعل سے بوجہ حال ہونے کے ہے۔ یہ دراصل بمعنے دائبین تھا یعنی حسبِ دستور کھیتی باڑی میں مسلسل محنت ومشقت سے کام لیں۔
ف: الزرع والحرث میں فرق یہ ہے کہ الحرث زمین کو کھیتی کے لیے تیار کرنے اور اس میں بیج ڈالنے کو کہتے ہیں۔ الزرع کہتے ہیں بیج ڈالنے کے بعد کھیتی کی نگرانی اور اسے پانی وغیرہ دینے کو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۔
اللہ تعالیٰ نے آیت ہذا میں ان کے لیے حرث اور اپنے لیے زرع بمعنے طرح البذر فرمایا ہے۔ زَرَعَ بمعنے اَنْبَتَ ہے۔ (کذا فی القاموس)
خلاصہ یہ کہ یُوسف علیہ السلام نے انھیں خبر دی کہ سات سال مسلسل کھیتی باڑی کریں اور سخت محنت ومشقت سے کام کریں کیونکہ اس سے خوشحالی متحقق ہوگی۔ سَبْعَ بقراتٍ سے یہی مراد ہے اور اس کی تعبیر یہی ہے اور امر نافع یہی تھا بلکہ اس سے ان کے مزید فوائد مرتب ہوں گے۔
فَمَا حَصَدْتُّمْ پس وہ جو تم ہر سال اناج بیج وغیرہ اٹھاتے رہو فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ پس اسے چھوڑ دو ان کے خوشوں میں، لیکن انھیں صاف کرکے چھوڑے نہ رکھو تاکہ غلّہ کو دیمک نہ کھا جائے جیسا کہ مصر اور اس کے گرد ونواح کا حال ہُوا کہ ان کے غلّہ کو دیمک کھا گئی۔ یُوسف علیہ السلام نے غلّے کو خوشوں میں رکھنے کا حکم اس لیے فرمایا کہ ان کی یہ عادت نہیں تھی اور کھیتی باڑی تو وہ عام طور پر کرتے تھے اسی لیے اس کا حکم نہیں فرمایا گویا وہ ایک محقق الوقوع امر ہے اور خواب کی تعبیر بھی اسی کے مناسب بتائی گئی اور ایسے ہی سات موٹی گائیں بھی اِلَّا قَلِيْلًا مگر بقدرِ ضرورت مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ○ کہ اسی سال کھاؤ اور اتنے خوشے غلّے کے لیے صاف کر لیا کرو جو اسی سال کھانے کے کام آئیں۔
ف: اس میں یُوسف علیہ السلام نے ایک حکمتِ عملی بتائی کہ خوراک میں فضول خرچی سے بچ جائیں اور اتنا صاف کریں

جتنا کھانے کے کام آ سکے بیج کے متعلق کوئی ہدایت نہ دی اس لیے کہ بیج تو بلا کم وکاست پڑتا ہے اس میں قناعت کا کیا معنےٰ
اور پھر اسے تزرعون سبع سنین میں ذکر کر چکے ہیں اسی لیے دوبارہ ضرورت نہیں تھی۔
ربط : ان کے امور جس وجہ سے تکمیل پذیر ہونے تھے بیان کر دیا تو بعد کو خواب کی تعبیر بیان فرمائی۔
ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ اس کا عطف تَزْرَعُوْنَ پر ہے۔ یعنی ان قحط کے سالوں کے بعد آئیں گے
سَبْعٌ شِدَادٌ شداد، شدید کی جمع ہے یعنی سات سال ایسے سخت آئیں گے جن سے لوگ صعوبتوں اور مشکلات
میں مبتلا ہوں گے اور انھیں شِدَادٌ اس لیے کہا گیا کہ انسان کو قید اور قتل سے زیادہ سخت بھوک لگتی ہے یَّاْكُلْنَ
مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ کھا جائیں گے تمہارے وُہ ذخائر جو تم نے جمع رکھے ہوں گے یعنی تمہارے دانے اور خوشوں کا جمع شدہ
تمام انبار ختم ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ یُوسف علیہ السلام کا ذخیرہ اندوزی کا حکم بوجہ ضرورت تھا۔
سوال : سال تو احوال کا نام ہے تو اناج وغیرہ کے کھانے کا کیا معنیٰ۔
- جواب : یہ اسنادِ مجازی ہے جیسے نہارہٗ صائمٌ میں اسنادِ مجازی ہے۔
ف : اس میں کمزور گائیوں کے کھانے کی تعبیر، اور لَهُنَّ میں اسی کی تشریح ہے گویا آپ نے ان سنابل کو ان
آنے والے قحط کے سالوں کے لیے ذخیرہ بنایا جیسے ایک آنے والے مہمان کے تشریف لانے سے پہلے اشیاءِ خوردنی
تیار کر کے رکھ دی جاتی ہیں۔ یہ مجاز اس معنیٰ پر ہے کہ یہ اشیا کھائی تو انسان نے ہیں لیکن اسناد سال کی طرف ہے۔
اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ○ مگر تھوڑا اناج جسے تم نے بیج وغیرہ کے لیے جمع اور ذخیرہ کیا ہے۔ ثُمَّ یَاْتِیْ
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ان مذکورہ اور موصوفہ سالوں کہ ان میں شدۃ اور قحط ہوگا کے بعد آئے گا عَامٌ ایسا سال کہ
فِیْهِ اس میں یُغَاثُ النَّاسُ لوگ بارش دیے جائیں گے۔ یہ مجرد کا باب ہے اس کا الف یا سے تبدیل
ہو کر آیا ہے۔ مثلاً :

غاثنا اللہ۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے بارش عطا فرمائی۔

یہ غیث سے باع کی طرح اجوف یائی ہے یہ بھی جائز ہے کہ غوث سے ہو۔ اب معنیٰ یہ ہوگا شدۃ سے پناہ مانگتے تھے۔
اس تقریر پر یہ اغاث سے ہوگا۔ اب معنیٰ یہ ہوگا کہ اس نے ہمیں پناہ دی۔ یہ غوث سے ہوگا۔ اس کا الف واؤ سے
تبدیل ہو کر آیا ہے وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ○ اور انگوروں، کماد، زیتون اور تل جیسی اشیا کو نچوڑیں گے کیونکہ ان میں
یہ اشیا بکثرت ہوں گی اس لیے غیث وغوث ہر دو فعل اللہ تعالیٰ کے لائق ہیں اور نچوڑنا بندوں کا کام ہے۔
ف : اس سال کے مسائل بادشاہ کے خواب سے متعلق نہیں بلکہ یُوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی منجانب اللہ معلوم ہُوا۔
(گویا یہ بھی یُوسف علیہ السلام کے علمِ غیب کی ایک دلیل ہے)
خلاصہ یہ کہ یُوسف علیہ السلام نے پہلے سات سال موٹی گائیوں اور سبز خوشوں کی تعبیر سے انھیں خوشحالی کی

خوشخبری سُنائی۔

ف : موٹی گائے جنس حیوانات سے ہے لیکن اسے کمزور اور دُبلے اور سرسبز خوشوں کو کہ جن میں اچھی اور کڑوی اور پانی صاف اور گدلا سب کو سُوکھی بالیاں کھا گئیں۔ اس سے سمجھ لیا گیا کہ سال میں ہر حسین و قبیح امر ہوتا ہے اسی لیے جب وُہ آئے گا تو اپنے ماضی کے امور اپنے اندر سمولے گا۔ اور یُوسف علیہ السلام نے بادشاہ کی باتوں یعنی گائیوں اور بالیوں سے یہ سمجھا کہ اوّل یعنی موٹا اور سرسبز ہونا کبیر پہ دلالت کرتا ہے جو اعلیٰ شے سے عبارت ہے اور دُبلا اور سُوکھا ہونا صغیر پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں بلا و مصیبت مضمر ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے لفظ خضر کی خا سے خیر اور ضاد سے ضُو مراد لی اور یابس کو یاس (ناامیدی) پر محمول فرمایا۔ (کذا فی شرح الفصوص للشیخ مویدالدین الجندی قدس سرہٗ)

صاحبِ رُوح البیان کا بیان

صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ گائیوں اور بالیوں کی تخصیص اس لیے کہ انسان کی سب سے بڑی اور بکثرت کام میں آنے والی غذا گندم ہے خواب میں اسی طرف اشارہ تھا کہ لوگ اپنی تنگی معاش میں گندم کی قلت میں مبتلا ہوں گے اس لیے کہ یہی ان کی اعلیٰ اور ضرورت میں بار بار آنے والی شے ہے اگرچہ دُوسری اشیاء میں بھی قحط اور تنگی ہو گی لیکن اس کے تابع ہو کر۔

تفسیر صوفیانہ

سبع بقرات سمان سے صفاتِ بشریہ مراد ہیں وہ یہ ہیں :

- حرص
- بخل
- شہوت
- حسد
- عداوت
- غضب
- کبر

اور اعجاف سے صفات روحانیہ مراد ہیں اور وہ بھی سات ہیں اور صفات بشریہ کی نقیض وہ یہ ہیں :

- قناعت
- سخاوت
- عفت
- غبطہ
- شفقت
- حلم
- تواضع

بادشاہ سے رُوح اور ملک مصر سے بشریت اور اس کی جماعت سے جوارح و حواس و قویٰ مراد ہیں اور بادشاہ یعنی رُوح ملکوت میں تصرف اور اس کے شواہد کی معرفت اسے نصیب نہیں جب تک قلب اس کی مدد نہ کرے اسی لیے نجات پانے والے شرابی سے نفس ملہمہ مراد ہیں اور یہ جب ملکوت سے کسی شئے کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو یوسف یعنی

قلب سے مدد لیتا ہے جب قلب نفس مہلمہ کو ملکوت کے شواہد کا پتہ دیتا ہے اس لیے کہ قلب کو ملکوت اور اس کے شواہد کی معرفت کا علم ہے اسی قلب سے نفس مہلمہ معلومات پاتا ہے کیونکہ قلب کو روحانیات اور نفس کے مابین ترجمان مقرر کیا گیا ہے اس لئے قلب جو کچھ روحانیت سے علوم حاصل کرتا ہے تو اس کی خبر نفس قلب کو۔ نفس مہلمہ کے خبر دینے کے تین طریقے ہیں:

۱۔ لسان خیال

۲۔ فکر سلیم

۳۔ الہام

تزرعون سبع سنین دأبا میں صفات بشریہ کی تربیت کی طرف اشارہ ہے کہ ان صفات سبعہ کی عادت وطبیعت کے ذریعہ تربیت دی جائے لیکن وہ بھی سن طفولیت یعنی قبل بلوغ ظہور عقل اور قلم تکلیف کے جریان سے پہلے فما حصدتم یعنی ان صفات کے کمال جب تمہیں قبل بلوغ محسوس ہوں تو انھیں عمل میں نہ لاؤ فذروہ بلکہ انھیں اپنی جگہ رہنے دو فی سنبلہ اس کی بالی میں الا قلیلاً مگر اس مقدار میں کہ اس سے زندگی بسر کر سکو اس لیے کہ یہ بمنزلہ غذا کے ہے اور یہ بھی اسی لیے کہ قلب یعنی جسم کے قیام کی مصلحتیں اسی طرح ہیں یہاں تک کہ وہ سن بلوغ تک پہنچ جائے اور عقل کے نور کا زجاجۂ قلب سے مصباح سر میں مکمل طور ظہور ہو گویا وہ عقل ایک چمکتا ہوا نورانی ستارہ ہے اور قاعدہ ہے کہ جب نور عقل کو بلوغ کے بعد انوار تکالیف شرع کی تائید اور الہام حق کا شرف نصیب ہوتا ہے تو عقل کو نفس کے فجور یعنی صفات بشریہ سبعہ اور اس کا تقویٰ یعنی ان صفات سبعہ سے اجتناب اور صفات روحانیہ سبعہ کا پتہ چل جاتا ہے۔

ف: سات دُبلی صفات روحانی موٹی صفات بشریہ کو کھا جاتی ہیں۔ اور روحانی صفات کو دُبلی اس لیے کہا گیا کہ وہ عالم ارواح سے ہیں اور عالم ارواح لطیف سے ہے۔ اور صفاتِ بشریہ دوسری شئے ہیں اور وہ کثیف ہیں۔ اسی لیے صفات بشریہ کو سمانٍ (موٹی) کہا گیا ہے اور قاعدہ ہے کہ صفات روحانیہ کا صفات بشریہ پر غلبہ پا جانے سے صفات بشریہ باقی نہیں رہ سکتیں مگر تھوڑی، اتنی مقدار میں کہ اس سے انسان اپنے قالب جسم کی زندگی بچا سکے۔ جب انسان پر صفاتِ روحانیہ کا غلبہ ہوتا ہے تو اس میں صفاتِ بشریہ مضمحل ہو جاتی ہیں اس وقت اسے محسوس ہوتا ہے اسے جذبات عنایہ میں اس وقت انسان اپنے معاملہ دُنیویہ و اُخرویہ سے بالکل بیزار ہو جاتا ہے یعنی ان کے ساتھ اسے کسی قسم کا سروکار نہیں رہتا بلکہ اپنے وجود کی قید اور انانیت کے حجابات ایک طرف پھینک دیتا ہے اس کا ہر کام بلکہ اس کا ملجا و ماوی حق تعالیٰ ہوتا ہے۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

حضرت کمال خجندی نے فرمایا: ؎

جامہ بدہ جان ستان روی مپیچ از زبان

عاشق بے مایہ عین زیانست سود

سرفنا کوش کن جام بقا نوش کن

حاجت تقریر نیست کز عدم آمد وجود

ترجمہ: جامۂ جان ستان دے اسے لپیٹ کے نہ رکھ اس لیے عاشق بے مایہ کے نزدیک زیاں کا نام نفع ہے سر کو فنا کرنے کی کوشش کر اس سے بقا کا جام پی تقریر کی حاجت ہی نہیں اس لیے کہ سب کو معلوم ہے کہ عدم سے وجود آیا ہے۔ (اے اللہ! ہمیں اصحاب فنا و بقا و ارباب لقا سے بنا۔ آمین)

تفسیر عالمانہ وَقَالَ الْمَلِكُ اور بادشاہ مصر یعنی ریان نے کہا ائْتُونِي بِهِ یوسف علیہ السلام کو میرے ہاں لاؤ وہ اس لیے کہ جب شراب والے غلام نے یوسف علیہ السلام سے تعبیر خواب سن کر واپس جا کر بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ اور تمام ارکانِ دولت اور اعیانِ سلطنت انگشت بدندان رہ گئے۔ بادشاہ نے چاہا کہ یوسف علیہ السلام کو اعزاز و اکرام کے ساتھ بلوائے اور ان کی زبانِ اقدس سے بذاتِ خود تعبیر خواب سُنے۔ ؎

سخن کز دوست آری شکر است آں

ولے گر خود بگوید خوشتر است آں

ترجمہ: دوست کا سخن شکر سے میٹھا ہے لیکن اگر اس کی زبان سے سنا جائے تو مزید لذیذ ہوتا ہے۔

اس لیے کہا کہ یوسف علیہ السلام کو میرے ہاں لاؤ۔ بادشاہ کا حکم لے کر شراب والا خادم یوسف علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوا فَلَمَّا جَاءَهُ جب یوسف علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوا الرَّسُولُ قاصد یعنی شراب والا خادم تاکہ یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے بادشاہ کے ہاں لے جائے۔ ؎

کہ اے سروِ ریاضِ قدس بخرام

سوئے بستان سرائے شاہ نہ گام

ترجمہ: اے باغِ قدس کے سرو! تشریف لے چلیے، بادشاہ کے دولت خانہ میں قدم رنجہ فرمائیے۔

یعنی خادم نے عرض کی کہ آپ کو بادشاہ بلا رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے جیل خانے سے نکلنے سے انکار کر دیا۔ قَالَ یوسف علیہ السلام نے قاصد سے فرمایا ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ اپنے سردار کے ہاں واپس جا فَاسْأَلْهُ اس سے سوال کیجئے تاکہ وہ عوام سے سوال کرے بلکہ پوری تحقیق و تفتیش کرے مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي کیا حال ہے ان عورتوں کا قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ جنہوں نے زلیخا کی مجلس میں اپنے ہاتھ کاٹے تھے اس کی تفصیل گزری۔

بگفتا من چہ آیم سوئے شاہی
کہ چوں من بنے کسی را بے گناہی
بزنداں سالہا محبوس کردست
ز آثار کرم مایوس کردست
اگر خواہد کہ من بیرون نہم پائے
ازیں غمخانہ گو اول بفرمائے
کہ آنانی کہ چوں رویم بدیدند
ز حیرت در رخسم کفہا بریدند
کہ جرم من چہ بود از من چہ دیدند
چرا رختم سوئے زنداں کشیدند
بود کین سر شود بر شاہ روشن
کہ پاکست از خیانت دامن من
مرا بہ گزنم ثقب خزائن
کہ باشم در فراش خانہ خائن

ترجمہ : ۱۔ یُوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بادشہ! میں تیرے ہاں کیسے آؤں میں بے گناہ ہوں۔
۲۔ مجھے ایک عرصہ تک مقید رکھا اور اپنے آثار کرم سے محروم رکھا۔
۳۔ اگر وُہ چاہتا ہے کہ میں جیل سے باہر آؤں اور اس غمخانہ سے نکل آؤں اسے کہو کہ وہ
۴۔ ان عورتوں کو حکم فرمائے جنھوں نے میرا چہرہ دیکھ کر حیرت سے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔
۵۔ ان سے پوچھو کہ اُنھوں نے میرا کون سا جرم دیکھا جس کی وجہ سے انہوں نے مجھے جیل میں بھیج دیا تھا۔
۶۔ یہ بھی اسی لیے تاکہ بادشاہ کے سامنے واضح ہو جائے کہ بُرائی سے میرا دامن پاک ہے۔
۷۔ میں چوری کرنے سے ترجیح دیتا ہوں بہ نسبت اس گناہ کے کہ بادشہ کے حرم خانہ میں خیانت کروں۔

سوال : یُوسف علیہ السلام نے زلیخا کا نام کیوں نہ لیا حالانکہ جیل میں بھیجنے کا اصل سبب تو وہی تھی۔
جواب : چونکہ یُوسف علیہ السلام زلیخا کے زرخرید تھے اس کا پاس ادب اور اس کی تربیت سابق مدنظر تھی علاوہ ازیں

یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ جیل میں بھیجنے کا اصل موجب وہی عورتیں تھیں جنہوں نے زلیخا کو طعن وتشنیع کی اور ان عورتوں کا افشا راز میں زیادہ ہاتھ تھا حالانکہ زلیخا تو اپنی غلطی کا اعتراف (انا راودتہ عن نفسہ فاستعصم) پہلے کر چکی تھی۔

سوال: یوسف علیہ السلام نے قید خانہ سے نکلنے کی یہ شرط کیوں لگائی کہ پہلے حالات کا جائزہ لیا جائے۔

جواب: تاکہ بادشاہ بالخصوص عزیز کو حقیقتِ حال معلوم ہو جانے کہ یوسف علیہ السلام کا واقعی کوئی قصور نہیں اور وہ بے گناہ جیل میں بھیجے گئے ہیں تاکہ آئندہ حاسدین پر طعن وتشنیع کا دروازہ بند ہو اور آپ کے کمال عقل اور صبر کا ظہور ہو اور نہایت اعزاز سے جیل خانہ سے باہر تشریف لائیں اس سے حاسدین خود اعتراف کریں اور عزیز کو پورا یقین ہو کہ اگر یہ جیل خانہ میں قصور کی وجہ سے قیدی تھے تو جونہی بادشاہ نے بلایا تھا فوراً باہر آجاتے۔ لیکن بارہ سال گزرنے کے باوجود پہلے اپنی برأت کی تحقیق کرانا چاہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوگا کہ ان پر صریح تہمت اور سفید جھوٹ تھا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اپنے سے تہمت دور کرنے میں پوری جدوجہد کی جائے بلکہ تہمت کے مواقع سے بچنے کے لیے پورا زور لگایا جائے۔

حدیث شریف ۱ جو شخص اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر لازم ہے کہ تہمت کے مواقع سے بچے۔

حدیث شریف ۲ ایک دفعہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف فرماتے تھے آپ کے پاس آپ کی زوجہ محترمہ تشریف فرما تھیں۔ مسجد اعتکاف سے دو صحابیوں کا گزر ہوا تو انھیں بی بی صاحبہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ میری زوجہ ہے۔ آپ نے صرف اس لیے فرمایا کہ انھیں غلط خیال نہ گزرے اور آپ پر تہمت کا گمان نہ کریں۔

حدیث شریف ۳ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے یوسف علیہ السلام کی پختگی اور صبر کی تعریف فرمائی جب انھیں بادشاہ نے جیل خانہ سے بلایا تو یوسف علیہ السلام نے جیل خانہ سے نکلنے میں جلدی نہ فرمائی۔ چنانچہ آپ کے ارشادِ گرامی کا ترجمہ یوں ہے کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے کرم صبر پر تعجب ہے اللہ تعالیٰ انھیں بخشے کہ جب ان سے دُبلی گائیوں اور موٹی گائیوں کے خواب کی تعبیر کا سوال ہوا تو آپ نے حل فرمایا اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا تو میں انھیں خواب کی تعبیر بعد کو بتاتا پہلے جیل خانے سے نکلنے کا کہتا اور پھر مجھے ان سے تعجب ہے کہ جب قاصد آیا اور عرض کی کہ آپ کو بادشاہ بلاتا ہے تو آپ نے قاصد سے فرمایا ارجع الی ربک الخ اگر میں ان کی جگہ پر قید میں ہوتا تو میں بادشاہ کے بلاوے پر جلدی کرتا اس وقت یہ سوال بھی نہ کرتا کہ میرے مخالفین کے متعلق تحقیق و تفتیش کی جائے وہ حلیم تھے اور ذوا ناۃ یعنی عجلت کار نہیں تھے۔

ف: الحلم بکسر الحاء ظالم سے بدلہ لینے میں تاخیر کرنا اور الاناۃ بروزن القناۃ بمعنے التانی یعنی ترک عجلت۔

ازالہ وہم ابن الملک نے فرمایا کہ اس سے کسی کو وہم نہ ہو کہ معاذ اللہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں صبر نہیں تھا یا معاذ اللہ آپ تکلیف اور دکھ برداشت نہیں کر سکتے تھے بلکہ اس سے صرف یوسف

علیہ السلام کی مدح وثنا کا اظہار مطلوب تھا اور انھیں عجلت اس لیے نہ تھی تاکہ بادشاہ کے ذہن سے یہ وہم دور ہو کہ یوسف علیہ السلام کے اندر بُرائی کا ارادہ ہے۔ تاکہ آئندہ کے امور کی سپردگی کے وقت وہ یوسف علیہ السلام کو مشکوک نگاہ سے نہ دیکھے۔

۲۔ طیبی نے فرمایا کہ یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع کے طور فرمایا اس سے یہ وہم بھی نہ کیا جائے کہ آپ اپنے امور میں عجلت کا رستے معاذ اللہ یا حوصلہ نہیں رکھتے تھے بلکہ تواضع کا سبق دیا کہ اپنے بزرگوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے اور نہ ہی کم درجہ کو اتنا بڑھایا جائے بلکہ اپنے اکابر کی قدر و منزلت (جیسا کہ ان کی شان ہے) کو ظاہر کیا جائے۔

اِنَّ رَبِّیْ بے شک میرا معبود برحق بِكَيْدِهِنَّ عورتوں کے مکر و فریب کو عَلِيْمٌ ۝ خوب جانتا ہے جس وقت انھوں نے مجھے کہا کہ اپنی مالکہ کا حکم مان لے اس سے یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا رہے ہیں کہ واقعی عورتوں نے آپ پر تہمت لگائی ورنہ آپ ہر طرح سے بری الذمہ تھے گویا یوسف علیہ السلام نے واضح فرمایا کہ میرے رب تعالیٰ کو معلوم ہے کہ یہ سارا پروگرام عورتوں کے مکر و فریب پر مبنی تھا وہ خود بھی اس کا اعتراف کریں کہ واقعی یوسف علیہ السلام کا دامن بے داغ ہے۔ ؎

جوانمرد ایں سخن چوں گفت بادشاہ
زنان مصر را کردند آگاہ
کہ پیش شاہ یکسر جمع گشتند
ہمہ پروانۂ آں شمع گشتند

ترجمہ: جب شراب والے خادم نے یہ بات بادشہ کو کہی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ مصر کی عورتوں کو خبر دے دیں کہ تمام کی تمام بادشاہ کے ہاں جمع ہو جائیں۔

جب حاضر ہوئیں تو قَالَ انھیں بادشاہ نے کہا مَا خَطْبُكُنَّ تمھارا کیا حال تھا اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ جب تم نے مطالبہ کیا یوسف علیہ السلام سے اس کے نفس کا تو اس وقت یوسف علیہ السلام کا تمھاری طرف کچھ میلان تھا۔ ؎

کزاں شمع حریم جاں چہ دید
کہ بروے تیغ بد نامی کشیدند
ز رویش در بہار و باغ بودید
چرا رہ سوے زندانش نمودید

بتی کا زار باشد بر تنش گل
کے از دانا سزد بر گردنش غل
گلے کش نیست تاب باد شبگیر
بپایش چوں نہد جز آب زنجیر

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ تمام عورتوں نے بادشاہ سے کہا۔ حاش للہ دراصل حاشا تھا الف کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے یہ دراصل حرف ہے لیکن یہاں پر اسے مصدر کے قائم مقام رکھا گیا ہے بمعنے تنزیہ اور لام اپنے مدخول سے برأت و نزاہت کے لیے ہے۔ اسی سورۃ مبارکہ میں حاشا کی تحقیق ہم نے بیان کر دی ہے اس سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور اسکی قدرت کاملہ کا بیان ہے کہ اس نے اپنے بندوں میں کیسے پاک دامن انسان پیدا فرمائے ہیں۔ اب اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے عجز سے کہ وہ یوسف علیہ السلام جیسے پاک دامن پیدا نہ کر سکے۔ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ط ہمیں یوسف علیہ السلام کے متعلق کوئی برائی اور خیانت معلوم نہیں۔ ؎

ز یوسف ما بجز پاکی ندیدیم
بجز عصمت و شرفناکی ندیدیم
نباشد در صدف گوہر چناں پاک
کہ بود از تہمت آں جان جہاں پاک

ترجمہ: ہم نے یوسف علیہ السلام سے سوائے پاکدامنی کے اور کچھ نہیں دیکھا سوائے عزت و شرافت کے کچھ نہیں دیکھا کوئی ان جیسا دنیا میں پاک دامن نہ ہوگا اور یہ ہر تہمت و بہتان سے پاک ہیں۔

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ عزیز مصر کی عورت یعنی زلیخا نے کہا اور وہ بھی مجلس میں موجود تھی۔ کاشفی نے لکھا ہے کہ جب زلیخا نے دیکھا کہ اب سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تو اس نے بھی یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا اَلْـٰٔنَ اس سے زلیخا کے بولنے کا وقت مراد ہے عورتوں کی شہادت کا وقت مراد نہیں یعنی اب حَصْحَصَ الْحَقُّ ز حق واضح اور منکشف ہو کر تمام لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں گھر کر گیا اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ میں نے یوسف علیہ السلام سے وصال کی آرزو کی وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ بیشک وہ اپنے قول ھِیَ رَاوَدَتْنِی عن نفسی میں سچے ہیں۔

حضرت مولانا جامی قدس سرہ نے فرمایا: ؎

ا بجرم خویش کرد اقرار مطلق
بر آمد زد صدائے حصحص الحق

۲ بگفتا نیست یوسف را گناہے
منم در عشق او گم کردہ راہے

۳ نخست او را بوصل خویش خواندم
چو کام من نداد از پیش راندم

۴ بزنداں از ستمہاے من افتاد
دراں غمہا ز غمہاے من افتاد

۵ غم من چوں گزشت از حد و غایت
بجانش کرد حال من سرایت

۶ جفاے گر رسید او را زجافی
کنوں واجب بود او را تلافی

۷ ہر احسان کاید از شاہ نکو کار
بصد چنداں بود یوسف سزاوار

ترجمہ: ۱۔ اپنے جُرم کا اقرار کر لیا اور اس سے حصحص الحق کی صدا برآمد ہوئی۔
۲۔ کہا یُوسف علیہ السلام کا کوئی گناہ نہیں میں نے ہی اس کے عشق میں راہ گم کیا ہے۔
۳۔ پہلے میں نے اسے اپنے وصال کی دعوت دی جب اس نے میری مراد پُوری نہ کی تو میں نے اسے اپنی درگاہ سے ہٹا دیا۔
۴۔ میرے ظلم کی وجہ سے قیدخانے میں چلے گئے اور غم در غم میں مبتلا ہوئے۔
۵۔ میرا غم جب حدو غایت سے گزرا میرے غم نے اس میں اثر ڈالا۔
۶۔ مجھ سے اس پہ اگر ظلم پہنچا ہے تو اس پہ احسان و کرم ضروری ہے۔
۷۔ ہر وُہ احسان و کرم جو بادشاہ سے ہو سکے اسی کے یُوسف علیہ السلام مستحق ہیں۔

ف: ابن الشیخ نے فرمایا جب زلیخا کو معلوم ہُوا کہ یُوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے سامنے زلیخا کو اپنی شکایت میں داخل نہیں کیا بلکہ مصر کی دُوسری عورتوں کو شکایت کا نشانہ بنایا۔ کما قال ما بال النسوة التی قطعن ایدیھن حالانکہ یہ سارا فتنہ زلیخا کی طرف سے تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہُوا کہ زلیخا کو عورتوں کی شکایت سے علیحدہ رکھا۔ یہ زلیخا کی تعظیم و تکریم کے پیشِ نظر تھا تاکہ اس کی مزید بدنامی نہ ہو اسی لیے زلیخا کو خیال گزرا کہ یُوسف علیہ السلام کو اس کا نیک بدلہ دے۔ چنانچہ بھرے مجمع میں کہہ دیا کہ یہ ساری غلطی میری ہے یُوسف علیہ السلام کا اس میں کسی قسم کا قصور نہیں۔

ایک عورت نے کسی قاضی (حاکم) وقت کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ اس کا شوہر اسے مہر نہیں دیتا۔
حکایت قاضی نے حکم فرمایا کہ عورت کے مُنہ سے کپڑا ہٹاؤ تاکہ گواہ اپنی گواہی پُوری دے سکیں۔ اس کے شوہر نے اگرچہ پہلے مہر کی ادائیگی کا کہتا تھا لیکن اب اقرار کیا کہ واقعی میں نے اپنی عورت کی مہر ادا نہیں کی۔ عورت نے کہا میرے شوہر نے میرے پردہ کی عزت رکھی اور مہر ادا نہ کرنے کا اقرار کر لیا اب میں نے اس کو اپنی مہر کے علاوہ اپنے جملہ حقوق معاف کر دیئے۔

سبق: یُوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی شہادت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ آپ کے بڑے بڑے دشمنوں نے آپ کی پاکدامنی کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ بھرے مجمع میں گواہی دی کہ واقعی حضرت یُوسف علیہ السلام کا دامن برائی میں داغدار نہیں۔ سچ ہے:

الفضل ما شہدت بہ الاعداء

تفسیر صُوفیانہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قلن کی ضمیر قوائے انسانی کی طرف راجع ہے حاش للہ اور امرأۃ العزیز سے نفسِ امّارہ مراد ہے الـٰن حصحص الحق سے نفس و قویٰ کا نورِ حق سے نورانی ہونا اور اس کا صفات الطاف اور صدق و عدل سے موصوف ہونا مراد ہے اور نفس ان صفات سے اس وقت موصوف ہوتا ہے جب اس کی اسماء سبعہ سے تکمیل ہو یا بارہ سال خلوت کے جیل خانے میں گزارے اس لیے کہ قلب اسی خلوت اور تکمیل سے نورِ وحدت تک پہنچتا ہے اور نفس کو فضیلت قلب اور اس کے صدق و برأت سے نفس کو تزکیہ و اطمینان نصیب ہوتا ہے کیونکہ نفس کا کمال اطمینان گناہوں کے اعتراف و استغفار میں ہے یعنی نفس کو اعتراف ہو کہ اس سے جتنی غلطیاں ہوئی ہیں انہیں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ یاد رہے کہ غلطیاں نفس امّارہ سے سرزد ہوتی ہیں۔ اور صدق فی الاعمال سے مراد یہ ہے کہ بندے کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے موافق ہو اور صفات نفسانیہ پاک ہے۔

تفسیر عالمانہ ذٰلِكَ یہ یُوسف علیہ السلام کے کلام سے ہے۔ یعنی برأت کی طلب یا ثابت قدمی یا برأت کے اظہار کے لیے جدوجہد کرنا۔

ف: بادشاہ نے یُوسف علیہ السلام کو کہلا بھیجا کہ آپ پر تہمت لگانے والی عورتوں نے آپ کی پاکدامنی اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے فلہٰذا آپ تشریف لائیے تاکہ انہیں سزا دی جائے۔ یُوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اظہار برأت سے میرا مقصود یہ نہیں تھا کہ میں اپنے اُوپر تہمت لگانے والی عورتوں کو سزا دلواؤں بلکہ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ لِيَعْلَمَ تاکہ عزیزِ مصر کو معلوم ہو اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ میں نے اس کے حرم میں کوئی خیانت نہیں کی۔

مسئلہ: معصیت بھی ایک قسم کی خیانت ہے۔

بِالْغَيْبِ غائبانہ۔ یہ لم اخنہ کے صیغہ متکلم سے حال ہے۔ در اصل عبارت انی لم اخنہ دانا

غائب خفی علی عینیہ تھی یا مفعول سے ہے اب عبارت یوں ہوگی ؛ وھو غائب عنی خفی عن عینی ۔ یا ظرف ہے یہ دراصل بمکان الغیب وراء الاستار والا بواب المغلقۃ تھا۔ یعنی میں نے پردوں اور دروازوں کے باہر خیانت نہیں کی وَاَنَّ اللّٰہَ اور تاکہ معلوم ہو انّ اللہ بے شک اللہ تعالیٰ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ○ خیانت کرنے والوں کے مکروفریب کو جاری نہیں کرتا اور نہ ہی اسے سیدھا رکھتا ہے بلکہ اس کا بطلان ظاہر کرکے مٹا دیتا ہے جیسے عورت کے مکروفریب کے بطلان کو ظاہر کرکے مٹایا کہ بالآخر اس عورت سے اسکے مکروفریب کا خود اس سے اعتراف کرایا اور خائن کے فعل کو کید سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ خائن خیانت مکروتلبیس کرتا ہے اور اس کی ہدایت سے تکمیل اور مقصد میں کامیاب ہونا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ خائن کو تکمیل اور اسے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔

ف : اس میں اشارہ ہے کہ زلیخا نے اپنے شوہر کے معاملہ میں خیانت کی اور عزیز مصر نے بھی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی خیانت کی بایں معنیٰ کہ ایک بے گناہ کو کئی سال قید میں ڈالے رکھا حالانکہ اس نے آپ کی پاکدامنی کے شواہد و دلائل آنکھوں سے دیکھ لیے تھے۔ نیز اس میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی امانت دیانت کی تاکید فرمائی ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اگر میں خائن ہوتا تو میرا انجام بکار بخیر نہ ہوتا۔

ف : اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو غم کے بعد سرور کی طرف اور ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لیجاتا ہے۔

حکایت ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں شیخ ابو حفص سے حدیث کا درس لیتا تھا۔ ہمارے قرب میں ایک عطار کی دکان تھی ایک مرد نے اس سے دس درم کا عطر خریدا اور وہ وہیں پر اس سے گر گیا۔ وہ شخص گھبرایا ہم نے کہا کہ معمولی نقصان سے گھبراہٹ کیوں۔ اس نے کہا اگر دنیا سے مجھے گھبراہٹ ہوتی تو مجھ سے اس سے قبل تین ہزار دینار اور اسی قیمت کا ایک جوہر گر گیا ہے لیکن میں اس سے نہیں گھبرایا دراصل مجھے گھبراہٹ اس سے ہے کہ اس بڑے سرمایہ کے گرجانے کے بعد میرے پاس صرف یہی دس درم تھے اپنے پوتے کی ولادت کی خوشی پر خوشبو لینے آیا اور وہ بھی ضائع ہو گئی۔ اب گھبراہٹ مجھے اپنے اہل وعیال کے فراق سے ہے کہ اب مجھے گھر سے بھاگ جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ ایک سپاہی نے اس کی بات سن کر ایک تھیلی نکالی جس میں اس کے تمام دینار اور جوہر قیمتی بھی تھا یعنی بعینہٖ وہی دینار اور جوہر قیمتی تھا جو اس شخص نے بتایا اس میں اس نے کوئی چیز گم نہ پائی۔

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندوں کو پہلے شدائد میں مبتلا کرتی ہے پھر نجات دے کر بڑے مراتب سے نوازتی ہے۔ حضرت مولانا جامی قدس سرہٗ نے فرمایا : ؎

درین دہر کہن رسمیست دیرین
کہ بے تلخی نباشد عیش شیرین

خورد نہ ماہ طفلی در رحم خون
کہ آید با رخ چوں ماہ بیروں
بسا سختی کہ بیند لعل در سنگ
کہ خورشید درخشانش دہد رنگ

ترجمہ: دہر کی عادت ہے کہ عیش شیریں میں تلخی کی ملاوٹ کرتا ہے۔ بچے کو نو ماہ ماں کے پیٹ میں خون پلاتا ہے تاکہ چودھویں کے چاند کی طرح باہر آئے۔ پتھر میں لعل بہت ہی تکلیف دیکھتا ہے تاکہ اس کی روشنی سے جہان روشن ہو۔

تفسیر صوفیانہ آیت میں اشارہ ہے کہ صفات ذمیمہ میں ایک صفت خیانت بھی ہے جیسے امانت صفات حمیدہ سے ہے۔ یاد رہے کہ نماز، روزہ، وزن صحیح، کیل صحیح اور غلام اور لونڈیاں اور دوسروں کی امانتیں اور دیگر احکام شرعیہ ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں اسی طرح امانت وخطابت اور اذان وغیرہ امانات ہیں۔ حکام (گورنمنٹ) پر لازم ہے کہ ان کے حقوق ادا کریں یعنی جو لوگ ان امور میں لگے ہوئے ہیں ان سے تعاون کریں، اور پھر وجود نفسی بھی انسان کے ہاں امانتیں ہیں یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ تمام اعضاء سب کے سب امانات ہیں ان کے متعلق قیامت میں حساب ہوگا اور قلب تو قیمتی امانت ہے اسے ماسوی اللہ کی توجہ سے محفوظ رکھا جائے۔ ؎

ترا گو ہر دل کردہ اند امانتدار
ز دزد امانت حق را نگاہدار مخسب

ترجمہ: تجھے دل جیسی قیمتی چیز سپرد کی گئی ہے اس کا حق امانت ادا کر اسے چوری سے بچا اور غفلت نہ کر۔

مسئلہ: یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے نزدیک اور اس کے تمام معاملات کو دیکھ رہا ہے تو وہ برائیوں کے ارتکاب میں جرأت نہیں کرتا اور نہ ہی نفس کی اتباع کرتا ہے اس لیے کہ نفس تمام قباحتوں کا سرچشمہ ہے۔

حکایت منقول ہے کہ ایک نوجوان کے وجود سے بہترین خوشبو مہکتی تھی۔ اس سے سبب پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ یہ عطائے الٰہی ہے۔ اور اصل موجب یہ ہے کہ ایک عورت مجھے حیلہ وفریب سے اپنے گھر لے گئی اور مجھے برائی پر مجبور کیا لیکن میں نے پاخانہ میں جا کر غلاظت سے اپنے جسم اور کپڑوں کو بھر دیا۔ اس نے مجھے مجنون سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے عوض یہ خوشبو عطا فرمائی ہے اور مجھے یوسف علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوئی اور میں نے عرض کی کہ آپ کو مبارک ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزیز کی عورت زلیخا کے مکروفریب سے بچایا۔ حضرت

یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تجھے مبارک ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اس عورت کے جال سے بچا لیا۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ تیرا اس عورت کے ساتھ بُرائی کا ارادہ بھی نہیں تھا اور میرے اوپر طبیعت بشریہ کے ہجوم کا حملہ تھا اگر وہاں وجود حقیقی کا مقتضیٰ نہ ہوتا۔

اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عصمت و توفیق فی الدارین کا سوال کرتے ہیں۔

صاحبِ رُوح البیان قدس سرہٗ نے فرمایا کہ بارھواں پارہ ۲۰ ج ۲ ۱۱۰۳ھ میں ختم ہوا۔

فقیر اویسی غفرلہ اس کے ترجمہ سے ۹ صفر المصفر ۱۳۹۷ھ بروز اتوار بعد نماز ظہر فارغ ہوا۔ فلہ الحمد علیٰ ذٰلک فصلی اللہ علیٰ حبیبہ الکریم الرؤف الرحیم وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہ الذین اقاموا دینہ القویم۔

فہرست مضامین پارہ ۱۲